اردو کے مشہور خاکے

مرتبہ: محمد معروف سلیمانی

اردو کے مشہور خاکے

مرتبہ

محمد معروف سلیمانی

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

URDU KE MASHHOOR KHAKE

Edited By

MOHD. MAROOF SULAIMANI

Edition: 2017 Price: ₹ 500/-

Mohd. Maroof Sulaimani
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh
Mob.+91-9358668342,9997972281
Email: maroofjs@gmail.com

کتاب : اردو کے مشہور خاکے
مرتبہ : محمد معروف سلیمانی
مرتب کا اصل نام : محمد معروف
ایڈیشن : ۲۰۱۷ء/ بہ مطابق ۱۴۳۹ھ
تعداد : ۳۰۰
کمپوزنگ : محمد شاہد عالم
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

ISBN: 978-93-81027-78-7

تقسیم کار:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲
- دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یوپی)، انڈیا۔۲۷۶۰۰۱

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

والدین

کے

نام

جن کے احسان سے میرا وجود گراں بار ہے۔

فہرست

مقدمہ		۷
• ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی (کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی)	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱۵
• نام دیو۔مالی	مولوی عبدالحق	۶۵
• محسن الملک	مولوی عبدالحق	۷۰
• حالی	مولوی عبدالحق	۷۸
• مولانا محمد علی	مولانا عبدالماجد دریابادی	۹۵
• مسیح الملک حکیم اجمل خاں	علامہ اخلاق حسین دہلوی	۱۰۳
• سروجنی نائیڈو	آغا حیدر حسن	۱۰۷
• کندن	رشید احمد صدیقی	۱۱۶
• ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد	رشید احمد صدیقی	۱۲۹
• مرزا چپاتی	اشرف صبوحی دہلوی	۱۶۴
• مینا کماری	خواجہ احمد عباس	۱۷۶
• دوزخی	عصمت چغتائی	۱۸۴
• منٹو میرا دوست، میرا دشمن	عصمت چغتائی	۱۹۵

• ہمارے مولوی صاحب (بابائے اردو مولوی عبدالحق)	حمیدہ اختر حسین رائے پوری	۲۲۰
• سجاد حیدر یلدرم	قرۃ العین حیدر	۲۸۲
• پنڈت جواہر لال نہرو	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۳۰۵
• مسز اندرا گاندھی (چند بکھرے ہوئے تاثرات)	سید حامد	۳۲۰
• فیض احمد فیض ('زادِ سفر' کا ایک ورق)	ساقی فاروقی	۳۳۳
• مولانا حسرت موہانی	نورالحسن نقوی	۳۵۳
• مولانا ابوالکلام آزاد	نورالحسن نقوی	۳۶۱
• پروفیسر علی محمد خسرو	نورالحسن نقوی	۳۷۲
• پروفیسر آل احمد سرور	نورالحسن نقوی	۳۸۲
• ڈاکٹر ذاکر حسین: پیکرِ ستودہ صفات	اسلوب احمد انصاری	۳۹۶
• رشید احمد صدیقی - ہمارے رشید صاحب	اسلوب احمد انصاری	۴۱۰
• سید حامد: حلم وانکسار کی روشن علامت	اسلوب احمد انصاری	۴۲۵
• جذبی صاحب	کبیر احمد جائسی	۴۴۰
• ثناخوانِ حق (مولوی ثناالحق صدیقی)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴۵۲
• مالک رام	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴۶۵
• کس ادا کے ساتھ (آدا بہن)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۴۷۴

○○○

مقدمہ

خاکہ، غیر افسانوی نثر کی ایک مقبول صنف ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش شعرائے اردو کے تذکروں (فارسی/اردو) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی (۱۸۸۴۔۱۹۴۷ء) نے اردو میں باضابطہ طور سے جدید طرز کے خاکے تحریر کیے۔ ڈپٹی نذیر احمد پر لکھا گیا مرزا فرحت کا خاکہ "مولوی نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے رسالہ "اردو" بابت جولائی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ فرحت اللہ بیگ کا تحریر کردہ دوسرا مشہور خاکہ مولوی وحید الدین سلیم سے متعلق تھا جو "ایک وصیت کی تعمیل" کے عنوان سے ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کا یہ طویل سفر تقریباً نوے (۹۰) سال سے جاری ہے۔ اس عرصے میں آغا حیدر حسن، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، شاہد احمد دہلوی، جلیل قدوائی، سید وحید الدین فقیر، عبدالماجد دریابادی، اعجاز حسین، عبدالشکور، فرقت کاکوروی، معین الدین دردائی، اشرف صبوحی، عصمت چغتائی، منٹو، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور خلیل الرحمٰن اعظمی سے لے کر سید حامد، حمیدہ اختر، کبیر احمد جائسی، نورالحسن نقوی، اسلم فرخی اور غضنفر تک اردو کے خاکہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان قلم کاروں نے خاکے کی صنف کو فکری و فنی بلندی عطا کی اور بہت سی معروف اور اکابر شخصیات کے علاوہ معمولی اور غیر اہم شخصیتوں کو بھی زندۂ جاوید کردیا۔

خاکے کا شمار اخلاقی ادب میں ہوتا ہے انسانی قدروں کے فروغ کے سلسلے میں اس صنف کی جو اہمیت ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں جس انداز کے خاکے لکھے

گئے ہیں ان میں شخصیت نگاری کا فن بھی اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے اور اخلاقی اقدار کا گہرا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ خیال آیا کہ خاکوں کا ایک ایسا انتخاب مرتب کیا جائے جس میں شخصیت نگاری کے تمام رنگ سامنے آجائیں اور اسی کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری کے ارتقا کی ایک واضح تصویر بھی اُبھر آئے۔ یہ انتخاب اسی خیال کو عملی شکل دینے کی ایک حقیری سی کوشش ہے۔

اس انتخاب میں ہم نے ۲۹ خاکے شامل کیے ہیں۔ کچھ خاکوں کا اس میں اور اضافہ کیا جاسکتا تھا لیکن طوالت کے خوف نے ہمیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ سب سے پہلے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی'' کے عنوان سے مرزا فرحت اللہ بیگ کے تحریر کردہ خاکے کو اس انتخاب میں جگہ دی گئی ہے۔ مولوی نذیر احمد سرسید کے نامور رفقا میں سے تھے۔ انھوں نے اردو میں معاشرتی اور اصلاحی رنگ کے ناول لکھے۔ مرأۃ العروس (۱۸۶۹ء)، بنات النعش (۱۸۷۲ء)، توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء)، فسانۂ مبتلا (۱۸۸۵ء)، ابن الوقت (۱۸۸۸ء) وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے انداز فکر کی جھلک تو ان کے ناولوں میں دکھائی دیتی ہے لیکن ان کی ذاتی شخصیت کے دلچسپ نقوش کو مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء۔۱۹۴۷ء) نے جس فنی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مرزا فرحت نے مولوی نذیر احمد کی خدمت میں رہ کر عربی کا درس لیا تھا اسی لیے انھیں اپنے استاد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) بھی اردو کے اہم ترین خاکہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے نامور فرزند تھے۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا سے فیض تربیت حاصل کیا تھا اسی لیے انھیں اقدار سے گہری دلچسپی تھی۔ مولوی صاحب کا خیال تھا کہ انسان ذات پات، رنگ نسل، مال و دولت اور جاہ و منصب کی بدولت بڑا نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی صفات اسے بڑا بناتی ہیں۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے اکابر شخصیات کے ساتھ ساتھ نام دیو۔ مالی جیسے معمولی آدمی کا خاکہ بھی لکھ ڈالا۔ مولوی عبدالحق نے نام دیو جیسے ادنیٰ شخص کو موضوع بنا کر اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں کا خاکہ لکھ کر مولوی عبدالحق نے سرسید کے اہم رفیق اور علی گڑھ تحریک کی ایک متحرک شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ محسن الملک کی خدمات ہمارے لیے آج بھی سبق آموز ہیں۔

سرسید کے رفقا میں مولانا الطاف حسین حالی کی شخصیت زیادہ اہم رہی ہے۔ انھوں نے سرسید کے اصلاحی مشن میں ہر طرح سے ان کا ساتھ دیا۔ ''مسدس حالی'' (مدو جزر اسلام) لکھ کر مسلمانوں کو ان کے ماضی اور اسلاف کے کارناموں سے روشناس کراتے ہوئے پوری قوم کو حرکت و عمل کا پیغام دیا تا کہ مسلمان ہمت اور استقلال سے کام لیتے ہوئے پستی سے نجات حاصل کریں اور ترقی کی بلندیوں تک پہنچیں۔ حالی کی سیرت و شخصیت میں قومی دردمندی، بشر دوستی، راستی، اخلاق، شرافت اور نیک دلی جیسی اعلیٰ انسانی صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ مولوی عبدالحق نے حالی کا خاکہ لکھ کر ان کی شخصیت اور خدمات کے تمام اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کے مجاہد آزادی، بے باک مقرر اور علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے۔ مولانا کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لیے توجہ کا مرکز رہی ہے۔ لہٰذا مولانا محمد علی جوہر سے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی (مارچ ۱۸۹۲۔۱۹۷۷ء) کا لکھا خاکہ ہمارے لیے قابل مطالعہ ہے۔

''مسیح الملک حکیم اجمل خاں'' کا خاکہ علامہ اخلاق حسین دہلوی نے لکھا ہے۔ حکیم اجمل خاں بہت بڑے ماہر طب اور ملک و قوم کے محسن رہے ہیں۔

آغا حیدر حسن (۱۵/اگست ۱۸۹۲۔ ۵/نومبر ۱۹۷۶ء) نے سروجنی نائیڈو کا عمدہ خاکہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے بیگماتی طرز بیان کے ذریعے سروجنی نائیڈو کی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے۔

رشید احمد صدیقی (۱۸۹۶۔۱۹۷۷ء) نے ''کندن'' جیسے معمولی انسان کا خاکہ لکھا۔ کندن علی گڑھ کالج کا ایک معمولی سا چپراسی تھا لیکن اس کی محنت، ایمان داری اور فرض شناسی نے رشید صاحب کو اس حد تک متاثر کیا کہ انھوں نے اس کا خاکہ بھی تحریر کر دیا۔

رشید احمد صدیقی کا لکھا ہوا دوسرا خاکہ ''ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد'' سے متعلق ہے۔ سر ضیاء الدین احمد ایک بڑے مفکر، دانش ور، ماہر ریاضی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر تھے جن کا زمانہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بعد کا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ رشید صاحب، ذاکر صاحب کے ارادت مندوں میں شامل تھے تاہم سر ضیاء الدین احمد کی شخصیت اور خدمات کے اعتراف میں انھوں نے اپنی دیانت داری کا ثبوت دیا۔

اشرف صبوحی دہلوی (۱۹۰۵-۱۹۹۰ء) اردو کے ایک اہم خاکہ نگار تھے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ان کے خاکوں کا مجموعہ ''دلّی کی چند عجیب ہستیاں'' انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے مولوی عبدالحق نے شائع کیا تھا۔ دلّی کی ٹکسالی زبان، محاوروں اور روزمرّوں پر اشرف صبوحی کو جو عبور حاصل تھا اس کی مثال کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے حقیقی شخصیتوں کے علاوہ بعض فرضی اور خیالی شخصیات کے بھی دلچسپ مرقع پیش کیے تھے۔ ان کا تحریر کردہ مشہور خاکہ ''مرزا چپاتی'' بھی ہم نے اس انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔

Bollywood کی اداکارہ مینا کماری بہت سے دلوں کی دھڑکن سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی اداکاری کی دھوم صرف ہندوستانی فلم انڈسٹری میں ہی نہیں تھی بلکہ بہت غیر ملکی بھی ان کے مداح تھے۔ وہ بڑی خوب صورت ہیروئن اور اعلا درجے کی اداکارہ تھیں۔ خواجہ احمد عباس (۷/جون ۱۹۱۴-یکم/جون ۱۹۸۷ء) کے قلم نے مینا کماری کی شخصیت کو مزید پُرکشش بنا دیا۔

''دوزخی'' عصمت چغتائی (۲۱/اگست ۱۹۱۵-۲۴/اکتوبر ۱۹۹۱ء) کا تحریر کردہ خاکہ ہے جس میں انھوں نے اپنے سگے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی سیرت و شخصیت کو غیر جانب داری کے ساتھ پیش کیا۔ اردو خاکہ نگاری میں یہ خاکہ اپنی مثال آپ ہے۔

''منٹو میرا دوست، میرا دشمن'' عصمت چغتائی کا دوسرا دلچسپ خاکہ ہے۔ منٹو کے بے تکلفانہ انداز، آزادیٔ رائے، بچوں سے محبت اور علم دوستی پر عصمت چغتائی نے جہاں اس خاکہ میں روشنی ڈالی ہے وہیں دوسری طرف منٹو کی شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر بھی یہاں سامنے آ گئی ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کی خدمت میں صَرف کردی۔ تحقیق، تدوین، لسانیات، لغات، قواعد، مقدمہ نگاری، خطبات نگاری، مکاتیب اور خاکے جیسی اصناف میں ان کی خدمات کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ وہ اردو تحریک کے شیدائی اور نڈر شخصیت کے مالک تھے۔ حق اور اصولوں کے آگے وہ کسی سے دبنا نہیں جانتے تھے۔ مشہور جاسوس، ناول نگار اور سول افسر ظفر عمر کی بیٹی حمیدہ اختر کی شادی بھی اختر حسین رائے پوری سے مولوی صاحب نے کروائی تھی۔ وہ اختر کو اپنے بیٹے اور حمیدہ کو اپنی بہو کی طرح مانتے تھے۔ حمیدہ اختر نے مولوی صاحب کو قریب سے دیکھا تھا، اسی لیے انھوں نے مولوی صاحب کا دلچسپ خاکہ تحریر کر کے ان کی شخصیت کے ایسے تمام پہلوؤں کو اجاگر کردیا جن سے اردو والے عموماً واقف نہیں تھے۔ اس لحاظ سے یہ خاکہ دلچسپ ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اپنے زمانے کے مشہور فکشن نگار تھے۔ ترکی ادب سے انھوں نے کئی اہم افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ترجمے اردو میں کیے تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار اور اردو کے اوّلین صدر شعبہ مقرر کیے گئے تھے۔ مشہور فکشن نگار قرۃ العین حیدر (۱۸ر فروری ۱۹۲۷۔ ۲۰۰۷ء) ان ہی کی بیٹی تھیں جنھوں نے اپنے والد کا خاکہ ''سید سجاد حیدر یلدرم'' کے عنوان سے لکھا لیکن شخصیت نگاری کے سلسلے میں دیانت داری کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ ان کا خاکہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۹۱۱۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء) نے تحریر کیا تھا۔ سیاسی شخصیات پر لکھے گئے خاکوں میں یہ انفرادی نوعیت کا خاکہ ہے اسی لیے ہم نے اس انتخاب میں شامل کرلیا۔

سید حامد کے ذریعے اندرا گاندھی پر لکھا خاکہ بھی قارئین کے لیے قابل توجہ ہے۔ سید حامد نے اندرا گاندھی کی زندگی کے نشیب و فراز، دانش ورانہ و جرأت مندانہ فیصلے اور حیات کے مختلف واقعات کی خوب صورت پیکر تراشی کی ہے۔

فیض احمد فیض پر مبنی خاکہ قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہے۔ خاکہ کے مطالعہ سے فیض کی شخصیت کے کئی نقوش ہم پر عیاں ہوتے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے اور مجاہد آزادی تھے جنھوں نے چکی کی مشقت میں بھی مشق سخن جاری رکھی اور قلندرانہ زندگی بسر کی۔ نورالحسن نقوی نے حسرت موہانی کی شخصیت کو دلچسپ اور موثر انداز سے پیش کر دیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام مجاہد آزادی، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم، نامور صحافی اور ادیب و دانش ور کی حیثیت سے مشہور ہے۔ الہلال، البلاغ، تذکرہ، غبار خاطر، کاروانِ خیال جیسے کارنامے ان کی ادبی شہرت پر دال ہیں، لیکن مولانا کی شخصیت کی گہرائی اور اس کے داخلی معاملات تک پہنچنا عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ نورالحسن نقوی نے مولانا آزاد کا خاکہ لکھ کر ان کی سیرت و شخصیت کے داخلی گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔

"پروفیسر علی محمد خسرو" ماہر اقتصادیات اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، وہ ایک دل نواز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے تدبر، حاضر جوابی اور شیرینی گفتار کے سبھی قائل تھے۔ نورالحسن نقوی نے ان کا خاکہ بھی دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ اسی طرح پروفیسر آل احمد سرور پر تحریر کردہ خاکہ بھی سرور صاحب کی سیرت و شخصیت کو آئینہ کر دیتا ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے آئینہ خانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا دلچسپ مرقع بھی موجود ہے، اس لیے اسے بھی اس انتخاب میں جگہ دی گئی ہے۔ ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامور فرزند تھے۔ وہ اس دانش گاہ کے شیخ الجامعہ اور ہندوستان کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ وہ افسانہ نگار اور ادیب بھی تھے۔ ان کی سیرت و شخصیت کے بعض اہم نقوش اسلوب صاحب کے تحریر کردہ خاکہ میں اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ "ہمارے ذاکر صاحب" کے عنوان سے رشید احمد صدیقی نے بھی ذاکر صاحب کو متعارف کرایا تھا، لیکن اسلوب احمد انصاری نے ذاکر صاحب کو نئے انداز میں دیکھا ہے۔

رشید احمد صدیقی اردو کے مشہور و معروف ادیب، انشاپرداز، علی گڑھ کے طالب علم، شعبۂ اردو کے صدر اور علی گڑھ کی تہذیبی روایات کے پاسبان رہے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری

نے رشید صاحب پر بھی عمدہ خاکہ تحریر کیا ہے۔ علی گڑھ کے ایک اور نامور فرزند اور یہاں کے سابق شیخ الجامعہ جناب سید حامد کا خاکہ بھی اسلوب احمد انصاری نے لکھا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے بھی یہاں شامل کرلیا گیا۔

کبیر احمد جائسی کے ذریعہ "جذبی صاحب" پر لکھا گیا خاکہ ان کی شخصیت کی کئی جہتوں کو روشن کرتا ہے۔

"مولوی ثناء الحق صدیقی"، "مالک رام" اور "ادا جعفری" سے متعلق ڈاکٹر اسلم فرخی کے تحریر کردہ خاکے بھی اہمیت کے حامل ہیں اور اس انتخاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

اس انتخاب میں علمی، ادبی، سیاسی، انتظامی ہر طرح کی اکابر شخصیات کے ساتھ ساتھ ادنیٰ اور معمولی انسان کے خاکے بھی شامل کیے گئے ہیں تاکہ اس کی جامعیت برقرار رہ سکے۔ اس کوشش میں کس حد تک مجھے کامیابی مل سکی ہے، اس کا فیصلہ اربابِ علم و دانش ہی فرمائیں گے۔

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مجھے اپنے فاضل اساتذہ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اردو کے اہم خاکوں کا یہ انتخاب بھی اسی فیضانِ نظر کا عطیہ ہے۔ اس سلسلے میں استاد گرامی پروفیسر شہاب الدین ثاقب اور استاد مکرم پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب (صدر شعبۂ اردو) کا میں خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اپنے تمام دوستوں کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے جو میری مشکلیں آسان کرتے رہتے ہیں۔

محمد شاہد عالم صاحب نے اس کتاب کی خوب صورت کمپوزنگ کی اور عرشیہ پبلی کیشنز کے ڈائرکٹر جناب اظہار ندیم نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔ میں ان دونوں حضرات کا بھی دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد معروف سلیمانی
(سینیر ریسرچ فیلو)
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲ (انڈیا)

۳۰ر جنوری ۲۰۱۷ء

ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی

(کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی)

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور دانی (ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب مرحوم) مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے۔ ان کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی۔ ان کا طرز بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا۔ ان کی خوش مذاقی خود ان کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی۔ ان کی تکلیفیں خود ان کو پُرنم اور ہم کو تڑپاتی تھیں، اور آج وہ دن ہے کہ ان کے حالات زبانِ قلم پر لانے سے ڈر لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی ''اخوتِ اسلامی'' کا سبق پڑھے ہوئے تھی، اس کو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا، وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتے تھے۔ اس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا، وہ کسی کی خوشامد کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑہ۔ وہ اپنے دست و بازو کے بھروسے پر اس میدان میں اُترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رُکاوٹیں نہیں ہیں جو بہ آسانی ہٹائی نہ جاسکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ I am a self made man کا فقرہ ضرور استعمال کرتے اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے، جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے، جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نااہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں۔ یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری۔ ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے جو اپنے آباؤ اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ان کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے "میاں اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ، دس روپیہ کے اہل کار ہو کے باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔"

بہر حال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا۔ بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں اینچن چھوڑ کسیتن میں نہ پڑ جاؤں لیکن رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تا کہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو۔ میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیوں کہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔ جس موقع پر جو کچھ سنا یا دیکھا اس کو جوں کا توں لکھ دوں گا اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کیے جائیں۔ انشاءاللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔ اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پروا نہیں میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں۔ اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدانِ حشر میں سود در سود لگا کر تاوان وصول کر لیں گے۔

اب رہا طرز بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں کیوں کہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا ان کا منھ چڑانا ہی نہیں ان کی توہین کرنا ہے بلکہ یوں کہو سید انشا کو میر اور مارک ٹوئین کو امرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں انھوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضع داری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں۔

چل رے خامہ بسم اللہ

۱۹۰۳ء میں، میں نے اور میاں دانی نے، ہندو کالج دہلی سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ ایف۔ اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی۔ اے میں عربی لے لو۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی۔ مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا، یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔ القصہ ہم دونوں بی۔ اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے، بڑے اللہ والے لوگ تھے۔ عربی کا گھنٹہ بہ آسانی تصوف کی باتوں میں گزر جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں کم ترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صرف ونحو تو اس میں تو کورا کا کورا ہی رہا، سنتے آئے ہیں کہ ''مصیبت کہہ کر نہیں آتی'' لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ ''عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے۔'' ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر کعبۃ اللہ چلے گئے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے، ان سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو انھوں نے کورا جواب دے دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے، بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو۔ میں نے دانی سے کہا کہ بھئی تمھارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی۔ اب میرے کہنے سے تم سائنس لے لو۔ جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا، اب اسی سہولت کے مدنظر اپنا مضمون بدلو۔

بقول شخصے کہ ''مرتا کیا نہ کرتا'' وہ راضی ہو گئے۔ دفتر میں جا کر جو لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔ لکچر کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریک امتحان ہونا پڑے گا۔ ''سنگ آمد و سخت آمد'' جب ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے'' کی صورت آن پڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ دونوں سر ملا کر بیٹھے مشورے کیے، ریزولیوشن پاس ہوئے۔ آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ ''خاک از تودۂ کلاں بردار'' کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیے۔ دلّی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے۔ ایک مولوی محمد اسحاق صاحب، دوسرے شمس العلما مولوی ضیاء الدین خاں صاحب ایل. ایل. ڈی اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی اس لیے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، قرعہ دوسرے صاحب کے نام پر پڑا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، مولوی ضیاء الدین صاحب جامع مسجد دہلی میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے، مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک کر خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے۔ ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے اس لیے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سرگیں آنکھیں، سفید ریشِ مبارک، سفید جبہ اور سب سے آخر زردبانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں۔ آہستہ آہستہ انھوں نے سیڑھیوں سے اُترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر ان کو جا لیا اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فراشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے وہی پہلے والی ترکیب کی کہ چکر کھا کر پھر سامنے

آ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے پوچھا ''میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے۔'' ہم رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے، فرمانے لگے: ''تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں۔'' بجنسہٖ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے جیسے اس زمانے میں کوئی کہے ''تم کو معلوم ہے کہ میں سی.آئی.ڈی کا انسپکٹر ہوں۔'' لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ ''تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجیے۔'' ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو، بہر حال کچھ بھی ہو انھوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر اور نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو، وہ حکم کا بندہ قندیل اُٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے طرز عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے۔ چلو امید نمبر ۲ پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لیے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے ایسے رستم کو پکڑنے کے لیے شغال بننا ضرور ہے۔ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور ریزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے۔ اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سن لیجیے۔ ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا۔ نہایت نیک اور پرہیز گار شخص تھے، جوتوں کی دوکان تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب اس دوکان کو ہمیشہ رتی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آ کر بیٹھتے تھے۔ عبدالرحمٰن گو میرے ہم جماعت نہ تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا۔ مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چنانچہ ان ہی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی.اے، ایل.ایل.بی کے امتحانات پاس کیے۔ ان کی وجہ سے وکالت میں ترقی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا

نتیجہ ہے کہ اس وقت دہلی میں ان کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ ایف. اے میں پڑھتے تھے۔

بہرحال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد ان سے اظہار مطلب کیا، کہنے لگے کہ ''بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے کہیں انکار نہ کر بیٹھیں۔'' میں نے کہا کہ ''میاں عبدالرحمٰن تم ان تک ہم کو پہنچا دو اگر ہوسکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو۔ آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت۔'' وہ راضی ہوگئے اور کہا کہ ''شام کو آٹھ بجے دوکان پر آ جانا میں مولوی صاحب سے ملوا دوں گا۔'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دوکان پر پہنچے، یہ دوکان فتح پوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فراشی سلام کیے اور خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمٰن ہمارے پاس آ بیٹھے، مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انھوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا، میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا، دھتکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔ سچ ہے مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے۔ ''مرتا کیا نہ کرتا۔'' میں نے یہی سوچ لیا کہ آج اس پار یا اس پار۔ مولوی ضیاء الدین صاحب تو بچ کر نکل گئے، لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔ قصۂ مختصر، مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا یہ دونوں صاحب کون ہیں، عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے کچھ اُلٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کیے۔ اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہوگئے۔ میں نے دل میں کہا ''پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ موا کل موا۔''

اب میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل و مرام باضابطہ پسپائی ہو۔ میں نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا تو فرمانے لگے ''تو عربی چھوڑ دو سائنس پڑھو، بیٹا آج کل

مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں مثل ہے: 'پڑھیں فارسی بیچیں تیل،
یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔ فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لوگے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا۔''
ان کی اس پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے، ہم رہنے والے ٹھہرے جامع مسجد
کے نیچے کے بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون درآ سکتا ہے۔ ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ
میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے۔ اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس دیے۔
دانی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ ''یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔
بیٹا جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو۔ دلّی میں کیا مولویوں کا کال ہے۔ مجھے ذرا
بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔'' میں نے عرض کی کہ ''جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے
مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں۔۔۔اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں ہیں۔'' کہنے لگے
''نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمس العلما
مولوی ضیاء الدین صاحب ایل۔ایل۔ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، ان کو
فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔'' میں نے کہا ''اس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن
بھی ہیں۔'' کہنے لگے ''میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔'' یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے، جامع مسجد
کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ ''بھئی تم
لونڈوں سے ڈرنا چاہیے ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصافِ حمیدہ و خصائل
پسندیدہ سراج الدین کی دوکان پر اسی طرح معرضِ بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش
ٹھونک دیں۔ اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا، مگر تم بھاگ جاؤ گے۔'' ہم دونوں کے منھ سے
ایک ساتھ نکلا ''نہیں ہرگز نہیں۔'' مولوی صاحب نے کہا کہ ''چھٹی ایک دن کی بھی نہ
ہوگی۔'' ہم نے کہا ''بہت خوب۔'' مولوی صاحب نے کہا کہ ''عید بقرعید کو بھی آنا پڑے گا۔''
ہم نے کہا کہ ''بہت مناسب کل کس وقت حاضر ہوں۔'' مولوی صاحب تھوڑی دیر تک
انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا ''دوپہر کو ڈیڑھ بجے۔'' ہم
نے کہا ''بہت خوب۔'' چوں کہ ان باتوں میں رات زیادہ ہوگئی تھی، اس لیے مولوی صاحب
دوکان پر سے اُٹھے ہم سب نے سلام کیا اور وہ وعلیکم السلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔

یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر اس فیصلے میں بڑی مدد کی۔ ہم دونوں بھی خوش خوش اُٹھے اور سلام علیکم وعلیکم السلام کر کے دوکان سے چلے۔ راستے میں دانی نے کہا "میاں مرزا، بڑے میاں نے مار ڈالا ابھی گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں چلنے کی تیاری کرنی پڑے گی۔ کہاں چاوڑی اور کہاں کھاری باؤلی۔ جون کا مہینہ کہیں راستے میں لو لگ کر ٹیں نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا میاں دانی کچھ دنوں چل کر دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آ جائے مگر ان کو آخر تک رحم نہ آنا تھا نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے چھ بجے سے تعلیم کا وقت مقرر ہوا لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہی کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے۔ بے چاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور انھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔ تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے، نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے، نہ ان دو سال میں ایک دن ناغہ کیا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ "بیٹا جب تم دونوں آتے ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے، کیوں کہ میں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح ہم نے پڑھا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس زمانے کے لونڈوں پر اگر ایسی پتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں مگر (میری طرف دیکھ کر) استاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں، تم صرف بی۔اے پاس کرنے کی فکر میں ہو۔ دانی کو شوق ہے یہ عربی میں ترقی کرے گا مگر تم کورے کے کورے ہی رہو گے اور انشاء اللہ پانچ چھ ہی برس میں میری ساری محنت اکارت کر دو گے۔" خدا کے فضل سے ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں، میں مولوی صاحب کی شکل وصورت، مکان کی حالت، ان کے رہنے سہنے کے طریقے اور ان کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں تا کہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہو سکے لیکن

سینومینوگراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں، کیوں کہ میری شوخی بعض جگہ حدِ تجاوز سے بڑھ جائے گی لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اس رنگ میں لکھتے اور اگر آپ ان کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی ان کے حالات لکھتے وقت میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی، ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے کسی ٹھیٹھ ملاّ کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس وقت بھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالمِ بے خودی مجھ پر چھا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو، کوئی قصہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو، کوئی طرز بیان نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ ''مجھے مقطع اور مسمے شاگردوں سے نفرت ہے۔'' اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دوں گا کہ:

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

لیجیے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنیے:

رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا، مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا، دوہرا بدن، گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ ''بچپن میں ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے۔''...بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے قد چوں کہ ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لیے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا، توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اس کے پلو اڑسنے کی بجائے ادھر اُدھر ڈال لیتے تھے

مگر اُٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اوّل تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے اگر اُٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جاسکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ سر بہت بڑا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا۔ جو تھوڑے سے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرادیے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ گر سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہوجاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، بھوئیں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں ان کو مسکراتی ہوئی آنکھیں کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کلہ جبڑا بڑا زبردست پایا تھا۔ چوں کہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لیے گنجائش بڑھادی تھی اس لیے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ۔ کوئی دور سے جو سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے اسی لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا۔ ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری، ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں ’گاجر‘ اور دلّی والوں کی بول چال میں ’’پھلکی‘‘ کہا جاتا ہے۔ گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کردی تھی۔ داڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال بہ آسانی گنا جاسکتا تھا۔ کلّے تو کبھی قینچی کے منت کش نہیں ہوئے، البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کرلیا جاتا تھا۔ داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنادی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی جیسے ایکسریز (X-rays) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز، ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی۔ لیجیے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجیے، جنھوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے، کشمیری جبہ یا ایل۔ایل۔ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انھوں نے عالی جناب شمس العلما مولوی، حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ایل۔ڈی مدظلہ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا، ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔ جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتا پیجامہ ہوتا اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبہ، چوں کہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اس لیے لال نری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے، پھر بھی وقت بے وقت کے لیے وہ انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے۔ انھیں کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کو برداشت کرتا تھا۔ جرابوں سے انھیں ہمیشہ سے نفرت تھی گو دربار میں جانے کے لیے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں، یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔

اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھیے، آیئے میرے ساتھ چوڑی والوں سے چلیے۔ چوڑی والوں سے نکل کر چاوڑی میں آیئے، اُلٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں سے گزر کر لال کنویں پہنچیے، آگے بڑھیے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آیئے، یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے۔ نکڑ سے ذرا ادھر ہی دائیں ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے۔ بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے۔ یہاں اچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دوکانیں ہیں ان ہی دوکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے، تھوڑی ہی دور جا کر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے۔ صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا۔ دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں۔ دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں

آتے ہیں، صحن کسی قدر چھوٹا ہے۔ سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پڑھا کیا کرتے ہیں۔ اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے۔ چولھے بنے ہوئے ہیں، آگ جل رہی ہے مگر برتن اور ہنڈیا وغیرہ جو باورچی خانے کا جز ولاینفک ہیں، سرے سے ندارد ہیں۔ آگ صرف حقہ کے لیے سلگائی جاتی ہے کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے۔ دروازے کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے اور اندر ایک لمبا کمرا، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دروازے بند ہیں، ایک کھلا ہے۔ باہر ایک پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رتی کھینچ رہی ہے۔ ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کرتا ہے نہ ٹوپی نہ پیجامہ۔ ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے۔ بندھی ہوئی نہیں محض لپٹی ہوئی ہے لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے۔ کمرے میں نہایت اجلی چاندنی کا فرش ہے۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا ہے۔ کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے۔ سرہانے تکیہ رکھا ہے مگر اس کی رنگت کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ البتہ جس گاؤ تکیے سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے۔ قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ ''مولانا ایں چہ کارست کہ کردہ'' تو انشاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ ''محتسب را درونِ خانہ چہ کار''

جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصہ میں رہتے تھے۔ چلیے وہاں کا رنگ بھی دکھا دوں۔ صدر دروازہ سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسل خانہ اور بیت الخلا ہے، اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے، دروازے سے گزر کے چھت پر آتے ہیں۔ سامنے ہی ایک کمرہ ہے اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسل خانے کے بالکل مقابل دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی، یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے۔ اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقہ اس کی حقیقت کما حقہ، بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا، مگر تمبا کو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے

دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی۔ فرشی قیمتی تھی، مگر چلم پیسہ کی دو والی اور نیچہ تو خدا کی پناہ۔ اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچے کو جورد کا مترادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بے چارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے، مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہے۔ سر پر کنٹوپ ہے، مگر بڑا دقیانوسی، کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں لٹکتی ہوئیں۔ کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرے کا کام دیتیں۔ کبھی پاکھوں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے۔ اوپر صندلی رنگ کا دھسہ پڑا ہوا۔ لیجیے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو؟ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی "پانی تیار ہے؟" جواب ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسل خانے میں گئے کپڑے بدل (یا یوں کہو کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو، لیجیے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استغنا کے کئی باعث تھے۔ اوّل تو یہ بات تھی کہ ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں تھی۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں ان کا سارا دن گزر جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے۔ جس کو ملنا ہوتا تھا، شام کو ٹاؤن ہال کی لائبریری میں جا کر ان سے مل آتا تھا۔ جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا ان کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال، اور ظاہر ہے ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں، کتنے پانی میں، لباس سے اس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے۔ ان کو جس طرح آرام آتا اسی طرح رہتے۔ جی چاہتا پہنتے نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ جب باہر جاتے تو "کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا" پر عمل کرتے۔ اصل عالم تو گھر پر تھے، باہر نکل کر ظاہری عالم بن جاتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر پر کوئی عورت نہ تھی جو ایسی

چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی یا کم سے کم ان کا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی۔ گھر میں تھا کون۔ ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کا نزا بدھو نفر، ان کا نوکر خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پروا کہ خدا کی پناہ، ظالم نے بہرا بن کر کام سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبر میں چونک پڑیں اس کو کبھی نہ سنائی دی اور جب تک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا، اس نے ہمیشہ سنی کو ان سنی کر دیا۔ البتہ حقے کے معاملہ میں بڑا تیز تھا، یا تو اس کو یہ خیال تھا کہ حقے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارا ہونا دشوار ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمبا کو زیادہ صرف کرنے میں اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے۔ غرض یہ حال تھا کہ حقہ پورا سلگا بھی نہیں کہ وہ چلم اُٹھا کر چلا۔ مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہی رہے، اس نے جا چلم اُلٹ دی دوسرا سلفہ رکھ، آگ بھر، چلم حقہ پر لا کر رکھ دی، تو اگرم حقہ بھڑک گیا۔ میاں نوکر صاحب کو پھر بلا کر تو اٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی۔ غرض سارے دن ان کا یہی کام تھا اور وہ اس میں بہت خوش اور مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے۔ بعض یورپ پرست اس کی پابندیٔ اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں میں تو یہ کہتا ہوں کہ میں نے صرف دہلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں کہ آندھی آئے، مینھ آئے، روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے۔ ادھر انھوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور اُدھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن چھ بجائے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں۔ یہ تین شخص کون تھے؟ ایک منشی ذکاء اللہ صاحب، دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب اور تیسرے مولوی صاحب۔ ایک چیلوں کے کوچے سے آتا ہے، دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آ کر دوسرے کا انتظار کیا ہو، اگر ان سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی

ملازم سے جا کر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ اب آتے ہی ہوں گے، چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں۔ دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں۔ ان کے اس نظام اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیر ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت سویرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ گرمیوں میں اُٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے۔ ان کی صبح اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی۔ باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے، نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا۔ صبح کی نماز پڑھ کر تلاوت کرتے، ادھر ذرا دن چڑھا اور مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا۔ اس جماعت میں بخارا، کابل سرحد وغیرہ کے لوگ تھے۔ ان کی تعداد کوئی ۱۵۔۱۶ تھی۔ محنت ایسی کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مر جائے لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی ان سے زچ ہو جاتے تھے۔ خوش مذاقی تو انھیں چھو کر نہیں نکلی تھی۔ خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اُٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوءِ ادبی سمجھتے تھے۔ اب ان کے "وہ عمامے اونچے اونچے، یہ یہ لمبی لمبی داڑھیاں" دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو۔ بے چارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض اُتارتے جاتے تھے۔ عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ان فتح پوری کے ملاؤں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ کیا کہوں "میں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں" کا نقشہ ہے۔ یہ جماعت اُٹھی اور مولوی رحیم بخش آنازل ہوئے۔ کاغذوں کا مٹھا بغل میں ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، ادھر فتح پوری کی جماعت نے کمرے سے قدم نکالا اور اُدھر انھوں نے کمرہ میں قدم رکھا۔ اب سلسلۂ تصنیف و تالیف شروع ہوا۔ چوں کہ آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا، اس لیے لکھوانے کا کام اکثر انھیں سے لیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کی جاتی۔ اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ کام سمیٹتے سمیٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے۔ رحیم بخش صاحب کے اُٹھتے ہی کھانا آتا، کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ادھر ڈیڑھ بجا اور اُدھر ہم دونوں

داخل ہوئے۔ ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اُٹھ بیٹھے۔ ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزنی کرتے رہے، اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے۔ چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانے میں گئے، نہائے دھوئے، کپڑے پہن کر نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھہرے، یہاں بھی ان کا حساب کتاب تھا، وہاں کا کھاتہ دیکھا، جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے۔ سات بجے تک وہاں ٹھہرے جس کو ملنا ہوا وہاں مل لیا۔ سات بجے وہاں سے اُٹھ کر سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے یہاں بھی حساب کیا۔ عبدالرحمٰن کو پڑھایا، گھنٹہ بھر وہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے۔ کھانا کھایا، کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے۔ جاڑے میں پروگرام میں تبدیلی ہو جاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے۔ اس کے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے۔ ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا۔ ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا۔ پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہو سکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلاح کرتے ان کے لیے تو مولوی صاحب کا ناشتہ "اونٹ کے منھ میں زیرہ" ہو جاتا البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے "بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے میاں کیا مزہ کا آم ہے" مگر بندۂ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ "بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔" میں نے تو یہ تہیا کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منھ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں ان کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا۔ بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے۔ کہا کرتے تھے: "میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں۔ پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکان داروں سے

فائدہ پہنچا ہے، اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے۔
بیٹا تم بھی تجارت کرو، روپیہ میں دیتا ہوں نوکری کی کھکیڑ اُٹھاؤ گے تو مزہ معلوم ہوگا۔''
جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے، اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینھ، قرض داروں کے یہاں ان کا روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا۔ گئے اور جاتے ہی پہلے 'غلق' پر قبضہ کیا، اس کے بعد کھاتہ دیکھا، گروی دیکھی، سامان دیکھ کر بکری کا اندازہ کیا، روپیہ جیب میں ڈالا سلام علیکم وعلیکم السلام کیا اور چل دیے۔ دوسرے دوکان دار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دوہرایا۔ کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے اعتراضوں کی بوچھاڑ سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے ''بھئی حساب جو جو بخشش سو سو'' فقرے کے پہلے جزو سے تو بے چاروں کو روز واسطہ پڑتا، لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے ان کے کسی قرض دار کا نقصان ہو جاتا یا دیوالہ نکل جاتا تو پھر اس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے۔ ان کو خیال تھا کہ دہلی کے پنجابی تجارت کو خوب سمجھتے ہیں، ان کو دل کھول کر روپیہ دیتے تھے اور اکثر ان ہی کے ہاتھوں نقصان اُٹھاتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک صاحب جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں مولوی صاحب کے پاس آئے۔ تجارت کا ذکر چھڑا اور مولوی صاحبؒ کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز بلا کسی ضمانت کے گیارہ ہزار روپیہ کا چک مولوی صاحب نے ان کے نام لکھ دیا۔ بڑے ٹھاٹھ سے سنہری مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی۔ مولوی صاحب جاتے گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے، دوکان دار صاحب کی لچھے دار باتیں سنتے، چلتے وقت کچھ روپیہ جیب میں ڈالنے کو مل جاتے اس لیے خوش خوش بغیر حساب کیے گھر آجاتے۔ یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی صاحب کو چوکنا کر دیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔

قصہ مختصر، اصل میں سے دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما اس نے دیوالہ نکال دیا۔ قرقی ہوئی مال نیلام چڑھا اور اس میرے یار نے کل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا۔ مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس کے بعد آیا، بہت رویا

بہت ٹسوے بہائے، مولوی صاحب سمجھے بے چارے کو بڑا رنج ہوا، کہا بھئی جاؤ تجارت میں یہی ہوتا ہے یا اس پار یا اُس پار، چلو گئی گزری بات ہوئی۔ ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جارہے تھے کچھ جھٹپٹا ہوا تھا کیا دیکھتے ہیں کہ دوکان دار صاحب خوب بنے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے، ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اُترے اور آکر ایک کھلی گاڑی میں سوار ہوئے۔ مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹک گئے۔ اتنے میں انھوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا، بہت مسکرا کر سلام کیا، رنڈی نے چپکے چپکے کچھ دریافت کیا تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ ''یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔'' مولوی صاحب کے آگ لگ گئی۔ دوسرے ہی دن نالش ٹھونک دی اور آخر ان کو ٹھکانے لگا کر ہی دم لیا۔ لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، انھوں نے خود بھی آکر بہت کچھ توبہ تلا کی لیکن یہ نہ ماننا تھا، نہ مانے اور آخر جب اس کو کھک کر دیا اس وقت ان کو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے، مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا ان کے دل میں تھا۔ کچھ تھوڑا بہت لوگوں کے کہنے سننے سے متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا، لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لیے جیسا دفتر چاہیے وہ انھوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔ سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے، اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کردیتے۔ ایک تو حافظ، دوسرے عالم، تیسرے لسان بھلا ان سے کون در آسکتا تھا اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے، خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کردیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا۔ کہنے لگے ''کتنا روپیہ چاہیے۔'' میں نے کہا ''بارہ ہزار۔'' بولے ''ضمانت'' میں نے کہا ''چوڑی والوں والا مکان۔'' پوچھا ''کتنی مالیت کا ہے۔'' میں نے کہا ''کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا۔'' فرمایا: ''کل قبالہ لیتے آنا۔'' میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی۔ بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا۔ دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا۔ پڑھ کر کہا ''ٹھیک ہے، مگر بیٹا سود کیا دو گے۔''

میں نے کہا ''مولوی صاحب آپ اور سود۔'' کہنے لگے ''کیوں اس میں کیا ہرج ہے، میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لوگے، اس کو خوشی سے سود دوگے۔ ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں۔ میرا بھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں۔ جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے جا کر تصفیہ کر آؤ۔ کل ہی چک بنگال بینک کے نام لکھے دیتا ہوں۔'' میں نے کہا ''مولوی صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں اور لیتے ہیں کس سے کہ اپنے شاگردوں سے۔'' کہنے لگے ''اس کی پروا نہ کرو جب مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا۔ جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑا لیتا ہوں، تم سے چودہ آنے لوں گا۔'' میں نے آ کر گھر میں ذکر کیا۔ ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑا روپیہ مل گیا، اس لیے یہ معاملہ یوں ہی کا یوں ہی رہ گیا۔ لیجیے یہ قصے تو سنا چکا۔ اب اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کے اوقات جو ان کی زبانی سنے تھے بیان کرتا ہوں:

ایک دن مولوی صاحب 'معلقات' پڑھا رہے تھے، عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا جب اس شعر پر پہنچے:

ابا هند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے کتاب رکھ دی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے، ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ شعر میں تو کوئی ہنسی بات نہیں، پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مرض اُٹھا ہے۔ آخر جب ہنسنے کا ذرا زور کم ہوا تو وجہ دریافت کی، مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے ''میاں بعض شعر قصہ طلب ہوتے ہیں، یہ شعر میری زندگی کے قصے کا آغاز ہے۔ اچھا لو سناتا ہوں، مگر پہلے تمہید سن لو۔ بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے، نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔ تعلیم کا شوق تھا اس لیے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں آ کر ٹھہر گیا۔ یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے، ان سے پڑھتا اور توکل پر گزارہ کرتا۔ مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے، انھیں بھی پڑھاتے مجھے بھی پڑھاتے۔ دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا۔

چار پانچ برس میں 'معلقات' پڑھنے لگا، گو میری عمر بارہ سال کی تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں ہاتھ میں چھڑی لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا، کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی، کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا (ٹرکایا)۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا، اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ انھیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، اُدھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی، جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی، نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلّہ بھر کا مصالحہ اُٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا، یہ خدا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر انھوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا، بہر حال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔ تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے۔ خدا غریق رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا۔ بھئی دیکھنا میں نے بھی کیسی مزے کی تاریخ کہی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے عربی کے چار پانچ اشعار کا قطعہ سنایا۔ مادۂ تاریخ 'لہا غفر' تھا۔ میں نے بڑے زور سے ''اوں ہوں'' کی۔ بگڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا ''کیوں آپ کو اس پر کچھ اعتراض ہے؟'' میں نے عرض کی ''جی نہیں لیکن اس قطعہ کو سن کر مجھے دبیر کی ایک رباعی یاد آ گئی۔ فرماتے ہیں:

هم شانِ نجف نہ عرش انور ٹھہرا
میزان میں یہ بھاری وہ سبک تر ٹھہرا

اس پلّے میں تھا نجف اور اس پلّے میں عرش
پہنچا وہ فلک پر یہ زمیں پر ٹھہرا

بڑے غور سے سنتے رہے پھر کہنے لگے "یہ تو بے معنی ہے نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھ دو اس سے یہ رباعی متعلق ہو جائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہوگی۔" میں نے عرض کی کہ "آپ کے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کر دو متعلق ہو جائے گا۔ اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔ اوّل تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابلِ تعریف نہیں ہوتیں۔ دوسرے سرسید کی تاریخ انتقال 'غفرلہ' پر آپ نے صرف الف کا اضافہ کر کے اس کو اپنا مال کرلیا ہے۔" مسکرا کر کہنے لگے "اچھا بھئی تو ہی سچا سہی۔" خیر اب اس جھگڑے کو چھوڑو اور میری اصلی کہانی کو لو۔ ہاں تو فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کا چکر لگاتے، کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے۔ ایک روز جو کشمیری دروازے کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے۔ کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدرالدین صاحب آئے ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں، برآمدے میں پہنچا، قد چھوٹا تھا۔ لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لڑکا آتا ہے اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ مدرسہ کے پرنسپل صاحب تھے۔ ہم تماشے میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لیے اُٹھے۔ چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو دروازے رو کے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے، چپراسی زبردستی دھکیل رہے تھے۔ غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہوگیا۔ دروازے کے سامنے سنگِ مرمر کا فرش تھا، اس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا۔ اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آگئے تھے۔ انھوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اُٹھایا۔ پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر 'کالنقش فی الحجر' ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا،

میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا ''معلقات'' ان کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر پوچھا،
میں نے پھر وہی جواب دیا۔ میری عمر پوچھی، میں نے کہا ''مجھے کیا معلوم۔'' وہ میرا ہاتھ
پکڑ بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے
''مفتی صاحب کے یہ لڑکا کہتا ہے کہ میں ''معلقات'' پڑھتا ہوں، ذرا دیکھیے تو سچ
کہتا ہے یا یوں ہی باتیں بناتا ہے۔'' مفتی صاحب نے کہا ''تو کیا پڑھتا ہے؟'' میں نے کہا
''معلقات!'' کہنے لگے ''کہاں پڑھتا ہے؟'' میں نے کہا ''پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں۔''
پھر کہا ''معلقات دوں پڑھے گا؟'' میں نے کہا ''لایئے۔'' انھوں نے میز پر سے کتاب اُٹھائی
میرے ہاتھ میں دی اور کہا ''یہاں سے پڑھ'' جس شعر پر انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا:

ابا ھند فلا تعجل علینا   وانظرنا نخبرک الیقینا

میں نے پڑھا معنی بیان کیے، انھوں نے پوچھی وہ بیان کی، میاں دانی تمہاری طرح
میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحت تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب کا
یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا۔ اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ مفتی صاحب بہت چکرائے
پوچھنے لگے ''مجھے کون پڑھاتا ہے؟'' میں نے کہا ''مسجد کے مولوی صاحب۔'' کہا ''مدرسہ میں
پڑھے گا۔'' میں نے جواب دیا ''ضرور پڑھوں گا۔'' مفتی صاحب نے قلم اُٹھا کاغذ پر چند
سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا ''اس کو پریذیڈنٹ صاحب کے پاس پیش
کردینا۔'' ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے۔ مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا، کوئی سات آٹھ
روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ
نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہوگئی ہے۔ کل سے اس کو آپ کالج میں آنے کی
ہدایت کردیجیے، اس کا وظیفہ بھی ہوگیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا۔ مولوی صاحب نے
مجھ کو بلایا، خط دکھایا، پوچھا ''یہ کیا معاملہ ہے؟'' میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ جب ذرا سختی کی تو
میں نے واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب
کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں منشی ذکاء اللہ
حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے۔ میں عربی کی

جماعت میں شریک ہوا۔ ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہوشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں میں نے اپنی سب جماعت والوں کو دبا لیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی انھوں نے لہک لہک کر یہ شعر:

ابا ھند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی۔" کہنے لگے "پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی۔ دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی جماعت۔" دانی نے کہا "مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے؟" مولوی صاحب ہنسے اور کہا "میاں دانی! ہم پڑھتے تھے آج کل کے طالب علموں کی طرح چوتڑوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے (مولوی صاحب اس فقرہ کا استعمال اکثر کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے)۔ ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے، آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں۔ آج پڑھا کل بھولے، تمہاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے گا بھی رڑا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے، پتھر بھی ہے کہیں کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے، ایک دھکا دیا اور اڑاڑا دھم گری۔ ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کردیتے تھے۔ پڑھانے والے بھی ایرے غیرے پچکلیاں نہیں ہوتے تھے۔ ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آج کل کے عالم محض کاٹھ کے الو ہیں۔ اچھا بھئی اچھا آگے چلو۔"

بانا نورد الرایات بیضا ونصدوھن حمراً قد روینا

میں نے کہا "مولوی صاحب پہلے شعر کے معنی تو رہ ہی گئے۔" کہنے لگے "اتنا بڑا قصہ سنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے۔ بس اس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک ملا کا بیٹا، ڈاکٹر، ڈپٹی، شمس العلما ایل۔ایل۔ڈی ہوگیا، ساتھ آسانی کے بیچ اسی دلی کے، بوجہ اس شعر کے۔"

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سن چکے۔ اب ہماری تعلیم کا حال سنیے اور قصہ کو سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے دن سے لیجیے۔

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسہ سے آئے اور کھانا وانا کھایا۔ سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتہ، پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ میں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جادھمکے۔ دروازے کی ایک چوکی پر میں اور دوسری پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا، بی چماری رسّی ہاتھ میں لیے اونگھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی رسّی کو ایک آدھ جھٹکا دے دیتی تھیں۔ کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے لیکن دروازہ بند تھا، اس لیے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا، اندر زنانہ تو نہیں ہے۔ غرض اسی شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا۔ ہم دونوں اُٹھے اور دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا۔ بی چماری نے سر بھی اُٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا تھا۔ کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا، اس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چوں کہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے اس لیے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا ''کون ہے'' اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے مگر بی چماری اچھل پڑی اور بے اختیار ان کے منہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا ''کون ہے'' میں نے کہا ''میں اور دانی۔'' مولوی صاحب نے کہا ''آؤ بیٹا، اندر آؤ۔'' مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اُتر آئے۔ پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی، تھوڑی دیر تک اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اس کے بعد کہا ایک کتاب میرے لیے بھی لیتے آنا۔ ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دے دی اور دوسری سے مل کر کام نکالا۔ کیا پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اس کا میں آئندہ ذکر کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اُٹھے تو سب کچھ یاد تھا مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ معلوم ہوتا تھا، خوشی خوشی گھر آئے چلو ''اللہ دے اور بندہ لے۔''

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے، یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلبا کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالب علم مسٹر رضا کے دل میں

گدگدی اُٹھی، وہ آئے ہم سے ملے اور کہا ''بھئی میں نے بھی تمہارے ساتھ چلوں، مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے۔'' ہم نے کہا ''چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے، دو کو نہ تین کو پڑھایا۔'' انھوں نے کہا ''نہیں پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو۔'' ہم نے کہا ''یار چلو بھی، اگر انھوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمہ۔'' وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہ پہلے پوچھ لو، اس عرصہ میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی۔ دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا، انھوں نے کہا ''لیتے کیوں نہ آئے۔'' ہم نے کہا ''وہ ذرا شرمیلے ہیں بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے۔'' انھوں نے کہا ''طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا، خیر کل ضرور ساتھ لانا۔ ذرا ان کا بھی رنگ دیکھ لوں۔'' شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہہ دیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر ڈھی دیے بیٹھے تھے ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے۔ مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اُٹھ بیٹھے اور کہا لاؤ کتاب۔ ہم نے کتاب طاق پر سے اُتار کر ان کے ہاتھ میں دے دی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آبیٹھے اور کہا ''اچھا یہ ہیں میاں رضا!'' بے چارے رضا نے گردن جھکا کر کہا ''جی ہاں۔'' مولوی صاحب نے کہا ''اچھا بھئی شروع کرو۔''

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں دانی اب اس کو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے۔ جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا ''ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں، کیا منھ میں گھنگنیاں بھر کر آئے ہو۔ اچھا میاں رضا! تم ہی شروع کرو!'' رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، مگر اعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر میاں دانی سے زیادہ بنا دیا۔ ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے، اس کے بعد کہنے لگے ''واہ بھئی واہ ہم کو عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں۔ میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے۔'' رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا دیا ''بسر و چشم۔'' مولوی صاحب نے کہا ''دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔'' یہ سن کر وہ بے چارے کچھ پژمردہ سے ہو گئے۔ مولوی صاحب

نے کہا "بھئی رضا یہ میں نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو۔ میں تم کو ضرور پڑھاؤں گا مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت "کالی جان" کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو۔ اتنے دنوں کے آتے جاتے میں تمہارے کانوں کو نظم ونثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا۔ بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھرتے دیکھا نہیں جاتا۔ بے چارے جنتی کو کیا خبر تھی کہ بتاشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کمرے میں ان کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے۔" بے چارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے۔ راستے میں ہم نے ان کو بہت بنایا، دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سن چکے اب ہماری بے حیائی کی داستان بھی سن لیجیے! میری صرف ونحو بہت کمزور تھی اور کمزور کیوں نہ ہوتی۔ شروع کیے ہوئے گے دن ہوئے تھے، اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا۔ نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں وقت پڑتی تھی۔ شعر خود بھی کہتا تھا دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے، اس لیے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جز بز ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا، معلوم نہیں کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں! کیا پڑھا۔" میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا۔ انھوں نے پھر بڑے زور سے "ہوں" کی ہم نے پھر اعراب بدل دیے۔ اس سے ان کو غصہ آ گیا، کہا "دانی تم پڑھو۔" انھوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا، کتاب اُٹھا کر جو پھینکی تو کمرہ سے گزر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں جا پہنچی اور نہایت غصیلی آواز میں کہا "نکل جاؤ، ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ۔ نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور نہ میں تمہارے پڑھانے کے لائق۔" دانی نے میری طرف دیکھا، میں نے دانی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں

میں کہا "چلو۔" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا "ہرگز نہیں۔" انھوں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبا دیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بھر رہے تھے، آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے اب جاتے ہو یا نہیں۔ میں نے کہا "مولوی صاحب جب تک کوئی دھکے دے کر نہ نکالے گا اس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو پھر ابھی آجائیں گے۔" مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے۔ کہنے لگے "اچھا نہیں جاتے ہو نہ جاؤ، مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤں گا۔" میں نے کہا "نہ پڑھایئے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ہلے ہیں نہ ہلیں گے۔" کہنے لگے "بیٹا اس وقت میری طبیعت خراب ہوگئی ہے، اب چلے جاؤ کل آجانا۔" دانی نے بچ جانا، میں سمجھا کہ اس وقت اُٹھے تو مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ دانی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر ان کو بٹھالیا، مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب پڑھیں گے تو اس وقت پڑھیں گے، پڑھانا ہے تو پڑھایئے ورنہ ہم کو یہاں سے جانا ہے نہ جائیں گے۔" آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے۔ کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہو گئے۔ اچھا بھئی میں ہارا۔ اچھا خدا کے لیے کتاب اُٹھا لاؤ اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑ دو۔ دیکھیے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے۔" میں جا کر صحن میں سے کتاب اُٹھا لایا اور مولوی صاحب جیسے تھے ویسے کے ویسے ہو گئے۔ کہا کرتے تھے "اگر اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں نے تمہارے شوق کو آزمایا تھا مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا۔ خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے۔ یہ بے حیائی نہیں میاں یہ شوق ہے۔ علم کا جس کو چسکا ہوتا ہے وہ بری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے۔ بدشوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں۔"

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب اُلٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے دانی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف ونحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے "بارہ پتھر باہر" سمجھ لیا جاتا تھا۔ کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا "آپ مہربانی کر کے اس بارے میں

اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے۔" اس کے بعد معنی بیان کیے، نکات بتائے اور پھر اس مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب میاں دانی خارج از بحث ہو گئے۔ اوّل تو مجھے یوں ہی ہزاروں اشعار یاد تھے، دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔ مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا۔ غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولا بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعرا اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا۔ اس میں دانی بھی شریک ہو جاتے، اگر کوئی شعر قصہ طلب ہوا اور اسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گزرا ہوتا تو اس قصہ کے ساتھ اپنا قصہ بھی ضرور بیان کر دیتے۔ غرض ایک شعر کی تشریح میں آدھ آدھ گھنٹہ گزر جاتا مگر اس کے بعد جو شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں۔ اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا تو اس سلسلے میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شرفائے دہلی پر اس طوفان بدتمیزی میں گزری تھی اس کی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے۔ اکثر کہا کرتے تھے "میاں بے چارا بہادر شاہ مجبور تھا، کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا۔ یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑے آئے تھے۔ ان کا مقصد تو شہر کو لوٹنا تھا وہ پورا ہوا اور انھوں نے دہلی کو کھک کر دیا۔"

ایک روز میں دریبہ میں جا رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تلنگوں کی آ رہی ہے، میں بھی دب کر گلاب گندھی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دُھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ، پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے مگر ان کی عجیب کیفیت تھی۔ گھوڑے کیا تھے دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے۔ بیچ میں سوار تھے، مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھریاں کیا تھیں دہلی کی لوٹ، جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا، اس کے کپڑے تک اُتروا لیے۔ جس روپیہ پیسے والے کو دیکھا، اس کے گھر پر جا کر دھنی دے دی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعہ کو، تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ جب تک کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے۔ غرض خدائی

فوج داروں کا یہ لشکر غل مچاتا، دین دین کے نعرے لگاتا میرے سامنے سے گزرا۔ اس جمِ غفیر کے بیچوں بیچ دولہا میاں تھے۔ یہ کون تھے، عالی جناب بہادر خاں صاحب سپہ سالار، لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولہا معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور سے لدے ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ۔ صافے پر بجائے طرے کے سراسری لگائی تھی، جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور میں لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان ہی کے ہاتھ آ گئی ہے۔ گلاب گندھی نے جو ان لٹیروں کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی اور اندر دروازوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اسی کی دوکان کے سامنے آ کر رُکا۔ بہادر خاں نے ادھر اُدھر گردن پھیری، پوچھا "یہ کس کی دوکان ہے۔" ان کے ایڈی کانگ نے عرض کی کہ گلاب گندھی کی۔ فرمایا "اس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ مابدولت ادھر سے گزر رہے ہیں، دوکان بند کرنے کے کیا معنی، ابھی کھلواؤ۔" خبر نہیں کہ اس حکمِ قضا شیم کا بے چارے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ "دروازہ کھولو" اور جس طرح "سم سم کھل جا" کے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس حکم سے گلاب کی دوکان کھل گئی، بجنسہٖ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اُٹھ گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ لالہ جی ہانپتے کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے مگر زبان یارا نہ دیتی تھی۔ اس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے کسی موٹی اسامی کو مار کر آئے تھے۔ کہنے لگے "تمہاری ہی دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے؟" لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کیے۔ معلوم نہیں بیس روپے تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے کا۔ بہادر خاں نے دونوں کنٹر لیے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں۔ عطر سونگھا، کچھ پسند آیا ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر اُلٹ دیا اور دوسرا

دم پر، کنٹر پھینک کر حکم دیا گیا ''فارورڈ'' اس طرح بے چارے گلاب گندھی کا سینکڑوں روپے کا
نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیے۔ادھر اس خدائی فوج دار کا جانا
اور اُدھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا بے چارے لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دوکان بند کر دی۔
بھئی غدر کے طوفان بے تمیزی میں نقصان جو ہونا تھا وہ ہوا مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو
نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب
کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین نصب تھی، پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ
یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دل دادہ انگریز نے کالج کی نذر کی تھی۔اس کا سامنے کا شیشہ
بڑی دقت سے تیار ہوا تھا۔اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا
اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا، غرض یہ کہ دوربین کالج کا سرمایہ ناز تھی۔
دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے۔غدر کے زمانے میں کسی
بدمعاش کی اس پر بھی نظر پڑ گئی اس نے جا کر فوج میں اڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات
کشمیری دروازہ سے آ کر کالج کے اوپر توپ لگا دی ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے۔
یہ سننا تھا کہ ساری فوج کالج پر چڑھ آئی، سیڑھیاں لگا کر، سینکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے۔
ایک کندۂ ناتراش نے بندوق کا کندہ سامنے کے شیشہ پر مارا چھن سے شیشے کے ٹکڑے ٹکڑے
ہو گئے اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی۔ان نابکاروں نے
اسی پر اکتفا نہیں کیا۔دوربین کی دوربین اُٹھا نیچے پھینک دی اور چند ہی منٹ کے اندر دین
دین کے نعروں میں اس یادگار سلف کا ان ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہو گیا۔''

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سنے ہیں لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ
ان کا موجودہ زمانے میں دُہرانا خطرناک ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے۔
ہم بی۔اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک لاجواب مضمون پر انعام مقرر ہوا۔
اس مضمون کے لیے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے جو کچھ
لکھا جائے شہر کے بڈھے بڑھیوں سے دریافت کر کے لکھا جائے۔ میں نے بھی مضمون
لکھا تھا اور مجھ ہی کو یہ انعام ملا۔میں نے اس مضمون میں ایک باب مولوی صاحب کے

بیان کردہ قصوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ہیں کرید کرید کر مولوی صاحب سے اس مضمون کے لیے واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے اب وہ مضمون دریا برد نہیں تو دریا پار ضرور ہو گیا۔ مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے اس لیے اب اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سن چکے۔ اب مولویوں کی جماعت کا حال بھی سن لیجیے۔ اس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار کے ہی لوگ تھے۔ لمبے لمبے کرتے، بڑی بڑی آستینیں، ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو تھان کی شلواریں، شملہ بہ مقدار علم کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے پگڑ، لمبی لمبی داڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اُٹھا کر بتاشوں کی گلی میں رکھ دیا گیا ہے۔ محنت کی یہ حالت کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے، ٹھوٹھ ایسے کہ باوجود اس محنت کے کورے کے کورے رہتے۔ مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ ان کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور کہتے ''بھئی میں ان ملاؤں سے عاجز آ گیا ہوں، اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی۔ جواب اس لیے نہیں دے دیتا کہ دل شکنی ہوگی۔ مگر کیا کروں اللہ میاں نے ان لوگوں کو ادب سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بھلا ان کو 'حماسہ' یا 'متنبّی' پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ فوج میں نوکر ہو جائیں، محنت مزدوری کریں یا ہینگ کا توبڑا گلے میں ڈال کر بیچتے پھریں! ہم کہتے ''مولوی صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں، رگڑ سے پتھر بھی گھس جاتا ہے۔ آخر متنبّی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں کہ جو غور کرنے سے سمجھ میں نہ آئیں۔'' ایک روز فرمانے لگے ''لو آج تم ٹھہر جاؤ اور ان مولویوں کا رنگ بھی دیکھ لو، مگر دیکھو کہیں ہنس نہ دینا ورنہ چھری بھونک دیں گے۔'' اس روز ہم کو بھی چھٹی تھی، ہم پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ یہ جماعت آ گئی یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے اور ہم اُٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اس روز مقامات حریری کا سبق تھا، کتابیں کھولی گئیں اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں اعوذ باللہ سے سبق شروع کیا۔ زید بن حارث کے سفر کا حال تھا اور رات کے وقت سفر کرنے کو 'فی اناءِ اللّیل'' سے ادا کیا تھا۔ اس میں شامت اعمال سے 'اناء'' کے معنی مٹکے کے بھی ہیں۔ ''اللہ دے اور بندہ لے۔''

انھوں نے یہاں منکا پھنسا دیا اور نہایت متانت سے ''فی اناء اللیل'' کے معنی ''رات کے منکے میں سفر کیا'' سے کر دیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا ''اناء'' کے دوسرے معنی بھی تو ہیں پڑھنے والے نے کہا ''جی ہاں کئی معنی ہیں لیکن اس مقام پر منکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے۔''
ہم کو ہنسی آئی، مولوی صاحب نے مسکرا کر اور ان لوگوں نے نہایت بڑے بڑے دیدوں سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سوچا بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں، یہاں سے کھسک ہی جانا مناسب ہے کہیں کوئی اُٹھ کر گلا نہ گھونٹ دے۔ ہم نے اجازت چاہی مولوی صاحب کہتے ہی رہے ''بیٹھو ذرا اور کچھ سن جاؤ۔'' ہم نے کہا ''مولوی صاحب ہم کو کام ہے کسی اور دن دیکھا جائے گا۔'' یہ کہہ جوتیاں پہن سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے، کوٹھے سے اتر جو ہنسنا شروع کیا تو گھر پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رُکی۔ اب جب کبھی خیال آتا ہے تو اس جماعت کا نقشہ آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے اور رات کے منکے میں سفر کرنے کا فقرہ ہنساتا نہیں تو مسکراہٹ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمہ پر ناز تھا اور اکثر اس کا ذکر فخریہ لہجے میں کیا کرتے تھے۔ اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچا دی ہے وہ ان کے نزدیک بہت معمولی چیزیں تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ اس میں مجھے جتنی محنت اُٹھانی پڑی ہے، اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ کے ترجمہ میں میرا سارا سارا دن صرف ہو گیا ہے۔ میاں سچ کہنا کیسا محاورہ کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے۔ ہم نے کہا ''مولوی صاحب بٹھایا نہیں ٹھونسا ہے۔'' جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی صاحب اچھل پڑے۔ بڑے خفا ہوتے اور کہتے ''کل کے لونڈو میرے محاوروں کو غلط بتاتے ہو، میاں میری اردو کا سکہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے، خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے۔'' محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا مولوی صاحب آپ نے محاوروں کی فہرست تیار کر لی ہے اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں، خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو۔ جناب والا اہل زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے۔ یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا

چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں دہلی والے ہیں۔'' تھوڑی دیر تو حجت کرتے، اس کے بعد کہتے ''اچھا بھئی تم ہی دہلی والے سہی، ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے۔ تم ہم کو دہلی والوں کی فہرست سے نکال دو، مگر میاں اپنا ہی نقصان کرو گے۔''

مجھ کو مولوی صاحب کی طرزِ تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیوں کہ اوّل تو میرے لیے ابتدا ہی میں ''خطاے بزرگاں گرفتن خطاست'' کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستہ میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں مولوی بھی ہوں۔ بہرحال ان کی تحریر کا ایک رنگ ہے اور اس کی نقل اُتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ ترجمہ کرنے کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

۱۹۰۳ء کے دربار تاج پوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اس کا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا۔ ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوب صورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے۔ ہم نے اجازت لے کر کتاب اُٹھائی اور اوّل سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں۔ اوّل تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے ''بیٹا! یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو گھر لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو، مگر دیکھو خراب نہ کرنا۔''

ہم دونوں نے دل میں سوچا کہ خدا معلوم کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں۔ خوش خوش بغل میں مار گھر آئے، دو ایک روز میں پڑھ ڈالا۔ ایک آدھ تصویر بھی غائب کر دی۔ چوتھے روز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالہ کی۔ پوچھا ''کہو پسند آئی۔'' ہم نے کہا ''مولوی صاحب خوب کتاب ہے۔'' کہنے لگے ''اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو۔'' ہم نے کورا جواب دے دیا۔ کہا ''دیکھو، سنو اس کتاب کا مجھے ترجمہ کرنا ہے، تم سے ترجمہ کراؤں گا۔ صحیح میں کروں گا اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں۔ اگر اب کے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دوں گا۔ یہ کہتے کہتے کتاب کی جلد توڑ دس صفحہ میرے اور دس میاں وانی کے حوالے کر دیے۔ ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی اور وہ آئے ان کو حکم دیا کہ ''ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا ان دونوں کو دے دو۔'' ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' کی صورت تھی جس طرح پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے تھے اسی طرح منھ بنائے ہوئے ان پلندوں کو بغل میں مارا گھر آ کر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا۔ دوسرے روز جا کر پڑھنے کے لیے کتاب اُٹھائی، پوچھا ''ترجمہ لائے۔'' ہم نے دبی ہوئی آواز میں کہا ''لائے۔'' کہا ''پہلے وہ پڑھو۔'' ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب اصل کتاب دیکھ کر اس کی درستی کرتے جاتے۔ اب اگر میں یا میاں وانی کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانیے کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ مولوی صاحب کی اصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہو گیا اور تھوڑی ہی دنوں میں کتاب ختم ہو گئی۔ اس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی کیوں کہ بندۂ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا، مگر کچھ پروا نہیں اس کا بدلا اب ہم لیے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کاٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چوں کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اس لیے ان کو

کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ ادائے مطلب کے لیے ضرور مل جاتا تھا مثلاً اسی جشن تاج پوشی کی کتاب میں ایک جگہ لفظ stallion آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اس کے معنی 'سیاہ بڑا جنگی گھوڑا' نکلے، یاروں نے ترجمہ میں وہی الفاظ ٹھونک دیے۔ جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سنے تو بہت ہنسے۔ کہنے لگے "واہ بیٹا واہ کیوں نہ ہو، دہلی والے ہو۔ خالص اردو لکھی ہے، بندۂ خدا 'شبدیز' لکھ دو، چلو چھٹی ہوئی۔" کوئی اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں۔

ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے، لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اُٹھا کر دیکھو وہی لفظ پر لفظ، معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ سیکڑوں کتابوں کے ترجمہ ہوئے، دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ جوں کا توں ہے۔ ایک لفظ ادھر سے اُدھر نہیں ہوا۔ کہا کرتے تھے کہ تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے۔

اس کتاب کے ترجمہ کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا، ان میں ایک مولوی عظمت اللہ صاحب تھے اس کی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمہ تھی اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے سررشتہ دار تھے۔ روزانہ ایک دو دفعات کا ترجمہ آتا ہم ڈائرکٹر صاحب کو سناتے۔ وہ بڑا غل مچاتے کہ "یہ لفظ خلاف محاورہ ہے، اس لفظ سے مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے۔" غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں۔ مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی یہ باتیں سنے کوئی، مگر بھئی یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا "باون تولے پاؤ رتی" کی کہتا تھا۔ جو اعتراض کرتا تھا وہ اُٹھائے نہ اُٹھتا تھا۔ میاں پرانے زمانے کے انگریز غضب کی اردو سمجھتے تھے گو اچھی اردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمہ کی وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دہلی والوں کے کان پکڑوا دیں۔ میں نے بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اُکھڑا اُکھڑا معلوم ہوتا۔ میں نے کہا کہ نذیر احمد تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آ جاتا۔ اردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہے، کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کر لے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا۔ رات کو لیمپ جلا، کپڑے اُتار، لنگوٹ باندھ ترجمہ پر پل پڑا۔ جن دفعات کا

ترجمہ دوسرے روز پیش ہونے والا تھا ان کا ترجمہ خود کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا۔ ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا ان لوگوں کے ترجمہ کو سن کر وہی گڑبڑ شروع کی، خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی۔ میں نے کہا کہ ''کم ترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔'' کہا ''اچھا کہو۔'' میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے۔ لینے کو ہاتھ بڑھایا میں نے کہا ''عرضی نہیں ہے، آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے بھی کیا ہے۔'' ڈائرکٹر صاحب یہ سن کر اچھل پڑے۔ کہنے لگے، تم نے، تم نے ترجمہ کیا ہے۔ تم کو تو انگریزی نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا؟ میں نے کہا ''رائل ڈکشنری سے۔'' انھوں نے ہنس کر کہا ''تعزیرات ہند کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا۔'' میں نے کہا ''سن تو لیجیے۔'' کہا ''اچھا سناؤ۔'' میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کہنے لگے ''یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے؟'' میں نے کہا ''ہاں۔'' کہنے لگے ''کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کر کے لاؤ۔'' میں دوسرے دن لے کر گیا۔ بہت پسند کیا اور کہا ''تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کر سکتا ہوں جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا۔ جاؤ تم بھی ان ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہو جاؤ۔'' اس دن سے ہم بھی پانچوں سواروں میں مل گئے اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیے ہیں۔ اگر کوئی کہتا بھی کہ ''مراۃ العروس'' پر تم کو انعام ملے گا تو میں اس کو دیوانہ سمجھتا۔ اصل یہ ہے کہ میں نے یہ کتاب اپنی لڑکی کے لیے لکھی تھی وہی پڑھا کرتی تھی۔ میاں بشیر کو ''چند پند'' لکھ دی تھی۔ میں اس زمانہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلا تھا، بال بچے ساتھ تھے۔ ایک جگہ ٹھہرے تھے کہ مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرہ بھی قریب میں آ گا۔ شام کا وقت تھا، میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلے۔ اُدھر ڈائرکٹر صاحب آ رہے تھے میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا۔ صاحب ٹھہر گئے، پوچھا ''میاں تمہارا کیا نام ہے؟'' انھوں نے نام بتایا۔ پھر پوچھا ''تمہارے والد کون ہیں؟'' انھوں نے میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا ''کہو میاں کیا پڑھتے ہو؟'' انھوں نے کہا ''چند پند'' ڈائرکٹر صاحب سمجھتے تھے کہ اردو کی پہلی یا دوسری کہے گا ''چند پند'' کا نام سن کر پریشان ہوئے کیوں کہ اس عجیب وغریب

نام سے ان کے کان نا آشنا تھے۔ کہا، ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے۔ بشیر نے کہا ''جی ہاں ابھی لاتا ہوں، ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھیے گا۔ انھوں نے کہا ''اس کتاب کا کیا نام ہے؟'' انھوں نے کہا ''مراۃ العروس'' یہ دوسرا نیا نام تھا۔ صاحب نے کہا ''ہاں وہ بھی لاؤ۔'' میاں بشیر نٹوانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے اور اپنا جزدان کھول ''چند پند'' نکالی۔ اس کے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا۔ اس نے جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی۔ اتنے میں بشیر ''مراۃ العروس'' لے کر بھاگا۔ یہ اس کے پیچھے بھاگی، دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی، خوب رونا پیٹنا ہوا۔ بشیر بہن کو دھکا دے، کتاب لے، یہ جا وہ جا۔ بہن صاحبہ نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا۔ میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالہ کیں۔ انھوں نے اُلٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا ''ہم یہ کتابیں لے جائیں گے کل بھجوا دیں گے۔'' انھوں نے کہا ''لے جایئے، کل ہم کو چھٹی رہے گی۔'' میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے۔ لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کر لی ہیں، میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ صاحب زادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا ہے۔ میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے۔ پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا، وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی۔ آخر بڑی مشکل سے اتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا۔ میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے پڑے ہیں ان میں وہ اُترے ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں سے کیا کام۔ خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دوں گا، نہیں تو دوسری دوں گا۔ اس نے کہا کہ میں لوں گی وہی کتاب لوں گی بڑی مشکل سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیوں کر پوچھوں۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہو سکتا ہے۔ غرض اس شش و پنج میں صبح ہو گئی کوئی سات بجے ہوں گے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں۔ وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ

صاحب بیٹھے ''مراۃ العروس'' پڑھ رہے ہیں۔ سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا ''مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند ہی روز میں بچوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ''مراۃ العروس'' کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو سکیں۔'' میں نے کہا ''آپ کو اختیار ہے'' یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی، وہاں سے انعام ملا۔ یہاں شیر کے منھ کو خون لگ گیا۔ اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں۔ جو کتاب لکھی اس پر انعام، جو لکھا وہ پسند کیا گیا۔ غرض ہم مصنف بھی بن گئے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ انسان کا عہدہ جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اس کی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے، یہی مصیبت ہم پر پڑی۔ ادھر کام کی زیادتی، اُدھر سر سید کی فرمائشوں کی بھرمار۔ آج یہاں لکچر دیا، کل وہاں دیا۔ تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا۔ خدا خدا کر کے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کر لو، لوگوں کو بھی مفید ہو گا اور شاید تمہاری نجات کا بھی ذریعہ ہو جائے۔ غرض جتنی محنت ممکن تھی اتنی محنت کی۔ اسی ترجمہ کے سلسلے میں ''الحقوق والفرائض'' کا مواد بھی جمع کر لیا۔ کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک پنتھ دو کاج ہو گئے۔ مگر بھئی سچ کہنا ''کیسا ترجمہ کیا ہے۔'' میں تو خاموش رہا مگر دانی نے کہا کہ ''مولوی صاحب ہم کو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' مولوی صاحب نے کہا ''ہیں میاں دانی! یہ کیا کہا تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا، بھئی غضب کیا۔ ارے میاں رحیم بخش ذرا ادھر تو آنا، وہ سنہری جلد کی حمائل شریف ہے میاں دانی کو دے دو۔ بیٹا ذرا اس کو غور سے پڑھو۔ دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے۔'' غرض حمائل شریف میاں دانی کے قبضہ میں آ گئی۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی۔ جب ہم اُٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا ''ارے بھئی ایک بات تو کہنی بھول گیا۔ اس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپے ہے،

کل ضرور لیتے آنا۔" بے چارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے روز ساڑھے پانچ روپیہ مولوی صاحب نے دھروا لیے۔

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رتی حملے کیے لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں، کبھی ایک پیسہ نہ دیا۔ یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا۔ میں اس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ "اچھا بھئی تو یوں ہی لے جا، مگر میرا پیچھا چھوڑ۔" میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا، مولوی صاحب قیمت مانگتے میں حجت کرتا۔ وہ جواب دیتے، میں اس کا جواب دیتا۔ غرض، بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا۔ مگر خدا غریق رحمت کرے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مجھ کو دے دیتے تھے اور جان بوجھ کر جھگڑتے تھے۔ ریویو کے لیے جو کتابیں آتیں، وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں۔ وہ پورا پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحۂ اول پر میرا نام درج ہو کر شہادت دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل اختیار کر لیتا اس وقت بھی میرے پاس اس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ ان کے پاس رہی یا نہیں۔ کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل. ایل. ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا۔ ہوا یہ کہ جب میں اور دانی بی. اے میں پاس ہوئے تو جلسہ تقسیم اسناد کے لیے لاہور جانا پڑا، گون بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا۔ اب خیال ہوا کہ گون کسی کی چھینیں۔ دانی کو تو گون مل گئی، میں نے مولوی صاحب کی گون تاکی۔ ہم دونوں مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے "بیٹا میری گون بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھ روپے میں دو گونیں پڑی ہیں، بھلا میں کیا خریدتا۔ یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں، وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے۔ مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات وتالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجیے، سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر ولیم میور ممالک مغربی وشمالی کے لفٹنٹ گورنر تھے مجھ پر بھی بہت مہربان تھے۔ میں نے مشرف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کی جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں۔ ان کتابوں میں میرا

کلام مجید کا ترجمہ بھی تھا وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں اور ہمیں گھر بیٹھے ایل. ایل. ڈی کی ڈگری مل گئی مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی۔ پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل. ایل. ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے براہِ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ روپے روانہ فرمائیے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر رہا ہے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا پلندہ بھی آ گیا۔ غرض اسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسری ڈاک سے ایل. ایل. ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا۔ 'قہر درویش بر جان درویش' درزی صاحب کو رقم روانہ کی۔ مشرف کو برا بھلا لکھا کہ ''وہاں سے یہ تھیلے بنوا کر بھجوانے کیا ضروری تھے، میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا۔ بہر حال یہ گونیں ساڑھے چھ روپے کی ہیں۔ معاف کیجیے میں نہیں دے سکتا۔ جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا جو میرے پیچھے پڑا ہے۔'' میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا اس کے بعد بغیر کچھ کہے سنے اُٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رُخ کیا۔ وہ ''ہاں ہاں'' کہتے ہی رہے۔ میں نے کنڈی کھول اندر گھس الماری میں سے کالی گون نکال ہی لی۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گزر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اُٹھے، میں اتنی دیر میں دروازہ بند کر، گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آ گیا۔ مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے اور اب انھوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات، بی. اے اور ایل. ایل. ڈی کی گون کے اختلاف، غرض اسی طرح بیسیوں چیزوں پر لکچر دے ڈالے۔ مگر میں بیٹھا سنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا۔ استادوں کی غیبت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت، وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں نے بھی اسپیچ دے دی اور آخر میں صاف کہہ دیا کہ یہ گون میں لے کر جاؤں گا اور ضرور لے کر جاؤں گا۔ اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے۔ کہنے لگے ''واپس کب کرو گے؟'' میں نے کہا ''آپ سرخ گون پہنتے ہیں، کالی گون مجھے دے دیجیے۔ آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا فائدہ

ہو جائے گا۔" مولوی صاحب نے کہا "نہیں بیٹا لاہور سے آ کر دے دیجیو، مجھے دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے۔" یہ الفاظ انھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ ہی کرتے بن پڑی۔ آخر میں گون لے کر گیا اور لاہور سے آ کر واپس کر دی۔ جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کر لیا، اس وقت بہت خفا ہوئے۔ کہنے لگے "اب کے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا نہ ہوگا، کل کو میرا کیش بکس اُٹھا کر لے جائے گا۔ خیر دانی گون لے جاتا تو کچھ حرج نہ تھا، کیوں کہ واپسی کی تو اُمید رہتی۔ مجھے کب امید تھی کہ آپ بزرگ واپس بھی کریں گے وہ تو کہو میرا حلال کا مال تھا جو واپس آ گیا۔" میں نے کہا "مولوی صاحب اگر پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی تمام عمر شکل بھی نہ دیکھتے۔" ہنس کر کہنے لگے "چلو 'مشتے بعد از جنگ' کی صورت ہے۔ آئندہ میں دینے میں احتیاط کروں گا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا۔" اس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں مگر اب افسوس ہوتا ہے کہ گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار رہتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیج دے، کیوں کہ اس میں میرا بھی حق ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی لیکن وہ بھی چکے تھے کہ یہ ہاتھ سے گئی۔ میری غلطی تھی جو اس کو لے جا کر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

جس طرح مسٹر مشرف نے یہ گونیں مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں اسی طرح نواب محسن الملک نے حیدر آباد میں فرنیچر ان کے سر چپک دیا تھا۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں نواب محسن الملک کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کی تجویز اور سرسید کی تحریک پر مولوی صاحب حیدر آباد آئے۔ پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا، اس کے بعد علاحدہ کوٹھی میں جا رہے۔ ہندوستانی وضع کا سامان، تخت چوکیاں وغیرہ خرید لیں، بھلا محسن الملک یہ کیوں کر دیکھ سکتے تھے کہ ان کا دوست پرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے۔ ایک روز سکندر آباد جا ایلین اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دے دیا اور کہہ دیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچا دو اور بل بنا کر بھیج دو۔ ایک روز جو مولوی صاحب اُٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے

ہیں کہ چھکڑے پر چھکڑا، فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے۔ بہت چکرائے، لینے سے انکار کر دیا، مگر وہ نواب محسن الملک کا پڑھایا ہوا جن تھا، وہ کب ماننے والا تھا۔ آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے اور دن بھر میں مولوی صاحب کا مکان صاحب بہادر کی کوٹھی ہو گیا۔ مگر یہ بھی نذیر احمد صاحب تھے، کچھ ایسی چال چلے کہ جب ان کا تقرر ہنچر و کی صدر تعلق داری پر ہوا تو وہ سب کا سب سامان، بہت ہی تھوڑی کمی پر ایلین کے سر مارا۔ ہنچر و وہی اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے۔ نواب محسن الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ نواب محسن الملک دورے پر نکلے۔ ہنچر و قیام کیا، مولوی صاحب خود کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ ”میں آیا ہوں میرے قیام کا انتظام کر دو۔“ ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں، ایک دو میزیں تھیں کھول دیا گیا۔ وہ ایلین والے فرنیچر کی تلاش میں تھے، سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا رکھا ہوگا اندر کہلا بھجوایا کہ ”میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھہروں گا۔“ پہلے تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہوگی، مگر جب ادھر سے اصرار ہوا تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفاچٹ میدان ہے۔ نہ دری ہے نہ چاندنی، نہ میز ہے نہ کرسی۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے اس پر ایک چھوٹا سا کمبل پڑا ہوا ہے۔ بازو میں ایک چوکی پر رحل اور جانماز رکھی ہے۔ کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت چکرائے، لوگوں سے پوچھا ”وہ فرنیچر کہاں گیا؟“ معلوم ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اس کے کوڑے کر آئے۔ بے چارے ایک رات ٹھہرے اور صبح ہی کوچ بول دیا۔

کچھ عرصے تک تو نواب محسن الملک اور ان کی بنی رہی بعد میں اتنی کھینچی کہ ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں، محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہو کر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔ غرض جب عماد السلطنت کا زمانہ آیا اور محسن الملک بہادر کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا۔ دوسرے حیدر آباد میں صحبت کا جو رنگ تھا وہ ایسا نہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اس زمانے کے جو حالات مولوی صاحب

بیان کیا کرتے تھے ان کا زبان قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ بعد میں دونوں بہ ظاہر ملتے جلتے تھے لیکن موقع پڑتا تو ایک دوسرے کو پردے ہی پردے میں سنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ ۱۹۰۲ء کے دربار کے موقع پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ہوا۔ اس زمانہ میں نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائی نس سر آغا خاں تھے۔ آدمیوں کی کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ ملتی تھی، ہر جلسے میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے۔ ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کے لیے مقرر ہوا۔ مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے خلقت ٹوٹ پڑی۔ لکچر شروع ہوا تھا کہ لارڈ کچنر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤں گا۔ نواب محسن الملک نے ایسے باوقعت اور ذی وجاہت مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں۔ مولوی صاحب کے لکچر میں اس سے کھنڈت پڑتی تھی۔ پنڈال کے باہر گڑبڑ ہوئی اور نواب محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچنر آئے۔ اُٹھ کر باہر جاتے اور پھر آ بیٹھتے۔ اسی طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے۔ مولوی صاحب بہت جز بز ہوئے، خفا بھی ہوئے مگر ان کی کون سنتا تھا، قصہ مختصر آخر لارڈ کچنر آ ہی گئے۔ نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کرایا۔ لارڈ کچنر کہنے لگے "مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" مولوی صاحب نے کہا "لاٹ صاحب مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمہ حل ہو گیا۔" لارڈ کچنر نے کہا "وہ کیا معمہ تھا؟" مولوی صاحب نے کہا "ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرا دے گی، مگر آج یقین آ گیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔ جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرا دیے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرا دے۔"
تمام پنڈال میں سناٹا ہو گیا مگر مولوی صاحب کو جو کچھ کہنا تھا کہہ گئے اور اس طرح اپنے دل کا

بخار نکال لیا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید و شاید، چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقر عید کے دن دہلی میں تھے۔ اس روز جمعہ تھا صبح کو بقر عید کی نماز عید گاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا۔ اس دربار میں آٹھ یا نو دہلی کے ہندو امیر اور اسی قدر مسلمان مشاہیر بلائے گئے۔ ان میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ سر ہنری میک موہن نے ان لوگوں کا تعارف امیر صاحب سے کرایا۔ جب مولوی صاحب کی باری آئی ان کی تعریف سر ہنری نے کی تو امیر صاحب نے کہا "آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں میں خود ان کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں۔ دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہو گیا۔" اس کے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا "آپ شعر بھی کہتے ہیں۔" مولوی صاحب نے کہا "جی ہاں کہتا ہوں لیکن آج آپ کی تعریف میں اپنا نہیں دوسروں کا شعر سناؤں گا۔ یہ کہہ کر متنبی کا یہ شعر پڑھا:

عید و عید و عید مجتمعا

وجه الحبیب و یوم العید و الجمعا

موقع کے لحاظ سے یہ ایسا برمحل ہو گیا کہ متنبی کو نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات اور خاص کر حبیب کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی۔ تمام دربار چمک اُٹھا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اُٹھ کر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور اتنے بوسے لیے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے۔ دوسرے روز جو انھوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا۔ اس کو انھیں کے الفاظ میں دہرانا اچھا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے "بھئی میں تو شعر پڑھ کر مصیبت میں پھنس گیا، شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آ کر مجھے دبوچ لیا۔ اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ، میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی، اس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ادھر تو ہڈیاں پلپلی ہو گئیں اُدھر دم گھٹنے لگا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں، جنبش تک نہیں ہوتی، قسم خدا کی اس وقت سے ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے۔ بارے خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علاحدہ ہوا،

ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسے لینا شروع کیا۔ بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو، کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہہ کر پھر لپٹ جاتا، لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسہ پر بوسہ لینا شروع کرتا۔ بے چارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے۔ جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی سے پانی رستا ہے۔ نا بھائی نا ایسے درباروں کو میرا دور ہی سے سلام ہے، کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈیاں تڑوائے۔" مولوی صاحب گو اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے، مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جا رہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔

اسی تیزی طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی، جو کہنا ہوتا تھا وہ بغیر کہے نہ رہتے تھے۔ اس میں کسی لفٹنٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے۔ ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندوستانی یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اس وقت تک ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا۔ اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بڑا غصہ آیا، خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے چند ہی روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے جو ہندوستان کے لاٹ پادری تھے تشریف لائے۔ شامتِ اعمال سے انھوں نے بھی اپنے لکچر کا موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لارڈ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مولوی صاحب تجویز کیے گئے، اب کیا تھا "اللہ دے اور بندہ لے" جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا خوب اچھی طرح نکال لیا۔ کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے مولوی صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات۔ مگر انھوں نے جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی خاموش نہیں ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے ہندوستان کے مغربی اثر کو نہایت پُر مذاق پہلو سے

بیان کیا۔ فرمانے لگے "حضرات پیجامہ اچھا ہے یا پتلون۔ ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے اُٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامہ ہی کو اچھا کہیں گے، مگر آج کل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے، یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے، اس سے ستر ڈھکتا ہے، آدمی بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے یورپ کے دل دادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے، کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے، کیوں کہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے، نرم نرم اور سبک ہوتی ہے۔ ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے، یہ کیوں؟ اس لیے کہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ ان کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں اور بھئی ہے بھی یہی بات، قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے۔ ان کی ہر چیز ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے اور ان کا ہر فعل ہمارے لیے چراغ ہدایت۔ اب افعال سے گزر کر اقوال تک نوبت آ گئی ہے۔ پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑ دو اور انگریزی سچ بولا کرو۔ آج ہمارے پادری لیفرائے بھی ان کے ہم نوا ہوئے ہیں۔ یا تو انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آ گیا ہے کہ پیجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اُتار پھینک دیا جائے اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے، یا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال وساور ہو کر ولایت سے آیا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو، اب تمہارے پرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے۔ خدا کے لیے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو، یہ بڑے لوگ ہیں۔ مولوی نذیر احمد یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم نے ہنس کر ٹال دیا۔ لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سچ نہ بولو گے اور یہ تازہ مال استعمال نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کو محتاج ہو جاؤ گے، کیوں کہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑو اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو، اسی سے تمہارے دلدر دور ہوں گے۔"

آخری میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ لیفرائے کا شکریہ بھی ادا کردیا۔
لاٹ صاحب اردو بہت اچھی جانتے تھے، مولوی صاحب کی اس پُر مذاق تقریر پر مسکراتے رہے مگر دل کا خدا ہی مالک تھا۔ کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، مگر یہاں "تیر از کمان جستہ" کی صورت تھی کیا کرسکتے تھے۔ البتہ دل میں انھوں نے ٹھان لی ہوگی کہ آئندہ مولوی صاحب کو شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدرآباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دہلی میں مولوی صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ "امہات الامہ" کی وجہ سے مولوی صاحب پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اس کا ذکر چھیڑا کہنے لگے "بھئی مجھے تو اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہو جائیں، تم نے بھی یہ کتاب دیکھی ہوگی۔ آخر تم ہی بتاؤ اس میں میں نے ایسی کون سی نئی بات لکھی ہے۔" میں نے خود "امہات الامہ" نہیں دیکھی تھی مگر میں مولوی صاحب کے طرز تحریر سے واقف تھا اس لیے میں نے یہی کہا کہ "مولوی صاحب آپ کا طرز تحریر مذاق کا پہلو لیے ہوئے ہوتا ہے، وہ کچھ قصہ کہانیوں ہی میں مزا دیتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں اور خاص کر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا۔ اگر لوگوں کو اعتراض ہوگا تو آپ کی طرز تحریر ہی کے متعلق ہوگا۔" مولوی صاحب نے کہا۔ "میرے کلام مجید کے ترجمہ کے متعلق تو یہ اُدھم نہیں مچا۔" میں نے کہا "اس پر بھی لوگوں کے اعتراض ہیں مگر اس میں آپ کا معاملہ اللہ میاں سے ہے اور یہاں انسانوں سے، مشہور مقالہ ہے:

با خدا دیوانہ باش

و با محمد ہوشیار

کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے "ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو، اس قسم کی تالیفات میرے دائرہ تحریر سے باہر ہیں۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس نقص کو رفع کردوں گا۔" جب میں چلنے لگا تو فرمایا "کہو بیٹا پھر ملوگے، ابھی تو تمہارے جانے میں بہت دن ہیں۔" میں نے کہا "انشاءاللہ ضرور آؤں گا۔" ہنس کر کہنے لگے "انشاءاللہ کہنے کے بعد تم ضرور آئے، مسلمانوں کو

جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ انشاءاللہ ضرور کروں گا۔ ہم تو اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہے ہاں اگر خدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرا دیا تو مجبوراً کر لیں گے۔'' میں نے کہا ''مولوی صاحب آپ کو انشاءاللہ کے یہ معنی پہنانے مناسب نہیں ہیں آپ مذاقیہ پہلو مذہبی معاملات میں بھی نہیں چھوڑتے۔'' کہنے لگے ''پہلے انشاءاللہ کے معنی دوسرے تھے، آج کل کے مسلمان وہی معنی لیتے ہیں جو میں نے بیان کیے۔'' خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا اور صبح ہی میل سے میں ایسا دہلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آ کر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا اس میں آ رہے تھے۔ رعشہ میں اضافہ ہو گیا تھا اور آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا۔ کہنے لگے ''ہیں! یہ کون صاحب ہیں؟'' میں نے کہا ''میں ہوں۔'' پھر'' آخر میں کون صاحب ہوئے، نام کیوں نہیں بتاتے۔ ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی دیتا ذرا قریب آؤ۔'' میں نے کہا ''واہ مولوی صاحب واہ، اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا دور سے پہچانیے تو بات ہے۔'' ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے ''اوہو مرزا فرحت صاحب ہیں، بھلا اور کون یہ بے تکی باتیں کرے گا۔ آؤ بیٹا اب کے تو کئی برس کے بعد آئے۔'' میں پاس گیا، گلے لگایا، حالات پوچھتے رہے، باتیں کرتے کرتے کہا ''ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں کیا بجا ہے۔'' میں نے گھڑی دیکھ کر کہا ''ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں۔'' کہنے لگے ''اوہو دیر ہو گئی۔ ذرا میرا جوتا اور جرابیں تو لے آؤ۔'' میں نے لا کر جرابیں پہنائیں، جوتا سوکھ کر لکڑی ہو گیا تھا وہ زبردستی پاؤں میں ٹھونسا، جوتا پہن کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کھونٹی سے اُتار کر شیروانی اور ٹوپی دی، وہ پہن کر کہنے لگے ''چلو بھئی وقت تنگ ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا ''مولوی صاحب آخر کہاں جانا ہے۔'' کہنے لگے ''بیٹا آج اک مقدمہ کی پیشی ہے وہاں جا رہا ہوں، ذرا مجھ کو کشمیری دروازے تک تو لے چل۔'' میرا

ہاتھ پکڑ کر نیچے اُترے، باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں۔ میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لیے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا کیجیے۔ خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے، آخر یہ کس دن کے لیے ہے۔ روپیہ اسی لیے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے، بال بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے پھر کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ذرا اپنی حالت کو دیکھیے اور کشمیری دروازے کو دیکھیے، یہ دو میل جانا اور دو میل آنا آپ کو مضمحل کردے گا۔ ذرا ٹھہر جایئے میں گاڑی لے آتا ہوں۔" بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اب چلنا ہے تو چل، نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں۔ ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جاسکوں۔" میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لیے اب تو گاڑی رکھ لیجیے، اگر آپ خرچ نہیں اُٹھاتے ہیں تو میں اُٹھاؤں گا۔" ہنس کر کہنے لگے "کیوں نہ ہو روپیہ اُچھلنے لگا ہے۔ کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں۔ بیٹا بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لیے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک تو دانہ گھاس چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا، کل وہ توڑا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے۔ رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے، لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے، اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں۔ نا بھئی نا، اب گاڑی رکھنا وضع داری کے خلاف ہے۔" میں نے کہا "تو کمیشن ہی جاری کرالیا ہوتا۔" کہنے لگے "وہ بھی میری وضع داری کے خلاف ہے۔ ہمیشہ کچہری میں جاکر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضع داری کو کیوں توڑوں۔" بہرحال یہی حجت کرتے کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی، انھوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے پہلے انھیں کا مقدمہ لے کر ان کی شہادت قلم بند کی، اور جس طرح گئے تھے اسی طرح ہانپتے ہانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدر آباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا، جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں، اندر قدم نہیں رکھتا، مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں، اور رہ رہ کر ذوقؔ کا یہ شعر زبان پر آتا ہے:

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اللہ بس باقی ہوس!

○○○
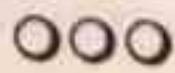
نام دیو۔ مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں:

قیس ہو، کوہ کن ہو، یا حآلی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اُٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا پھر اُلٹے پانو پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوتی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہ داشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچے کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور تناند دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گانو (گاؤں) والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا، بہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے، لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دِق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اُٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا، یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو وہ تو ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کو تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوق باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی تربیت و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ

ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے۔
اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار
اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایران اور شام سے شامی
آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت
میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فن باغبانی کی
کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے
سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے
مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔
یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ
بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے
کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھنڈ اس غریب پر
ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے
شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت
اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا۔ غریب تھا اور
تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے
عشق تھا اور آخر کار کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اسے کبھی یہ
خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے
کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو
اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا، آدمیوں،
جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔

نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ مجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی، وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ کو ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

○○○

مولوی عبدالحق
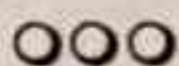
محسن الملک

(۱۹۳۴ء)

قدرت نے نواب محسن الملک مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں، وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔ خطاب یا نام اٹکل سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ مسمّٰی کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا، نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں۔ عطائے خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا، لیکن محسن الملک کا خطاب ان کے لیے بہت ہی موزوں نکلا۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو ان سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں، اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو ان پر اس کا بار رہتا تھا۔ اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے انھیں چین نہ آتا، یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہیں بھولتے تھے۔ اور یہ میں ذاتی علم سے کہتا ہوں کہ وہ بھی ان کے زیر بار منت تھے۔ سیاسی مصلحتیں بعض اوقات اہل حکومت کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان افراد کو جو ان کی یا حکومت کی راہ میں حائل ہیں دودھ میں مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں۔ مرحوم کو بھی کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا، لیکن انھوں نے اس ناگوار اور دل شکن کام کو اس خوبی اور سلیقے سے کیا کہ مخالف ہونے پر بھی محسن الملک کو دعائیں دیتے گئے اور جب تک زندہ رہے ان کے شکر گزار رہے۔

وہ جوہر قابل تھے مگر موقع کی تاک میں تھے۔ حیدرآباد میں ان کی سیاست، ذاتی تدبر، انتظامی قابلیت کے جوہر کھلے۔ ریاستوں میں نوکری کرنا اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا

آسان نہیں۔ وہاں سازشوں، ترغیبوں اور پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تیز نظر اور ہوش مند بھی پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ بالواسطہ یا بلاواسطہ پھنسنا ہی پڑتا ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ اکثر تو ذاتی اغراض کے لیے یہ سب جتن کرتے ہیں، مگر خاص خاص لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ریاست کی بہبودی کی خاطر اپنا سر اوکھلی میں دے دیتے ہیں، ان چند مخصوص لوگوں میں نواب محسن الملک کا بھی شمار ہے۔ اس اکھاڑے میں اُترنا اور بلوہ نکل آنا اصل حکمت اور تدبر ہے اور یہ کوئی محسن الملک سے سیکھتا۔ انھیں ان جھگڑوں میں پھنسنا پڑا، بعض اوقات طوعاً اور بعض اوقات کرہاً، لیکن انھوں نے کبھی ریاست کے مفادات کو ذاتی اغراض پر قربان نہیں کیا۔ وہ کوئلوں کی اس کوٹھری میں گئے مگر ہمیشہ بے داغ نکل آئے لیکن باوجود اس قدر مدبر، ہوش مند اور شاطر ہونے کے آخر وہ خود بھی اسی کا شکار ہوئے۔

ریاستوں میں دوگونہ مصیبت ہوتی ہے، ایک اندرونی اور دوسری بیرونی۔ پچاس برس پہلے کا ذکر ہے اب رنگ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ خود مختار حکومتوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی بہت گنجایش ہوتی ہے۔ ہر شخص کی (خواہ وہ کوئی ہو) یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح 'سرکار' کو خوش کرلیا جائے، جس سے 'پیا خوش اسی کا راج' اسی سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ اسی کش مکش سے کذب و افترا، بہتان، مخبری، غرض کوئی ایسی حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے خلاف کام میں نہ لاتے ہوں۔ یہ ایک عجیب اسرار ہے، جس کا سلسلہ شاخ در شاخ دور دور پہنچتا ہے اور عجیب رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایسے حیرت انگیز نتائج پیدا ہوتے ہیں جن کا سان گمان بھی نہیں۔ یہ بڑی طویل داستان ہے، اس کی تفصیل کو دفتر درکار ہیں۔ اس کے لیے بعض لوگوں کے دماغ خاص طور پر موزوں ہوتے ہیں۔ یہاں علمی قابلیت اور فضیلت کام نہیں آتی، یہ کوچہ ہی دوسرا ہے۔ بعض لوگ دیکھنے میں بالکل بدھو معلوم ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ایسے ہی ہیں لیکن بلا کے سازشی ہوتے ہیں اور ان کا دماغ ان معاملات میں ایسا رسا ہوتا ہے کہ ان کے کارنامے دیکھ کر بڑے بڑے مدبر اور

قابل لوگ ششدر رہ جاتے ہیں۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یہ چیزیں خوب پھلتی پھولتی تھیں۔

یہ تو ہوئی ایک مصیبت اور اندرونی۔ اب دوسری مصیبت کا حال سنیے جو بیرونی ہے۔ والیِ ریاست اپنے علاقہ کا حاکمِ با اختیار ہے۔ سیاہ و سفید کا مالک ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک ایسی پیخ لگی ہوئی ہے جس کے سامنے سارے اختیارات دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص ہوتا ہے، نہ صاحب اختیار نہ صاحب جاہ و منصب، نہ غیر معمولی قابلیت و ذہانت رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے، یہ ریزیڈنٹ بہادر ہیں۔ راج پاٹ تو ''حضور'' کا ہے لیکن اس ''کنکوے کی ڈور صاحب عالی شان بہادر'' کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے مدعیوں کے دعوے باطل ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے مدبروں کی تدبیریں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ ''بڑے صاحب'' کی نظر پڑی تو ایک دنیا پھر جاتی ہے۔ بعض اوقات ''رزیڈنسی'' اور ''پیلس'' دو بڑی رقابت گاہیں ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک طرف فارن آفس اور گورنمنٹ اور دوسری طرف ارکان ریاست اور مصاحبین حضور ایک دوسرے سے الجھ جاتے ہیں۔ حسد اور ''رقابت'' ''پرسٹیج'' اور بات کی پچ بیچ میں آ پڑتی ہے جس کی وجہ سے سازشوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ایسے پیچ پہ پیچ پڑنے شروع ہوتے ہیں کہ اصل معاملہ تو الگ رہ جاتا ہے اور بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات حالت ایسی نازک ہو جاتی ہے کہ حکومت تو رہی ایک طرف، جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اس پُر پیچ گتھی کو اس طرح سلجھانا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے، ریزیڈنٹ بہادر بھی خوش رہیں اور ریاست کے وقار کو بھی زیادہ صدمہ نہ پہنچے اور اصل معاملہ (جو کچھ بھی نہ تھا) اس طرح طے ہو جائے کہ طرفین کو کچھ عذر نہ ہو، ریاست کے انتظام میں سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ یہ کمال نواب محسن الملک کا خاص حصہ تھا، ان کا ذہن ایسا رسا، ان کی طبیعت ایسی حاضر، ان کے اوسان ایسے بجا اور معاملات و واقعات پر ایسا عبور تھا کہ بڑے بڑے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سلجھا دیتے تھے۔ وہ اگر ٹرکی یا کسی اور سلطنت کے منسٹر ہوتے تو یقیناً دنیا میں بڑا نام پیدا کرتے۔ بڑے بڑے ان کا لوہا مان گئے تھے۔

یوں تو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نواب صاحب مرحوم کے احسانات حیدر آباد اور اہلِ حیدر آباد پر بے شمار تھے، لیکن ریاست کے نظم و نسق میں چند چیزیں خاص ان کی یادگار ہیں۔ مثلاً ریاست کا بجٹ نواب صاحب نے مرتب کیا اور یہ مصر کے بجٹ کے نمونہ پر تھا جو وہاں انگریزی نگرانی کے بعد پہلی بار تیار ہوا تھا۔ بندوبست کا محکمہ بھی انہی کا قائم کیا ہوا ہے، جس نے اراضی کی پیمائش کا کام کیا۔ اس کے علاوہ فنانس اور مال گزاری میں بہت سی اصلاحیں کیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں یہ ان کے سوانح نویس[1] کا کام ہے۔

حیدر آباد میں بڑے بڑے لوگ آئے اور گئے لیکن اب تک کسی کو وہ عام مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل نہیں ہوئی جو نواب محسن الملک کو ہوئی۔ ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر بڑے اور صاحبِ اقتدار آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان اس وقت آتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار یا منصب سے محروم ہو جاتا ہے، نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدر آباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزار ہا آدمی کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سیکڑوں آدمی جس میں امیر، غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا؟

جس زمانے میں نواب صاحب پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا، مسلمانوں میں مذہبی جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں سے شاید ایک یہ بھی تھا کہ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مسلمان دولت و اقبال، جاہ و ثروت سب کچھ کھو چکے تھے، ایک مذہب رہ گیا تھا۔ اس لیے یہ انھیں اور بھی عزیز ہو گیا تھا، ذرا سی بدگمانی پر بھی ان کے جذبات بھڑک اُٹھتے تھے۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا مسلمان مصنف یا ادیب ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو یہاں تک کہ وہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے ہیں اور اپنے خیال میں بدمذہب اور بدعقیدہ سمجھتے تھے ان کا اوڑھنا بچھونا بھی مذہب تھا، سرسید تو خیر ان کے مرشد ہی تھے ان کے حلقے کے دوسرے رکن

۱۔ افسوس ہے کہ مؤلف اس دشوار راستے کو طے نہ کر سکا۔

بھی مثلاً نواب محسن الملک، حالی، مولوی مشتاق حسین، شبلی، چراغ علی، نذیر احمد وغیرہم خواہ کچھ بھی لکھتے، لیکن تان مذہب ہی پر ٹوٹتی تھی۔ نواب صاحب مرحوم کو ابتدا سے مذہبی لگاؤ تھا۔ پہلے وہ میلاد پڑھتے اور وعظ کہتے تھے۔ نیچری ہونے پر لیکچر اور مضامین لکھنے لگے۔ لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب سے ہوتا تھا۔ ان کی ایک ہی تصنیف ہے جو خالص مذہبی ہے ورنہ اس کے سوا ان کی جتنی تحریریں ہیں وہ یا تو تعلیمی ہیں یا معاشرتی یا علمی ہیں لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے اسلام یا مسلمانوں سے ہے۔ گو وہ اردو کے اعلا درجہ کے ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریر میں ادبیت کی شان ضرور پائی جاتی ہے۔ روانی، فصاحت، تسلسل بیان ان کے کلام میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے، اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا کر سنتے تھے اور ترجمہ کرا کر مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے مضامین میں مغربی خیالات کی ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔

تقریر کے وقت منھ سے پھول جھڑتے تھے، آواز میں شیرینی اور دل کشی تھی، اکثر لوگ جو ان سے ملنے یا کسی معاملے میں گفتگو کرنے آتے تو ان کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔ ان کی خوش بیانی ایسی تھی کہ اکثر اوقات مخالف بھی مان جاتے تھے۔ دکن میں رہتے رہتے اور بعض امراض کی وجہ سے بھی وہ شدید موسم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے زمانے میں وہ بمبئی چلے آتے تھے۔ بدرالدین طیب جی، سرسید کے مشن اور علی گڑھ کالج کے بہت مخالف تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے بدرالدین طیب جی سے ایسی فصیح اور پُر زور تقریر کی کہ دونوں آب دیدہ ہو گئے اور تھوڑی سی دیر میں ان کی دیرینہ مخالفت کو ہمدردی سے بدل دیا، اور ایک گراں قدر عطیہ کالج کے لیے ان سے وصول کر لیا۔ بمبئی میں جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس کے صدر بھی بدرالدین طیب جی ہوئے۔ بڑے بڑے جلسوں میں جب معاملہ بگڑنے لگتا اور یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا کہ کہیں جلسہ درہم برہم نہ ہو جائے تو اس وقت نواب صاحب کی خوش بیانی، فصاحت اور ظرافت جادو کا کام کر جاتی تھی اور منغض اور مکدر چہرے بشاش اور شگفتہ ہو جاتے تھے۔ ان کی باتوں اور تقریروں میں ظرافت کی چاشنی بڑا مزہ دیتی تھی۔ باتوں میں ظرافت کبھی کبھی شوخی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

دوسروں سے کام لینے میں انھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح سے ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں سے بھی اور ماتحتوں سے بھی ان کا حسن سلوک ایسا تھا کہ وہ ان کی فرمایشوں کی تعمیل ایسی تندہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے ان کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔ آدمی کو پہچاننے میں انھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں وہ آدمی کو پوری طرح بھانپ لیتے تھے۔ ان کے ملنے والے برے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں ہے، اس میں بدوں کا بھی حصہ ہے اور شاید دنیا کی بہت کچھ رونق ان ہی کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے۔ مدبرین اور سیاست دانوں کو طرح طرح ضرورتیں پیش آتی ہیں اور قسم قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کبھی ایسا وقت آپڑتا ہے کہ بدمعاشوں سے کام لیے بغیر چارہ نہیں ہوتا، لیکن کمال تدبر اس میں ہے کہ ان سے کام لیا جائے لیکن انھیں قابو پانے کا موقع نہ دیا جائے۔ نواب صاحب اس فن کے استاد تھے۔ وہ بدمعاشوں سے کام لیتے تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ وہ بدمعاش ہے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات اس کی اپنے ہاتھ میں ایسی رکھتے تھے کہ وہ سر نہ اُٹھا سکتا اور اسے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ان پر قابو پانے کا موقع نہ ملتا تھا۔

ان کا ذوق نہایت نفیس اور پاکیزہ تھا، رہنے سہنے، کھانے پینے، پوشاک، غرض ان کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔ جن لوگوں نے حیدرآباد میں نواب صاحب کی کوٹھی (جو اَب بھی کوٹھی محسن الملک کہلاتی ہے) دیکھی تھی وہ اس کی داد دے سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا منشا کیا تھا اور ان کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا، لیکن یہ بلا آدمی انھی دنوں اور ان کی ہی بدولت، مسلمانوں کو اسراف کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ اس معاملے میں سرسید کے سب سے بڑے معتقد اور خلیفہ نواب محسن الملک تھے، ان کی دیکھا دیکھی دوسروں پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا۔ ان بزرگوں نے ہر چند لباس کی ''تراش وخراش'' مکانوں کی سجاوٹ اور بود و باش کے طریقوں میں انگریزوں کی تقلید کی، لیکن کھانا ان کا وہی ہندوستانی رہا، اسے

نہ بدل سکے، یہ چٹخارے انگریزی کھانوں میں کہاں؟ نواب صاحب کھانے کے بڑے شوقین تھے اور بہت نفیس اور عمدہ کھانے کھاتے تھے۔ ان کے کھانے بڑے مرغن ہوتے تھے۔ حیرت اس بات کی تھی کہ ایسے کھانے بغیر کسی ورزش وغیرہ کے وہ کیوں کر ہضم کر لیتے تھے۔ یہی حال نواب عماد الملک مرحوم کا تھا۔ انھیں بھی کھانے کا بہت شوق تھا۔ یہ لوگ کھانے کے عیب و ہنر کو بھی خوب پرکھتے تھے۔ اسی شوق کی بدولت وہ باورچیوں کی بڑی ناز برداری کرتے تھے۔ ان کا باورچی جہاں گیر تھا۔ یہ بھی اٹاوے کا تھا، پہلے اس کا باپ یہ کام کرتا تھا، وہ ضعیف ہو گیا تو جہاں گیر اس کی جگہ آ گیا۔ خوب کھانا پکاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاص مزہ تھا۔ مگر بڑا ہی گستاخ اور بدمزاج تھا۔ ایک دن اس نے گستاخانہ اور ناملائم کلمات نواب صاحب سے کہے۔ نواب صاحب خفا ہو کر اوپر چلے گئے۔ تیسرے پہر کو جب وہ نیچے آئے تو ان کے نیاز مند نے عرض کیا "کیا افسوس کی بات ہے! ایسے کھانے سے تو فاقہ بہتر ہے۔" فرمانے لگے "ارے میاں تم کیا جانو یہ گالیاں نہ تھیں چٹنی تھی۔"

ایک روز نہ معلوم کیا بات ہوئی وہ خفا ہو کر چل دیا۔ اب نواب صاحب سے کھانا نہیں کھایا جاتا۔ بیگم صاحب نے طرح طرح کے کھانے پکائے مگر جہاں گیر کی بات کہاں۔ بمبئی سے غدار شہر میں ایک سے ایک بڑھ کر ہوٹل اور ریستوران، مگر کہیں کھانا پسند نہ آیا۔ آخر روپے کا منی آرڈر تار پر بھجوایا اور جہاں گیر کو بلوایا۔ تب لقمہ حلق سے اُترا۔ کھانے کا شوق ہو تو ایسا ہو۔

بمبئی ہی کا ذکر ہے کہ ایک باورچی نواب صاحب کا نام سن کر حاضر ہوا، نواب صاحب نے پوچھا۔ کیا کیا پکانا جانتے ہو، کہنے لگا چپاتی اور قورمہ۔ نواب صاحب نے کہا بس، تو کیا جواب دیتا ہے کہ اصل کھانا تو یہی ہے، باقی سب نوابوں کے نخرے ہیں۔

نواب صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اخبارات اور اردو، فارسی، عربی کی کتابیں برابر پڑھتے رہتے تھے۔ انگریزی کے اخبارات اور مضامین بھی پڑھوا کر سنتے تھے۔ انگریزی کی ایسی کتابیں جو ان کے مذاق کی ہوتی تھیں ان کا ترجمہ کرا کے پڑھتے اور بحث کرتے تھے، ان کے کتب خانے میں فارسی، عربی اور انگریزی کی اعلا درجہ کی کتابیں تھیں۔

سرسید کی وفات کے قریب زمانہ ہی میں اردو کی مخالفت کا آغاز ہو گیا تھا اگر چہ سرسید کی حالت اس وقت نازک تھی تو بھی اس جواں ہمت بڈھے نے اس کے متعلق لکھا پڑھی شروع کردی تھی۔ محسن الملک کے زمانے میں اس مخالفت نے اور زور پکڑا۔ اردو کی حفاظت اور حمایت کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی جس کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے بڑی زبردست اور پُر جوش تقریر کی جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا اور جوش کی ایک لہر پھیل گئی۔ سرانٹونی میکڈانل اس وقت لیفٹیننٹ گورنر تھے، وہ ہندی کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ اس نے کچھ ایسی دھمکی دی کہ نواب صاحب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا اور انجمن ٹوٹ کے رہ گئی۔ ان کی یہ کمزوری نہایت قابلِ افسوس ہے، لیکن اندیشہ یہ تھا کہ اگر انھوں نے اس پر اصرار کیا تو انھیں کالج کی سکریٹری شپ سے سبک دوش ہونا پڑے گا۔ کالج کی حالت اس وقت بہت نازک تھی۔ اس لیے مصلحت اس میں سمجھی کہ اردو کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں، تاہم ان کی یہ کارروائی بے اثر نہ رہی۔

نواب محسن الملک اسی شاہراہ پر گامزن رہے جس کی داغ بیل سرسید ڈال گئے تھے۔ سید کے بعد محسن الملک نے ان کے کام کو جس طرح سنبھالا، نبھایا اور بڑھایا یہ انہی کا کام تھا۔ ان کے بعد کوئی ان کی یادگار بنائے یا نہ بنائے محسن الملک کا کام ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

(از تذکرہ محسن)

ООО

مولوی عبدالحق
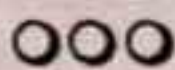
حالؔی

(۱۹۳۷ء)

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ مولانا حالی اس زمانے میں یونین کی پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس سال تعطیلوں کے زمانہ میں وطن نہیں گیا تھا، بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ''حیاتِ جاوید'' کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ''یادگارِ غالب'' کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھی دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے۔ میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں عزیز مہمان فرمانے لگے کہ ملنے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنھوں نے 'مسدس' لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی بلدۂ حیدرآباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جارہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے

رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے، ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور سارے ساڑ کئی ہنٹر غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ کر کے سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا، وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا" اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے، کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔" اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِدلی۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے نامور اصحاب اور اپنی قوم کے اکثر بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسا پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عمادالملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بہ حیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے یا جو اُن سے ملے ہیں وہ ضرور اس قول کی تصدیق کریں گے۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی، اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور پھر عمر بھر ان کے حسن اخلاق کا مداح رہتا تھا۔ ان کا رتبہ بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے چھوٹوں کا

بھی ادب کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک بار جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے،
میں اور مولوی حمید الدین مرحوم ان سے ملنے گئے تو وہ سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔
ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر
مجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آئندہ آپ ہی
تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

اس سے بڑھ کر خاکساری کا ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی
معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں، ہمیشہ "مرتبہ" لکھا، کبھی "مؤلفہ" یا "مصنفہ" کا لفظ نہیں لکھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ
ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے
مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے پردہ اٹھایا اور
جھانک کر دیکھا۔ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔
انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھا لیا مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر
ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد کھانا منگوایا، انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت
شوقین تھے۔ پانی پت کی ملائی بہت مشہور تھی، ان کے لیے ملائی منگوائی۔ کھانا کھانے کے
بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا۔ پھر ان کے لیے پلنگ بچھوا کر بستر کرا دیا اور خود آرام
کے لیے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے پڑ کر سو رہے۔ مولوی انوار احمد کہتے تھے کہ
رات کے بارہ ایک بجے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رضائی کو آہستہ آہستہ چھو رہا ہے۔
انھوں نے چونک کر پوچھا کون؟ مولوی صاحب نے کہا، میں ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے
مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اوڑھا
رہا تھا۔ انوار احمد صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر ان کی اس شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں
بھول سکتا۔

مہمان کے آنے سے (اور اکثر ایسا ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچے دل
سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے تھے۔ باوجود یہ کہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کرکے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروّت ایسے تھے کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مند ان کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انھیں بہت رنج و افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے بھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو، بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے، جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

ہندی اردو کا جھگڑا ان کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی، لیکن باوجود اس کے کہ انھوں نے عمر بھر اردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اردو کا درجہ بہت بلند کر دیا۔ وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے، چنانچہ ''خمخانہ جاوید'' کے تبصرے میں لکھتے ہیں:

> ''آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی سے جو اختلاف ہندو اور مسلمانوں میں اردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی رفع داد ہو سکتی ہے تو اس طریقے سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاف کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے اسی طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے

ہردل عزیز ہیرو نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔
اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس
الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی
جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا مال کرنے
کی کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد
ڈالیں اور ایک متنازع فیہ زبان کو مقبولہ فریقین بنائیں جیسی کہ لکھنؤ
جانے سے پہلے تقریباً اہلِ دہلی کی زبان تھی۔ مذکورہ بالا اختلاف کے
متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے اس قسم کا
بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں
جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں
آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر
کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ
اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے
زیادہ فصیح، زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات
میں عمریں بسر کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو
قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی
آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بہ مقابلۂ سنسکرت کے نہایت
سہل الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور
فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے
دیکھتے رہے حالاں کہ جو اردو دان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا
دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی فارسی
سے اس کو اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسما اس میں کثرت
کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام اجزاے کلام جن کے بغیر کسی

زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہو سکتی، برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر
سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور
سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے
تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ 'دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر۔"

یہ بات بعض لوگوں کو بہت ناگوار گزری اور بعض اردو اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے، اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی فارسی سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دست گاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے، اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے، قائم ہوتی ہے۔ نیز اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسہ پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔"

ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوب صورتی

سے لکھ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گویا اسی موقع کے لیے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ اردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کسی ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادیب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

نام و نمود چھو کر نہیں گیا تھا۔ ورنہ شہرت وہ بدبلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی، بلکہ شیوہ ہوگئی ہے۔ وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کر کے اپنی فضیلت جتانا اور اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آگئی ہے، مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرایے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ مثلاً:

گرچہ حالی اگلے استادوں کے آگے، ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اس سے بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

ان کا ذوق شعر اعلیٰ درجہ کا تھا جیسا کہ ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے ظاہر ہے، لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمایش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آپڑتی تو وہ کھل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے یہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمایش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر سے اس لیے فرمایش کرتا ہے کہ اسے بھی اپنا کلام سنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے بعد مخاطب بھی اس سے یہی فرمایش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بغیر فرمایش ہی اپنے کلام سے

محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے (بعض شاعر تو اس کے لیے بے چین رہتے ہیں) لیکن بعض لوگ سچے دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کسی شاعر کا کلام اس کی زبان سے سنیں۔ لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا اس میں کچھ حقیقت بھی تھی، لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدر آباد میں تھا ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی۔ چند اور احباب کو بھی بلایا۔ چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سنائیے۔ مولانا نے وہی حافظہ کا عذر کیا۔ ہر چند لوگوں نے کہا کہ جو کچھ بھی ہو یاد وہ فرمائیے۔ مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے۔ اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی وہ چپکے سے اٹھے اور کہیں سے دیوان حالی لے آئے اور لا کے سامنے رکھ دیا۔ اب مجبور ہوئے کہ کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا آخر انھوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع تھا:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور سے گا کے پڑھتے ہیں، ان کا ذکر نہیں لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، ان میں بعض طرح طرح سے چشم وابرو، ہاتھ، گردن اور جسم سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے۔ البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔ انھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحید الدین سلیم صاحب کو دی جو بہت بلند آواز مقرر، پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک ہی بند پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا۔ نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی۔ ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسید تو اس زمانے میں خیر مورد لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس و ناکس ان پر منھ آتا تھا،
لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھار پڑی وہ حالی تھے۔ ایک تو
ہر وہ شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری
جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور ''مقدمہ شعروشاعری'' نے تو خاصی
آگ لگادی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی
روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ یہ ساری کارروائی ان ہی کی مخالفت میں کی گئی ہے۔
پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی صدا آنے لگی۔ ''اودھ پنچ'' میں ایک
طویل سلسلۂ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب وغریب
نمونہ تھا وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت
پہنچ گئی تھی جن مضامین کے عنوان:

ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

تو اس سے سمجھ لیجیے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی، مولانا یہ سب کچھ
سہتے رہے، لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا:

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک
نہیں سمجھتے تھے، ان کی تقلید کرنے لگے:

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا عجیب وغریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ رہتے تھے۔
جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر
غصہ آتا تھا لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے
اور یہ وہ خوبیاں ان کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے۔

یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ جوش میں آ کر آدمی سررشتہ اعتدال کھو بیٹھتا ہے اور بہہ کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلّانے لگتا ہے۔

ان کا ایک نواسہ تھا، ماں اس کی بیوہ تھی اور اس کا ایک ہی لڑکا تھا۔ اکلوتا لڑکا بڑا لاڈلا ہوتا ہے۔ اس پر ایک آفت یہ تھی کہ صرع کی بیماری میں مبتلا تھا اس لیے ہر طرح اس کی خاطر اور رضاجوئی منظور تھی۔ وہ مولانا کو بہت دق کرتا مگر وہ اُف تک نہ کرتے۔ وہ اینڈے بینڈے سوالات کرتا، یہ بڑے تحمل سے جواب دیتے۔ وہ فضول فرمائشیں کرتا۔ یہ اس کی تعمیل کرتے۔ وہ خفا ہوتا اور بگڑتا، یہ اس کی دل دہی کرتے۔ وہ روٹھ جاتا، یہ اسے مناتے۔ وہ لڑ کر گھر سے بھاگ جاتا، یہ اسے ڈھونڈتے پھرتے۔ پانی پت سے کہیں باہر جاتے تو وہ انھیں دھمکی آمیز خط لکھتا۔ یہ شفقت آمیز خط لکھتے اور سمجھاتے بجھاتے۔ کچھ اس کی دُکھیا ماں کا پاس، وہ سب سے زیادہ اس پر شفقت فرماتے اور اس کی ہٹ، خفگی، روٹھنے، مچلنے کو سہتے اور کبھی آزردگی یا بےزاری کا اظہار نہ کرتے۔ اگرچہ جوان ہو گیا تھا مگر مزاج اس کا بچوں کا تھا۔ سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار اس نے مولانا کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گر پڑے۔ کہیں خواجہ سجاد حسین صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ بہت برہم ہوئے اور شاید اس کے ایک تھپّڑ مار دیا۔ مولوی صاحب اس پر سخت ناراض ہوئے اور خواجہ صاحب سے بات چیت موقوف کر دی اور جب تک انھوں نے اس لڑکے سے معافی نہیں مانگ لی، ان سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی، جس حالت پر تھے اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے جس کے تخمینا پچھتر حالی ہوتے ہیں۔ ایک مدت پچھتر ہی ملتے رہے۔ بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدرآباد سے معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں، وہ چاہتے تو

کچھ مشکل نہ تھا، مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا وہ اس کے لیے بہت شکرگزار تھے۔

غالباً سوائے ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصانیف مالِ یغما تھیں۔ مسدس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے۔ خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

مروّت کے پتلے تھے۔ جب تک خاص مجبوری نہ ہو کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ وقت بے وقت لوگ آجاتے اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے، وہ بیٹھے سنا کرتے لیکن محض دل آزاری کے خیال سے یہ نہ ہوتا کہ خود اٹھ کر چلے جاتے یا کنایتاً اشارتاً کوئی ایسی بات کہتے کہ لوگ اُٹھ جاتے۔ حیدرآباد کے قیام میں، میں نے اس کا خوب تماشا دیکھا۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی جس سال حیدرآباد تشریف لائے، سرسید کی برسی کا جلسہ بھی انھی کی موجودگی میں ہوا۔ ان سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لیے سرسید کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عماد الملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لیے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل تھا۔ پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی، اس لیے آخری حصہ چھوڑ دیا۔ قیام گاہ پر واپس آکر فرمانے لگے میرا گلا بالکل خشک ہوگیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، اچھا ہوا جو اندھیرا ہو گیا ورنہ اس سے آگے ایک حرف نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا، اسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا۔ کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اس کی فوراً داد

دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ "پیسہ" اخبار روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی۔ "ہمدرد" اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو سمجھاتے۔ ان کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر اس بات سے ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بڑی فیاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے کتنا دل بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض وقت چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور ان کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف ہیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم ان کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے ان میں دونوں نے طبع آزمائی کی 'برکھارت'، 'حبِ وطن'، 'نشاطِ امید' اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبعِ نازک پر گراں گزرا، اس وقت سے ان کا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثال نثار ہیں مگر شعر کے کوچہ میں ان کا قدم نہیں اُٹھتا لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجیے کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں:

"۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ

ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔''

بات میں بات نکل آتی ہے جب ''حیات جاوید'' شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے تھے۔ ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب جو اس وقت اتفاق سے حیدر آباد میں وارد تھے، میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف دیکھتے ہی فرمایا کہ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے'' وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا سوءِ ادب تھا لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بیکار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سنیے۔ قیامِ حیدر آباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ 'دکن ریویو' نکالتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں سے ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا۔ تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

خود مولانا پر بہت سی تنقیدیں لکھی گئیں اور نکتہ چینیاں کی گئیں لیکن انھوں نے کبھی اس کا برا نہ مانا۔ مولانا حسرت موہانی کا واقعہ جو مجھ سے مولوی سلیم مرحوم نے بیان فرمایا اور اب شیخ اسمٰعیل صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے، بہت ہی پُر لطف ہے۔

۱۹۰۳ء میں جب مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے علی گڑھ سے 'اردوئے معلیٰ' جاری کیا تو جدید شاعری کے اس مجددِ اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ 'اردوئے معلیٰ' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور 'اردوے معلیٰ' کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔

حسرت اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے، خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچہ کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور 'اردوے معلیٰ' کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ! خوب لکھا کہہ کر داد دیتے تھے، حالی بھی ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے۔
''اے مولانا! یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟'' اور کچھ اس قسم کے الفاظ شروع کیے۔
''سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلد اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔''

فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ ''نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اور یہ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ ''حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟'' جواب دیا کہ ''جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔''

(رسالہ زمانہ، ماہ دسمبر ۱۹۰۸ء، جلد: ۱۱، نمبر ۶، ص: ۲۹۸ تا ۲۹۹)

(ماخوذ از تذکرۂ حالی، ص: ۱۹۵ تا ۱۹۸)

مولانا حالی انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے، ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہو سکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا کہ وہ سمجھتے تھے اس وقت بہت سے

انگریز تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں، اور جو یہ سمجھتے تھے وہ کر کے دکھایا۔ آج سینکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشر عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح بالکل خیالی شخص تھے۔ بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکر بھی ہو اور عملی بھی ایسا شاذ ہوتا ہے، تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو انھوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا جو اب حالی اسکول کے نام سے موسوم ہے اور ایک پبلک اور ینٹل لائبریری قائم کی جو پانی پت میں سب سے بلند اور پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے، انھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔ ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' یہ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں، دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے، کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اُٹھتا تھا، مگر وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے، خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی سے باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے، لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبا کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کے نام حیدر آباد میں ایک روز ''اولڈ بوائے'' آیا تو

اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخراپن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انھیں علی گڑھ کے طلبا سے اس سے اعلا توقع تھی۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اردو زبان میں اعلا درجہ کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تا کہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ خود کوئی ڈرامہ لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔

آخر میں ان کی دو بڑی تمنائیں تھیں۔ ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد ہوا تھا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی ہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے۔ پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پُر فضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آیئے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آکر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز واقارب رضامند نہ تھے۔ عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے، ضعیفی کا عالم ہے۔ طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلاف مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو دو ایک روز کے لیے پانی پت بھی چلے آنا، اس وقت میں تمہارے ساتھ ہو لوں گا، پھر کوئی چوں و چرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو وہ بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی، اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگزر کا

یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ جب ملتے تو اسی شفقت و عنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس کی بدسلوکی اور بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔ اسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص عذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے، پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں ان کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں۔ ورنہ یوں دنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالیؔ نہیں۔

○○○
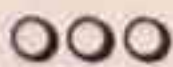
مولانا محمد علی

نومبر کا مہینہ اور شروع کی تاریخیں ۱۹۲۶ء۔ ایک خوش گوار شام کو لکھنؤ میل کان پور سے چھوٹنے کے قریب ہے کہ دو شخص ندوہ کے سالانہ اجلاس سے بھاگم بھاگ موٹر پر اسٹیشن پہنچتے ہیں، اور جھٹ ٹکٹ لے لیا، اسباب کچھ قلیوں اور کچھ والنٹیر وں کی مدد سے پھینک پھانک ایک درجہ میں جا داخل ہوتے ہیں۔ دو انگریز، بمبئی کے پہلے ہی سے بیٹھے چلے آتے ہیں۔ دونوں نو وارد کھدر پوش عبا پوش۔ ایک وجیہ خوش قطع، دوسرا کریہ بدقوارہ۔ دونوں داڑھی باز۔ ان نو واردوں کو انگریز دیکھ کر کچھ ہنسے کچھ مسکرائے۔ عجب نہیں کہ یہ سمجھے ہوں کہ بلا ٹکٹ گھس آئے ہیں۔ خوش قطع نو وارد اسی برتھ پر بیٹھ گیا جن پر صاحب بہادر جمے ہوئے تھے۔ دوسرے نے مقابل کی نشست اختیار کی۔ گاڑی چلی۔ گنگا کا پل بات کرتے آ گیا۔ صاحب بہادر دونوں کی طرف دیکھ چھیڑ کی، مسکراہٹ سے ہنسے اور منھ بنا کر بولے: "This is mother ganses." (یہی گنگا مائی ہے۔) طنز اور زور لفظ mother پر تھا۔ پاس کے کھدر پوش نے معاً چائے کی پیالی منھ سے ہٹا انگریزی زبان اور انگریز کے لہجہ میں جواب دیا۔ یہ مائی اور موسی اور خالہ کیا معنی؟ اچھا آپ یہ رشتہ لیتے ہیں۔ میں تو جانتا تھا کہ دریا بس دریا ہے۔ صاحب یہ تڑاق سے جواب پا سناٹے میں آ گئے۔ یہ برجستہ جواب دینے والا تھا محمد علی اور اس کا ساتھی یا 'تابع مہمل' آپ کا یہ خادم۔ صاحب کو یہ گمان نہ تھا۔ یہ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹھے رکھا کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہوئے ہندوستانی کچھ بھی انگریزی جانتا ہوگا۔ چہ جائے کہ انگریزی میں جواب دے سکے اور دیا بھی شستہ اور برجستہ! چپ سادھ کر رہ گئے۔

اس کے بعد ادھر سے منھ پھیر گفتگو اپنے پرانے رفیق سفر سے شروع کی۔ ولایت سے کرکٹ کی مشہور و معروف ٹیم 'ایم.سی.سی' نئی نئی ہندوستان آئی ہی تھی۔ موضوع گفتگو میں ٹیم تھی، اور اس کے کھیل اور مختلف میچ، محمد علی تھوڑی دیر تو چپ ہنستے رہے اس کے بعد نہ رہا گیا۔ بولے دخل در معقولات معاف۔ کھلاڑیوں پر آپ جو رائے زنی کر رہے ہیں صحیح نہیں ہے۔ فلاں کھلاڑی میں یہ خوبی ہے اور فلاں میں یہ خرابی۔ اور لگے اس کی تفصیل بیان کرنے اور صاحب تھے کہ بھوچکے بنے ایک ملّا نما انسان کی زبان سے یہ ماہرانہ معلومات سن رہے تھے۔ محمد علی اب نفس کرکٹ پر آگئے اور لگے انگلستانی کرکٹ کی تاریخ بیان کرنے۔ لندن میں اور آکسفورڈ میں فلاں سنہ میں بولنگ کے یہ طریقے رائج تھے، گیند کی پچ یوں پڑتی تھی، بیٹنگ یوں کی جاتی تھی، فلاں زمانہ میں یہ تبدیلیاں ہوئیں، ہندوستان اور انگلستان دونوں کی زمینوں میں یہ فرق ہے وغیرہ وغیرہ۔ بولنے والا اب گفتگو نہیں کر رہا تھا گویا کرکٹ پر انسائیکلوپیڈیا کا آرٹیکل سنا رہا تھا۔ آخر میں صاحب بولے۔ آپ کو کرکٹ کے متعلق بڑی معلومات ہیں۔ محمد علی نے کہا مجھی کو نہیں بلکہ ہر علی گڑھی کو ایسی ہی معلومات ہوتی ہیں۔ وہ بولا کیا آپ علی گڑھ میں کپتان رہ چکے ہیں۔ یہ بولے میں نہیں تھا۔ بڑے بھائی big brother تھے شوکت صاحب کے لیے یہ big brother کی تلمیح محمد علی ہی نے اپنے کانگریس کے خطبۂ صدارت کے وقت سے چلا دی تھی۔ وہ انگریز اس پر بے ساختہ بولا: "You talk like Mohd. ali." یہ تو آپ محمد علی کی زبان بول رہے ہیں۔ یہ بولے: "I am Ali" زبان کیسی، میں خود ہی محمد علی ہوں۔" صاحب بہادر کی حیرت اب دیکھنے کے قابل تھی، آنکھیں پھاڑ کر بولے: "Really one of the two Ali Brother." یعنی وہی محمد علی جو علی برادران ہیں۔ انھوں نے چہک کر جواب دیا: "Yes the younger and the more sharp-tongued of the two." جی ہاں انھیں میں سے چھوٹا اور زیادہ تیز زبان بھائی۔ صاحب کو اپنی حیرت کے رفع کرنے میں اب کی دیر سیکنڈوں کی نہیں منٹوں کی لگی۔ بے چینی اور بے قراری کے ساتھ بار بار پہلو بدل رہے تھے اور نظر محمد علی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھی۔ محمد علی نے اب ہنسنا اور لطف لینا شروع کیا۔ بولے اتنا گھبرائیے نہیں

کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ علی برادران جس انگریز کو دیکھ پاتے ہیں اس پر جست کر بیٹھتے ہیں۔ دیکھ لیجیے نامیرے ناخن تک ترشے ہوئے ہیں۔ حملہ کا خیال ہی دل میں نہ لائیے۔ ایک مشہور انگریزی روزنامہ اس وقت علی برادران کا شدید مخالف تھا۔ صاحب نے اس کا تازہ پرچہ آگے بڑھایا محمد علی نے پرچہ کو چھوا تک نہیں، البتہ اس کے ایڈیٹر پر خوب خوب فقرے کسے۔ داستان خاصی طویل ہوگئی اور ایک ہی قصہ کو... کہاں تک سنے جائیے گا۔

ایک بار محمد علی انگلستان میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ وقت کل پانچ منٹ کا ملا۔ انھوں نے تمہید یوں اُٹھائی، کہ میں چھ ہزار میل کے فاصلہ سے تیس کروڑ آبادی کی نمائندگی کرنے آیا ہوں۔ اب آپ خود حساب لگائیے کہ ایک ایک منٹ نہیں ایک ایک سیکنڈ بلکہ ہر سیکنڈ کی کسر میں مجھے کتنی ترجمانی کا وقت ملتا ہے۔ حاضرین لوٹ گئے اور آوازیں آنے لگیں کہ آپ کہے جائیے نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا پانچ منٹ کی جگہ پورے بیس منٹ تک بولے۔

ایک اور منظر اسی سفر میں لندن میں کسی جگہ مولانا تقریر میں بیان یہ کر رہے تھے کہ ہرلن اور سمرنا تو چاہے حضور چھوڑ ہی دیں۔ قسطنطنیہ کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جس سے ہماری تمام قدیم ملی روایات وابستہ ہیں۔ جلسہ مخالفین سے بھرا ہوا تھا۔ انھیں میں سے ایک تاریخ کے فاضل نے کھٹ سے سوال کر دیا کہ یہ تو بتائیے کہ قسطنطنیہ کب سے آپ کے قبضے میں ہے۔ کوئی معمولی مقرر ہوتا تو گھبرا جاتا۔ مولانا نے اپنے سلسلۂ کلام میں ذرا فرق آنے دیے بغیر جواب دیا۔ سنہ تو یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ جب سے آپ کے قبضہ میں ہندوستان ہے اس سے تگنی مدت سے ہمارے قبضہ میں قسطنطنیہ ہے۔ جلسہ میں قہقہہ پڑا اور فاضل تاریخ مدھم پڑ گئے۔ محمد علی کی قوتِ حافظہ بلا کی تھی اور ذہانت اور برجستگی تو کہنا چاہیے ان پر ختم تھی۔ سارے لطائف وظرائف کوئی لکھنے پر آئے تو کتاب کیا معنی دفتر کا دفتر تیار ہو جائے اور سب لکھ بھی کون سکتا ہے۔ کس کو سب یاد رہ سکتے تھے اور یاد کا سوال تو مجھ کو ہے۔ سال کے ہر دن اور ہر دن کے چوبیسوں گھنٹے ہم زاد بنا ساتھ۔ ایسا کون رہ سکتا تھا۔

مناسبت لفظی کے بادشاہ تھے۔ بات میں بات پیدا کر دینا انھی کا حصہ تھا۔ ذیابیطس میں جتلا مدت سے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں یہ حال سُن سُنا مہاراجہ انور کو کچھ رحم سا آ گیا، ہزار ہا

روپے دیے۔ علاج کے لیے یورپ بھجوایا۔ اس سے قبل انور مدعو کیے گئے۔ مہاراجہ انگریزی
کے تو ادیب تھے ہی فارسی کے بھی شاعر تھے اور وحشی تخلص کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت اپنا
دیوان پیش کیا اور اس پر اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی: "To my Moulana from his Wehshi."
اپنے مولانا کی خدمت میں ان کے وحشی کا ہدیہ'' مولانا نے جب جامعہ کا نصاب تعلیم نکالا۔
اپنا تصنیف کیا اور اس پر یہ عبارت لکھ کر پیش کردیا: "From a bogus Moulana to a real
Maharaja." یعنی ''ایک نام کے مولانا کی طرف سے کام کے مہاراجہ کی خدمت میں ہدیہ''
حد ذہانت یہ تھی کہ غصہ کی حالت میں بھی فقرہ چست کرنے سے نہ چوکتے۔

خلافت کمیٹی کے جلسوں میں گرما گرم نوک جھونک کے وقت بار ہا یہ منظر دیکھنے
میں آتا۔ ایک بار کیا ہوا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب
کے مکان پر ہو رہا تھا۔ محمد علی بیمار و معذور لیٹے ہوئے تھے مخالف صف میں ایک اور مشہور لیڈر
ایک روزنامہ کے مالک، مع اپنے صاحب زادے کے، اور اسی روزنامہ کے ایڈیٹر بھی
تشریف فرما تھے۔ بحث نے طول کھینچا اور یہ تینوں صاحب ناخوش اور جلسہ سے اُٹھ کھڑے
ہوئے۔ محمد علی برجستہ پکار اُٹھے۔ غضب ہوگیا۔ باپ بیٹے روح القدس تینوں خفا ہو گئے۔
ذہانت کے لیے بڑا میدان شعر و شاعری کا تھا۔ محمد علی خود بھی شاعر تھے اور شاعری کی دنیا میں
نام تھا جوہر۔ سب سے بڑے بھائی کا تخلص تھا گوہر۔ فرماتے تھے کہ منجھلے بھائی شوکت بے تخلص
رہے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تخلص تجویز کرتا ہوں اسی وزن اور قافیہ میں شوہر۔ شیفتہ کی مشہور
غزل پر غزل۔ نادانیوں میں ہم پشیمانوں میں ہم۔ پر غزل کہنے بیٹھے۔ تو مطلع فرماتے ہیں:

کیوں شہر چھوڑ جائیں دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہوں گے بیابانیوں میں ہم

علی گڑھ کے ایک مشہور خاندان شروانی سے تعلقات بڑی تکلفی کے تھے۔ اس کے
ایک معزز فرد کی زبان سے کہتے ہیں:

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

خود بیجاپور جیل میں قید تھے۔ یہم شمیم بڑے بھائی راج کوٹ جیل میں پڑے پڑے دبلے ہو گئے تھے۔ ان کی زبان سے ادا کیا ہے:

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گئیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

ابھی گو جوان ہی تھے کہ علی گڑھ کالج میں طالب علموں نے زبردست اسٹرائک (Strike) کی۔ عین اسی زمانے میں سرسید کی برسی کا دن آیا، اور اسی دن اولڈ بوائز (Old boys) نے بھی اپنا سالانہ جلسہ منانا طے کیا۔ محمد علی آتے ہیں اور ایک منظوم عریضہ سرسید کی روح کی خدمت میں اپنے ہی جیسے بڈھے لڑکوں کو سنا کر پیش کرتے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں:

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
پڑے ساحل پہ ہیں تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

سرسید کے عقائد ملحوظ خاطر رہیں:

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
تمہیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں اب آنکھیں علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بہ جا تم ہو
سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کا گھر گھر اس گیت سے گونج رہا تھا:

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ سب جیل کے باہر تھے۔ جیل کے اندر خود محمد علی کہہ رہے تھے:

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے
امید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

یہ شاعری نہ تھی آپ بیتی کا ایک ٹکڑا تھا:

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

لڑکا کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر چہیتی اور لاڈلی۔ ۱۹۲۳ء میں ابھی جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی آمنہ بی۔ پالی پوسی، جوان شادی شدہ دق میں مبتلا ہوئیں اور مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ مجبور و مقید چاہنے والے باپ پر کیا گزری ہوگی جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی نورِ نظر کے لیے کیسا کیسا بلبلایا ہوگا، تلملایا ہوگا، پھڑ پھڑایا ہوگا۔ کچھ زور نہ چلا تو عالمِ خیال ہی میں بیٹی سے کہنے لگے:

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے ہی کو یوں وہ تسکین دینے لگے:

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہے وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر، گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کرتے ہیں:

تُو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآن میں کیا
تخرج الحی من المیّت مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پالے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے کہ سرنوشت کا نوشتہ ٹلتا نہیں، بجھتے تھے کہ تقدیر الٰہی کیا فیصلہ کر چکی ہے۔ کہتے ہیں اور کلیجہ تھام کر کہتے ہیں:

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

ایک نہیں دو جوان پہاڑ سی لڑکیوں کا جنازہ اپنے ہاتھوں اُٹھایا، قبر میں سلایا۔ دل ان ذاتی صدموں کی تاب کہاں لاتا۔ قومی صدمے ان سے بڑھ چڑھ کر۔ جیے اس کے بعد چھ سات سال، محمد علی کو قوم وملت کے پیشوا، ملک کے سردار کی حیثیت سے لاکھوں نے جانا، کروڑوں نے پہچانا۔ ان سب سے زیادہ خوش نصیب وہ تھے جنھوں نے محمد علی کو قریب سے بحیثیت دوست کے، عزیز کے، انسان کے دیکھا۔ کیا بیان کیا جائے کیسی نعمت انھیں ہاتھ آ گئی تھی۔ ایک صداقت مجسم، ایک پیکر اخلاص، جرأت، دیانت، ہمت، بے خوفی کا مجسمہ۔ پاس والے جتنے قریب سے دیکھتے گئے، حضرت جوہر کے جواہر اور زیادہ کھلتے گئے، نکھرتے گئے۔ مشہور تمام تر ایک بے باک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے تھے، لیکن ان کے لغت میں ڈپلومیسی کا لفظ ہی نہ تھا۔ ظاہر باطن یکساں۔ جو خیال جس کے متعلق دماغ میں آ گیا، زبان سے ادا ہو کر رہا۔ جو بات دل میں آئی منہ پر آئے بغیر نہ رہی۔ کہتے ہیں کہ اہلِ سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ محمد علی اس معنی میں اہل سیاست قطعاً نہ تھے۔ ایک بار نہ تھے، ہزار بار نہ تھے۔ محبت کے پتلے تھے، مہر و اُلفت کے بندے تھے بیوی بچوں کے عاشق زار، دوستوں، رفیقوں، ساتھیوں پر سو جان سے نثار اور دور کا واسطہ رکھنے والوں کے مونس و غم گسار۔ کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ مسلمانوں کے اور عالم اسلامی کے ساتھ شیفتگی کی یہ کیفیت کہ افریقہ میں کسی کے تلوے میں

کانٹا چبھے اور اس کی چبھن یہاں ہندوستان میں بیٹھے محمد علی محسوس کریں۔ ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔'' یہ مصرع بار ہا سننے میں آیا تھا اور دل ہمیشہ اسے نری شاعری سمجھا۔ محمد علی کی زندگی نے سمجھا دیا کہ شاعری کبھی حقیقت مجسم بن جاتی ہے۔ لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے، خاطریں کرنے کے حریص تھے۔

اور زندگی کا ثبوت بہت سے زندوں سے بڑھ کر دیتے رہے لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ نہ پنپنا تھا نہ پنپے۔ ہنستے ہیں، بولتے ہیں، گرجتے ہیں لیکن اندر ہی اندر جلتے گئے، پھکتے گئے، پھکتے گئے۔ مذہب کے دیوانے تھے۔ پروردگار سے عشق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ قرآن پڑھتے تو قرآن ہی کے ہو جاتے۔ جب اس مضمون آیتیں آتیں کہ منافقوں کو دیکھو کہ بجائے اللہ کے یہ اللہ کے بندوں سے ڈرتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور بار بار ان آیتوں کی تکرار کرتے۔ اِنَّ الحکم اِلّا للہ تو گویا تکیہ کلام تھا۔

۴؍اور ۵؍جنوری ۱۹۳۱ء کو درمیانی شب میں جو مسلمانوں کے یہاں پندرہویں شعبان کی متبرک رات تھی۔ جب روئے زمین کے مسلمان بڑے ذوق و شوق سے جان کی اور ایمان کی، دنیا کی اور عقبیٰ کی دونوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے مشیت الٰہی نے ان سے یہ نعمت واپس طلب کر لی۔ شاید اس لیے کہ محمد علی کے اہلِ وطن، اہلِ ملت اس نعمت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ جان لندن میں جان آفریں کے سپرد کی۔ آخری آرام گاہ کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین مقدس میں، قبلۂ اوّل کے قریب۔ جامع عمر سے متصل۔ اقبال کو الہام ہوا:

''سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت''

ماتم و شیون کی صدائیں ہندوستان بھر میں اور سارے عالم اسلامی میں اس زور شور سے اٹھیں اور اتنے روز تک رہیں کہ تاریخ میں مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

''ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے'' انھیں کا مصرع ہے اور یہ بھی تو خود ہی فرما گئے تھے:

بے شک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

○○○

علامہ اخلاق حسین دہلوی
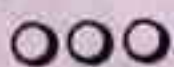
مسیح الملک حکیم اجمل خاں

مسیح الملک حکیم حافظ اجمل خاں شیدا دہلوی خاندانِ علم و شرافت کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۷ر شوال ۱۲۸۴ ہجری (مطابق ۱۱ر فروری ۱۸۶۸ عیسوی) کو پیدا ہوئے۔ خاندانی دستور کے مطابق اعلا تعلیم و تربیت حاصل کی اور شہرۂ آفاق ہوئے۔

حکیم محمد اجمل خاں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد پاک نہاد سے تھے ان کے پردادا حکیم محمد شریف خاں آخری عہد مغلیہ میں دہلی آکر آباد ہوئے، جو ماہر طبیب اور جید عالم دین تھے۔ ان ہی نے سب سے پہلے کلام اللہ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو شائع نہیں ہوا۔ حکیم محمود خاں مرحوم حکیم محمد اجمل خاں کے والد بزرگوار تھے جو نامی طبیب اور اہلِ قلم تھے، کتاب ضیاء الابصار ان کی یادگار ہے، جو شائع ہوتی رہی ہے۔

طبابت پیڑھیوں سے حکیم محمد اجمل خاں کے خاندان میں متوارث تھی جو انھیں ورثے میں ملی اور انھوں نے باکمال اور ماہر فن اساتذہ سے استفادہ کیا اور کامل دسترس حاصل کی، حتیٰ کہ وہ اپنے عہد کے کامیاب ترین طبیب مانے گئے۔ ریاستوں کے نواب و راجہ اکثر ان ہی کے زیر علاج رہتے تھے۔

حکیم محمد اجمل خاں خوش گو شاعر اور باکمال نثر نگار تھے۔ شیداؔ تخلص تھا اور جناب ارشد گورکانی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان کا دیوان پاکستان میں شائع ہو گیا ہے۔ نثر میں ان کی معروف کتاب حاذق ہے جو طب کے موضوع پر ہے اور مقبول ہے۔ ۱۹۱۷ء (۱۳۲۶ھ) سے اب تک متواتر شائع ہوتی رہی ہے۔

حکیم محمد اجمل خاں متوسط قد وقامت، خوش اندام، گندم گوں مائل بہ سفیدی رنگ، کشادہ پیشانی، بھرے بھرے رخسارے، ستواں ناک، گنجان بھنویں، متوسط دہن، بھرواں سیاہ داڑھی نہ بہت لمبی نہ بہت چھوٹی۔ انگلیاں گاؤدم، سینہ فراخ، وضع قطع دیدہ زیب اور جاذب نظر چہرے پر آثار شرافت، نمایاں سنجیدگی اور متانت نور افشاں۔

لباس میں ترکی ٹوپی، شیروانی، سیدھی موری کا پاجامہ، کبھی گورگابی زیب یا کبھی ہلکی سی کامدار سلیم شاہی جوتی، کم سخن شیریں کلام بولتے تو منھ سے پھول جھڑتے۔ ہلکے ہلکے نرم ونازک جملے منھ سے نکلتے جو دل میں اترتے چلے جاتے۔ تکلف اور تصنع ذرا نہیں، جس کسی سے ملتے خندہ پیشانی سے ملتے۔

حکیم محمد اجمل خاں اپنی عمر کی باسٹھویں منزل سے گزر رہے تھے، نواب رام پور نواب حامد علی خاں کے مہمان تھے اور ان ہی کے دولت کدے پر مقیم تھے کہ ۲۸۔۲۹ ردسمبر ۱۹۲۷ء (۲۳۔۲۴ رجمادی الآخر ۱۳۴۶ھ) کی درمیانی رات میں انھیں گولی کا نشانہ بنایا اور وہ اللہ کو پیارے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس اطلاع سے ملک بھر میں غم کی لہر دوڑ گئی، اور صف ماتم بچھ گئی۔ تعزیتی جلسے منعقد ہوئے، خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ملکی اور غیر ملکی اخبارات نے کالم کے کالم لکھے مگر یہ بھید نہ کھلا کہ ایسا کیوں ہوا اور کس نے کیا؟ میت کو دہلی لایا گیا، نماز جنازہ میں دلّی والوں نے بہ کثرت شرکت کی اور ان کی پشتینی ہڑواڑ درگاہ سید حسن رسولنماؒ (پنچکوئیاں روڈ) نئی دہلی میں دفن کیا گیا۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے اور مراتب بلند کرے آمین۔

(۲)

حکیم محمد اجمل خاں گوناگوں اوصاف سے مالا مال تھے۔ انھیں قومی وملی اور ملکی وعلمی مشاغل سے گہری وابستگی تھی۔ وہ آزادئ ملک کے دل دادہ اور رہنمایان ملک وقوم میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے معزز رکن تھے۔ صدارت کی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں ان ہی کا گھر ملکی رہنماؤں کی اقامت گاہ تھا۔ مہاتما گاندھی، علی برادران، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد نیز دیگر ممتاز رہنما ان ہی کے مہمان رہتے اور ملاقاتیوں کی آمد ورفت سے میلا سا لگا رہتا تھا۔

حکیم محمد اجمل خاں کو فن طب سے فطری لگاؤ تھا اور وہ اس کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء (۱۳۲۴ھ) میں طبی کانفرنس کی تاسیس فرمائی۔ ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں حکومت برطانیہ نے ان کی طبی خدمات کے صلے میں انھیں حاذق الملک کے خطاب سے سرفراز کیا جو انھوں نے تحریک ترک موالات کے دوران ۱۹۲۰ء (۱۳۳۹ھ) میں واپس کر دیا جس کے فوراً بعد قوم نے انھیں مسیح الملک کے معزز خطاب سے نوازا جو آخر دم تک ان کے نام کا جز رہا اور اب تک ہے۔

انھوں نے ۱۹۱۶ء میں ویدک یونانی طبیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا جس سے ویدک اور یونانی طب کے قالب بے جان میں جان پڑی۔ انھوں نے اسی مقصد سے دو بار یورپ کا سفر کیا اور کالج کے مصارف کے لیے ایک عالی شان دواخانہ قائم کیا جس کا نام ہندوستانی دواخانہ دہلی ہے، اور اس کی آمدنی کالج کے لیے وقف فرمائی۔ یہ ویدک یونانی طبیہ کالج ان کی عظیم یادگار ہے جو عظیم ہندوستان کی واحد و بے مثل اور مایۂ ناز طبی درس گاہ ہے جس سے رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔ انشاءاللہ۔

حکیم محمد اجمل خاں کو قومی و ملی کاموں سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی اسی کی بنا پر وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جیسے کتنے ہی قومی اداروں کے سرپرست اور سربراہ تھے۔ وہ رضا لائبریری رام پور سے بھی وابستہ تھے جہاں نادر مخطوطات کا انمول ذخیرہ ہے، اور وہ ان اداروں کی ممکن معاونت فرماتے تھے۔

انسان دوستی اور انسانی ہمدردی ان کا فطری جوہر تھا جو ہمہ وقت جگمگاتا رہتا تھا لیکن موقع محل سے اس کی تابندگی آنکھوں کو خیرہ کر دیا کرتی تھی۔ دہلی میں جب بھی وبا پھیلتی، اموات کی کثرت ہوتی اور گھر کے گھر بے چراغ ہوتے نظر آتے تو وہ اپنے مجوزہ نسخے کی بہت سی پڑیاں بندھواتے، اپنی گاڑی میں رکھواتے، گھر گھر جاتے، مریضوں کو دیکھتے اور انھیں دے آتے۔ اللہ پاک نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی۔ بیمار صحت یاب ہو جاتے تھے۔ ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ دہلی میں کسی مریض کو اس کے گھر دیکھنے جاتے تو نذرانہ قبول نہ فرماتے۔ یہی روش رام پور میں تھی ممکن ہے کہ کہیں اور بھی ہو۔ تاہم ان کی یہ ہمدردیاں ایسی تھیں کہ دِلّی والے انھیں دل سے چاہتے تھے۔

والد مرحوم یہ واقعہ بھی بیان فرماتے تھے کہ سردی کا موسم، کڑاکے کا جاڑا، رات کا وقت، بارہ ایک کا عمل، بازاروں میں سناٹا، وہ کسی تقریب میں شریک ہو کر آ رہے تھے۔ جامع مسجد پہنچے تو دیکھا کہ ہلکے ہلکے بگھی آئی اور جنوبی دروازے کی سیڑھیوں کے پاس ٹھہر گئی۔ حکیم محمد اجمل خاں نکلے، سیڑھیوں پر جو سکڑے سکڑائے پڑے تھے، گاڑی میں سے لحاف نکالتے اور ہر ایک کو آہستہ سے اوڑھا دیتے۔ جب سب ہی کو اوڑھا چکے تو گاڑی ہلکے ہلکے ہرے بھرے صاحبؒ کے مزار کی طرف چلی گئی۔ وہ آب دیدہ ہو کر فرماتے۔ عجب خیر کا بندہ ہے حق تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے۔

ترک موالات کی تحریک عروج پر تھی۔ ملک بھر میں قومی رہنما گرفتار کیے جا رہے تھے۔ میں نعمانیہ پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا جو بلیماران میں حکیم محمد اجمل خاں کے مکان کے قریب ہی تھا۔ دوپہر کو چھٹی ہوئی، مدرسے سے باہر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بازار آدمیوں سے بھرا پڑا ہے۔ بڑی مشکل سے چند قدم چلے دم گھٹنے لگا تو مسجد حکیم محمد شریف خاں میں چڑھ گئے اور وہاں سے یہ منظر دیکھتے رہے کہ ہر کوئی جس حلیے میں ہے دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ خالی ہاتھ کوئی بھی نہیں ہے۔ لکڑی لاٹھی، بانس، پلنگ کا پایہ، سیردا۔ پٹی، اَدھ جلی چولھے کی لکڑی لیے چھوڑو چھوڑو کا نعرہ لگاتا بھیڑ میں گھسا چلا جاتا ہے۔ مسجد میں کچھ اور اشخاص بھی آ گئے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ علی الصبح دلّی کے انگریز چیف کمشنر نے حکیم صاحب کو دلّی کے ٹاؤن ہال میں بلایا اور وہ ابھی واپس نہیں آئے۔ شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ حکیم صاحب کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ اس خبرِ وحشت اثر سے سارا شہر اُمنڈا پڑا ہے۔ کمپنی باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ چاندنی چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے مگر کوئی ٹس سے مس بھی نہیں ہوتا۔ آخر کار جب حکیم صاحب آتے نظر آئے تو ان متوالوں کی جان میں جان آئی اور بھیڑ چھٹنے لگی۔ جب چھٹ گئی تو ہم بھی کوئی دو گھنٹے بعد مسجد سے اُترے اور گھر گئے۔ رہنمایانِ قوم کی گرفتاریاں تو عمل میں آتی ہی رہتی تھیں لیکن یہ منظر کبھی دیکھنے میں آیا نہ سننے میں۔ یہ کیا تھا؟ یہ تھا دراصل حکیم محمد اجمل خاں کی اس فطری مخلصانہ ہمدردی کا ثمرہ جو اُن کی خلقت میں مرکوز تھی۔ جو آج بھی سبق آموز ہے۔ اللہ پاک ہم سب ہی کو یہ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ○○○

آغا حیدر حسن

سروجنی نائیڈو

اب جلسے کی جان روح رواں سروجنی کی بابت سنو، ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی چمپئی رنگت، کتابی چہرہ، کھڑا کھڑا نقشہ، چہرے سے متانت اور سنجیدگی ہویدا ہے مگر ساتھ ہی اس کے خوش خلق اور ہنس مکھ بھی ضرور ہیں۔ خوب گہری گہری کالی جٹی بھویں، جٹ کے اوپر چھوٹا سا خوب گہرا سرخ کسوم کا ٹیکہ۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی۔ دیکھنے میں کمزور مگر چلنے اور حرکت کرنے میں ہوا سے باتیں کریں۔ آنکھوں کے ڈھیلے ہر وقت تر و تازہ رہتے ہیں۔ پتلیاں خوب سیاہ اور بڑی بڑی جن کے چاروں طرف بڑے بڑے مڑے ہوئے سیاہ گنجان پلکوں کا جنگلہ ہے جس میں یہ وحشی ہر وقت رم کرتے رہتے ہیں۔ بھلا کہیں اس جنگلے سے یہ کالے شیرازی کبوتر رکتے ہیں، نہیں، آناً فاناً میں دور دور کے کاوے کاٹ آتے ہیں۔ بوا، آنکھیں کیا بتاؤں، غضب کی ہیں موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان سے حجاب و شرم و حیا اور عصمت و عفت پڑی برستی ہے۔ یہ دیکھ لو کہ شہر شہر ملک ملک اکیلی پڑی پھرتی ہیں، ہزاروں لاکھوں مردوں میں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ چاہیے تھا کہ دیدے کا پانی ڈھل جاتا مگر نہیں؟ آنکھ میں وہ حیا ہے کہ بعض بے حیا مردوں کی طرف اٹھتے ہی ان کو بھی حیادار بنا دیتی ہیں۔ یہ باہر کا پھرنا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ گھروں کی چار دیواری کے اندر پڑے پڑے پردوں میں گردے لگائیں اور نہ بی بی ہم نے حاشا اللہ حاشا رحمٰن کوئی ان کی ایسی ویسی بات سنی۔ متناسب اعضا ہیں، چھب تختی بڑی پیاری ہے، جس کے سبب جامہ زیبی اور پھبن غضب کی ہے، کان موزوں ہیں،

اور لویں نیچے کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ جھکی ہیں، بال بڑے گھنے دار کالے بھونرا سے ہیں اور انگریزی موجودہ طرز کے موافق کنپٹیوں پر جھکا کر اور کانوں پر سے لے جا کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کالی کنگھیاں لگائی گئی تھیں جن میں ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید نگ جڑے ہوئے تھے جو مہین بنارسی ساڑی کے اندر سے پٹ بیچوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے۔ بالوں کی وضع تھی تو انگریزی مگر ہماری محمد شاہی پٹیوں اور سادی بریوں سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے۔ بائیں رخسار پر ذرا کچھ اوپر ہٹ کر ایک ننھا سا ہلکے سیاہ رنگ کا تل ہے کہ جب ہنستے وقت گال اوپر کی طرف بڑی خوب صورتی سے تلاطم پیدا کرتے ہوئے چڑھتے ہیں تو شامت زدہ آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیدھے رخسارے میں ہلکا سا گڑھا پڑتا ہے جس کی بابت دلی والیوں کا خیال ہے کہ ساس پر بھاری ہوتا ہے۔ چوکھٹا موزوں، برابر برابر۔ جمی ہوئی خوب چمکتی ہوئی بتیسی جیسے بحرین کے موتی، ہونٹ جو ہنسنے اور مسکرانے میں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور پھر کچھ وقفے کے بعد مل کر بالکل وابستہ ہو جاتے ہیں پتہ دیتے ہیں کہ یہ عورت بڑی برداشت اور تحمل کی ہے۔ رکھ رکھاؤ اور اپنے تئیں لیے دیے رکھنے کا بڑا مادہ ہے۔ کوئی راز کی بات کہہ دو تو گویا کوئیں میں ڈال دی یا یوں سمجھ لو کہ وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہم نے آج تک کوئی چھچھوری، پوچ، بے ہودہ اور لغویات اپنے میں سے باہر نہیں جانے دی، پہلے ہم ساکنانِ دل و دماغ کا جھاڑا لیتے ہیں پھر نکلنے دیتے ہیں۔ خوب صورت ٹھوڑی جیسے بنارسی لنگڑے کی کیری، مورنی کی سی گردن، گول سڈول بازو، چپٹی لمبوتری سانچے میں ڈھلی بانہیں، اچھی گول گول نازک کلائیاں جن میں پھنسی پھنسی چمکتے ہوئے زبرجدی رنگ کی جاپانی ریشمین چوڑیاں، بیچ میں نیم کے پھول کے بمبئی کی جلادار اشرفی کے سونے والی چوڑی اور پھر ریشمین چوڑیوں میں ملی ہوئی ادھر اُدھر ایک کے بعد ایک، بائیس کے درو والی وہی سرخی لیے اشرفی کے سونے کی پتلی پتلی نگنیں لگی ہوئی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ گلے میں ست لڑے کی سی وضع کی کنٹھی تھی جس میں جگنی کی جگہ یاقوت کی آواز دار جڑائی کا چاند اور پکھراج کی جڑائی کا تارہ سا لگا ہوا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے چھوٹے چھوٹے بندے تھے جو بجلی کی روشنی میں حرکت کے ساتھ بڑے جھمر جھمر کرتے تھے۔

بیگم نیڈو کے کانوں کو دیکھ کر اللہ بخشے دڈا سو بھایاد آ گئیں جو کہا کرتی تھیں کہ اے ہے! عورت کا حسن ہی کیا جو اوپر کے سب کان نہ چھدے ہوں۔ نرے نیچے کے ایک ایک یا دو دو کان چھدے ہوں تو عورتیں لگتی نہیں۔ خاصے بھانڈوں کے ساتھ ناچنے والے لونڈے معلوم ہونے لگتی ہیں۔ صورت ہی نہیں نکلتی جب تک کہ نرم نرم کان گونٹی کی طرح نہ جھکے پڑتے ہوں اور جو بیویاں مارے نزاکت کے گہنا پاتا نہیں پہنتیں تو لوگو! چاہے مجھے کوئی بدشرم کہے یا بے حیا اس بندی کو وہی میاں مراد کے چوتڑ جیسے چاند سادہ سادہ روڑھا روڑھا منھ لگنے لگتا ہے۔ چاہے کتنا ہی گورا چٹا کیوں نہ ہو۔ خصم بھی بات کرتے لجیائے، موئے ہم زاد کا دھوکا کھائے۔ اللہ غریق رحمت کرے کیا اگلے لوگ بھی تھے اور کیا تھے ان کے خیال۔ بیشتن کسی کو بھی ذرا ہلکا ہلکا سا زیور پہنے دیکھ لیتی تھی تو کوئی نہ کوئی چوٹ ضرور ہی کر دیتی تھی اور ہم بہنوں میں سے تو اگر کوئی ذرا بھی گھبرا کر ایک بھی چیز علاحدہ کر دیتی تھی تو ہماری جان سے دور، چار بار پنجتن پاک کا قدم درمیان، بے چاری کی ارواح نہ شرمائے، بلا کی طرح ہاتھ جھاڑ کے پیچھے پڑ جاتی تھی اور جو نہ کہنی تھی وہ کہہ سناتی۔ خیر بے چاری، اب ہم سے اچھے لوگوں میں ہے۔ اللہ داں کی اچھی بنائے یاں تو اچھی کاٹ ہی دی۔ کہتے ہیں کہ مر کے پاؤں پھیرے اس نے تو مر کے بھی پھیرہ دیا۔ یاد ہوگا۔ شتابو کی اس رات کیسی گھگھی بندھی تھی اور کیسی چیخی چلائی ہے اور پوچھتے تھے کہ اری مردار بتا کیا آفت ہے سر پہ میراں آئے ہیں یا موں اللہ بخش چڑھ بیٹھے ہیں، کوئی مچھل پھری دیکھی یا تیرے میرے پیاروں نے آٹیوا دبایا۔ کچھ جواب نہ دیتی تھی۔ بیری کی طرح تھر تھر سر سے پاؤں تک کانپتی تھی، بات کرتی تو منھ سے پورے لفظ نہ نکلتے، آخر جب خالہ مغلانی نے قرآن شریف کی، واری جاؤں نام کے، ہوا دی اور استانی جی نے پنج سورہ اور لعل خاں ڈیوڑھی بان کی ماں نے لایلاف پڑھ کر دم کیا، جب قطامہ کے اوسان درست ہوئے، منھ سے پھوٹی کہ منجھلی سرکار اللہ میری خطا معاف کریں مجھ سے بڑی چوک ہوئی۔ حضرت بی بی کے بچوں کا صدقہ درگزر رو۔ جب اماں جان نے بگڑ کر کہا شغل صدقے واسطے ہی دلائے جائے گی یا کچھ کہے گی بھی، تو کس طرح چبا چبا کے کہا ہے کہ سرکار عالیہ، میں نے منجھلے سرکار کی گردے کی جڑائی والی، ہیرے کی آرسی صبح فجر

ہی نور ظہور کے تڑکے چھوٹی مہتابی والی صحنچی میں سے جب سلفچی آفتابہ اور لال کھاروے کا
زیر انداز اٹھانے گئی یہ نگوڑی اندر سہارات کو عشا کے بعد وہیں بھول آئی تھی۔ تھا تو سویرا ہی،
میرا کلیجہ بھی کھرچ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ دیکھوں پچھرات کا بچا کھچا گنجینے میں دھرا ہو تو لے
جا کر برتا دوں۔ ناگہانی ہونی شدنی کلنک کا ٹیکہ لگنا تھا اُٹھالی، میرا اللہ گواہ ہے جو کوئی بھی
نیت میں خلل ہو۔ ادھم اس کی بچے ہی گی اور حافظ جی بدھنی کی فال کھولیں گے دیکھوں کس کا
نام نکلتا ہے۔ ستو جی کی بیٹی کس کا حلیہ بتلاتی ہیں، حضور یہاں سرکاریں ایسی بے پرواہ ہیں کہ
کسی نے پلٹ کر سدھ بھی نہ لی۔ جھٹ پٹے کے وقت سے مجھے خیال ہوا کہ کچھ ذکر نکالوں
اس کی بابت، پھر میں نے کہا کہ مجھے چپ ہی سادھ لینی چاہیے، دوسرے مجھے ملمع تولنا تھا
اور مودی خانہ میں رکھنا تھا ادھر نانی فتن نے سارا محل سر پر اُٹھالیا کہ لوگو! غضب ہے جس
سرکار، دربار میں یہ پر تھمی کی پر تھمی بھری ہو۔ ہتھیلی کا پھپھولا نہ پھوڑیں۔ ہلکے پانی نہ پئیں۔
نگوڑے سب کے سب بادشاہی احدی ہو گئے کہ ہلاؤ نہ جلاؤ ٹکڑے مانگ کھلاؤ۔ کھائیں
اور مگرائیں۔ کرموجلیاں انعام اکرام کے وقت تو کیا کیا پل پل کے دشمنوں، بیریوں کی
جان پر آتی ہیں، ایک ہے کہ اپنا حق خدمت جتاتی ہے، بھلا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے، کوئی
رویہ ہے، کوئی قرینہ ہے کہ دونوں وقت ملنے کو آئے اور جنس اب تک باہر نہیں گئی۔ اب بھلا
کس وقت وہ نمانا کرموں بندہ جنس سنبھالے گا اور کب پکار یندھ کر فارغ ہوگا۔ پھر وہی
مدعیوں کی جان پر سر شام ہائے ہائے ہوگی، یہ معصوم معصوم پھول سے بچے خالی انتڑیوں ان
نمک حراموں کی جان کو دعا دیتے ہوئے آرام کریں گے۔ اسی طرح نواب کہ جس کے
دم کی ساری راون بھاون ہے۔ ان مستانی کے کلیجے میں چھری کٹاؤں ڈالنے کو وقت سے
بے وقت کھانے کے مارے بھوک ماری جائے گی۔ بس کچھ یوں ہی ساجھی جم کھائیں گے۔
ان مال زادیوں کے گہرے ہیں، سارا اُلش انھیں غیبانیوں کے تلڑ میں گھسے گا۔ سرکار عالیہ
میں جلدی جلدی جنس تول جھونک فرخندہ کے ہاتھ باہر باورچی خانہ میں بھجوا، نانی فتن کی
پھپھا پھپھا اور تھوک پیک اڑتے دیکھنے چھوٹی سہ دری میں چلی گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر اور تیز
ہوئیں اور آئیں تو جائیں کہاں، ایک ایک گالی سوا سو من کی دے ڈالی اور میں جب ہنسی اور

ہنستے ہنستے لوٹ گئی پیٹ میں بل پڑ گئے تو اور بھی آپے سے باہر ہوئیں۔ پن کٹی ہنچ ناک کے بانسے پر عینک کو رکھ اور اس کے ڈوروں کو پیچھے چٹیا کی طرف کھسکا، لکڑی ٹیکتی اٹھیں کہ بھلا رہ تو سہی خام پارہ میں خود نواب پاس چھوٹی محل سرائے میں جاتی ہوں اور قسم ہے مجھے تیس دھار دودھ کی جو نواب پر نثار کیں اور طلاق ہے اس بندی کی جنتی پر جو تیری پوری طرح کد بدیا نہ بنوائی۔ ٹھیر جا بڑی چر بیا گئی ہے۔ ابھی آن کے آن سد ھروائے دیتی ہوں۔ میرا بھی فتح النسا نام نہیں۔ اپنے نام کی میں بھی ایک بندہ بشر ہوں کسی مغل کی نہیں چمار کی جنی کہیو جو تیرے سارے مغز کی گرمی نہ چھٹوادی۔ وہ رسیوں سے بندھوا سائیسوں سے جوتیاں نہ لگوائی ہوں کہ تو بھی کدھی کو یاد کرے۔ لنکا کہیں کی چوٹی، جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ کی شہدن، اڑوا بیگنی۔ ادخو کیا کیا تھرکتی ہے۔ کیا کیا کلیس توڑتی ہے۔ بوٹی بوٹی پڑتی ناچتی ہے۔ خاک پہ بسم اللہ، اللہ نے دیکھ کے ہی پنچا ہے۔ دیکھتی جا وہ چار چوٹ کی مار پٹواؤں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے، کھڑی پڑی کہروانا چے۔ اب تو ہی اس گھر میں براج لے یا میں رہ لوں۔ سرکار عالیہ! نانی فتن نے سرکار حضور سے شکایت کی دھمکی دی، میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ زمین کے سرے ٹٹولتی تھی۔ نانی فتن کے آگے ہاتھ جوڑے، توبہ کی، ناک رگڑی، اللہ رسول کے واسطے دیے، ہزاروں خوشامدیں درامدیں، منت سماجتیں کیں تب کہیں خدا خدا کر کے ان کا جوش اُترا، غصہ ٹھنڈا ہوا، نرم پڑیں، پسیجیں، چھوٹی حویلی میں تو نہ گئیں مگر ہاں بڑ بڑ بوڑ گھنٹوں کرتی رہیں۔ پھر میں اُٹھ درے میں خالہ ہمؤ کے پاس جا بیٹھی، چھالیہ کترا ایک زردے کا ٹکڑا کھایا اتنے میں خاصے کا وقت آیا، مکھو پٹڑچن بھنگی سنبھال پتیلیاں لینے ڈیوڑھی پر گئی۔ میں نے شیدی کو چھلکوں کا آتار کوانے باہر دوڑایا۔ اور خود چچی رحمت کے پاس کھانا اتروانے نعمت خانے کے قریب جا بیٹھی۔ وہاں کچھ بیٹھے بیٹھے نیندی آئی۔ سوچی کہ تو نے ابھی صبح کے خرچ کو صراحیاں آب دار خانے میں سے نکال کر بجھیروں پر نہیں دھری ہیں۔ اس کام سے نچنت ہو کر سو رہوں گی۔ اتنی بھی ہمت نہ پڑی اپنے حصے کی روٹی اور تصرف کا سالن دادی دلین کی پوتی سے لے لینے کو کہہ، اور اس سے آب حیات کو نکالنے اور بجھیروں پر رکھنے کو جتا، جا کر پڑ رہی۔ سرکار عالیہ! ذرا کی ذرا ہی آنکھ جھپکی ہوگی دیکھتی کیا ہوں کہ ایک بڑھیلا منہ میں

دانت نہ پیٹ میں آنت آئی اور میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ بہتیرا اسے دونوں ہاتھوں سے ہٹاتی ہوں، پاؤں بھی مارتی ہوں، دھکیلتی ہوں مگر وہ مریم سے ٹلیم نہیں ہوتی۔ آخر اسی ہشت مشت میں اس نے میری گردن کی طرف ہاتھ بڑھا مونڈھے پر رکھ دیا اور کہا کہ چھوٹی چنبلی میری بچی کی آرسی ابھی اس کے حوالے کر ورنہ مونڈیا مروڑ کر رکھ دوں گی۔ سرکار میرا لہو خشک ہوگیا، چیخنے کی کوشش کرتی تو آواز نہ نکلتی۔ پھر میری آنکھ کھلی تو آپ لوگوں کو دیکھا۔ لیجیے یہ رہی آرسی۔ یہ کہہ نیفے میں سے نکال کر حوالے کی۔ نانی حضرت بڑی ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں ذوف ہے، لعنت ہے تجھ پہ خدا کی، دیکھا مردار چرانے کا مزا۔ وہ بے غیرت، دھویا دیدا، چکنا گھڑا، بوند پڑی پھسل گئی، بیٹھی ٹھی ہنستی رہی۔ ہم لوگ تو پھر چلے آئے۔ صبح اس نامراد نے بے چاری دداسو بھا کی فاتحہ مچھلی کی دھوون، ماش کے بڑوں اور انڈوں پر دلوادی۔ اس روز سے پھر کسی کے خواب میں نہیں آئیں مگر دیکھو پھیرا مرے پر بھی دیا۔ میری کوئی چیز ادھر سے اُدھر، جا سے بے جا ہوئے یا ذرا بھی میں آنکھوں سے اوجھل ہوجاؤں بس دیوانوں کی طرح سڑی سودائیوں کی طرح ہو جاتی تھی۔ اے ہے دیکھو! اچھوں کی یاد مرنے کے بعد بھی ہوتی ہے۔ سچ ہے چاند پیارا نہیں کام پیارا ہے۔ لو میں نے بھی بات کہاں سے کہاں لاڈالی۔ کہاں بیگم نیڈو کا سراپا کہاں ان کی جان سے دور دداسو بھا کا رونا صورت اور زیور سے تو آشنا ہوگئیں اب لباس اور جو باتیں ان کے متعلق رہ گئی ہیں سب آگے چل کر بتائے دیتی ہوں۔

کنائے دار ہلکے موتیائی رنگ کی بنارس ساڑھی۔ کنارے پر دھنیے کی بیل اور متن پر برف کی بوٹیاں پڑی تھیں۔ چولی مرہٹی تراش کی تھی جس کی آستینیں خوب پھنسی پھنسی آدھے بازوؤں تک تھیں۔ چولی کا کپڑا بنارسی تھا جس کی زمین پہ پاس پاس گلاب اور مہوے کی سنہری بوٹیاں پڑی تھیں اور اس پہ کنارہ جو لگایا تھا وہ بھی بنارسی۔ جس کی بیل خدا جانے کس قسم کے جال کی تھی، لیکن چولی کا رنگ اور نکائی ساڑی ہی کے جواب کی تھیں۔ ساڑی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف خوب اچھا میٹھا جھول دیا ہوا تھا۔ لیکن اوڑھنے کا سرا معمولی ساڑھیوں سے بڑا تھا جس کے آنچل کو اُلٹے کھوے پر مہین مہین چنٹ دے کر اور

پھول سوئی اٹکا کر سر پر سے لے جا کر پیچھے نیچے تک لٹکتا چھوڑ دیا تھا۔ جس سے بچھانے کی ڈھکن بڑی خوبی سے ہوگئی ہے اور بمبئی کی عام ساڑیاں جو پارسنیں باندھتی ہیں کہ پلو کا ایک سرا لے کر دائیں پہلو کی لپیٹ کے بعد گائی کے نیچے سے بائیں پہلو کی طرف اڑس لیتی ہیں اور دوسرا سرا پیچھے سموسہ نما لٹکا رہنے دیتی ہیں۔ اس میں وہ بات نہ رہی تھی (یعنی پیچھے سموسے کی طرح نہیں لٹکتا تھا) بلکہ دونوں سرے پیچھے ہی لٹکے ہوئے تھے۔ کان کے پاس کچھ سرگاہ کے آنچل کی جھوک تھی۔ جس کو سروجنی صاحبہ اکثر بولتے وقت عجیب انداز سے دائیں کان اور ہنسلی کا سرا ڈھانکنے کے لیے بڑی پھرتی سے جھکا لیتی تھیں جو پھر حرکت سے آہستہ آہستہ کھسک کر پیچھے ہٹ جاتا تھا اور پھر وہ چٹکی سے پکڑ کر آگے کھسکا لیتی تھیں۔ پاؤں میں پیر سے اونچی ایڑی کی سیاہ بیگمی جوتی تھی۔ جس وقت یہ تقریر کرنے کھڑی ہوتی ہیں اس وقت کا عالم بیان سے باہر ہے۔ آواز میں ایک خاص قسم کی لرزتھی جو دلوں میں لرزش پیدا کرتی تھی۔ کبھی تو آواز رساں رساں اوپر چڑھ کر مہاوٹ کے بھورے بھورے بادلوں کی سی گرج پیدا کرتی تھی اور کبھی آہستہ آہستہ نیچے ہو کر ساون بھادوں کی باجرا پھوار کا مزا دیتی تھی۔ اور کبھی ایک جگہ قائم ہو کر سننے والوں کے دلوں کی متحرک موجوں میں چاند کے غیر مستقل عکس کا مزا دے جاتی تھی۔ یا یہ معلوم ہوتا تھا کہ گل مشکی کے تختے میں سونے موتیوں کا ہزارہ چھوٹ رہا ہے۔ جس کی صدہا پتلی پتلی دھاریں لب کے پاس ایک دوسرے سے بہت ہی قریب قریب ملی ہوئی نکل کر اور اوپر پھیلتی ہوئی اور ایک دوسرے سے دور ہوتی ہوئی اور پھر ایک خاص قسم کی محراب بنا کر پھولوں کی نازک نازک کالی پنکھڑیوں پر گر کے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر اور اپنی چمک دکھا کے چھوٹے چھوٹے موتیوں کی ٹوٹی ہوئی لڑیوں کی طرح تختے میں چاروں طرف بکھر جاتی ہوں۔ جس وقت وہ جوش میں آن کر سر کو حرکت دے کر گردن کو اکڑاتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ بارش سے دھلے ہوئے ہرے کچھن سے جنگل میں ہرنی ہوا کے رُخ کھڑی کستوری کی بو لے رہی ہے۔ لفظوں کو پُر زور اور پُر اثر بنانے کے لیے جب وہ مٹھیاں بھینچ کے اور ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کے جو اکڑاتی تھیں اور جھومتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ سطح آب پر کنول کی تیرتی ہوئی بیلوں میں جل پری راج ہنسوں کے ساتھ کھڑی اٹھکھیلیاں

کر رہی ہے۔ پھر خاتمہ تقریر کے بعد ان کا ایک دم فوراً ہی بیٹھ جانا اور دیوان میں تالیوں کا شور اور حاضرین کی چہ مگوئیوں کا غل بالکل جل پری کے کھیلتے کھیلتے دفعتاً غوطہ لگا جانے اور جل کوؤں کے شور وغل کے مانند تھا۔ یا ان کا جھومنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہری ہری دوب کے جنگل میں چاندنی چمک رہی ہے اور ہوا کے جھونکے سے ہلتے ہوئے پتوں کی اوٹ میں پٹ بیجو کی چاندنی کے سامنے مدھم مدھم چمک میں ایک دور کسی چٹان پر بیٹھے ہوئے گڈریے کی بین کی آواز پر کیچلی پھاڑ کر نئی نکلی ہوئی ناگن کا پھن پھیلا کر کھیلنے یا کسی گاؤں سے رات کے سناٹے میں پونگی کی آنے والی لہر پہ لہرا لینے کے مانند تھا اور پھر بولتے بولتے آناً فاناً میں کچھ جسم کو ڈھیلا چھوڑ کے کرسی، جو جگہ کی تنگی کی وجہ سے پیچھے ہٹائی گئی تھی تاکہ انھیں کھڑے ہونے میں سہولت ہو اور اس کا ہٹایا جانا انھیں یاد نہ رہا تھا، ایک پاس ہی پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھ جانا۔ لہرا بند ہونے پر ناگن کے پھن سکیڑ کے پتوں پہ سے اوس چاٹنے کی طرح تھا۔

اور ہاں جب ہمارے کالج کے مشہور شاعر سہیل صاحب نے فارسی کا قصیدہ پڑھا ہے، اس وقت بیگم نیڈو کی پتلی پتلی انگلیاں خود بخود تال سر کے ساتھ کرسی پر، جس پر وہ بیٹھی تھیں، پڑنے لگیں۔ ایک تو قصیدے کے الفاظ ایسے تھے کہ جن کے ادا کرنے میں خود بخود ایک راگ کی سہاؤنی آواز نکلتی تھی۔ پھر لفظ بڑے فصیح شان شوکت کے، بندشِ انوری اور قاآنی کی بندش سے پالا جمائے۔ سونے پہ سہاگہ سروجنی صاحبہ کی انگلیوں کی حرکت نے غضب کا سماں باندھ دیا۔

اچھی۔ کہوگی تو سہی کہ دوئی سب کی صورت بتائی لیکن سہیل صاحب کی بابت کچھ نہ بتایا۔ لو سنو، ایک مٹھی بھر کا سوکھا سہما مردوا، ہڈیوں کی مالا، مرزا منحنی، ہلکا پتا پھوک سے کوسوں دور جائے۔ بنارس کے پاس جو اعظم گڑھ ہے جہاں کے شبلی مرحوم رہنے والے تھے وہیں کے یہ بھی رہنے والے ہیں۔ ان کی شاگردی کا بھی انھیں شرف حاصل ہے، مگر بڑے میاں کی ارواح بھی ایسے قابل آدمی کے شاگرد ہونے پر ناز کرتی ہوگی۔

اے ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ جس وقت سروجنی صاحبہ بول رہی تھیں تقریر ساری انگریزی میں۔ اور انگریزی وہ زوردار کہ خود انگریز منھ تکیں کہ یا اللہ کوئی رحمت کا

فرشتہ ہے یا آزادی کا کھڑا بول رہا ہے۔ سارے لوگوں پہ وہ سناٹا جیسے اگن چھکے اور سارے پرند چپکے ہو کر بیٹھ رہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ چل تو نے تو کئی دفعہ سنا ہے آج اور سننے والوں کا تماشہ دیکھ۔ اب میں نے جو لوگوں کی طرف آنکھیں دوڑائیں، کسی کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں اور کسی کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ایک انگریز ذرا موٹا سا، سرخ سرخ لال چقندر سا رنگ، زرد زرد دانت نکوسے، منھ پھاڑے ایسا مبہوت ہو کے بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں کو سانپ سونگھ گیا۔ اے ہے کچھ عجیب ہی بے چارے کی صورت بن کے رہ گئی تھی کہ دیکھے سے ہنسی آتی تھی۔

○○○

کندن

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے۔

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا، معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۳۰۔۳۵ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدّت ملازمت ختم کی، یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹہ بجاتے چھوڑا۔ گھنٹے کی آواز روزمرّہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو، جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔

کئی دن بعد کسی نے بتایا کہ کندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا۔ ارے کندن مر گیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسبِ معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مر گیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا۔ پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں، نظامِ فطرت میں اس سے زیادہ ناقابلِ التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بیزاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر ہونا نظامِ فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا

حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی ''تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سبی!''

کندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آجاتیں۔ ترکی ٹوپی سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف، امیر غریب گھرانوں کے خوب رو، خوش اطوار، ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بہ قولِ انشا:

''ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن''

ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی اُمیدوں اور اُمنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا۔ پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقررہ وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا، وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آجاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا — کندن! کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لیے نہیں، جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لیے۔ ہمیشہ جواب دیتا، بجور فلاں گھنٹہ، چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلّم ہو، یا کلرک، اس کے بجور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنع کی گراوٹ نہیں۔

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا، کتنوں کو چھوٹا، کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس 30-35 سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور، ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے، نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں: ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود و معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مرگیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ زِ زُہد ہیچو توئی زُفسق ہیچو منی! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی، تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے۔ جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی۔

O

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹنٹ اور کواڈر ینگل (کچی پکی بارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈر مقرر کیا اور چھپیرا (ایک بڈھے مہتر) کو لانس کارپول Mirza Akhtar Husain's own Fussiliers (مرزا اختر حسین اون فوسیلیرس) کے لقب سے اور عوام میں کندن کی سفر مینا کے نام سے مشہور ہوئی۔ امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب، کندن اور یہ سفر مینا پلٹن ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی۔

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے جن کے لیے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے، جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہوجانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرے تو اس کے اونچے برآمدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے، کوٹ کے اوپر کی جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا رکھتے۔ ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے، بغل میں طرح طرح کی فائلیں اور کاغذ کے پلندے۔ ڈیسک یا کرسی پر، یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دیے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیے۔ زینے پر کندن، اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی سفرِ مینا "جاروب بدست و کھریا در بغل" اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسے آج کل سلامی دینے کے لیے کوئی نیتا کھڑا ہو اور دوسرے حسبِ مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن، سفرِ مینا کے ایک حصے کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہو جاتا۔ دوسرا ڈیچ منٹ (Detachment) اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا۔

○

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا۔ یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں، لیمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔ اس کا حساب کندن رکھتا تھا اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے ادا کرتے تھے۔ ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔ مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورتِ حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی، اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا، مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی قدر شوخ تھا، کہنے لگا۔ جو اطلاع کرتا تو پہلے.... صاحب کے گھر والوں کو کرتا، آپ کو کرنے سے کیا پھائیدہ تھا! مرزا صاحب نے فوراً اس واؤچر پر بھی سرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لیے یہ رعایت ہمیشہ کے لیے اٹھالی:

چو از قومے یکے بے دانشی کرد!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحوں کے لیے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیاں بنائی جاتی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے، ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا، جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابانِ اودھ کے ہاں وثیقے دار ہوتے تھے، اسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے، یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیے جاتے تھے۔ بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوسِ شاہی کا یومِ تقریب، دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی، عظمت الٰہی زبیری کے عہد رجسٹراری تک برقرار رہی، اس کے بعد یہ قصّہ ختم ہوگیا۔ کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہنچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔ کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا کیوں کندن مرزا صاحب کے حضور ہماری کارگزاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا؟ تول ٹھیک ہے؟ کہتا، ہجور بالکل ٹھیک ہے، کھاتر جمع رکھیں۔ ایک دن کندن کی عمل داری میں سے گزرا۔ نئی کاپیوں کے لیے پرانی کاپیاں پھاڑی جارہی تھیں۔ پوچھا، کندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا؟ بولا، ہجور اب نبابی (نوابی) نہیں رہی، دوسری عمل داری ہے۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لیے نوابی زمانے والوں کے پاس آہی جایا کرو۔

○

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہوکر پٹنہ چلے گئے اور امتحانات کے لیے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصّے میں آگیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کیے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم مے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہوجاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں، جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک کندن تھا! تقریب کہیں ہو کیسی ہو، وقت کم ہو، مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گذشتہ ۳۰۔۴۰ سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے۔

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف سُتھری تقریبیں ''صلائے عام'' کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں، میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید کہیں

اور، اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کہ یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا بُرا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی یا خرابی کا نمایاں وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کرلیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بڑے عہدے داروں کی ایک اہم صفت اور ان کے ثباتِ صحت وحواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ایک ہفتے تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد ونوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخ رو رہے!

کسی شعبے یا شعبے کے کس کمرے میں کتنے ڈیسک اور کرسیاں ہیں، کس حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ گئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں، اس کی خبر جتنی کندن کو تھی، خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی قلت، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی، ان سب سے نبٹنے کے لیے کندن کی "ایک شخصی وزارت" کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہوسکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبے کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آجاتا کہ امتحان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈیسک مہیا کیے جاسکیں، کردیں۔ شکرگزاری کے موجب ہوں گے۔ یہ خط لے کر کندن آجاتا، پوچھتا، کندن کیسے ادھر آنکلے؟ "حضور امتحان نہ ہے، کرسی ڈیسک چاہئیں۔" "بھئی یہ ہمیشہ کا دھندا ہے۔ اس میں ایسا پوچھنا کیا؟ میاں خاں (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اُٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈیسک اسی طرح کمرے میں قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبے کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سے پہلے اس پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا لیکن کندن کی پہچان اور انکل کو کیا کہیے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے

گھرانوں (شعبہ جات جن کی امانت اور نگہ داشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہو گیا یا کسی کو اغوا کر لیا گیا!

کنووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہو کر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لیے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے، جس طریقے سے جیسی گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے، چائے کے لیے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے انتظام، تین گھنٹے کے اندر اندر، اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صحیح ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے، جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ رات گئے تک یہ "ہنگامۂ شعر و سخن" برپا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز اور کرسیاں حسبِ معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے۔

جلالۃ الملک شاہ سعود اور اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کے اوقاتِ ورود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں رکھا گیا تھا جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالی شان عمارت کھڑی ہے۔ یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ، دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا۔ دونوں تقریبوں میں حسبِ معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصے میں منتقل کر کے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیا کو حسبِ منشا میزوں پر چُن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسبِ معمول اس

خوش اُسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دست گاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دُشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اُسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا مؤکل قبضے میں ہو۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا، وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ چیخ پکار، نہ دوڑ دھوپ، نہ تو تکار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے، جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھ کام کرنے والوں کا جتنا پکا تعاون کندن کو حاصل تھا، کم دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبران اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا۔ اس کا کسی شعبے میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیے۔ اس کے کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا، اس کی کون نہ مانتا۔

○

میرا خیال ہے، کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا لیکن اس کی انکل اور قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ اس پر کامل بھروسا نہ ہو۔ کندن کی ایمان داری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کے نہیں دوسرے غیر سرکاری نیم سرکاری اور پرائیویٹ کام

بے تکلف سپرد کر دیے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سینٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آکر بتایا کہ سائیکل کوئی اٹھالے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی۔ لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہو گئی اور بس۔

امتحان کی کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے کے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا۔ یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر اُدھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے، کبھی انکار کیا کبھی ٹالنا چاہا۔ بالآخر کندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی بہ درجۂ مجبوری وہ یہاں اپنی سفرمینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا۔ اور کہا کہ پارسل گھر لے چلو میں خود تلاش کر لوں گا۔ یہ آفریا چیلنج ان کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جا کر پارسلوں کے جنگل میں اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا۔ ایک ہی طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے اوپر نیچے گڈمڈ رکھے ہوں گے۔ ان میں سے کندن کا اپنے پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبھے کی بات ہے۔

۱۹۴۷ء کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل و غارت گری کی جیسی ہولناک خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوسی اور درماندگی کا جو عالم تھا، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اُس زمانے میں یہاں تھے۔ کندن کا مکان دودھ پور میں تھا جو یونیورسٹی سے ملا ہوا، ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کندن سے دوچار ہونے کا اتفاق

ہو جاتا، پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابہ ہوتا رہے گا؟ گاؤں میں کیا خبر ہے؟ کندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو، کہتا: ''ہجور کالج پر سید صاحب کی دعا ہے۔ سب کھیریت رہے گی۔ کالج کا بڑا نمک کھایا ہے۔ پرمیسر (خدا) لاج رکھ لے۔'' اس زمانے میں، مَیں نے کندن سے زیادہ مُضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا، جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو ''سید صاحب'' کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہو!

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے افراد دہلی گئے، ایک ایسے محلّے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آ رہے تھے۔ نہ کوئی جا سکتا تھا، نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے، وہ بیان سے باہر ہے۔ اس واقعے کا علم کندن کو ہوا تو اُس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا۔ لیکن اُس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کرنے کے بعد بے محابا دہلی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقل مندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا، اس کا ذکر اُس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا، وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب اور کہاں کیا گزری۔

کندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے، ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں۔ چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہیے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا۔

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں یہ صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کندن کو دودھ پور کا راج پرمکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کندن چپکے چپکے راج پرمکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا: ''ہجور یہ لڑکے ہیں نہ، جب چاہیں خود راج پرمکھ بن جائیں، جب چاہیں دوسروں کو بنا دیں۔ ان کا کیا؟

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دوراستے ہیں جن کے دو سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں، جن سے سید محمود اور سرسید کورٹ میں آمدورفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے میں تھی، معلوم نہیں کب سے۔ یونیورسٹی کھلی ہو، ادھر سے گزریے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو، یا آفس کا کوئی عہدے دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا، مزاج پوچھتا، کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو بجالاؤں۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری کے اس تقاضے کی بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عمل داری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں۔

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی عمر ایک خاص حد پر آکر ٹھہر سی گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قویٰ شکل وصورت اور رفتار و گفتار میں عرصے سے نمایاں کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں، وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو۔

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی ڈیل، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پائیدار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا، نہ دن دیکھتا، نہ رات، نہ سردی، نہ گرمی، نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھا ہوا، اتنی محنت نہ کیا کر، تو وہی کلمہ دُہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا۔ یعنی حجور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے۔

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی، خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ، کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عمل داری میں وکٹوریہ گیٹ سے لے کر باب اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے ۳۰۔۳۵ سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دن میں نے کہا، کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونی فارم (بھورے کوٹ)
میں خاص طور سے جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔
نپولین کو جانتے ہو کون تھا؟ بولا، میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا، ہسٹری ڈپارٹمنٹ
تمھارے سائے میں بسا ہوا ہے، کسی دن وہاں پوچھ آنا۔ ایک زمانے میں کالے کوسوں دور
ولایت میں تمھاری ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں
کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں اُلٹ پلٹ ہوتی رہتیں۔

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لیے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔
''کالج کا نمک کھانے کا'' ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا
دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا، تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنوانے کا منصوبہ
بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے
کرانے یا دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن اب تک اس حرکت
سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا۔

کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسید کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ
تنہا تمام عمر کلید بردار رہا۔ یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اُس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں۔
زندگی بھر وہ ان ہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا۔
ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ ''کالج کا نمک کھانے'' کا ایک اور
اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں
یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل
اتنے ہی محدود ہوتے ہیں! کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا۔

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے روز بروز تیزی سے بڑھنے لگے۔
اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے، ان کا بیان ہے کہ
اس تعمیر کے چکر میں کندن ادھ موا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کی بھی

پوری کردی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے، ناقابلِ تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کندن کو بچایا جاسکتا تھا۔

○

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفاشعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں، ان کو روکا جاسکتا ہے یا ان سے روگردانی کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جاسکتی تو آج یا کل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو، کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نو وارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے۔ وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا۔ یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جارہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورتِ حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم ”گذشتہ سے پیوستہ ہیں گذشتہ کا ذکرِ خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو اب تک نہ بدلی ہے، نہ کبھی بدلے گی۔

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پُرانی ہو جاتی ہے۔ یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پُرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پُرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پُرانی دنیا کی یہ بات قابلِ فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ، اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پُرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی!

○○○

رشید احمد صدیقی
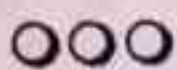
ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد

میرے دیار (اضلاع مشرقی) اور اسکول کے دنوں میں یہ خیال عام تھا اور ایسا خام بھی نہ تھا (عام اور خام کی رعایت کی معذرت چاہتا ہوں اس لیے کہ اس ہنر کا التزام ان اطراف میں بھی بہت مقبول تھا) کہ ریاضی میں مسلمان بالعموم کمزور ہوتے ہیں، جس کا سب سے نمائندہ نمونہ اپنے کو سمجھتا تھا۔ چنانچہ رسوائی اور محنت سے بچنے کے لیے ریاضی پر اتنی توجہ صَرف نہیں کرتا تھا جتنا اپنے مسلمان بنے رہنے پر۔ بڑا ہوا، زمانہ اور زندگی ہی نہیں مسلمانوں کے بھی چلن دیکھے تو معلوم ہوا کہ میرے جیسے مسلمانوں کی کمی نہیں۔ اسکول ہی میں خبر مشہور تھی، اور اس کا تذکرہ اس شوق سے کیا جاتا جیسے یہ حقیقت افسانہ ہو یا افسانہ حقیقت کہ علی گڑھ میں ایک ڈاکٹر ضیاء الدین ہیں جن کی ریاضی میں مہارت کی دھوم ولایت تک ہے۔ وہ بڑے سے بڑے عبارتی سوال زبانی حل کر دیتے ہیں۔

معلوم نہیں اب اس لفظ 'عبارتی' کا مفہوم کسی کے ذہن میں باقی رہ گیا ہے یا نہیں۔ جب ریاضی اتنی عبارتی نہیں رہی جتنے عبارتی مسلمان اس زمانے میں۔ ریاضی کے سوالات دو قسم کے ہوا کرتے، ایک کسر کے جن میں صرف ہندسے اور طرح طرح کے علامات ہوتے، دوسرے عبارت میں ہوتے جن کے ہیرو زید، عمر، بکر یا سود در سود یا مختلف سمتوں سے دو تیز آنے والی ریل گاڑیاں ہوتیں جو ایک دوسرے سے ٹکرانے کے بجائے ایک دوسرے سے پہلو بچا کر نکل جاتیں یا وہ کیڑا جو کسی ستون پر جتنا چڑھتا اس سے زیادہ ورنہ اتنا ہی نیچے سرک آتا۔ ریاضی میں جو نیاز مند تھے ان کو تھوڑی کہ ناہ کسر کے سوالات

میں مل جاتی۔ عبارتی سوالات ہم میں سے کسی کے بس کے نہ تھے۔ ریاضی کے ان مقتولین یا معصومین میں اکثر اس کا مقابلہ رہتا کہ کون کس ارتھ میٹک سے کتنے بڑے سے بڑے سوالات ڈھونڈ لاتا ہے۔ پھر فرصت کے اوقات میں اس کو اس شوق سے پڑھتے جیسے آج کل جاسوسی ناول پڑھے جاتے ہیں اس کے بعد ریاضی کے اپنے اپنے ہیروؤں کی طرح ذہن منتقل ہوتا کہ وہ اس سوال کو حل کر سکتا تھا یا نہیں۔ اس پر بہت کم اتفاق ہوتا تھا کہ کسی کا ہیرو اس سوال کو کر سکتا تھا، اس لیے یہ صحبت اکثر بدمزگی پر ختم ہو جاتی۔

لنگڑی کسر کا مفہوم یا شکل دیکھنے میں ایسی ہوتی جیسے بے شمار کنکھجورے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوں۔ کسر کے ان سوالات کا اتا پتا ہم میں ہر شخص کسی دوسرے کو بتائے بغیر ذہن میں محفوظ کر لیتا تا کہ وقت ضرورت ریاضی کے کسی سورما کی آبروریزی کی جا سکے۔ ہم کو ریاضی داں ہونے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی ریاضی کے مربی یا مفکر ہونے کی اور کیسے کیسے جتن اس کے لیے کیے جاتے تھے وہ آج تک یاد ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ولایت سے ریاضی کی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ڈگریاں لائے ہیں اور اب ریاضی کا کوئی حل طلب مسئلہ باقی نہیں رہا۔ یہ مژدہ ان ساتھیوں کو جو میری طرح ریاضی میں صفر تھے سنایا جاتا۔ منطق کچھ اس طرح کی ہوتی کہ ہم اور ڈاکٹر صاحب ایک عہد میں ہیں اور مسلمان بھی ہیں اس لیے ڈاکٹر صاحب ہم جیسے ہوں یا نہیں، ہم ان جیسے ضرور ہیں! علی گڑھ آیا اور ریاضی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو بڑی حیرت اور خوشی ہوئی لیکن اس کی تہہ میں منطق وہی تھی جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے ہم عصر ڈاکٹر گنیش پرشاد کی ریاضی کی بھی بڑی شہرت تھی، یہ کوئنس کالج بنارس میں پروفیسر تھے۔ مسلمان طالب علموں کے لیے یہ بھی عجوبہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہم میں ہر ایک چاہتا تھا کہ کسی طرح ایک نظر ان کو دیکھ لے۔ ہائی اسکول کا امتحان دینے بنارس جانا ہوا۔ اتفاق سے کوئنس کالج امتحان کا مرکز تھا۔ پہلے ہی دن خبر ملی کہ ڈاکٹر گنیش پرشاد تشریف لا رہے ہیں۔ امتحان میں شریک ہونے والے ہم سب

امیدوار ایک جانب مودّب کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نمودار ہوئے۔ قد و قامت چہرے مہرے کے اعتبار سے غیر معمولی نہ تھے لیکن ریاضی میں ان کے باکمال ہونے کا ہم پر ایسا اثر تھا جیسے ہم کسی یورپین کلکٹر اور مشرقی دیوتا دونوں کی زد میں ہوں۔ برآمدے میں آئے تو ایک چپراسی نے آگے بڑھ کر ان کے جوتے صاف کر دیے۔ دوسرے نے آفس کی چلمن اٹھائی اور ڈاکٹر گنیش پرشاد بغیر کسی طرف نظر اٹھائے کمرے میں داخل ہو گئے، ہم نے اطمینان کا سانس لیا جیسے ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گئی اور ایک موہوم خطرے سے بھی بچ گئے۔

کبھی کبھی ہندو ساتھیوں سے اس پر گرما گرم بحث بھی ہو جاتی کہ ڈاکٹر گنیش پرشاد افضل تھے یا ڈاکٹر ضیاء الدین۔ آج کے دن ہوتے تو اس اختلاف پر معلوم نہیں کیسا اختلال برپا ہو جاتا، لیکن اس زمانے میں آپس کے معاملات کو مذہب سے قطعاً دور، علاحدہ اور بلند رکھتے تھے اور اس بحث کو تفریحی، اُلٹے سیدھے کسی فقرے پر ختم کر دیتے۔ دوسری طرف ہم مسلمان طالب علم اس فارمولے کو معرض بحث میں لائے یا آپس میں کسی کو بتائے بغیر قبول کر لیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین برتر تھے اس لیے کہ ہم سب میں وہ تنہا ریاضی کے فن میں کامل تھے۔ دوسروں کا کیا ان کے ہاں تو کبھی ڈاکٹر گنیش پرشاد ہوتے ہیں۔

امتحان ختم ہوا تو ساتھیوں نے ہندو کالج دیکھ آنے کا پروگرام بنایا کالج کے حدود میں داخل ہوئے تو پوچھنے پر ایک شخص نے بتایا کہ سامنے جو مندر دکھائی دیتا ہے وہاں چلے جاؤ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ مندر کے آس پاس کچھ لوگ تھے جن میں دو خاص طور پر نمایاں تھے۔ دونوں یوروپین، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک مسز اینی بسنٹ تھیں۔ دوسرے مسٹر جی۔ ایس۔ آرنڈیل، مسز بسنٹ اپنی تحریک تھیاسوفی، تقریروں، ہندو کالج سے شیفتگی اور تند سیاسی رجحانات کے سبب سے تمام ملک میں مقبول و محترم تھیں ان کو دیکھ کر ہم سب بہت متاثر ہوئے ان کی شخصیت میں ایک خاص طرح کا دبدبہ اور ایک پُراسرار کشش ملتی تھی۔ مسٹر آرنڈیل کالج کے پرنسپل یا اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ نامطبوع حد تک سپید رنگت، سپید ہی دھوتی کرتے میں، ملبوس لباس، رنگ، نسل و نژاد گرد و پیش کہیں بھی کوئی مناسبت نظر نہ آتی۔ شاید یورپین لباس بھی نہ سجتے ہوں۔

مندر بڑا خوش نما تھا۔ سب سے زیادہ دل کش اور پُر کشش ایک دیوی کی مورت تھی۔ غالباً علم کی دیوی سرسوتی کی۔ پتھر میں نسوانی حسن اور ماورائی تقدس کو اس طرح یک جا کر دینا کہ کون کہاں شروع اور کہاں ختم ہوتا ہے یا دونوں کو علاحدہ علاحدہ دیکھنا اور سمجھنا دشوار ہو جائے انسانی ہنر کا معجزہ ہے۔ مندر کے دروازے پر یا مجسمہ کے آس پاس سنسکرت کا یہ فقرہ کندہ تھا ''وِدّیا دھرمے شوبھتے'' آٹھویں جماعت تک ہندی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھی تھی اس لیے بغیر کسی مدد کے یہ کتبہ پڑھ گیا اس کے جو الفاظ تھے وہ اسکول میں اکثر کانوں میں پڑا کرتے تھے اس لیے اپنے اطمینان کے معنی بھی پہنا لیے یعنی علم اور ایمان سے نفس انسانی کی آراستگی ہوتی ہے۔ صحیح یا غلط اس وقت یہی بتایا گیا کہ جو کچھ سمجھا تھا وہ غلط نہ تھا۔ خیال آتا ہے کہ علم اور دھرم کے ہندو تصور کو اگر یک جا اور مجسم دیکھنا چاہیں تو ایسا ہی نسوانی پیکر موزوں ہو سکتا ہے جیسا کہ سرسوتی دیوی کا تھا اس کی بھی خوشی ہوئی تھی کہ سنسکرت سمجھ سکا۔ وہ بھی ایسی سنسکرت جو ادھر اُدھر نہیں، خاص بنارس کے شوالے پر نقش تھی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اور آتی ہے تو کتنی دوسری باتوں کو بھلا دینے والی ہوتی ہے کہ طلوع تہذیب کی اوّلین کرنوں سے روشنی اور گرمی پا کر کچھ سیدھے سادے اَن پڑھ اَن گھڑ لوگوں نے اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے جو دو چار کلمے کہہ دیے وہ آج ان تمام مفروضات و مسلمات پر بھاری، انسانی فکر و فن کی ترقی و تگ و تاز کی کبھی بھی نفی نہیں کرتے بلکہ ترغیب دیتے تھے۔

....

علی گڑھ آ کر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو دیکھا۔ میانہ قد، بھرا بھرا جسم اعتبار و یگانگت کو دعوت دیتا ہوا چہرہ، مختصر سیاہ گول گھنی داڑھی، ترکی ٹوپی، معمولی انگریزی لباس، نرم سخن، کچھ سوچتے کچھ کہتے یا کرتے تکلفات سے قطعاً بری لیکن قدیم شریفانہ آداب و انداز کا پورا لحاظ اور رکھ رکھاؤ۔ بچوں اور طالب علموں سے ایسا لگاؤ جیسے انھیں کے لیے بنائے اور بھیجے گئے ہوں۔ طالب علموں اور معمولی متوسط لوگوں میں اسی طرح گھومتے پھرتے اور ان سے لطف و شفقت کی باتیں کرتے تھے جیسے وہ ماہر ریاضیات ہی نہ تھے بلکہ بعض ایسے اعلیٰ صفات کے بھی حامل تھے جن کا ہم کو پہلے علم نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی محبت اور مخالفت کو

دیکھنے پرکھنے کے مواقع کم و بیش 32 سال تک ملتے رہے۔ اس طویل مدت کے تاثرات و تجربات کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ نہ شاید بیان کرنے کی زندگی اب مہلت دے۔ لیکن علی گڑھ کی بڑائی اور بھلائی اور مقصود و موقوف کا ذکر یا موقع ہو اور اپنے اور اپنوں کو جن حالات میں آج دیکھتا اور پاتا ہوں اس میں ڈاکٹر صاحب کو یاد کیے یا ان کی یاد دلائے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ کیسا وقت آ گیا ہے، کتنی حسرت و عبرت کہ وہ زندگی میں جتنے معمولی معلوم ہوتے تھے مرنے کے بعد آج کتنے محبوب، کتنے محترم اور کتنے بے مثل معلوم ہونے لگے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بی۔ ایس۔ سی اور ان کے ایک ساتھی ممالک متوسط کے رہنے والے ولایت اللہ صاحب بی۔ اے آرٹس میں یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن لائے تھے۔ دونوں کو ڈپٹی کلکٹری کا آفر ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ وہ کالج، قوم اور ملک کی خدمت کو حکومت کی ملازمت پر ترجیح دیں گے۔ ان کے اس فیصلے کا سرسید پر گہرا اثر پڑا۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک تحریر میں بڑی محبت اور افتخار سے کیا ہے۔ سرسید کو اپنے مقصد اور مشن کی اولیں کامیابی کی جھلک ڈاکٹر صاحب کے اس عزم و ایثار میں نظر آئی۔ ہر مسیح اپنا حواری پانے پر اسی طرح مسرور و مطمئن ہوتا ہے اور کیسا حواری جس نے اپنے مسیح کے مشن کو اس تندہی قابلیت اور وفاداری سے ہر دم اور ہر حال میں آگے نہ بڑھایا ہوتا تو مسیح اور مشن کو وہ برکت اور پائندگی نصیب نہ ہوتی، جو ہوئی اس زمانے میں قوم اور خدمت کا وہ تصور نہ تھا جو آج کل ہے جب خدمت یا لیڈرشپ کا تصور خود کے نفع کو جماعت کے ضرر پر اور پارٹی کے مفاد کو ملک کے مفاد پر ترجیح دینا رہ گیا ہو۔ ہم میں بہتوں کو تعجب تھا کہ ڈاکٹر صاحب ڈپٹی کلکٹری پر قوم کی خدمت یا کالج میں معلم ہونے کو کیوں ترجیح دی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ہمارے دنوں میں ڈپٹی کلکٹری کے معنی آمدنی و اقتدار کے اور قوم کا مفہوم حکومت سے لڑائی مول لینے یا اردو اخبارات میں مضمون لکھنے کا تھا۔

ولایت اللہ صاحب نے ڈپٹی کلکٹری قبول کر لی اور حکومت کے بڑے مدارج پر فائز ہوتے رہے، مدھیہ پردیش (سی پی) میں ان کی بڑی مان دان تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور

ولایت اللہ صاحب میں بڑے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کالج اور کالج کے طلبا کی امداد میں ان سے بڑا کام لیا۔ اس کا اعتراف ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوکر کیا کرتے تھے۔ ہدایت اللہ صاحب ریٹائرڈ چیف جسٹس سپریم کورٹ دہلی ان ہی ولایت اللہ صاحب کے نام ور فرزند ہیں جن کے پریسیڈنٹ جمہوریہ ہند کے انتخاب اور والیان ریاست کی پریوی پرس کی ضبطی سے متعلق مقدمات کے فیصلوں کو تاریخی اہمیت اور ہندوستان گیر شہرت ہوچکی ہے۔ اس سال ہدایت اللہ صاحب یونیورسٹی کنووکیشن کا خطبہ دینے تشریف لائے تھے۔ طلبا نے ان کا استقبال بڑی دھوم اور گرم جوشی سے یونیورسٹی یونین میں کیا۔ سپاس نامے میں ان دشواریوں خطروں اور نزاکتوں کا ذکر کیا گیا تھا جو کچھ دنوں سے یونیورسٹی کو پیش تھے، جن کے سبب سے یونیورسٹی کے تمام بہی خواہ نہایت درجے غیر مطمئن و مضطرب تھے۔ طلبا کی گزارش اور مہمان کا پُر خلوص، تشفی آمیز اور حوصلہ افزا جواب سن کر، گزرے ہوئے وہ دن یاد آگئے جب ولایت اللہ صاحب علی گڑھ تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب کے یہاں مقیم ہوتے اور سی۔ پی (مدھیہ پردیش) کے مسلمان اور علی گڑھ کے مسائل پر ایک دوسرے اور اسٹاف کے بعض سینئر اراکین سے مشورے ہوتے اور ان کے حل تلاش کیے جاتے کتنا عجیب اور امید افزا معلوم ہوا کہ آج جب کہ یونیورسٹی طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا اور بلاؤں میں گھری ہوئی ہے ہدایت اللہ صاحب کو وہی رول ادا کرنا پڑے گا جو اُن کے والد کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے زمانے میں ادا کرنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کالج ہی کے بورڈنگ ہاؤس اور طالب علموں میں نہیں بلکہ اسکول میں بھی اسی شوق و پابندی سے گھومتے پھرتے اور بچوں سے اُن کے مذاق اور مطلب کی باتیں کرتے جیسے وہ نوجوانوں سے کرتے۔ کالج کے طالب علموں میں کبھی کبھی بے اطمینانی کی بھی صورت پیدا ہو جاتی یا بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں شریک ہونے کے لیے طلبا الہ آباد اور وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تو کالج میں صرف فرسٹ اور تھرڈ ایر کے طلبا رہ جاتے۔ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی سونی اور سنسان ہونے لگتی۔

ڈاکٹر صاحب ان مواقع پر علی گڑھ کے باہر کے اپنے سارے پروگرام ملتوی کر دیتے اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کو طرح طرح سے دلچسپ بنانے میں مصروف ہو جاتے، تاکہ لڑکوں میں تنہائی، بے شغلی اور بے دلی کا احساس نہ پیدا ہونے پائے۔ سب سے موثر نسخہ یہ ہوتا کہ ڈائننگ ہال کے عملے کو ہدایت کی جاتی کہ وہ کھانے کے مینو کو متنوع کرے۔ ان کی مقدار بڑھائے اور کچھ لذیذ کھانوں کا اضافہ کرے۔ اس کے علاوہ نرورا اور ہردوا گنج کی نہروں پر طلبا کو پکنک لے جاتے۔ طعام و قیام و طرح طرح کی تفریحوں کا پروگرام ہوتا۔ بورڈنگ میں رات گئے تک کبڈی اور نون کی پالی کے مقابلے ہوتے رہتے۔ موسیقی اور مشاعرے کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ بیش تر پہلی ہی ترکیب (ڈائننگ ہال میں چیزے فزوں کنند) کارگر ہو جاتی۔ کالج اور اسکول میں جتنے طلبا تھے ان کے والدین، خاندان اور اُن کے اقتصادی حالات سے ڈاکٹر صاحب اچھی طرح واقف ہوتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہر ضلع، کمشنری اور صوبے کے چھوٹے بڑے حاکموں اور اصحاب خیر و ثروت سے بھی واقف رہتے تھے ان کے وسیلے سے وہ طلبا اور ان کے گھر والوں کو حسب ضرورت نفع پہنچاتے رہتے۔ یا کوئی مشکل آن پڑتی تو ان کی معرفت اس کا مداوا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں عام طور پر مشہور تھا کہ وہ بھولتے بہت تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو باتیں یاد رکھنے کی ہوتیں ان کو وہ کبھی نہیں بھولتے تھے۔ ان کے حافظے یا قوت ارادی کے بارے میں اگر کوئی یہ کہے کہ وہ صرف بھول جانے یا بھلا دی جانے والی باتوں کو بھلا دیتے یا اس کو بھلا رکھتے تھے تو میں اس کی تصدیق کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب نے باوجود اُن طویل، بے شمار، بے غرض اور بیش بہا خدمات کے جو کالج اور اس سے وابستہ چھوٹے بڑے لوگوں کی تمام عمر بجا لاتے رہے۔ وہ ہر طرح کی بدنامی اور مخالفت بھی سہتے رہے کالج یونیورسٹی میں منتقل ہوا تو مخالفت دشمنی کی حد تک بڑھ گئی۔ یہ اتنی موقف و منہاج کی نہ تھی جتنی ذاتی اثر و اقتدار کے لیے، تحقیقاتی کمیٹی اور کمیشن قائم ہوتے رہے ان کی رو سے معزول و منکوب بھی ہوئے لیکن ع

حسرت سے نہ چھوٹی کوئے جاناں کی ہواداری

وقفہ وقفہ سے وہ برسرِ کار آتے رہے اور اپنے معمولات میں اس درجہ منہمک ہو جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ معلوم نہیں کس پر کیسا یقین تھا اور کیسی طبیعت و تقدیر پائی تھی کہ ان حادثات سے بدلتے تو کیا متاثر تک نہ ہوئے۔ کبھی بددل اور شکستہ خاطر نہیں ہوئے۔ اپنے دشمنوں تک کو کبھی زبان قلم یا در پردہ کسی طور پر بُرا نہیں کہا۔ نہ ان کی طرف سے کبھی تلخ ہوئے۔ 30-32 سال کی مدت کم نہیں ہوتی اس دوران میں ان کو ہر حال میں دیکھا اور پایا۔ کسی موقع پر ڈاکٹر صاحب کو اس شخص کو بھی بُرا کہتے نہ سنا جس نے ان کو سب سے زیادہ رسوا کیا تھا۔ کبھی ذکر آجاتا تو اس خوب صورتی اور شرافت سے ٹال جاتے جو صرف ان کا حصہ تھا۔

تقسیم ملک سے کچھ پہلے سیاسی بحران کا زمانہ تھا۔ کچھ غیر ذمے دار طلبا نے وائس چانسلر کے آفس پر یورش کی۔ ڈاکٹر صاحب کام کر رہے تھے۔ بعض طلبا ناشائستہ طریقے سے پیش آئے تھوڑی ہی دیر میں ہنگامہ ختم ہو گیا ہر طرف سے لوگ اُمڈ آئے، ڈاکٹر صاحب بڑے وقار لیکن خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اردگرد مجمع تھا جس میں اسٹاف اور آفس کے اراکین طلبا، ڈاکٹر صاحب کے ہم وطن اور اقربا بھی شامل تھے ایک صاحب نے ایک طالب علم کا نام لے کر یہ کہنا چاہا کہ آپ نے کیسے کیسے نازک مواقع پر اس کی مدد کی تھی..... جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب جیسے چونک پڑے ہوں۔ بے اختیار ہو کر تاکید کرنے لگے کہ خبردار، طلبا کے بارے میں ہرگز ایسی باتیں نہ کرد۔ پھر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کوٹھی واپس چلے گئے۔ شام کو کچھ لوگوں نے مکان پر جا کر دیکھا تو لان پر چھوٹے بچوں کے ساتھ تفریح کی باتیں کر رہے تھے اور ان کو کچھ بسکٹ اور ٹافی بھی دیئے جا رہے تھے۔ دوسرے دن حسب معمول بورڈنگ ہاؤس اور آس پاس کا چکر لگاتے ہوئے آفس کے کاموں میں مصروف ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اچھے کام کرنے کا بھی کیا فیضان ہوتا ہے جو زندگی کے تمام مکائد و مفاسد کو ناقابل التفات بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جس دن اپنی تعلیم ختم کی اس کے فوراً بعد سے اس دن تک جب وہ ۱۹۴۸ء میں انگلستان اور وہاں سے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے، علی گڑھ سے وابستہ

رہ کر جیسی جیسی دشواریاں، مخالفتیں، سب وشتم اور رسوائیاں جھیل کر، بغیر کسی طرح کی شکایت دل میں رکھے اور زبان پر لائے، مسلمانوں کی کم و بیش تین نسلوں کی خدمت جس خوشی اور دل سوزی سے بغیر کسی امتیاز و تفریق کے انجام دی اس کی مثال اس صدی کے ہندستانی مسلمانوں میں مشکل سے ملے گی۔ ان کو علی گڑھ اور اس کے متعلقین و متوسلین سے جیسا تعلق خاطر تھا اتنا اپنے اعزا و اقربا سے نہ تھا۔ انھوں نے اپنے اثر سے اوروں کو جتنا نفع پہنچایا اور وقت پر دست گیری کی اس کا عشر عشیر بھی اپنے عزیزوں کے لیے نہیں کیا۔ وہ جتنی طویل مدت تک جتنے اہم مناصب پر علی گڑھ میں برسر اقتدار رہے اور حکومت اور ملک کے اکابرین میں ان کا جتنا رسوخ تھا اس اعتبار سے اگر وہ چاہتے تو اقربا اور ہم وطنوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ وفات کے بعد انھوں نے کیا، کیسی اور کتنی منقولہ غیر منقولہ جائیداد یا بیلنس چھوڑا، وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ میرس روڈ (علی گڑھ) جس پر طبقہ اشراف اور دوسرے دولت مند اشخاص کی نہایت شان دار اور خوب صورت وسیع کوٹھیاں اور باغ واقع ہیں، ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی اور باغ اس حالت کو پہنچ گئے ہیں جیسے وہ کسی کی ملکیت نہ ہوں یا سب کی ہوں۔ مدتوں ملکیت مہاجر کی زد اور ضبطی میں رہ کر واگذاشت ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کے فرزند اور متعلقین کے قبضے میں آئے لیکن پس ماندگان کو اتنے ذرائع و وسائل نہیں میسر ہیں کہ وہ کوٹھی اور باغ کے کم سے کم حصے کو بھی بہتر حالت میں رکھ سکیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر کیا کمایا کیا کھایا اور کیا چھوڑا، اور یہ سب کیوں اور کس لیے!

آج تک ان پر کسی نے اقربا پروری اور نفع اندوزی کا الزام نہیں لگایا، آج جب کہ یہ عیب یا ہنر ہر سطح پر اس درجہ عام ہو گیا ہے جیسے یہ جنس (Sex) کا کوئی ناقابلِ انسداد مطالبہ ہو گیا ہو اس لیے اس کو ہر قانونی یا اخلاقی گرفت سے بری کر دینا چاہیے جیسا کہ مغرب کی تمدنی زندگی میں آئے دن دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس طرز عمل اور طریق احسن پر جتنی حیرت کی جائے کم ہے۔ وہ کتنے عجیب و غریب اور عزت و محبت کے لائق تھے کہ بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی شخص دونوں کو نقصان

سے بچانے اور فائدہ پہنچانے کی کوشش میں کوئی تفریق یا دریغ نہیں کرتے تھے۔ بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے ہیں جن کے اور ضرورت مند کے درمیان اتنا کم فاصلہ ہوتا ہو جتنا کہ ڈاکٹر صاحب اور ضرورت مند کے درمیان۔ جس کا جب جی چاہے اور جہاں چاہے ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف مل سکتا تھا۔ وہ نہ کسی سے اکتاتے تھے نہ اس سے بے توجہی برتتے تھے۔ یہ جو ہمارے یہاں تاکید ملتی ہے (اُکتا کر یا بے زار ہو کر) اپنے غلام سے بھی 'اُف' کرکے بات نہ کرو اس کی تمثیل جیسی ڈاکٹر صاحب کے ہاں ملتی ہے وہ مشکل سے کہیں اور نظر آئے گی۔

ڈاکٹر صاحب کو بُرا کہنا یا ان کی ہنسی اُڑانا سب کو آتا تھا لیکن ہر کسی کے کام آنے والا ان جیسا کوئی نہ تھا۔ ان پر سب سے عام اور سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا تھا کہ وہ انگریز اور انگریز حکام کی خوشامد کرتے تھے اس پر اپنی طرف سے یہ اضافہ کروں گا کہ انگریز حکام ہی نہیں وہ آفس کے عملے سے بھی یکساں رسم و راہ رکھتے تھے وہ جانتے تھے کہ حاکموں سے اتنا نہیں جتنا جلد اور قابلِ اطمینان کام دفتر کے عملے سے نکلتا ہے۔ دفتر کے عمال اس لیے ممنونِ کرم رہتے کہ ان کو کوئی دشواری پیش آتی تو ڈاکٹر صاحب متعلقہ حکام سے کہہ سن کر اس کا کام بنا دیتے اسی طرزِ عمل سے خود انھوں نے کیا نفع اُٹھایا اور دوسروں کو کتنا نقصان پہنچایا، اس کو تولیں تو معلوم ہوگا کہ ترازو کا موخر الذکر ہی پلڑا ہر متاع سے لبریز اور گراں بار ہے اور پہلا بالکل خالی ہے۔ آج یہ بات افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس کو حقیقت بنا رکھا تھا!

غالبؔ نے ایک موقع پر کہا ہے، محبوب کے نقشِ پا نے کیا کیا ذلیل کیا ہے کہ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا۔ شعر کی بلاغت اور ناظرین کے ذوقِ سلیم کے احترام میں شعر کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہاں دیکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کیوں کرتے تھے اور کس کے لیے کرتے تھے۔ لوگوں کی غرض جہاں کہیں اٹکی ہوتی ڈاکٹر صاحب ننگ و نام سے بے نیاز ہو کر پہنچ جاتے۔ انگریزی دورِ حکومت میں کس کا بالخصوص پس ماندہ و درماندہ مسلمانوں کا کام انگریزوں سے نہیں پڑتا تھا اور کام بنتا اسی وقت تھا جب سفارش

کرنے والا انگریز اور اس کے بابوؤں سے بخیریت تمام گزر جائے۔ آج کیا ہوتا ہے پہلے تو خیر غیر کفو میں رشتہ کرنا معیوب و ممنوع تھا، آج اپنے کفو سے رابطہ پیدا کرنے میں کیسی کیسی خواریاں نصیب ہوتی ہیں۔ اس سے بھی شاید ہی کوئی ناواقف ہو! ایک ڈاکٹر صاحب کی خوشامد نے ہم کو کتنی خوشامدوں سے محفوظ کر دیا اسے بھی نہ بھولنا چاہیے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران اناج، کپڑا، اسٹیشنری، دوائیں اور ضرورت کی دوسری اشیا کم یاب ہوتے ہوتے نایاب ہونے لگی تھیں۔ بڑی پریشانی کا زمانہ تھا، لیکن کیا کہا جائے جب آج کل کی مہنگائی بدرجہا بڑھ چکی ہو اور کبھی کبھی جان و مال و آبرو کے غیر متوقع محاصل اوپر ادا کرنے پڑتے ہوں۔ متذکرہ صدر اشیا کو ادھر اُدھر لے جانے پر بڑی کڑی پابندی لگا دی گئی تھی۔ طلبا اسٹاف اور ان تمام لوگوں کو جو اُن سے وابستہ تھے بڑی تشویش کا سامنا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس زبوں حالی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کہیں جلسہ جلوس تھا نہ مردہ باد یا کشتہ باد کے نعرے نہ جرائم نہ فتنہ و فساد۔ ایک دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کسی نامعلوم مہم پر روانہ ہو گئے ہیں۔ پان سات دن کے بعد واپس آئے تو معلوم ہوا کہ جلو میں گیہوں، چاول، کپڑے، اسٹیشنری اور دواؤں کا ذخیرہ ساتھ آ رہا ہے۔ یونیورسٹی میں اطمینان اور آسودگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ حکومت ہند یوپی، ریلوے بورڈ، ریاست کے حکمرانوں، مل مالکوں، کیسے کیسے دفتروں کے کیسے عمال اور ہندوستان میں پھیلے ہوئے اولڈ بوائز کے قبیلے سے ڈاکٹر صاحب کے کیسے تعلقات تھے اور سب کو موصوف کا کتنا احترام اور ان پر کتنا اعتماد تھا کہ جو مراحل شاید مہینوں میں طے پاتے یا طے پا کر بعد از وقت ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے رسوخ سے ہفتوں میں یکہ و تنہا سفر کر کے طے کرا دیے۔ یہ مہم اس زمانے میں سر کی جب جنگی مطالبات کے پیشِ نظر بیش تر سویلین مطالبات کو التوا میں رکھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں جب سفر کی سہولتیں اتنی عام اور آسان نہ تھیں جتنی آج ہیں، ان سے زیادہ سفر کرنے والا وہ بھی کم سے کم سامان و اہتمام کے ساتھ، شاید ہی کوئی دوسرا رہا ہو۔ ہندوستان کا کوئی قابل ذکر گوشہ ایسا نہ تھا جہاں وہ گئے ہوں اور وہاں کے

لوگوں سے ان کی اچھی واقفیت نہ ہو۔ اس کا ایک بڑا سبب اولڈ بوائز تھے جو کسی نہ کسی حیثیت سے ہر جگہ موجود تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً تمام یونیورسٹیوں تعلیمی بورڈ کمیشن، کمیٹیوں اور اہم تعلیمی اور سماجی اداروں کے رکن تھے۔ ہر جگہ کے حکام ڈاکٹر صاحب کے نام اور کام سے واقف ہوتے اور یہ سب ''شجر سایہ دار'' کا کام دیتے۔ سفر کرتے تو راستے کے تمام اسٹیشنوں پر خبر ہو جاتی ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی رہا ہو کہ وہ ریلوے بورڈ کے ممتاز ممبر تھے۔ شناساؤں، عقیدت مندوں اور اصحاب غرض کا مجمع ہر اسٹیشن پر ہوتا جہاں ان کی گاڑی رکتی تھی، ان کے مسائل اور مشکلات کو حافظہ میں نوٹ کرتے جاتے۔ سفر کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہوتا کہ ہر اسٹیشن پر جہاں ان کی گاڑی رکتی ڈاکٹر صاحب کے شناسا، عقیدت مند یا اولڈ بوائز کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز لیے موجود ہوتے، سب کا تحفہ قبول کرتے جاتے۔ دوسرے اسٹیشن پر بھی یہی صورت پیش آتی، چنانچہ جو لوگ ناشتہ اور فواکہات لائے ہوئے ہوتے اسے قبول کرتے اور جو خالی ہاتھ آئے ہوتے ان کو وہ تحفہ جات حوالے کر دیتے جو پچھلے اسٹیشن پر ملے تھے جیسے مسلمان گھرانوں میں قربانی کے گوشت کی تقسیم ہوتی ہے۔ منزل مقصود پر پہنچتے تو بچا کھچا سامان میزبان کی نذر کر دیتے۔

پروگرام کا دوسرا اہم پہلو یہ ہوتا کہ جہاں کہیں قیام ہوتا وہاں اکابر کے علاوہ مقامی اور آس پاس کے اولڈ بوائز بڑے اہتمام سے استقبالیہ دیتے۔ بڑے بڑے افسر تاجر، اکابر شہر اور نادار لیکن ہونہار طالب علموں کے سرپرست یا والدین اور دوسرے اہلِ غرض موجود ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب سب کی سنتے اور سب کی مشکلات کا انصرام زیادہ تر پارٹی ہی میں موجود اشخاص سے کرا دیتے۔ کبھی یہ ہوتا کہ بعض طلبا کے والدین کسی معذوری یا مصلحت کی بنا پر اپنے لڑکوں کو گھر پر نہیں رکھ سکتے تھے ان کو ڈاکٹر صاحب اپنی سرپرستی میں لے لیتے اور علی گڑھ واپس آتے تو ایسے طلبا ساتھ ہوتے۔ ان میں کم سن بھی ہوتے سیانے بھی، ان کو کچھ دن اپنے ہاں مہمان رکھتے، جب وہ اپنے نئے گرد و پیش سے مانوس ہو جاتے تو حسب حالات یا تو متعلقہ بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیتے یا کسی ایسے ممبر اسٹاف کے ساتھ قیام کا بندوبست کر دیتے جس پر ان کا کامل اعتماد ہوتا۔ اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ

وقتاً فوقتاً ایسے طالب علموں کو دیکھنے بھالنے خود پہنچ جاتے، کبھی کبھی ان کو اپنے ہاں کھانے پر یا ناشتے پر بلاتے رہتے۔

سندھ کے بڑے سربرآوردہ اور باثر زمین دار پیر پگھارو کا المناک حشر شاید ہم میں سے بہتوں کو فراموش نہ ہوا ہو۔ انگریزی حکومت کا عہد تھا۔ بعض انسانیت سوز حرکات کی بنا پر پیر پگھارو پر مقدمہ چلایا گیا ہے پھر جو کچھ ہوا اس سے مفر نہ تھا۔ اس حادثہ سے پگھارو خاندان کو جس تباہی و رسوائی کا سامنا ہوا اس سے ڈاکٹر صاحب بڑے متاثر ہوئے۔ ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف سے ان کو بڑی فکر لاحق تھی، کہتے تھے جلد سے جلد اور خاص اہتمام و احتیاط سے اصلاح کی کوشش نہ کی گئی تو یہ حادثہ اور زیادہ دردناک ہو جائے گا۔ چنانچہ پیر پگھارو کے دو لڑکوں کی تعلیم اور دیکھ بھال کا انتظام علی گڑھ میں کیا گیا۔ عرصے تک ان کو اپنے ساتھ اور اپنے یہاں مہمان رکھا، یہ لڑکے کافی مدت تک اسکول کے بہترین بورڈنگ ہاؤس (انگلش ہاؤس) میں زیر تربیت رہے پھر وطن واپس گئے آج وہ سندھ (پاکستان) کے مہذب و ممتاز بخیر اور معتبر شہری مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان بچوں کے لیے غیر معمولی محبت سے فی الفور کام نہ لیا ہوتا تو کون جانتا ہے پگھارو خاندان کا کیا انجام ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب کے یہاں آم پارٹی تھی۔ جن لوگوں کو ان پارٹیوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے وہی جانتے ہیں کہ یہ تقریب کیسی ہوتی تھی۔ ہر طرح کے آم سوا ایک قسم کے ہوتے۔ ہر برتن میں ہر جگہ بھیگتے ہوتے اور ہر طرح کا اہتمام ہوتا سوا حفظ صحت کے۔ فارغ ہونے کے بعد چائے شروع ہوئی اور باتیں ہونے لگیں۔ آم پارٹی سے جو لوگ جس طرح متاثر تھے اسی انداز کی باتیں تھیں۔ اس دوران میں ذکر چھڑ گیا ''علی گڑھ بوائے'' کا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے ''عرصہ ہوا آسام کے ایک غیر معروف خطے میں جانا ہوا۔ شام کی چائے میں شرکت کی دعوت تھی۔ بڑے تکلف، سلیقے اور ساز و سامان کی پارٹی تھی۔ کھانے پینے کی منتخب اور وافر چیزیں تھیں۔ صفائی، ستھرائی اور نفاست کا خاص اہتمام تھا جو اس دیار میں غیر متوقع تھا۔ ایک نوجوان نے بڑی اچھی خیر مقدمی نظم پڑھی۔

دوسرے نے شستہ انگریزی میں تقریر کی۔ بالآخر میں نے میزبان سے دریافت کیا کہ پارٹی کا انتظام کس نے کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہی دو نوجوان جنھوں نے نظم پڑھی اور تقریر کی تھی تقریب کے مہتمم تھے۔ میزبان نے کہا آپ کی تشریف آوری کے سلسلے میں ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ آپ کا خیر مقدم کس طرح کیا جائے جو آپ کی شایانِ شان ہو اور ہماری سبکی نہ ہو۔ چنانچہ اس کی تلاش شروع کی گئی کہ کوئی علی گڑھ والا مل جائے وہی اس دشواری اور نزاکت کا مقابلہ کرسکتا تھا، چنانچہ یہ دونوں مل گئے اور دشواری رفع ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان نوجوانوں کو بلا کر پاس بٹھایا۔ کالج سے ان کی زندگی کے متعلق لطف کی گفتگو کرتے اور شفقت فرماتے رہے۔ پارٹی ختم ہونے پر پارٹی میں شریک وہاں کے اعلیٰ حکام اور دیگر اکابر سے ان کی سفارش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی زندگی میں بڑی ترقی اور خوش حالی نصیب ہوئی۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ''علی گڑھ بوائے'' اس طرح کا ہوتا ہے اسی کو انگریزی میں Rising to the occasion کہتے ہیں۔ یعنی ہر صورت حال کا سامنا کرنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتا ہو۔ علی گڑھ بوائے کا اطلاق ایسے ہی نوجوان پر ہوتا ہے۔

آموں کے بیان میں ایک بات اور یاد آئی۔ آموں کے موسم میں ڈاکٹر صاحب نینی تال اور شملہ ضرور جاتے۔ صرف 3-2 بار وہ بھی زیادہ سے زیادہ دو چار دن کے لیے۔ ظاہر ہے اس سے تبدیل آب و ہوا بالکل مقصود نہ ہوتا بلکہ یونیورسٹی کے وہ مسائل ہوتے جو حکومت کے اکابر یا قوم کے صاحبان ثروت اور اہلِ خیر سے متعلق ہوتے۔ ان کی پلیننگ اس طرح سے کی جاتی۔ آم کی فصل کا شباب ہوتا، ڈاکٹر صاحب آموں کی نمائش کا اعلان کرتے۔ اطراف و جوانب سے بکثرت اعلیٰ درجے کے طرح طرح کے آم آجاتے، کمیٹی فیصلہ کرتی کہ کس کو کس درجے کا انعام دیا جائے جو صرف سارٹیفکٹ کی شکل میں ہوتا اور کلکٹر ضلع یا ڈویژن کے کمشنر سے کامیاب مقابلے کرنے والے کو عطا کیے جاتے۔ نمائش میں آم رکھنے والے خوش ہو جاتے۔ ان سارے آموں کو لے کر ڈاکٹر صاحب نینی تال یا شملہ

چلے جاتے۔ وہاں ان تمام اکابر میں تقسیم کر دیتے جن سے کالج کا کوئی معاملہ انکا ہوتا۔ واپس ہوتے تو معلوم ہوتا کہ وہ سارے مسائل جو متعلق تھے رو براہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کالج اور یونیورسٹی کے اندر طلبا کی آزادی اور کبھی کبھی بے راہ روی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ نہ طلبا کے ساتھ رعایت کرنے میں اپنی بے راہ روی کو قابل التفات سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ نوجوان کالج میں آزادی سے رہیں گے تو کالج سے باہر جا کر آزادی کے حدود اور اس کی ذمے داری کا احساس کریں گے۔ البتہ وہ اس کے خلاف تھے کہ باہر کے لوگ طلبا کو ان کے بنیادی فرائض اور مقاصد سے ہٹا کر سیاست کے خارزار میں جھونک دیں۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی سے ان کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہی تھا آج یہ بات کتنی عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے، لیکن آج کے نوجوان جس حال کو پہنچ گئے ہیں یا پہنچا دیے گئے ہیں وہ عجیب اور مضحکہ انگیز ہو یا نہ ہو عبرت ناک ضرور ہے۔ غالباً پہلی جنگ عظیم کے بارے میں ایک دردمند یا ستم ظریف نے کہا تھا کہ نوجوان توپوں کا چارا بنائے گئے۔ آج بھی سیاست کے مزبلے یا قمار خانے میں نوجوانوں کی تصویر کچھ کم المناک نظر نہیں آتی۔ یہ ذکر یہاں اتنا خواہ مخواہ نہیں ہے جتنا بے اختیار ہے۔ یوں بھی زندگی میں ہر بہار کی خزاں دیکھنی نصیب ہو اور دوسری طرف بھٹکے ہوئے آہو کو سوے حرم لے چلنے والا کوئی نہ ہو تو میرے اس انحراف کو معاف کر دینا چاہیے۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب کے سامنے یہ قصہ پیش کیا گیا کہ فلاں طالب علم کے ایک لڑکی کے ساتھ کچھ ایسے ویسے تعلقات بتائے جاتے ہیں۔ طالب علم کا خط پکڑا گیا اور چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس زمانے میں اس طرح کا واقعہ، صحافی اصطلاح میں جتنا سنسنی خیز ہوتا آج بڑے سے بڑے پیمانے پر قتل، آتش زدگی، غارت گری اور آبرو ریزی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے اور خط کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ اس کی تعمیل کی گئی۔ آفس میں طالب علم کی پیشی ہوئی۔ لڑکے کو ایک نظر دیکھ کر کام میں مشغول ہو گئے اور آفس کے کاموں سے متعلق کلرک یا پیش کار کو باہر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر میں سر اٹھائے بغیر خط کو طالب علم کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا، یہ خط کا کیا قصہ ہے۔ طالب علم کسمسایا اور ہاں نہیں کے درمیان کچھ کہنا چاہا۔

ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دیر کے لیے کام بند کر دیا اور طالب علم سے کہا جائیے جو ہوا سو ہوا۔ طالب علم واپس ہونے کے لیے آمادہ ہوا تو بولے "اور ہاں یہ خط وط نہ لکھا کیجیے۔" موصوف کے اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے اپنی تحریر کے عواقب کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیے۔ خط کو لڑکے کے سامنے پرزہ پرزہ کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دینے کے بجائے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس زمانے میں بہت دنوں تک ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ زبان زد رہا اور گفتگو یا بحث کا تفریحی اختتام (تصفیہ) اسی فقرہ پر ہوتا کہ "جو ہوا سو ہوا، آئندہ خط وط نہ لکھا کیجیے۔"

ڈاکٹر صاحب اپنی پوری ذہانت اپنے تمام اختیارات اور اس گہری اور فطری دل سوزی کو جو ان کو طالب علموں سے تھی اس وقت کام میں لاتے جب کوئی طالب علم ناسازگار حالات کا شکار ہو گیا ہو۔ ان کی یہ صفت جو کمزوری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اور اکثر مصلحت اندیشی کی منافی ہوتی ان کے زوال وزیاں کا باعث ہوتی تھی، طالب علم کیسا ہی معروف یا غیر معروف، مستحق یا غیر مستحق کیوں نہ ہوتا جب تک اپنی غرض ڈاکٹر صاحب تک نہ پہنچا لیتا ناسازگار حالات سے ہار نہ مانتا۔ وہ جانتا تھا کہ بالآخر ڈاکٹر صاحب اس کی دشواری کا حل نکال لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب اسی اقتدار اعلیٰ کے مانند جہاں مجرم، ترحم شاہی King's Mercy کے لیے پہنچ سکتا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ 'شاہ' اپیل نامنظور بھی کر دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ علی گڑھ کی روایت بن گئی تھی کہ جب تک طلبا ہی نہیں دوسرے بھی اپنی داد فریاد لے کر وائس چانسلر تک پہنچ نہ جاتے چین نہیں لیتے تھے۔ یہ روایت ڈاکٹر صاحب کی قائم کی ہوئی تھی جس کو سوا ذاکر صاحب کے پھر کسی نے نہیں نباہا شاید نباہ بھی نہیں سکتے تھے۔

طالب علموں کے مسائل یا مشکلات اکثر یہ ہوا کرتے۔ داخلہ، حاضری کی کمی، کالج کے مطالبات کی بے باقی، امتحان میں شرکت کا اجازت نامہ، امتحان میں بے عنوانی پر گرفت یا نتائج سے متعلق مراعات خاص ان میں بیشتر مالی اعانت سے متعلق ہوتیں۔ یہ دشواریاں اس طور پر دور کی جاتیں کہ مقررہ ذرائع اور مسائل کے علاوہ کہیں اور سے روپے فراہم کیے جائیں۔ بے باقی کی ضمانت اکثر ممبران اسٹاف، ممبران کورٹ اور ڈاکٹر صاحب

خود کرتے۔ اس وقت کی ایک عوامی اصطلاح کے مطابق اس میں طرح طرح کے 'گھپلے' پڑتے جن کی زد بالآخر جا کر ڈاکٹر صاحب پر پڑتی جسے موصوف کسی طرفہ تر ''گھپلے'' سے دور دفع کرتے رہتے۔ حاضری کی کمی پوری کرنے کے لیے جتنے قابل قبول عذر ہو سکتے تھے وہ پہلے سے منضبط تھے۔ یہ بالعموم ناکافی ہوتے اس لیے ڈاکٹر صاحب کو ان میں ایسے نکتے پیدا کرنے پڑتے جو مقررہ رعایتوں سے متفرج ہوتے تھے یا ہونے کا امکان تھا۔ اس طرح کمی بیشی میں تبدیل نہ ہو جاتی تو برابر سرابر ضرور ہو جاتی یہ ''تلطف شاہی'' اس ''ترحم شاہی'' سے بالکل علاحدہ ہوتا جس کا ذکر آچکا ہے ظاہر ہے ایسے عہد معدلت یا معذرت میں عدلیہ، مقننہ یا منتظمہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہوگی۔ ہر سطح پر اور ہر طبقہ میں رسوخ، رسائی اور اس کی رفاقت حاصل کرنے کے لیے، خواہ وہ کسی خدمت یا قیمت پر ملتی ہو۔ ڈاکٹر صاحب اس لیے کوشاں رہتے اور کامیاب ہوتے کہ اس سے وہ علی گڑھ، اس کے طلبا اور عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچا کر ملک کی بحالی اور خوش حالی میں اضافہ کر سکیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں ہی کے خدا کے ہاں نہیں، ہر مذہب و ملت کے خداؤں کے یہاں (اگر ایسے خدا ہوتے ہوں) ڈاکٹر صاحب کو اچھے سے اچھا اجر ملے گا۔

طالب علموں کی ڈسپلن اور امتحان وغیرہ کے بارے میں جب کبھی ڈاکٹر صاحب سے گفتگو ہوتی اور یہ بالعموم اس وقت ہوتا جب وہ آئین وضوابط کے تقاضوں کو طلبا کے لیے نفع جوئی اور نفع رسانی پر نظر انداز کر چکے ہوتے تو فرماتے ڈسپلن، نصاب اور امتحان وغیرہ کے معیار کا انحصار اتنا آئین وضوابط کی سختی اور غیر مشروط پابندی پر نہیں ہوتا جتنا اراکین اسٹاف کی قابلیت اور طالب علم سے ان کی محبت اور رفاقت پر، اور دونوں کو اپنی اچھی صلاحیتوں کو بر سر کار لانے کے لیے آزاد اور صحت مند فضا رکھنا۔ بیش تر طالب علم غیر معمولی طالب نہیں ہوتے۔ متوسط درجے کے ہوتے ہیں بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لیے ہر ایک کو اعلیٰ طالب علم بنانے کی فکر کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ان کو اعلیٰ اور عملی شخص بننے کا شوق اور حوصلہ دلایا جائے اور سہولتیں فراہم کی جائیں، اس سے تعلیم و تربیت کے بہت سے مسائل خود بخود طے ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب تعلیم، فلسفہ، الٰہیات وغیرہ کے ماہر رہے ہوں یا

نہیں، تعلیم و تدبیر سے نوجوانوں کو خوش حالی کی زندگی سے ہم کنار کرنے اور رکھنے کی جیسی غیر معمولی قابلیت ان میں تھی وہ اب تک کسی اور میں کم دیکھی گئی ہے۔

ایسا بہت کم ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کسی مسئلے پر دیر تک گفتگو یا بحث کرتے، باتیں بھی زیادہ مربوط و مسلسل نہ ہوتیں۔ تقریر میں بھی بہت کم ربط یا روانی ہوتی۔ فن تقریر کے جتنے شرائط اور تقاضے تھے ان کے احترام کے بجائے ان سے انحراف ملتا۔ ان کی تحریر پر نظر ثانی کرنے والے ایسے تھے جواب شاید کہیں اور نظر نہ آئیں، یعنی ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے ایک عامی جو مطلب نکال سکتا تھا یہ ماہرین اس کے برعکس نکالتے اور وہی ڈاکٹر صاحب کا مطلب ہوتا! ڈاکٹر صاحب اپنی روزانہ کی کثیر ڈاک سے کافی خطوط اور رمز شناس یا مزاج شناس ماہرین کے حوالے کر دیتے۔ ہدایت یہ ہوتی کہ کوئی Non-committal (جس کا ٹوٹا پھوٹا ترجمہ 'نا قابل گرفت' ہو سکتا ہے) جواب لکھ کر بھیج دیں۔ 'ہاں نہیں' کا یہ جواب بھیج دیا جاتا اور کارگر ہوتا۔ بایں ہمہ وہ اپنے مطالب کو واضح کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہے، دوست یا دشمن، موجود ہو یا غیر موجود۔ کوئی بھی ان کے کسی فیصلے یا انتظام کو اخلاقی یا قانونی نقطۂ نظر سے معرضِ بحث میں لاتا تو ڈاکٹر صاحب بحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیتے "ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔" آج بھی علی گڑھ میں بے تکلف احباب بحث سے اُکتا کر یا اس کو لطف سے ختم کر دینے کے لیے اس فقرے "ان باتوں میں کیا رکھا ہے" سے کام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے سیاق و سباق میں یہ فقرے جتنے تفریحی معلوم ہوتے ہیں تعدادی و تعدّی کی سیاست میں اتنے نہیں معلوم ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب کے کام کرنے کے طریقوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے اس خیال کو پیشِ نظر رکھیں جو تعجب نہیں۔ یقین کی حد تک پہنچ چکا ہو کہ مسلمانوں کی ہمہ جہت آبادکاری کا مسئلہ نارمل حالات کا نہیں بلکہ ایمرجنسی کے تحت آتا ہے اور بہت دنوں تک اسی سطح پر کام کرنا پڑے گا۔ اس لیے جو کچھ کیا جائے فی الفور کیا جائے، بھرپور کیا جائے اور ہر قیمت پر کیا جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال غلط تھا اس لیے ان کے طور طریقوں پر اتنا بدگمان نہ ہونا چاہیے جتنا ایمرجنسی کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب میں آدمی پہچاننے اور اس کو اپنا گرویدہ کرنے کی بڑی نادر صفت تھی۔ عموماً وہ بڑے آدمی سے زیادہ معمولی آدمی پر بھروسا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کا کوئی نہایت اہم اور رازداری کا کام لینا پڑتا تو سینئر اسٹاف کے بجائے ان کی نظر انتخاب معمولی درجے کے اراکین اسٹاف پر پڑتی۔ اس کو بالکل تاکید یا ہدایت نہیں کرتے تھے کہ وہ کسی احتیاط، دیانت یا دانش مندی سے کام لے، نہ یہ محسوس ہونے دیتے کہ اس کام کو سپرد کرنے میں اس کی طرف سے ان کو کسی طرح کا تذبذب یا تشویش ہے۔ اس کا اثر بڑا اچھا اور گہرا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنا اہم کام کس کے سپرد کیا ہے۔ کام دور اور دیر کا ہوتا۔ اس دوران میں اس کے متعلقین کی خبر گیری بذات خود اس طرح کرتے رہتے کہ اس کے خاندان والوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ ڈاکٹر صاحب مسلسل اس کے متعلقین کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صاحب جب کسی مشکل میں مبتلا ہوتے تو ان کے سینہ سپر یہی چھوٹے اور اوسط طبقے کے افراد ہوتے اور رہتے۔ کالج اور یونیورسٹی میں ان کے اونچے طبقے کے ساتھی بالعموم ان کے مخالف رہے۔ اس کا ایک سبب اور غالباً معمول بھی یہی ہے کہ اونچے طبقے کے افراد اس کے خواہش مند رہتے ہیں کہ چوں کہ وہ صاحب طبل و علم و مال و ملک ہیں اس لیے ''سجدۂ تعظیمی'' ان کا حق ہے لیکن ہوتا دراصل یہ ہے کہ پرستش ان کی ہوتی ہے جو پس ماندوں کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موخر الذکر میں تھے اس لیے وہ اصحاب کید و کبر کے رشک و رعونت کے تمام عمر شکار رہے لیکن نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت!

ڈاکٹر صاحب غصہ، نفرت یا مایوسی کے جذبات سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔ ان کی زبان سے کسی نے کوئی رکیک کلمہ نہیں سنا۔ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی کوئی سخت کلمہ نہیں کہا۔ کبھی برہم و بے زار نہیں پائے گئے۔ اس سے ان میں بے انتہا و بے تکان کام کرنے کی قوت آئی اور حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ فروعات میں پڑنے سے نجات مل گئی تھی اور مفید کاموں کے کرنے کا کافی وقت مل جاتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ ان کو یہ پہنچا تھا کہ وہ معمولی سے معمولی لوگوں کی معمولی سے معمولی باتوں سے خوش ہو جاتے۔ تکان اور تشویش کو دور کرنے اور اس سے بچے رہنے کا اس سے سستا اور مجرب نسخہ کوئی اور نہیں۔

کوئی تفریح کی بات یا برجستہ فقرہ سنتے تو بے اختیار خوش ہو جاتے، اور ہلکی سی گلوگیر ہنسی کے ساتھ حاضرین کی طرف دیکھتے جیسے فقرہ کہنے والے، اپنے اور حاضرین سب کے لیے داد کے خواست گار ہوں۔ ایسے موقع پر ہمیشہ کہتے "ذرا پھر کہیے گا" اس کے بعد پہلے کی طرح پھر اپنے انبساط کا اظہار کرتے۔ بڑے عالی ظرف، وضع دار اور چھوٹوں پر خاص طور سے شفقت کرنے والے تھے۔

ایک صاحب کو ڈاکٹر صاحب سے رنجش پیدا ہو گئی تھی۔ بات چیت، ملنا ملانا سب بند تھا۔ ان کی لڑکی کی شادی تھی۔ ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر تھے، تقریب میں مدعو نہیں کیے گئے، نکاح کے وقت دیکھتے ہیں کہ شاداں و فرحاں دائیں بائیں، کسی قدر جھومتے ہوئے، جواں کے چلنے کا خاص انداز تھا، چلے آرہے ہیں جو شخص سامنے آیا اس سے معذرت کرتے ہوئے کہ معاف کیجیے گا کام میں دیر ہو گئی۔ میزبان کو گلے لگایا، دولہا کے قریب بیٹھ گئے۔ بے تکلف ہو کر بات چیت کرتے اور چائے پیتے رہے پھر دعا اور مبارک باد دیتے ہوئے جس طرح آئے تھے ہنسی خوشی واپس تشریف لے گئے، میزبان جتنے شرمندہ ہوئے اتنے ہی شاداں و شکر گزار ہوئے، تعلقات میں جو کشیدگی آ گئی تھی وہ ہمیشہ کے لیے محبت و عقیدت مندی میں تبدیل ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے مسائل و مشکلات اتنی زیادہ اور پیچیدہ نہیں تھیں جتنی ملک کی آزادی کے بعد سامنے آئیں۔ ان میں سب سے زیادہ نامبارک و تشویش ناک سیاسی قسمت آزماؤں کی نا قابلِ انسداد ریشہ دوانیاں اور تباہ کاریاں ہیں۔ بایں ہمہ گذشتہ دور میں بھی علی گڑھ کی زندگی کے مخصوص تقاضے اور روایات تھیں جن سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا انھیں دشواریوں اور نزاکتوں کے پیشِ نظر یہ بات مان لی گئی تھی کہ علی گڑھ کی لیڈر شپ ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہیے جو علی گڑھ کا ساختہ پرداختہ، قوم کا معتمد ہو اور جو علی گڑھ کو بڑا بنانے، دیکھنے اور رکھنے کا حوصلہ اور قابلیت رکھتا ہو۔ یہ روایت ڈاکٹر صاحب کی قائم کی ہوئی ہے، اپنے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جسے علی گڑھ سے وابستہ مسائل اور مشکلات سے اتنی واقفیت رہی ہو جتنی

ڈاکٹر صاحب کو تھی۔ اراکین اسٹاف کے بھی راحت و رنج سے ڈاکٹر صاحب جتنے آگاہ رہتے تھے کوئی اور نہ تھا۔ علی گڑھ میں ہوتے تو کوئی ایسی شام نہ گزرتی جب ان کے یہاں کسی نہ کسی بورڈنگ ہاؤس کے کچھ طلبا اور ان کے وارڈن (اسسٹنٹ ٹیوٹر) چائے پر مدعو نہ ہوتے یا ڈاکٹر صاحب خود کسی نہ کسی بورڈنگ میں گھومتے پھرتے یا طلبا کی کسی تقریب میں شریک نہ ہوتے۔ اس طرح وہ طالب علموں اور ان کی ضروریات سے پورے طور پر براہ راست واقف رہتے، ان کے ہاں ہر کھانے پر یونیورسٹی یا باہر کا کوئی مہمان ضرور ہوتا۔ یہ بات اور تھی کہ مہمان معمولی ہو یا غیر معمولی، کھانا معمولی ہوتا۔ دستر خوان بھی جتنا وسیع ہوتا اتنا کھانوں سے آباد نہ ہوتا۔ بیش تر طلبا سے ڈاکٹر صاحب واقف ہوتے۔ ایک بار ایک طالب علم نے ان کو بتایا کہ اس کی تین پشت علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ پوچھا اپنے والد کا نام بتاؤ۔ اس نے بتایا تو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہا دادا کا نام بتاؤ۔ یہ معلوم ہوا تو خوش ہو گئے اور دادا کے طالب علمی کے کچھ واقعات سنائے جیسے وہ کل کی بات تھی۔ چنانچہ اسٹاف اور طلبا میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی مخالف ہی کیوں نہ ہوتا دل میں ان کی عزت محسوس کرتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے اور اس کے عزیزوں کے بارے میں کتنے اچھے خیالات رکھتے اور کس احترام و محبت سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا عملی سیاست کی طرف کوئی رجحان نہ تھا۔ ایک گفتگو یاد آتی ہے۔ کھانے پر مخلصوں کا ایک مختصر اتفاقی اجتماع تھا۔ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل و مقدر کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمانے لگے، نان کوآپریشن کی تحریک سے پہلے یوپی کی سیاست الٰہ آباد کی تین شخصیتوں کے گرد گھومتی تھی۔ ایک پنڈت سندر لال ہائی کورٹ کے مشہور وکیل، دوسرے پنڈت موتی لال نہرو، تیسرے سی وائی چنتامنی انگریزی روزنامہ لیڈر کے ایڈیٹر۔ گورنر اور ان کے مشیروں کو متاثر و متحرک کرنے اور رکھنے میں ان تین کا سب سے زیادہ دخل تھا۔ پنڈت سندر لال ہر تحریک و تجویز کے قانونی پہلوؤں کی دیکھ بھال رکھتے اور گورنر اور اس کی منتظمہ کو مطمئن رکھتے۔ پنڈت موتی لال نہرو کی شاہانہ ضیافت و مدارت سے حکومت کے اکابر ممنون و مسحور رہتے۔ چنتامنی اپنے اخبار سے رائے عامہ کو ہموار و سازگار رکھتے۔ کہتے

تھے کہ اس سہ گونہ گرفت سے کوئی گورنر اور اس کے مشیر باہر نہیں جا سکتے تھے۔ ہم میں شاید اس سے کسی کو اختلاف نہ ہو کہ سیاسی جبر واقتدار کا یہ نسخہ ہر زمانے اور ہر دور میں کارگر رہا ہے۔ صرف موسم اور مزاج کے اعتبار سے جہاں تہاں بعض اجزا کی کمی بیشی کر دی جاتی ہے۔ اقبال نے جس کی تعبیر یوں کی ہے:

''اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات ومنات''

سیاست کی وادی میں ڈاکٹر صاحب نے اس لیے قدم رکھے تھے کہ اس سے ان مقاصد مہمہ کے حصول میں مدد ملے گی جو ہمہ وقت اور تمام عمران کے پیشِ نظر رہے۔ یعنی علی گڑھ کی نیک نامی اور مسلمانوں کی خوش حالی مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلاف پیدا ہو جانے سے پہلے تک ڈاکٹر صاحب کا پروگرام کامیاب رہا۔ جوں جوں لیگ اور کانگریس میں کشیدگی بڑھتی گئی، ڈاکٹر صاحب سیاست سے پیچھے ہٹتے گئے۔

وہ علی گڑھ کو سیاسی فساد وفشار سے دور اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے وسیلے سے مسلمانوں کی آبادکاری بڑی محنت ومحبت سے کی تھی۔ اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ یہ ادارہ سیاست کے شور وشر کا شکار ہو جائے اور تمام امیدوں اور کیے دھرے پر پانی پھر جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی زمانے میں ایک تقریر کے دوران اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جو ہوا سو ہوا اب کانگریس سے مصالحت اور مفاہمت کر لینا بہتر ہوگا۔ یہ بات ارباب لیگ کے عتاب کا موجب ہوئی، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے بجائے کورٹ سے زاہد حسین صاحب وائس چانسلر منتخب کیے گئے۔

بہت دن گزرے سینئر ممبران اسٹاف میں ہندو، مسلمان، عیسائی، بودھ سبھی کا اجتماع ہو گیا تھا۔ ان میں تاریخ کے مشہور پروفیسر (سردار) کے۔ ایم۔ پانیکار تھے، جن کی شہرت، قابلیت اور حسن خدمات محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کے معترف تھے۔ کہتے تھے، سینئر ممبران اسٹاف میں اس وقت پانیکار جیسا ذہین، قابل، عقل مند، بے خوف اور متاثر ومسخر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان سے دوستی اور دشمنی اسی کو راس آئے گی جو ان ہی اوصاف کا حامل ہوگا۔ ہندوستان کے آئندہ مرقع میں پانیکار کے خدوخال نمایاں ہوتے

رہیں گے۔ اس ذکر کی یہاں کوئی ضرورت نہ تھی لیکن اس سے ڈاکٹر صاحب کی مردم شناسی کی صفت کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے شخص کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جس کی حیثیت اس وقت کچھ زیادہ قابل لحاظ نہ تھی، لیکن بعد میں ہندوستان کی سیاسی، علمی اور تہذیبی حیثیت و اہمیت کو مقبول و مرتفع کرنے میں اس کا بڑا نمایاں حصہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے سینئر ممبران اسٹاف کی مخالفت کو کبھی اہمیت نہیں دی وہ جانتے تھے کہ اس مخالفت میں خدمت اور خلوص کا اتنا نہیں جتنا دوسرے عوامل کا دخل تھا۔ ڈاکٹر صاحب کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے لیکن اس کا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے، ان میں نام کا بھی کوئی پندار نہ تھا۔ ان کو اپنے کاموں میں ایسا اعتقاد تھا اور ان میں ایسا شغف رکھتے تھے کہ کسی دوسرے کی مخالفت پر غور کرنے کی فرصت ملتی تھی نہ اس کی پروا کرتے تھے، اچھے کام کو وہ ہر وقت مخالفت و مخاصمت کے خلاف سپر سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو اردو سے کوئی عشق نہ تھا۔ وہ اس کا حق دینے میں ہنسی خوشی کبھی راضی نہیں ہوئے، فارسی و عربی سے بھی کچھ زیادہ الفت نہ تھی، لیکن ان مضامین کے سربراہوں کی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لطف یہ ہے اردو کو معمولی قانونی اہمیت یا اجازت نہ دینے میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے کٹر مخالفوں کی بھی تائید حاصل ہوتی جو اُن کی کسی اور تجویز کی جو کتنی ہی معقول کیوں نہ ہوتی نہ ملتی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اردو یا بعض اور مضامین کو یونیورسٹی کے Major Subject (بڑے درجے کے مضامین) کا درجہ دینے سے یونیورسٹی کی ساکھ گر جائے گی۔ اپنے پرووائس چانسلری کے عہد میں انھوں نے یونین کلب کے وائس پریسی ڈنٹ کو اس پر متنبہ کیا تھا کہ یونین میں انگریزی کے بجائے اردو مباحثوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہوتا کہ اردو کو یونیورسٹی مضامین کے درجے پر لانا قبل از وقت اور بعید از مصلحت تھا۔ جب یہ دلیل پیش کی جاتی کہ آج سے بہت پہلے ایک اردو یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور کامیابی سے چل رہی ہے جس میں وہ علوم و فنون بھی سکھائے پڑھائے جاتے ہیں جن کی ہمارے یہاں انگریزی زبان میں بھی تعلیم دینے کی ہمت نہیں

ہوتی تو بڑے لطف اور رازدارانہ لہجے میں فرماتے: "ریاستوں کی بات اور ہے، ہم کو اور آپ کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔"

قطع نظر اس کے کہ اردو اور انگریزی میں کس کا درجہ کیا تھا یا ہونا چاہیے تھا اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ انگریزی عہد حکومت میں اچھی انگریزی جاننا، لکھنا اور بولنا کالج اور یونیورسٹی کے طلبا پر بطور خاص لازم آتا تھا۔ اس میں مسلم یا غیر مسلم طالب علم یا تعلیم گاہ کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ علی گڑھ ہی نہیں بیش تر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے دیسی زبانوں سے کہیں زیادہ توجہ انگریزی پر صرف کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس کے وسیلے سے حکومت کے مختلف محکموں میں ذمے دار مناصب پر فائز ہونے کا امکان بدرجہا بڑھ جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی میں اچھی استعداد کے ساتھی طالب علموں میں بھی امتیاز کا باعث ہوتا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ اچھا کیرکٹر اور اچھا اسپیکر کسی نہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو کر رہے گا۔ اس کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں، میرا خیال ہے کہ یکسر منقلب حالات میں بھی کم و بیش انگریزی کی وہی کارفرمائی ہے۔

اکثر ایسے بھی مواقع آیا کرتے جب اردو کی حیثیت دفعتاً قابلِ رشک حد تک پہنچ جاتی۔ یعنی جب یونیورسٹی میں کسی بڑے آدمی کی تشریف آوری ہوتی یا ڈاکٹر صاحب الیکشن میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوتے، معزز مہمان اردو میں قصیدہ اور سپاس نامہ سن کر خود سراپا سپاس نامہ بن جاتے اور الیکشن کا پمفلٹ یا مینی فیسٹو پڑھ کر ووٹرس ڈاکٹر صاحب پر جاں نثاری اور حریف کی آبروریزی کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ جو اصحاب علی گڑھ میں کسی عالی مرتبت مہمان کی پذیرائی کا منظر دیکھ چکے ہیں وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسٹریچی ہال میں قصیدہ اور سپاس نامہ سن کر اور یونین میں چھت کے روشن دان سے گل ریزی کی رسم سے گزر کر مہمان فخر و فیروزی کے کس عالم میں پہنچ جاتا۔ تقسیم ملک اور آزادیِ وطن کے بعد اردو کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں جو سلوک دیکھنے میں آرہا ہے وہ ایک عجیب المیہ ہے۔ تفصیل میں کون جائے اور تفصیل سننے کی ضرورت یا فرصت کسے۔ عمر کا بہترین اور طویل ترین حصہ اردو کے ساتھ اور اردو کے لیے گزارنے کے بعد اس سے

دور، اور علاحدہ رہنا ممکن نہیں رہا۔ ایک زمانے میں سب سے زیادہ روشن خیال وہ سمجھا جاتا تھا جو خدا کا قائل نہ ہو۔ آج سب سے بڑا محبِ وطن وہ ہے جو اردو کا دشمن ہو۔ دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ اردو ہر جنگ میں تکبیر کا کام دیتی ہے، اور ہر جیت میں تاوان کا!

کم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ حیثیتوں میں، زیادہ مشکل حالات میں اور زیادہ مدت تک علی گڑھ کی خدمت کی ہوگی۔ طالب علم، پروفیسر، پرنسپل، پرووائس چانسلر، ممبر مجلس واضعانِ قانون، ریلوے بورڈ، یونیورسٹیوں کی مجالس تعلیمی و منتظمہ اور متعدد چھوٹے بڑے تعلیمی اور رفاہی اداروں کے رکن، انھوں نے جو خدمات جن سطحوں پر جن مہمات میں اور جس پیمانے پر انجام دیں ان میں ان کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ مسلمان جس حال کو پہنچ گئے تھے، اور جن مشکلات کا ان کو سامنا تھا اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سر سید نے علی گڑھ کی تاسیس اور ڈاکٹر صاحب نے اس کی تبلیغ و توسیع اور تنظیم نہ کی ہوتی تو مسلمان عزت اور فراغت کی وہ زندگی بسر نہ کر سکتے جو اُن کو میسر آئی۔

ڈاکٹر صاحب میں سر سید جیسی آئیڈیلزم (مثالیت، عینیت) تو نہ تھی لیکن مسلمانوں کو طرح طرح کی جن دشواریوں اور نزاکتوں کا سامنا تھا اس کا احساس اور اندازہ ان سے زیادہ شاید ہی کسی اور کو رہا ہو۔ وہ بڑے عملی اور حقیقت پسند تھے۔

اس ادارہ اور مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کے کاموں کو اس طرح اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے جیسے حالات نارمل نہیں، بلکہ ایمر جنسی کے ہوں۔ اس میں ان کو ہمیشہ غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی! ڈاکٹر صاحب بغیر کسی نمائش کے بڑے مذہبی تھے، علمائے کرام، صوفیہ اور مشائخ کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔

یہ حضرات بھی مسلمانوں کے تمام دوسرے چھوٹے بڑے لیڈروں سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کا لحاظ کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے کوئی ایسا کلام کبھی سننے میں نہیں آیا جو دین اور دین داروں کی سبکی کا باعث ہوتا۔ باطن کا حال اللہ جانتا ہے جس کی شہادت حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے شعائر

اسلام کا ہر موقع پر پورا احترام ملحوظ رکھا تھا۔ ان کو دو بدو ناز یبا کلمات سنا دینے کا بعض طبائع کو تامل نہیں ہوتا تھا، لیکن آخر وقت تک کسی فرعون یا مسخرے کی ہمت نہ ہوئی کہ دین یا ائمہ دین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کوئی ناشائستہ کلمہ زبان سے نکال سکتا اور یہ سب باوجود اس کے کہ ڈاکٹر صاحب دین اور دین داری کے نہ بلند بانگ مبلغ تھے نہ ہمہ وقت محتسب!

وہ تعلیم و تربیت اور مذہب و اخلاق کے آئین و حکمت سے پورے طور پر آشنا تھے جیسے اس زمانے کے شریف و شائستہ مسلمان بالعموم ہوا کرتے تھے، لیکن کسی کا اظہار یا اعلان جارحانہ طور پر نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے موقف و مقاصد کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے نفاذ اور نتائج اور مسلمانوں کے مستقبل کا نقشہ بھی ان کے سامنے تھا۔ وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ جب تک تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کے لیے مناسب معاشی خوش حالی کے وسائل نہ مہیا ہوں گے اور حکومت کی مشین میں پاور اور کل پرزے کی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے اور رکھنے پر قادر نہ ہوں گے، وہ نہ اچھے مسلمان رہ سکتے ہیں نہ اچھے شہری۔ وہ اپنے اس خیال پر شروع سے آخر تک قائم رہے اور جب تک ہو سکا مسلمان نوجوانوں کو حکومت میں حصہ لینے اور پانے کی سہولتیں فراہم کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس پالیسی اور پروگرام اور اس کی کامیابی پر علی گڑھ کے نکتہ چینیوں نے سرسید اور علی گڑھ کو کلرکی اور حکومت کے کاسہ لیسوں کا ورک شاپ قرار دیا تھا۔ حالات اور حکومت کے بدل جانے سے معلوم نہیں ہمارے دوستوں کا کلرکی اور کاسہ لیسی کا تصور بدلا یا نہیں۔ کاسہ لیسی اب اتنی پستی نہیں رہی جتنی پالیسی یا پروگرام جس کا سہارا کبھی رعایا لیتی تھی اب رعایا سے کہیں بہتر و برتر لوگ لیتے ہیں۔ دوسری طرف علمائے کرام تھے جو سرسید اور علی گڑھ کو اسلام سے منحرف قرار دیتے تھے، اور آج تک اس ماتم یا ذکر خیر سے فارغ نہیں معلوم ہوتے۔ غالباً نپولین کا قول تھا کہ فوج پیٹ کے بل پر آگے بڑھتی ہے۔ سرسید اور ڈاکٹر ضیاء الدین کا اس پر اعتقاد تھا کہ فوج ہی نہیں، مذہب اور اخلاق بھی پیٹ کے بل پر آگے بڑھتے ہیں۔ نپولین سرسید اور ڈاکٹر ضیاء الدین

سے قطع نظر، ہندوستان کی روح وضمیر کے شاعر ٹیگور نے اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے جہاں انھوں نے کہا ہے کہ عقاب کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ پرواز کرے، کھانے پینے کے لیے اسے زمین ہی پر اُترنا پڑے گا۔

مہارشی ٹیگور کے ضمن میں سرآسوتوش مکرجی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ سرآسوتوش کا نام اور مرتبہ غیر منقسم بنگال اور کلکتہ یونیورسٹی کے نامور سربراہ کی حیثیت سے اتنا معروف ہے اور اس احترام سے لیا جاتا ہے کہ ان کے تعارف میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بنگال اور اہلِ بنگال کو سربلند کرنے اور ان میں مغربی تعلیم کو ترقی دینے اور مقبول بنانے میں ان کا نام بنگال کی مایۂ ناز شخصیتوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ان کا اتنا ہی گہرا تعلق رہا ہے جتنا ڈاکٹر صاحب کا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔ دونوں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے ممبر تھے۔ اس طور پر دونوں کی قومی اور تعلیمی خدمات میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے باوجود ان تمام غیر معمولی اور گراں قدر تہذیبی، ذہنی اور اقتصادی ترقیوں کے جو اہالیان بنگال کو شروع سے میسّر ہیں، سرآسوتوش برابر اس کے قائل، کوشاں اور داعی رہے کہ بنگالی طلبا اور نوجوان، حکومت کی چھوٹی بڑی آسامیوں پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں فائز رہیں۔ دفتروں میں بابو کی اصطلاح بنگال ہی نے دی ہو تو عجب نہیں۔ یوں کلمۂ تعظیم کی رُو سے دور دور تک عام ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں، جسے بحیثیت مجموعی حکومت کہہ سکتے ہیں، موثر حصہ لینا یا پانا یا اس کی کوشش کرنا بامقصد اور باعزت شہری یا شہریت کے لیے لازمی ہے۔ علی گڑھ کے وسیلے سے ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبا کی آبادکاری، کارسازی اور حیثیت افزائی کا جیسا بے مثل اور گراں قدر رول پیش کیا ہے۔ وہ نسلاً بعد نسلٍ فخر اور شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ واصل الی اللہ کرا دینے والوں کی ہماری قوم ملک اور تاریخ میں کبھی کمی نہیں رہی۔ لیکن علم، انسانیت، خدمت اور جدوجہد کی زندگی سے واصل کرنے اور رکھنے میں موجودہ صدی میں سرسید سے بڑا کوئی اور شخص نظر نہیں آتا اور سرسید کے مشن اور مقصد کو مقبول، مستحکم اور بارآور رکھنے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی خدمات کو ہم میں سے کوئی کبھی نظر انداز نہ کر سکے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کو خیال آیا کہ جنگی ضرورتوں کی بنا پر بہ کثرت کارخانے کھلیں گے، اشیا فراہم کی جائیں گی ان کے لیے انجینئرنگ مکینک اور مخصوص مہارت کے کاریگر درکار ہوں گے۔ مسلمان انجینئر اور کاریگر بہت کم ہیں۔ اگر ان کی فراہمی کا جلدی کوئی بندوبست کر دیا جائے تو یونیورسٹی اور اس کے طلبا کو بیش از بیش نفع پہنچے گا۔ چنانچہ انجینئرنگ کالج کو معرض وجود میں لانے کا اہتمام شروع ہو گیا۔ وہ زمانہ یاد آتا ہے، نہ سرمایہ تھا نہ سامان، نہ اسٹاف نہ کلاس روم یا ورک شاپ، مگر وہ سب ہونے لگا جیسے سب کچھ تھا۔ جہاں پر جو جگہ، کمرہ، برآمدہ، احاطہ مل گیا وہ لکچر روم ورک شاپ یا گودام قرار دے دیا گیا۔ یونیورسٹی کے شعبوں میں سے کسی میں انجینئرنگ کے شعبہ کی شباہت یا شبہ نظر آیا وہاں کے معلموں کو جز وقتی طور پر نوزائیدہ انجینئرنگ کالج کی خدمت کے لیے لے لیا گیا، اور کام چل نکلا۔ انجینئرنگ کے پورے نصاب کے لیے غالباً 5-4 سال درکار تھے۔ کچھ جنگ کے مطالبے اور بہت کچھ ڈاکٹر صاحب کے مصالح اور ہیر پھیر سے یہ مدت تین سال کر دی گئی۔ حکومت کو جنگ میں کامیابی کی بشارت دے کر اور ٹھیکے داروں کو گورنمنٹ کے بڑے ٹھیکوں اور خطاب کی امید دلا کر کام چلاؤ عمارتیں ادھر اُدھر بننے سے زیادہ نمودار ہو گئیں۔ پریکٹیکل کی مدت اس لیے حذف کر دی گئی کہ جنگ میں کارآمد اشیا کی تیاری کے لیے کارخانوں میں کام کرنا یونیورسٹی اور کالج کے ورک شاپ میں کام کرنے سے قابلِ ترجیح تھا۔ کچھ ہی عرصے میں انجینئرنگ کالج کو وہ درجہ ملا جو ملک کے اچھے سے اچھے کالجوں کو نصیب تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ بہتوں سے کم عمر تھا اور ایسی بے سروسامانی کی حالت میں وجود میں آیا جس میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی دوسرا انجینئرنگ کالج ظہور میں آیا ہو گا۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا جہاں گئے جو کام سپرد کیا گیا اس کو اس خوبی سے انجام دیا کہ مسلم یونیورسٹی انجینئرنگ کالج کی تعلیم، اساتذہ، طلبا اور یہاں کے امتحانوں کے معیار اور طلبا کے ڈسپلن کو ہر چھوٹے بڑے نے سراہا۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے، ڈاکٹر صاحب کو سیاسی مسائل و معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ کلیتاً تعلیم تربیت کے آدمی تھے۔ تمام عمر ان ہی خطوط پر سوچتے

اور عمل کرتے رہے۔ ان کی خدمات علی گڑھ کی تاریخ میں بھلائی یا جھٹلائی نہ جاسکیں گی، مثلاً کالج پر نان کوآپریشن کی یورش کا کامیابی سے مقابلہ، ناسازگار حالات اور ناموافق شرائط پر مسلم یونیورسٹی کو قبول کرنا لیکن اس کو مسلسل رُو بہ ترقی رکھنا، انجینئرنگ کالج کا قیام اور میڈیکل کالج کی تحریک و تاسیس کو بروئے کار لانے کا اقدام و اہتمام، میڈیکل کالج کی مہم کو سر کرنے میں ڈاکٹر صاحب کے دستِ راست، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر سید ہادی حسن مرحوم تھے۔ ہادی صاحب فارسی کے مشہور اسکالر اور پروفیسر اور انگریزی و فارسی کے بے مثل مقرر تھے۔ بلا کا حافظہ تھا جس کا تقریر میں اظہار ہوتا تو سامعین مبہوت رہ جاتے۔ خوش رُو، خوش آداب، خوش طبع، خوش باش اور جامہ زیب تھے۔ جہاں پہنچ جاتے ہر چھوٹے بڑے کو اپنا لیتے۔ نواب محسن الملک کے خاندان سے تھے اور حیدرآباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اشراف سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت دنوں تک اس یونیورسٹی کی شہرت و شائستگی کا نشان بنے رہے۔ ان کی وفات سے یونیورسٹی کی وہ رونق ختم ہوگئی جسے ہادی صاحب کہتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ اور کبھی کبھی تنہا سارے ہندوستان کا دورہ کرکے جس طرح چالیس پچاس لاکھ روپے کم سے کم مدت میں میڈیکل کالج کے قیام کے لیے اکٹھا کرلیے تھے اس سے اس زمانے کی یاد تازہ ہوتی تھی جب مسلم یونیورسٹی کے لیے چندہ فراہم کرنے سر آغا خاں اور علی برادران ہندوستان میں دورہ کرتے تھے اور اس تحریک کی شہرت سارے ہندوستان میں تھی۔

انجینئرنگ کالج کی طرح ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں میڈیکل کالج کے قیام کا خیال بھی دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں آیا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے گورنمنٹ سے وہ وسیع مرتفع پرانا قلعہ اور ملحقہ اراضی بھی حاصل کرلی تھی جو یونیورسٹی کے شمال میں تھوڑی دور پر واقع ہے۔ جدید ترین معیار کے مطابق ایک اعلیٰ درجے کے میڈیکل کالج کی تاسیس کے لیے ہندوستان کے نام ور ڈاکٹروں کی مدد سے مکمل اسکیم کا خاکہ تیار کرالیا تھا۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر امریکن سرپلس اسٹورز (American Surplus Stores) سے ڈاکٹر صاحب نے اس زمانے میں ایک لاکھ سے اوپر نہایت قیمتی کم یاب اور کارآمد

سامان بڑے سستے داموں پر خرید کر کے جمع کر لیا تھا۔ اسی طرح عمارت کے لیے سیمنٹ اور لوہے کی سلاخیں بھی کثیر مقدار میں فراہم کر لی تھیں جو لڑائی کا زمانہ ہونے کے سبب سے بڑی مشکل سے محدود مقدار میں دستیاب ہوتی تھیں۔ میڈیکل کالج کے التوا میں پڑ جانے سے یہ تمام سامان سالہا سال ضرورت کے وقت میں کام آتا رہا۔ انھوں نے گورنمنٹ سے ایگریکلچر فارم اس لیے حاصل کر لیا تھا کہ اس میں یونیورسٹی کا زراعتی کالج قائم کیا جائے گا یہ سلسلہ کچھ چلا لیکن بعض مجبوریوں کے باعث گورنمنٹ کو واپس کر دینا پڑا۔

اس کا افسوس رہے گا کہ میڈیکل کالج کی تاسیس و تشکیل ڈاکٹر صاحب کے عہد میں نہ ہو سکی۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا المیہ نہیں ہے بعد میں آنے والوں کا بھی ہے۔ زاہد صاحب کے بعد نواب محمد اسماعیل صاحب نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی ذمے داری سنبھالی تو ڈاکٹر صاحب نے نواب صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ موصوف مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ صرف میڈیکل کالج کو قائم کر دینے اور چلا دینے کا انصرام ڈاکٹر صاحب کو تفویض کر دیں۔ نواب صاحب نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ اس کے بعد میڈیکل کالج کا مسئلہ کچھ اس طور پر معرضِ التوا میں آیا اور آتا رہا کہ ذاکر صاحب کے عہد میں بھی روبراہ نہ ہو سکا۔ اگر میڈیکل کالج ڈاکٹر صاحب کی درخواست کے مطابق وجود میں آجاتا تو شاید ان کو بہت سی مایوسیوں کا سامنا نہ ہوتا جن کا ہوا۔ اچھے اور ضروری کاموں کو لیت و لعل یا معرضِ التوا میں رکھنے سے ان کے فیض و فوائد معدوم نہیں تو محدود ہو جاتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے میڈیکل کالج کی اسکیم کو ترقی و تکمیل کی حد تک نہ پہنچا دیا ہوتا جس کے بعد اس کا سرکاری طور پر باضابطہ اعلان و نفاذ باقی رہ گیا تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس یونیورسٹی میں ایک میڈیکل کالج قائم بھی ہو سکتا یا نہیں، اور قائم بھی ہوتا تو کب اور کیسا۔ انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج کے قیام سے ہماری یونیورسٹی کی اہمیت و قدر و قیمت میں جیسا بیش بہا اضافہ ہوا اس میں محکمی آئی اور قوم و ملک کے سود و بہبود کا سرچشمہ قرار پائی اس کا ہر شخص کو احترام ہے۔ یہ کارنامے ڈاکٹر صاحب کے ہیں۔ علی گڑھ کی طرف سے ملک و قوم کو ڈاکٹر صاحب کی یہ قیمتی پیش کش ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب کے شب و روز اور آج کے لیل و نہار میں بڑا فرق ہے۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اس کی شدت اور تواتر آئندہ بڑھتا رہے گا، البتہ ایک چیز خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔ پہلے ہم ناسازگار حالات میں بھی پُرامید رہتے تھے۔ اب سازگار حالات میں بھی پُر اندیشہ رہنے لگے ہیں۔ اس کے اسباب پر جتنا سب کو اتفاق ہے اس کے علاج پر اتفاق یا اختیار نہیں ہے۔ موجودہ نسل کا بہت بڑا مسئلہ اور خطرہ ہے اور زندگی کے برتنے میں یہ فرق معمولی فرق نہیں ہے۔ اس طویل زمانے میں جب ڈاکٹر صاحب اس ادارے کے سربراہ رہے، چھوٹے بڑے حادثے اکثر پیش آتے رہے۔ آج کی طرح پہلا سوال یہ نہیں ہوتا تھا کہ پولیس کدھر ہے اور فوج کہاں ہے؟ بلکہ یہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کدھر ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہمیشہ یہی معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب باخبر، موجود اور برسرِ عمل ہیں۔ یہ معلوم کر کے سب اپنی اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے۔ خطرے کے وقت یونیورسٹی کی پوری بستی کا ایک شخص واحد پر اتنا بھروسہ کرنا اور رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس دلیری اور احساسِ ذمے داری کا سرچشمہ کہیں اور تھا جواب شاید نایاب و نایافت ہے۔

۱۹۴۷ء اور اس سے کچھ پہلے قتل و غارت گری کا جو عالم تھا وہ کسے نہیں معلوم۔ یونیورسٹی بڑی درماندگی اور اضطراب کے عالم سے گزر رہی تھی۔ علی گڑھ اور دہلی کے درمیان ٹرینوں پر دردناک حادثے وقوع میں آ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب فوج کے اعزازی لفٹنٹ کرنل بھی تھے۔ یونیورسٹی میں اس کے یونی فارم میں شاید ہی کبھی دیکھے گئے ہوں۔ اس تہلکے کے زمانے میں وہ برابر یونی فارم میں دہلی اور علی گڑھ کے درمیان سفر کرتے رہے جیسے پٹرول ڈیوٹی پر ہوں۔ کہتے باوجود عام بدامنی اور بدنظمی کے اب بھی پولیس، فوج اور پبلک، یونی فارم کا احترام کرتی ہے اور قتل و غارت گری کی روک تھام میں اس سے مدد ملتی ہے۔ صبح کی گاڑی سے دہلی کے لیے روانہ ہو جاتے۔ وہاں تمام دن اس ادارے کے تحفظ کی تدابیر میں معلوم نہیں کہاں کہاں کے چکر لگاتے۔ شام کو علی گڑھ واپس آ جاتے اور رات گئے تک حکام ضلع سے گفتگو کا سلسلہ قائم رہتا۔ کئی ہفتے یہی پروگرام رہا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب سے کم عمر اور زیادہ توانا شخص بھی تردّد اور تگ و دَو کے اس فشار کا شاید ہی متحمل ہو سکتا ہے۔

لیکن وہ کسی وقت تھکے ہارے یا مایوس وملول نہیں پائے گئے۔ ان کو جیسے اس کا یقین ہو کہ وہ ہر دشواری پر قابو پالیں گے اور کیسے کہا جائے کہ یہ یقین غلط تھا۔ اس لیے کہ ہر وہ شخص جو ان کے قریب تھا جانتا تھا کہ وہ ہر خطے پر کرائسس کا کامیابی کے ساتھ سامنا کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بظاہر غیر معمولی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان میں کشش اور کرامات کے بھی آثار نہیں معلوم ہوتے تھے۔ لیکن تھا یہ کہ وہ غیر معمولی حد تک معمولی نظر آتے ہوئے غیر معمولی حد تک غیر معمولی حالات وحوادث پر قابو پالینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اپنے غیر معمولی طویل زمانۂ اختیار میں اس ادارے اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے جتنے منصوبے ڈاکٹر صاحب نے بنائے ان میں ان کو زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ ریکارڈ سر سید کے بعد ہندوستان میں شاید ہی کسی اور مسلمان لیڈر کے حصے میں آیا ہو!

ایک موقع پر ایک عزیز نے یہ سوال کیا کہ آخر اس کا کیا سبب تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اچھا بتانے والے جتنے لوگ تھے اتنے ہی برا سمجھنے والے بھی تھے! اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ اس شخص کے بھلا یا برا ہونے کی اتنی پہچان نہیں ہے جتنا اس کے غیر معمولی ہونے کی۔ اس کے بعد دیکھنا چاہیے اچھا یا برا جاننے والے کس قرینے یا قماش کے لوگ تھے۔ مثلاً صاحب ثروت واقتدار یا رہین ستم ہائے روزگار۔ ڈاکٹر صاحب کو بُرا کہنے والے عموماً اوّل الذکر تھے۔ موخر الذکر ہمیشہ ان کے دعاگو اور شکر گزار رہے اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب تمام عمر درماندہ کے حامی ومربّی رہے۔ صاحبِ ثروت واقتدار کے فتووں کو انھوں نے ہمیشہ ناقابلِ التفات سمجھا اور ٹھیک سمجھا۔

جیسا کہ پچھلے اوراق میں کہیں ذکر آچکا ہے، ڈاکٹر صاحب کے فردِ اعمال کا سب سے بڑا جرم انگریز پرستی یا حکام دوستی بتایا جاتا ہے۔ اپنے وقت کے مسلمانوں کو افلاس وادبار سے نکالنے اور عزت وفراغت تک پہنچانے میں ڈاکٹر صاحب کا خالصتاً للہ یہ عمل یا طرز کار سیآت میں نہیں بلکہ حسنات میں آتا ہے۔ جس کا اجر غریب اور کسمپرسی کے جذبۂ شکر گزاری اور اللہ تعالیٰ کے کرم بے حساب کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ صاحبان اثر واقتدار کے افعال واقوال جن کا وزن ووقعت اللہ کی ترازو میں جتنا اور جیسا کچھ ہوگا اس کا اندازہ لگانا

مشکل نہیں ہے۔ آج غریب کا آدمی بننا جتنا آسان، پُر منفعت اور شہرت بخش ہے اتنا ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں نہیں تھا۔ اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے!

ملک تقسیم ہوگیا۔ وطن آزاد ہوا لیکن ہم غلام رہے یا وسیلے بن گئے اُن نامبارک قوتوں کے جو اس آزادی کے ساتھ آزاد ہو جائیں۔ آزادی سے بڑی نعمت نہیں اگر اس کی ذمے داری کا احساس ہو اور اس سے بڑی آفت نہیں اگر یہ ذمے داری کے احساس سے خالی ہو۔

ڈاکٹر صاحب علی گڑھ کو خدا حافظ کہہ کر انگلستان چلے گئے اور وہاں سے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ جہاں نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ چوں ہے نہ چرا۔ ان کا علی گڑھ کو خدا حافظ کہنا کوئی بندھا ٹکا فقرہ نہ تھا بلکہ ایک انجام کا اندیشہ اور اس کے لیے صمیم قلب سے ایک دعا تھی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے یا ایسا ہی ہوا بھی کہ علی گڑھ سے باہر اور علی گڑھ کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ یونیورسٹی کو آخری بار ہمیشہ کے لیے چھوڑتے وقت کیا عجب انھوں نے محسوس کیا ہو کہ اس پر کیسا وقت آنے والا ہے اور اس کے بچانے یا بیچ ڈالنے والے کون ہوں گے اور کہاں ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب جذباتی نہ تھے۔ لیکن علی گڑھ سے ان کو جو لگن تھی، تمام عمر کی لگن و جذبات کی نمی و نرمی بغیر نہ پیدا ہو سکتی تھی نہ قائم رہ سکتی تھی۔ دور دراز دیارِ غیر میں مرض الموت میں ان کے دل میں کچھ حسرتیں کچھ تمنائیں اُبھری ہوں گی۔ کس کے نہیں ابھرتیں، لیکن خیال ہوتا ہے علی گڑھ کے لیے کچھ کم نہ ہوں گی۔ اس لیے کہ وہ تمام عمر ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور آرزوؤں کا مرکز رہا۔ علی گڑھ کو انھوں نے جیسا پایا، جس طور پر بنایا، بچایا اور بڑھایا، بارگاہِ الٰہی میں اس کو اپنی خدمت اور عبادت کے طور پر پیش کیا ہوگا۔ مرضیِ الٰہی ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمے داری سپرد کرتی ہے اور اسی ذمے داری کو پورا کرنے یا نہ کرنے کے اعتبار سے اس کو صلہ دیتی ہے، یا باز پُرس کرتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بارگاہِ الٰہی سے کیسی سرفرازی نصیب ہوئی ہوگی۔

....

۴۰ سال ہوئے دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے علی گڑھ کے نامور فرزند، ہر معرکہ کے مجاہد اور ہر محفل کے محبوب، مولانا محمد علی

انگلستان گئے تھے جہاں انھوں نے تاریخی فقرہ کہا تھا کہ وطن کی آزادی لے کر واپس جاؤں گا یا جان جاں آفریں کے سپرد کردوں گا۔ آزادی نہیں ملی، اور محمد علی اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ میت بیت المقدس لے جائی گئی اور جوار اقصیٰ میں سپرد خاک کی گئی۔ ملت کے کیسے مجاہد کو اس کے مالک نے کیسی سرفرازی بخشی۔ اس اقصیٰ کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

"وہ خدا عجز و درماندگی سے پاک ہے جو اپنے بندے (محمدؐ) کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے دنیا و دین کی برکتیں دے رکھی ہیں اور اس کے جانے سے مقصود یہ تھا کہ ہم اپنی قدرت کے چند نمونے معائنہ کرائیں....."

اس مقدس سرزمین میں ہزاروں انبیائے کرام مبعوث ہوئے، پیام رحمت وراستی سے دلوں کو روشنی و تازگی بخشی، زندگی کو برگزیدہ و بابرکت بنایا اور واصل بحق ہوئے۔ اتنی پاک ہستیاں، ان کی یادیں اور یادگاریں شاید ہی دنیا کے کسی اور خطے میں مدفون و منور ہوں۔ شب معراج میں سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرش اعلیٰ کی طرف صعود فرمانے سے پہلے یہاں انبیائے مرسلین کی روحوں کی نماز میں قیادت فرمائی۔ اس سے اس امر کی مزید تصدیق ہوئی کہ حضور اکرم اشرف الانبیا اور خاتم المرسلین تھے، نیز یہ کہ معراج جو تنہا شرف رحمۃ للعلمین کے حصے میں آیا، حضور ہی کے طفیل اس کی سعادت ظلی تمام انبیا و مرسلین کو نصیب ہوئی جو اس نماز میں شریک تھے جس طرح حج کا ثواب و شرف ان لوگوں کے بھی حصے میں آتا ہے جن کی طرف سے کوئی دوسرا یہ فریضہ ادا کرائے، شب معراج میں حضور کا حضرت ام ہانیؓ کے مکان سے براہ راست عرش اعظم کی طرف صعود فرمانا بھی ممکن تھا۔ مسجد اقصیٰ سے ہو کر جانے میں ممکن ہے یہ مصالح بھی پیش نظر رہے ہوں۔

۲۴ سال ہوئے ہندوستان کو آزادی ملی۔ ڈاکٹر صاحب وطن سے انگلستان چلے گئے جیسے وہ آزادی ان کے لیے نہ رہی ہو، وہاں جاں بحق ہو گئے۔ سولہ سال پہلے یہی حادثہ محمد علی کو پیش آیا تھا اور ان کے جسدِ خاکی کو بیت المقدس پہنچایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی میت علی گڑھ کے بیت المقدس میں لائی گئی اور سرسید کے پہلو میں سپرد خاک کی گئی ان طلبا کے

ماتم ومیمنت اور احترام وعقیدت کے ساتھ جن کی خدمت وخیر خواہی اور فراغت وفراغ کے لیے مرحوم نے اپنی تمام عمر صرف کردی تھی۔ سرسید کے پہلو اور پائیں میں جگہ پانے کے صرف ڈاکٹر صاحب مستحق تھے انھوں نے سب سے زیادہ اپنے سردار کے کاموں کو آگے بڑھانے اور بارآور کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں تمام عمر وقف رکھی تھیں۔

یونیورسٹی کی مسجد میں داخل ہوتے ہی اس کی فضا، اس کی روایات اور اس میں صاف، ستھرے، پاکیزہ خیال وخصائل اپنے طلبا کو نماز پڑھتے دیکھ کر اور اس میں مدفون گراں مایہ ہستیوں کی یاد سے دل طرح طرح سے شادماں ہوتا اور سکون پاتا ہے۔ پھر ذہن میں وہ آیت جگمگانے لگتی ہے، جو مسجد کے بیرونی دروازے کی پیشانی پر کندہ ہے، جس میں مسجد کا یہ تصور پیش کیا گیا ہے:

"..... ہاں وہ مسجد جس کی بنیاد شروع دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے اس کا البتہ حق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو کر امامت کیا کرو کیوں کہ اس میں ایسے لوگ ہیں جو خوب صاف ستھرے رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب صاف ستھرے رہنے والوں کو پسند کرتا ہے....."

کتنی عجیب بات ہے کہ اس کتبے کی تائید وتکریم اس عربی عبارت سے ہوتی ہے جو وکٹوریہ گیٹ پر نقش ہے اس کا مفہوم یہ ہے:

"قوم کے بزرگوں اور معزز لوگوں نے جو غفلت کے اندھیرے کے لیے مثل چراغوں کے ہیں ایک عالی شان مکان بنایا ہے، جس کی بنیاد تقویٰ الٰہی پر ہے تاکہ اس میں علوم دینی اور دنیوی سکھائے جائیں اور عالم کے اخلاق مہذب اور شائستہ بنائے جائیں۔ ان لوگوں نے اللہ کی راہ میں کما حقہ، کوشش کی ہے اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک کوشش کی جزا دے اور اجرِ عظیم عطا کرے۔"

پھر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مدرستہ العلوم کے تصور وتاسیس میں مسجد تقویٰ، مسجد اقصیٰ اور مسجد قرطبہ سب کی فضا اور فیضان پیوست ہو— ڈاکٹر صاحب یہیں آسودۂ رحمت ہیں۔ ●

مرزا چپاتی

خدا بخشے مرزا چپاتی کو، نام لیتے ہی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھیں، لمبا قد شانوں پر سے ذرا جھکا ہوا، چوڑا اشفاف ماتھا، تیموری داڑھی، چنگیزی ناک، مغلئی ہاڑ۔ لڑکپن تو قلعے کی در و دیوار نے دیکھا ہوگا۔ جوانی دیکھنے والے بھی ٹھنڈا سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ڈھلتا وقت اور بڑھاپا ہمارے سامنے گزرا ہے۔ لٹے ہوئے عیش کی ایک تصویر تھے۔ رنگ روغن اُترا ہوا محمد شاہی کھلونا تھا جس کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ دلّی کے آخری تاج دار ظفر کے بھانجے تھے۔ ضرور ہوں گے۔ پوتڑوں کی شاہ زادگی ٹھیکروں میں دم توڑ رہی تھی، لیکن مزاج میں رنگیلا پن وہی تھا۔ جلی ہوئی رسّی کے سارے بل گن لو۔ جب تک جیے پرانی وضع کو لیے ہوئے جیے۔ مرتے مرتے نہ کبوتر بازی چھوٹی، نہ پتنگ بازی۔ مرغے لڑائے یا بلبل، تیراکی کا شغل رہا یا شعبدے بازی کا۔ شطرنج کے بڑے ماہر تھے۔ غائب کھیلتے تھے خدا جانے غدر میں یہ کیوں کر بچ گئے اور جیل کے سامنے والے خونی دروازے نے ان کے سر کی بھینٹ کیوں نہ قبول کی؟ انگریزی عمل داری ہوئی، بدامنی کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو مراحم خسروانہ کی لہر اُٹھی۔ خاندان شاہی کی پرورش کا خیال آیا، پنشنیں مقرر ہوئیں مگر برائے نام۔ ساڑھے تیرہ روپے مرزا چپاتی کے حصے میں آئے۔ اللہ اللہ کیا زمانے کا انقلاب ہے، ایک ذرا سے چکر میں تقدیر ہزار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

لیکن صاحب عالم مرزا فخر الدین عرف مرزا فخرو الملقب بہ مرزا چپاتی نے مردانہ وار زندگی گزاری۔ گھر بار جب بھی ہوگا، ہوگا۔ ہماری جب سے یاد اللہ ہوئی دم نقد ہی دیکھا۔ قلعے کی گود میں بازیوں کے سوا اور سیکھا ہی کیا تھا جو بگڑے وقت میں آبرو بناتا۔ اپنے والد رحیم الدین حیا سے ایک فقط شاعری ورثے میں ملی تھی۔ پڑھنا لکھنا آتا نہ تھا، پھر زبان توتلی۔ مگر حافظہ اس بلا کا تھا کہ سو سو بند کے مسدس از بر تھے۔ کیا مجال کہ کہیں سے کوئی مصرع بھول جائیں۔ گویا گراموفون تھے کوک دیا اور چلے۔

حاضر دماغ ایسے کہ ایک مرتبہ دہلی کی مشہور ڈیرہ دار طوائف دوتی جان جو ادھیڑ عمر کی عورت ہو چکی تھیں کہیں سامنے سے آتی نظر آئیں۔ انھیں دیکھ کر مرزا کے کسی دوست نے کہا کہ استاد اس وقت دوتی جان پر کوئی پھبتی ہو جائے تو مزہ آجائے۔ بھلا مرزا صاحب کہاں چوکنے والے تھے، فوراً بولے:

گھستے گھستے ہوگئی اتنی ملٹ
چار پیسے کی دوتی رہ گئی

اس طرح ایک دن کسی شخص نے مرزا صاحب کے سامنے یہ مصرع پڑھا:

سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

اور اس پر مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے اسی وقت بہترین مصرع لگا کر اس طرح ایک اعلا پایہ کا شعر بنا دیا:

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

قلعہ مرحوم کے حالات اور موجودہ تہذیب پر ان کی نوکا جھوکی جتنی مزہ دیتی تھی، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے پتنگ بازی کے دنگلوں میں لے جاتے تھے۔ مرغ اور بلبلوں کی پالیاں بھی دکھائیں۔ تیراکی کے میلوں میں بھی لے گئے۔ کبوتر بھی مجھے دکھا دکھا کر اڑائے۔ سب کچھ کیا، میں جہاں تھا وہیں رہا۔ ہر جگہ ان کا دماغ کھایا۔ انھیں بھی میری خاطر ایسی منظور تھی کہ بادل خواستہ یا ناخواستہ وہ سب کچھ مجھے بتاتے۔

ایک دن دوپہر کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ برسات کا موسم تھا، کئی گھنٹے کی موسلادھار بارش کے بعد ذرا بادل چھٹے تھے کہ حضرت معمول کے خلاف میرے پاس تشریف لائے۔ منھ بنا ہوا، آنکھیں اُبلی ہوئی، چہرے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا خدا خیر کرے آج تو صاحب عالم کے تیور کچھ اور ہیں۔ کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اور میں ان کا منھ تکتا رہا۔ ذرا سانس درست ہوا تو بولے "سید! اس پٹھانچے کا بڑو مغزاپن بھی دیکھا۔ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے، باوا تو جھک جھک کر مجرا کرتے کرتے مر گیا، یہ بابو بن کر بابو کی طرح دُلتیاں جھاڑتا ہے۔ ہے شرط کہ چار جامہ کس دوں، ساری ترش نکل جائے گی۔"

میں: میں بالکل نہیں سمجھا۔ ہوا کیا؟ کون پٹھانچہ؟

مرزا: ایسے ننھے سمجھے ہی نہیں۔ میاں وہی کالے خاں کا لڑکا جو کچہری میں نوکر ہے۔

میں: منیر۔ کیا اس نے کچھ گستاخی کی؟

مرزا: گستاخی! نہ ہوا ہمارا زمانہ خاندان بھر کو کولھو میں پسوا دیتا۔

میں: بڑا نالائق ہے کیا بات ہوئی؟

مرزا: ہوا یہ کہ میں کبوتروں کا دانہ لینے نکلا۔ گلی کے نکڑ پر بنیے کی دُکان ہے۔ نالیوں میں دھائیں دھائیں پانی بہہ رہا تھا۔ ساری گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ محلّے والوں نے جابہ جا پتھر رکھ دیے تھے کہ آنے جانے والے ان پر پاؤں رکھ کر گزر جائیں۔ دیکھتا کیا ہوں وہ اکڑے خاں بیچ گلی میں کھڑے ہوئے ایک خوانچے والے سے جھک جھک کر رہے ہیں۔ گلی تنگ، کیچڑ اور پانی پتھروں پر ان کا قبضہ۔ کوئی بھلا اس پر گزرے تو کہاں سے؟ میں نے کہا کہ میاں راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ یہ کون سی انسانیت ہے کہ سارا راستہ روک رکھا ہے۔ تڑا کر جواب دیا کہ چلے جاؤ۔ مجھے تاؤ آ گیا، بولا کہ تمہارے سر پر سے جاؤں۔ بس پھر کیا تھا جامے سے باہر نکل پڑا۔ وہ تو پاس پڑوس کے دو چار آدمی نکل آئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ آج یا وہ نہیں تھا یا میں۔ خیر جاتا کہاں ہے۔ آج کے تھپے آج ہی نہیں جلا کرتے۔

میں: صاحب عالم! آپ اپنی طرف دیکھیے۔ جو ظرف میں ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔ آنے دیجیے وہ ڈانٹ بتاؤں کہ ہاتھ جوڑے بنے...... سنا ہے کہ قلعے کے آخری دور ہی میں شہر کی حالت بدل گئی تھی۔ نہ چھوٹوں کا رکھ رکھاؤ رہا تھا نہ بڑوں کا۔

مرزا: توبہ توبہ تم نے تو دلی کو دم توڑتے بھی نہیں دیکھا، اس کا مردہ دیکھا ہے۔ مردہ وہ بھی لاوارث! میاں شہر آبادی کی باتیں قلعے والوں کے صدقے میں تھیں۔ جیسے جیسے وہ اُٹھتے گئے دلی میں اصلیت کا اندھیرا ہوتا گیا۔ اب تو نئی روشنی ہے نئی باتیں۔ اور تو خدا بخشے دلی کی صفتیں تم کیا جانو۔ پڑھے لکھے ہو، شاعری کا بھی شوق ہے، بھلا بتاؤ تو سہی اردو کی کتنی قسمیں ہیں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا، ”صاحب عالم اردو کی قسمیں کیسی؟ یہ بھی ایک ہی۔ مجھ پر بھی داؤ کرنے لگے۔“ ”واہ بھئی معلوم ہوا کہ تم دلی والے نہیں، کہیں باہر سے آ کر بس گئے ہو۔“ میں شرمندہ تھا کہ کیا جواب دوں۔ میرے نزدیک تو صرف ایک ہی قسم کی اردو تھی۔ زیادہ سے زیادہ عوام و خواص کا فرق سمجھ لو، مگر یہ قسمیں کیا معنی؟ مجھے چپ دیکھ کر مرزا مسکرائے اور کہنے لگے: ”سید پریشان نہ ہو، مجھ سے سن اور یاد رکھ۔ بھولیو نہیں پھر پوچھے گا تو نہیں بتاؤں گا۔“ میں بڑے شوق سے متوجہ ہوا اور انھوں نے انگرکھے کے دامن سے منہ پونچھ کر کہنا شروع کیا۔ دیکھ اول نمبر پر تو اردوئے معلّٰی ہے جس کو ماموں حضرت اور ان کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے، وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفا کے گھروں میں آ چھپی۔ دوسرا نمبر قل اعوذی اردو کا ہے جو مولویوں، واعظوں اور عالموں کا گلا گھونٹتی رہتی ہے۔ تیسرے خودرنگی اردو۔ یہ ماں ٹینی باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ کے بچے نکالے ہیں۔ اخبار اور رسالوں میں اسی قسم کی اردو، ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھے ہڑدنگی اردو، مسخروں اور آج کل کے قومی بلم ٹیروں کی منہ پھٹ زبان ہے۔ پانچویں لفنگی اردو ہے جسے آکا بھائیوں کی لٹھ مار، کڑاکے دار بلی کھویا پہلوانوں، کرخن داروں، ضلع جگت کے ماہروں، پھبتی بازوں اور گلیر وں کا روزمرہ۔ چھٹے نمبر پر فرنگی اردو ہے

جو تازہ ولایت انگریز، ہندوستانیوں عیسائی ٹوپ لگائے ہوئے کرانی، دفتر کے بابو، چھاؤنیوں کے سوداگر وغیرہ بولتے ہیں۔ پھر ایک سربھنگی اردو ہے یعنی چڑسیوں، بھنگڑوں، بینواؤں اور تکیے داروں کی زبان۔" میں نے کہا آج تو بہرہ کھلا ہوا ہے۔ بھئی خوب تقسیم ہے، کیوں نہ ہو آخر شاہ جہانی دیگ کی کھرچن ہے۔ میری طرف دیکھ کر ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنے لگے "سید! ابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سنا ہے۔ قلعہ آباد ہوتا، دربار دیکھے ہوتے تو اصلی زبان کا بناؤ سنگار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بیسنی ہو گئی ہے۔ وہ لچیلی چونچلے کی باتیں، شریفوں کے انداز، امیروں کی آن، سپاہیوں کی اکڑفوں، وہ خادمانہ اور خوردانہ آداب وانکسار، شاعروں کے لچھے دار فقرے، شہر والوں کا میل جول، پرانے گھرانوں کے رسم ورواج، وہ مروّت وہ آنکھ کا لحاظ کہاں؟ مجلسوں محفلوں کا رنگ بدل گیا، میلے ٹھیلے، پرانے کرتب، اگلے ہنر سب مٹتے جاتے ہیں۔ اشراف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بٹھا دیا، فیل نشین، پالکیوں میں بیٹھنے والے کھپریلوں میں پڑے ہوئے ہیں، مفلسی، ناداری نے رذالوں کے آگے سر جھکوا دیے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی، کم ظرفوں، ٹٹپیوں کے گھر میں دولت پھٹ پڑی۔ زمانہ جب کمینوں کی پشتی پر ہو تو خاندانیوں کی کون قدر کرتا؟ پیٹ کی مار نے صورتیں بگاڑ دیں، چال چلن میں فرق آ گیا۔ ہمت کے ساتھ حمیت بھی جاتی رہی۔

مرزا نے یہ تقریر کچھ ایسے عبرت خیز لفظوں میں کی کہ میرا دل بھر آیا اور میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

میں: کیوں حضرت، غدر سے پہلے دلّی والوں کا لباس کیا تھا؟ دو چار پرانی وضع کے لوگ دیکھنے میں آئے ہیں، ان کی برزخ تو کچھ عجیب ہی سی معلوم ہوتی تھی۔

مرزا: جھوٹے ہو، تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔ کوئی بہروپیا یا نقال نظر آ گیا ہوگا۔ میاں ان وقتوں میں ادنا اعلا میں یک رنگی نہ تھی...... درباری اور بازاری لوگ لباس سے

پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل وشباہت، تن و توش، جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا تاکہ دور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے؟ اگر نو جوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے، بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے۔ بانکوں کا بانک پن، چھیلاؤں، ملاؤں کی ملائی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک کو اختیار کر لیتے تھے، بھلے مانس چھوڑ دیتے۔ دو پلڑی ٹوپیوں کا عام رواج تھا مگر چوگوشی، پچ گوشی، گول، مغلئی، تاج دار ٹوپیاں، مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے۔ قلعے کے آنے جانے والوں میں مندیلیں، بنارسی، دوپٹے، گولے دار پگڑیاں۔ مسلمانوں کا حصہ تھا۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ امرا جیغہ سرپیچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروّج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا، پھر نیم جامہ اور اُلٹی چولی کے انگرکھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں انگالق، اچکن، قبا، عبا، جبہ، چغہ، مرزئی وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔ پاپجامے یا تو تنگ موری کے یا اک برے یا غرارے دار ہوتے تھے۔ داڑھی مونچھوں کی وضع بھی ہر خاندان اور ہر پیشہ ور کی علاحدہ تھی، آج کی طرح نہیں کہ کوٹ پتلون نے تمیز ہی اُڑادی۔ دوسروں کی پوشاک پہننے میں کوئی شرماتا ہی نہیں۔ علی گڑھ والوں کو شیروانی اور دوبگیوں کے غلاف والا پاجامہ پہنتے دیکھا، اس کی نقل کر لی۔ پنجابی آئے تو ان کی شلواریں اُڑالیں، مونچھوں کی جگہ بچھوپال لیے۔ داڑھی بھی چونچ دار ہے تو کبھی صفاچٹ اور تھوڑے دن سے تو ''داڑھی کو منڈا ڈال تو مونچھوں کا بکھیڑا'' سنتے آئے تھے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہندو مسلمان کی پہچان تو ایک طرف، مردوں پر عورتوں کا دھوکا ہونے لگا ہے، اور کہاں تک سناؤں، بس یہ سمجھ لو کہ دلّی کا نقشہ ہی بدل گیا۔

میں: مگر یہاں والوں کو فضول کھیلوں، دولت کو لٹانے والی بازیوں اور بے کار مشغلوں کے سوا کام ہی نہ تھا۔

مرزا: تم کیا جانو کہ وہ بازیاں اور ان کے مشغلے کیسے کمال کے تھے۔ ویسے ہنر آج کوئی نہیں پیدا کر لیتا۔ زہرہ پھٹ جائے زہرہ۔ بات یہ ہے کہ ساری چیزیں وقت سے ہوتی ہیں۔ نامردوں کا زمانہ ہے تو نامردوں کی سی باتیں بھی ہیں۔ شریفوں کا شغل ڈنڑ، مگدر، بنوٹ، پھکیتی، اکنگ، تیراندازی، نیزہ باری، پنجہ کشی تھا۔ کہہ دو بے کار تھا۔ تیراکی، کشتی، شکرے اور باز کا شکار، پتنگ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ سے دلچسپی تھی۔ کہہ دو یہ بھی فضولیات ہیں۔

میں: فضولیات نہیں تو اور کیا ہیں۔

مرزا: جی ہاں فضولیات ہیں۔ خدا کے بندے ان ہی باتوں سے تو دلّی دلّی تھی، ورنہ شاہ جہاں کی بسائی ہوئی محمد شاہی دلّی اور خورجہ بلند شہر میں کیا فرق۔ پھکیت اور بنوٹے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسا یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آجاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر۔ ایک زانو پر پیچوان لگا ہوا ہے، دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے۔ دھواں اُڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں۔ قلعے کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی، گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں۔ اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو میں جانوں۔ میر مچھلی تو خیر استاد تھے، ان کا سا کمال تو کسے میسر ہے۔ دو چار گز تو اتنے پانی میں تیر کر میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

میں: اجی جناب آپ ریت پر تیریے۔ حبابوں پر کھڑی لگایئے نتیجہ؟ کھیل ہی تو تھے۔ پھر یہ کبوتر بازی، پتنگ بازی، مرغ بازی، مینڈھے بازی کیسا بلا تھی؟ بچارے بے زبانوں کو لہولہان کرنا اور اپنا دل بہلانا کیا اچھے ہنر تھے۔

مرزا: ارے میاں ایرانی تورانی منچلے وہم ہو کر کیا چوڑیاں پہن لیتے۔ جنگ وجدال کا خیال انسانی قربانیوں، ملک ستانیوں کے چاؤ۔ خون کی پچکاریوں سے ہولی کا وقت تو لد گیا تھا۔ نہ ان پر کوئی چڑھ کر آتا تھا نہ یہ کہیں چڑھائی کرتے تھے۔

انگریزی عمل داری کی برکت سے نکسیریں بھی نہیں پھوٹتی تھیں۔ وہ جانوروں کو ہی لڑا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا نے ایک جھرجھری لی اور یہ کہتے ہوئے کہ بھئی غضب ہو گیا شام ہونے آئی۔ کبوتر بھوکے میری جان کو رو رہے ہوں گے اور چوک کا وقت بھی آ لگا ہے۔ لال بند کا جوڑ الگانا ہے، یہ جا وہ جا۔

ان باتوں کو کوئی ایک مہینہ گزرا ہوگا کہ صبح ہی صبح مرزا صاحب چلے آتے ہیں۔ آتے ہی فرمانے لگے "پرانی عیدگاہ چلنا ہوگا۔" میں نے کہا "خیریت؟" بولے لکھنؤوں سے پیچ ہیں۔ جانوں ڈھیری یا مالوں ڈھیری۔ پانچ روپے پیچ ٹھہرا ہے، بڑا معرکہ ہوگا۔" میں نے عرض کیا۔ "صاحب عالم مجھے نہ تو پتنگ بازی سے کوئی دلچسپی ہے نہ میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ آپ کے ساتھ واہی تباہی پھروں۔" تاؤ دکھا کر آنکھیں نکال لیں اور حاکمانہ انداز سے کہنے لگے۔ "تمہاری اور تمہارے وقت کی ایسی تیسی۔ بس کہہ دیا کہ چلنا ہوگا۔ دوپہر کو آؤں گا تیار رہنا۔" میں بہت پریشان ہوا مگر کرتا کیا، دوستی تھی یا مذاق قہر درویش بہ جانِ درویش۔ اپنی ساری ضرورتوں کو طاق پر رکھا اور حضرت مرزا چپاتی کا منتظر تھا کہ ٹھیک بارہ بجے آواز پڑی، "سید آؤ۔" آگے آگے مرزا صاحب اور پیچھے پیچھے میں۔ اجمیری دروازے سے نکل قبرستان لانگتے پھلانگتے پرانی عیدگاہ پہنچے۔ وہاں دیکھا تو خاصا میلا لگا ہوا ہے۔ کبابی، کچالو والے، دہی بڑوں کی چاٹ، پان بیڑی، پانی پلانے والے سقے پوری خرافات موجود ہے۔ جا بہ جا پتنگ بازوں کی ٹکڑیاں بیٹھی ہیں۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہی "صاحب عالم ادھر" "مرزا صاحب ادھر" "استاد پہلے میری سن لیجیے" "میاں ادھر آنے دو۔ بات سمجھتے ہیں نہ بات کی دم اُڑنے سے کام۔ حضت آپ یہاں آیئے۔ میر کنکیا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" چاروں طرف سے آوازیں پڑنے لگیں، مرزا چوکنے ایک ایک کو جواب دیتے شامیانے کے نیچے جہاں میر کنکیا تشریف فرما تھے، پہنچے۔

میر کنکیا لکھنؤ کے واجد علی شاہی پتنگ باز تھے۔ کاکریزی رنگ، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی ناک، دانتوں میں کھڑکیاں، سر پر کڑ بڑے پٹھے، خشخاشی داڑھی، چھاتی کھلا سنجاف دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا، سر پر دو انگل کی کلابتو کے حاشیے کی ٹوپی، پاؤں میں مخملی گرگابی، کلّے میں گلوری، اٹھ کر مرزا چپاتی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر جو پتنگ بازی کا ذکر شروع ہوا تو تین بج گئے۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا ایک ایک کا منھ تک رہا تھا۔ پتنگ بازی کی ہوتی تو ان کی اصطلاحیں سمجھ میں آتیں، آخر خدا خدا کر کے لوگ اپنی اپنی ٹکڑیوں میں گئے۔ آسمان پر چیل کوے منڈلانے شروع ہوئے۔ میں مرزا صاحب کے ساتھ تھا۔ عیدگاہ کی دیوار کے نیچے سے انھوں نے بھی اپنا اختر بختر کھول کر ایک انگارا ادھا اڑایا۔ ہچکا ایک لڑکے کے ہاتھ تھا۔ کوئی دس منٹ تک جھکا بیاں دیتے رہے، پینچ ہوا۔ کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ ایک دفعہ ہی جھلا کر لڑکے کو تمانچا رسید کیا اور بولے "ابے ہچکا پکڑنے کی سُرت بھی نہ تھی تو یہاں آن کیوں مرا آخر کٹوا دیا نا۔"

پھر ایک الفن بڑھائی اور اب کے ہچکا پکڑنے کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی۔ بدقسمتی سے یہ گڈی بھی کٹ گئی۔ بہت بگڑے کہ بس جب تم جیسے منحوس ساتھ ہوں تو ہم اڑا چکے۔ غضب ہے سانولیا ہمیں استاد کہنے والا، میر گولنداز ہمارے ہاں کے شاگرد، شیخ پیچک جیسے برابر پینچ نکالے جاتے ہیں اور مرزا فخر داو پر نیچے دو کنکوے کٹوائے۔ سمیٹو میاں سمیٹو مجھے اپنی استادی تھوڑی گنوانی ہے۔" وہ کہتے رہے، میں تو وہاں سے ہٹ کر رومال بچھا کر الگ جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی اپنا اسباب جہالت لنگی میں باندھے میرے پاس آ بیٹھے۔ تیوری پر بل تھے، چہرہ سرخ آنکھیں اُبلی ہوئی۔ میں نے کہا مرزا صاحب ہوا کا کھیل ہے۔ اس میں کسی کی کیا پیری۔ آپ کی استادی میں کہیں فرق آتا ہے۔ سلطنت ہی جب بنتھے پر سے کٹ گئی تو ان دو کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا غم! آپ، آپ ہی ہیں کہنے لگے۔

"سچ کہتے ہو۔ میاں ہم قلعے والوں کی تقدیر ہی خراب ہے۔ ہوا بھی موافقت نہیں کرتی۔ میں نے ان کے بشرے سے ان کی دلی تکلیف کا اندازہ کرتے ہوئے اس ذکر کو موقوف کر دیا اور پوچھا۔ "کیوں مرزا صاحب قلعہ جب آباد تھا اس وقت بھی پتنگ بازی کے ایسے ہی دنگل ہوتے تھے؟"

مرزا: اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ اس وقت کا سماں کیوں کر دکھاؤں۔ میاں ہر بات میں اک شان تھی، ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے۔ معمول تھا کہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔ بڑے بڑے پتنگ، دوتادی اور سہ تادی تکلیں، ڈور کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے، خلوت کے امیر اور شوقین شہزادے مرزا ہٹو، مرزا کدال، مرزا کالینٹن، مرزا چڑیا، مرزا جھر جھری بھی آموجود ہوئے۔ یہ سلاطین زادے بہت منہ چڑھے تھے۔

میں: (بات کاٹ کر) حضرت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اردوے معلّٰی ہے۔

مرزا: کچھ پڑھا لکھا بھی، یا گھاس ہی کھودتے رہے ہو۔ ارے زبان کی ٹکسال قلعے ہی میں تو تھی، وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے۔ طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ ہر بات میں جدت مدنظر تھی۔ ہنسی مذاق میں جو منہ سے نکل گیا گویا سکہ ڈھل گیا۔ کسی کے پھٹے پھٹے دیدے ہوئے مرزا ہٹو کہہ دیا۔ لمبا چہرہ، چگی داڑھی دیکھی، مرزا چکا یا مرزا کدال کہنے لگے۔ چکلے چہرے والے پر چوپال کی اور ٹھگنے پر گھٹنے کی پھبتی اڑادی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا جھپٹ، مرزا ایاہو، مرزا رنگیلے، مرزا رسیلے بیسوں اسم بامسمّٰی تھے۔ میں جمعرات کو چپاتیاں اور حلوا بانٹا کرتا تھا میرا نام مرزا چپاتی مشہور کر دیا۔

میں: لیجیے ہمیں آج تک مرزا چپاتی کی وجہ تسمیہ ہی معلوم نہ تھی۔ یہ آپ کا خیر سے ٹکسالی نام ہے۔

مرزا: اب زیادہ نہ اتراؤ۔ قصہ سنتے ہو یا کوئی پھبتی سننے کو جی چاہتا ہے۔

میں: اچھا اب کان پکڑتا ہوں بیچ میں نہیں بولوں گا۔ فرمایئے۔

مرزا: سب سامان لیس ہو گیا تو بڑے حضرت کی سواری آئی۔ دعا سلام مجرے کے بعد حکم لے کر دریا کی طرف پتنگ بڑھایا گیا۔ دوسری جانب سے معین الملک نظارت خاں بادشاہی ناظر کا، مرزا یاور بخت بہادر یا جس کے لیے پہلے سے ارشاد ہو چکا ہے، پتنگ اٹھا۔ ریتی میں سوار کھڑے ہو گئے۔ پیچ لڑے، ڈھیلیں چلیں۔ پتنگ یا تکلّیں جھکتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ یا ہاتھ روک کر ڈور دی تو ڈوبتے آسمان سے جا لگیں۔ پٹیا چھوڑ دیا، ڈوریں زمین تک لٹک آئیں، سواروں نے دو شاخے بانسوں پر لے لیں۔ پتنگ کٹا تو دریا کے وار پار ڈور پڑ گئی۔ ڈوریں لٹیں پتنگ کے پیچھے پیچھے غول کے غول شاہدرہ تک نکل گئے۔ جس نے وہ تکل یا پتنگ لوٹی پانچ روپے کی مزدوری کی۔ ڈور بھی بیس بیس تیس تیس روپے میں بک جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی تو خالی سیر ہی دیکھتے رہے، کبھی جی میں آتا تو تخت رواں سے اُتر پڑتے۔ مچھلی کے چھلکوں کے دستانے پہن لیے، پتنگ ہاتھ میں لیا ایک آدھ پیچ لڑایا اور ہنستے بولتے محل معلّٰی میں داخل ہو گئے۔ سید! یہ بھی خبر ہے کہ وہ پتنگ یا تکلّیں کتنی بڑی اور کیسی محنت سے بنائی ہوئی ہوتی تھی؟ تکلّیں تو تمہارے پیدا ہونے سے پہلے مر چکیں۔ خیر میں کبھی ان کی تصویر دکھاؤں گا۔ تو وہ قد آدم ہوتی تھی اور ایک ایک کی تیاری میں کئی کئی دن لگے جاتے تھے۔ ڈوریں بھی اک بلی، دو بلی، تبلی، چو بلی کنکوؤں اور تکلّوں کے زور کے موافق بنتی تھیں۔ مانجھوں کے نسخے بھی ہر گھرانے کے الگ تھے۔ تکلّیں تو تکلّیں آج ویسے پتنگ بھی نہ بنتے ہیں نہ کسی میں اتنا بوتا ہوتا ہے کہ ان کی جھونک سنبھال سکے۔ چھوٹی تخنیں رہ گئی ہیں یا بڑے نامی پتنگ بازوں کے ہاں اڈھے۔ وہ بھی کنکوے نہیں گڈیاں ہوتی ہیں۔ لنڈوری بن پنچھلے کی۔

میں: بھئی واقعی لطف تو بڑا آتا ہو گا۔

مرزا: جہاں اپنی حکومت، گھر کی بادشاہت اور پرائی دولت ہوتی ہے، یہی رنگ ہوا کرتے ہیں۔ عشرت گاہوں میں ہر وقت نمازیں نہیں پڑھی جاتیں۔ مجاہدے اور

مراقبے نہیں ہوتے، یہ نہ اٹھائیں تو زندگی کی راحتیں کون اٹھائے۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ سلطنتوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ جس طرح آدمی کوئی پیٹ میں، کوئی پیدا ہوتے ہی، کوئی بچپن میں، کوئی جوان ہوکر، اور کوئی عمر طبعی طے کرنے کے بعد مرتا ہے، اسی طرح بادشاہتیں ہیں۔ کوئی ایک پشت چلتی ہے، کوئی دو پشت۔ کسی کا سلسلہ سو پچاس ہی برس میں ٹوٹ جاتا ہے اور کسی کی عمارت صدیوں کی خبر لاتی ہے۔ مغلوں نے چھے سو برس تخت کو سنبھالا۔ آخر بڑھاپا تو سب ہی کو آتا ہے، ان کے کندھے بھی شل ہو گئے۔ دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا تو کل اس کا زمانہ ہے، موت اور زوال بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے لیے عیش و عشرت ہی بہانہ ہو گئی۔

میں سمجھتا تھا کہ مرزا نرے شہزادے ہیں اور ان کی معلومات میں بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آج معلوم ہوا کہ قلعے والوں کا دماغ بگڑی میں بھی کتنا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا، ”مرزا صاحب! یہ آپ نے کس فلسفی کا لکچر یاد کر لیا ہے۔ دو چار جملوں میں کیسے کیسے نکتے حل کر گئے۔“ بولے، ”پیارے ہمارے احوال پر نہ جاؤ، جان کر دیوانے بنے ہوئے ہیں۔ نہیں تو کیا نہیں جانتے کیا نہیں آتا:

عالم میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

○○○

خواجہ احمد عباس

مینا کماری

آج سے بارہ برس پہلے کی بات ہے۔

میری فلم ''چار دل چار راہیں'' کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔

بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ پچھلے بارہ گھنٹے سے لگا تار بارش ہو رہی تھی۔ رات بھر میں ایک پل کے لیے بھی جھڑی بند نہیں ہوئی تھی۔

میرا اصول ہے کہ جس دن شوٹنگ ہو صبح سویرے ہی اسٹوڈیو پہنچ جاتا ہوں۔ اس دن بھی میں کسی نہ کسی طرح ماڈرن اسٹوڈیو تک پہنچ گیا۔ سڑکیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی سڑک پر ایسے چل رہی تھی جیسے ندی میں ناؤ چلتی ہے، ایک بار انجن میں پانی چلا گیا اور ٹیکسی رُک گئی۔ کسی نہ کسی طرح ڈرائیور نے انجن کو پھر چالو کیا اور اسٹوڈیو کے دروازے تک پہنچا دیا۔ مگر اندر جانے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسٹوڈیو کے اندر تو سڑک کا نام ونشان ہی نہیں تھا۔ سارا کمپاؤنڈ ایک تالاب بنا ہوا تھا۔ میں نے پتلون کے پائچے گھٹنوں تک چڑھا لیے، جوتے اُتار کر ہاتھ میں لیے اور پانی میں اُتر پڑا۔

پانی میں شرابور اسٹوڈیو کے اندر گیا تو دیکھا کہ آگ جلا کر گیلے سیٹ کو سکھایا جا رہا ہے۔ اس وقت تک میرا کوئی اسسٹنٹ بھی نہیں آیا تھا۔ صرف میک اَپ روم میں پنڈری جو کر اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔

پنڈری نے کہا ''عباس صاحب! آج تو آپ کو شوٹنگ کینسل (Cancel) کرنی پڑے گی۔ ایسی برسات میں کون ہیروئن اپنے گھر سے باہر نکلے گی؟''

میں نے کہا "شوٹنگ کا پہلا دن ہے۔ ہیروئن کی پریکشا بھی ہو جائے گی۔"

پنڈری نے پوچھا "ہیروئن نے کتنے بجے آنے کو کہا تھا؟"

میں نے جواب دیا "ساڑھے سات بجے۔ کیوں کہ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ شوٹنگ کا وقت ساڑھے نو بجے سے ہے۔ مگر کالا میک اَپ کرنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔"

پنڈری نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا: "ساڑھے سات تو بج گئے۔"

ٹھیک اس وقت موسلا دھار پانی گرنے کی آواز کو چیرتا ہوا ایک موٹر کا ہارن سنائی دیا اور ایک موٹر پانی میں تیرتی ہوئی میک اَپ روم کی سیڑھیوں کے پاس آ کر رُک گئی مگر یہ سیڑھیاں خود پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اور اب موٹر میں سے پہلے ہیروئن کے دو ننگے، گورے گورے، نازک سے پاؤں باہر نکلے، پھر دو ہاتھ نکلے جن میں وہ اپنے چپل سنبھالے ہوئے تھی۔ پھر سفید ساڑھی پہنے سر پر ایک بڑا سا تولیہ اوڑھے ہوئے ہیروئن باہر آئی اور بے تکلف پانی میں سے ہوتی ہوئی اپنے میک اَپ روم تک پہنچ گئی۔

"آداب عرض، مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" اس نے کہا اور آئینے کے سامنے میک اَپ کرنے بیٹھ گئی۔ "ڈائلاگ میں نے یاد کر لیے ہیں۔ اتنے اچھے لکھے ہیں آپ نے کہ یاد کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی مگر ہریانے کی دیہاتی چمارن کیسے بولتی ہے وہ انداز اور وہ لب و لہجہ آپ کو سکھانا ہوگا۔"

وہ ہیروئن تھی مینا کماری۔

لوگ کہتے ہیں وہ آج اس دنیا میں نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ مر گئی ہے۔ شاید تب ہی اس کی یاد اس شدت کے ساتھ زندہ ہو گئی ہے۔

اسی دن سے ہماری "نیا سنسار" یونٹ میں وہ آج تک "ہیروئن نمبر ون، (Heroine Number One)" کہلاتی تھی اور کہلاتی رہے گی۔

"چار دل چار راہیں" میں تین ہیروئنیں تھیں۔ مینا کماری، نمی، کم کم۔ ہر ایک نے اپنی اپنی کہانی میں لاجواب کام کیا تھا، لیکن ہمارے اسٹاف کے سب لوگ 'ہیروئن نمبر ون'

مینا کماری کو کہتے تھے۔ کیوں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ بس کہنے لگے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی طرح سے بھی ہیروئن نہیں لگتی تھی۔ فلم اسٹاروں جیسے بھڑک دار کپڑے نہیں پہنتی تھی۔ سفید کلپ لگی وائل کی ساڑھی اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ فلم اسٹاروں کی طرح اِٹھلا کر بات نہیں کرتی تھی۔ فلم اسٹاروں کی طرح نخرے نہیں کرتی تھی۔ ڈائلاگ گھر سے یاد کر کے آتی تھی۔ آتے ہی یہ نہیں پوچھتی تھی کہ آج کون سا سین کرنا ہے؟ آپ نے جو ڈائلاگ کے کاغذ بھجوائے تھے وہ تو میں گھر بھول آئی ہوں۔

اس ہیروئن سے سب لوگ بہت خوش رہتے تھے۔ پروڈیوسر سے لے کر اسسٹنٹ میک اپ مین اور کیمرہ قلی تک۔ کیوں کہ وہ ہر ایک سے انسانوں کی طرح ہمدردی سے بات کرتی تھی۔ نہ ڈائرکٹر کو ڈائریکشن سکھاتی تھی، نہ کیمرہ مین کو فوٹوگرافی کی شکشا دیتی تھی، لیکن جب شاٹ شروع ہوتا تو وہ اپنے کیرکٹر میں کھو جاتی۔ پھر وہ مینا کماری نہیں رہتی تھی۔ وہ 'وہ' ہو جاتی تھی جو کیرکٹر اس فلم میں وہ کر رہی ہوتی تھی۔

''چار دل چار راہیں'' کی کہانی جب میں نے اسے اور اس کے شوہر اور اپنے پرانے دوست کمال امروہی کو سنائی تو میری دلی خواہش تھی کہ وہ چاؤلی چمارن کا کیرکٹر کرے۔ مگر میں نے کہا ''آپ تینوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کیرکٹر کو پسند کر لیجیے۔ دوسری ہیروئنوں کا انتخاب بعد میں ہوگا۔''

مگر کہانی سننے کے بعد ہی اس نے فوراً کہا: ''میں چاؤلی چمارن کا کیرکٹر کروں گی۔''

کمال امروہی نے مسکرا کر کہا ''کیرکٹر تو سچ مچ وہی تمہارے قابل ہے مگر شرط یہ ہے کہ جیسے عباس صاحب نے اپنی کہانی میں لکھا ہے۔ کالی کلوٹی کا میک اَپ کرنا ہوگا۔''

مینا کماری نے کہا: ''وہ تو کرنا ہی ہوگا۔ اسی لیے تو میں نے یہ کیرکٹر اپنے لیے چنا ہے۔''

سو ایک دن ایسا آیا کہ شوٹنگ ہو رہی تھی کہ سیٹ پر کوئی صاحب تشریف لائے۔ کہنے لگے ''سنا ہے مینا کماری اس فلم کی ہیروئن ہے۔''

میں نے کہا: ''جی ہاں۔ آپ نے ٹھیک سنا ہے۔''

گھڑی دیکھ کر وہ بولے: ''گیارہ بج گئے مگر ہیروئن صاحبہ ابھی تک تشریف نہیں لائیں؟ کیا مینا کماری بھی دوسرے اسٹاروں کی طرح دیر کر کے آتی ہے؟''

میں نے کسی قدر اچنبھے سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''آپ مینا کماری کو پہچانتے ہیں۔''

''کیوں نہیں؟'' درجنوں فلموں میں دیکھا ہے۔ پھر زندگی میں بھی دو چار بار فلموں کے سیٹ پر دیکھ چکا ہوں۔''

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ پھر وہ بولے: ''وہ کونے میں کالی کلوٹی سی کون بیٹھی ہے؟''

تب میں نے جواب دیا: ''جی وہ کالی کلوٹی چاؤلی چمارن ہے جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے، جو اس فلم کی اور جسے دنیا مینا کماری کے نام سے جانتی ہے۔''

مینا کماری اور چاؤلی چمارن۔

ایکٹرس اور اس کا کردار۔ ان دونوں میں آسمان اور زمین، دن اور رات کا فرق تھا۔

ایک گوری دوسری کالی۔

ایک لاکھوں کمانے والی عوام کی ہر دل عزیز فلم اسٹار۔ دوسری اپلے ڈھونے والی اچھوت چمارن۔

ایک جو اپنی گوری پیشانی کی وجہ سے ''مہ جبین'' کہلاتی تھی۔ دوسری جو اپنی رنگت کے کارن ''کالی کلوٹی بینگن لوٹی'' کہلاتی تھی۔

ایک پڑھی لکھی، کتابیں پڑھنے والی، شعر گنگنانے والی جو خود غزل کہتی تھی اور خود ہی ترنم کے انداز میں گاتی تھی، جو شعر کہتی تھی اور بہ ذاتِ خود شعر تھی۔ دوسری ان پڑھ، گنوار، اچھوت کنیا۔

کیا مینا کماری اس انوکھے اور مشکل کردار کے ساتھ نباہ کر سکے گی؟ مجھے تو کوئی شبہ نہیں تھا مگر میرے ساتھیوں میں کئی ایسے تھے جو ڈرتے تھے کہ مینا کماری رہے گی، چاؤلی نہ بن سکے گی۔

مگر پہلے دن ہی جب وہ اپنا کالا میک اَپ کر کے، پھٹے پرانے کپڑے اور دیہاتی گہنے پہن کر، ننگے پاؤں، جھانجن بجاتی سیٹ پر پہنچی تو وہ چاؤلی چمارن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس دن سے اس نے سیٹ پر ہیروئن والی کرسی پر بیٹھنا چھوڑ دیا۔ اب وہ کسی ٹوٹی ہوئی کھاٹ یا پھٹی ہوئی چٹائی پر پھسکڑا مار کر ٹھیٹھ دیہاتی انداز میں بیٹھتی۔ پہلے دن اس سے ملنے کوئی صاحب ہمارے سیٹ پر آئے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بالکل اس کے سامنے کھڑے ہو کر پوچھا: ''کیوں، مینا کماری اب تک نہیں آئیں؟''

میں نے کہا: ''آپ تو جانتے ہی ہیں کوئی ہیروئن وقت پر نہیں آتی۔ چاؤلی چمارن سے بات کرنا چاہیں تو وہ حاضر ہے۔''

اور یہ سن کر کالی کلوٹی چاؤلی ہنس پڑی اور بھانڈا پھوٹ گیا اور اس قسم کی غلط فہمیاں ہمارے سیٹ پر بار بار ہوئیں۔

یہ تو ہر فلم اسٹار کے لیے کہا جاتا ہے کہ ''وہ اپنے کام میں بالکل کھو جاتا ہے یا کھو جاتی ہے'' لیکن مینا کماری کس حد تک اپنے کردار میں کھو جاتی تھی، اس کی گواہی میں دے سکتا ہوں۔ میری یونٹ کے سب ساتھی دے سکتے ہیں!

مئی کا مہینہ تھا۔ دوپہر کی جلتی ہوئی دھوپ۔ اندھیری کے پاس ایک پتھر کی کان ہے، اس کے جلتے ہوئے پتھر تھے۔

سینکڑوں مزدور پتھر توڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں ہمارے فلم آرٹسٹ بھی تھے۔ ان میں ''ایکسٹرا'' لڑکیاں بھی تھیں جو گرمی کی شکایت کر رہی تھیں۔ بار بار پینے کے لیے برف کا پانی مانگ رہی تھیں اور ان میں مینا کماری بھی تھی جو موٹر سے ہی ننگے پاؤں اُتری تھی۔

میں نے کہا ''ابھی تو صرف کلوز اَپ لینا ہے۔ آپ سینڈل پہن لیجیے۔''

مینا کماری نے کہا: ''چاؤلی بے چاری کے پاس سینڈل ہوتے تو پتھر توڑنے کیوں آتی؟''

میں لاجواب ہو گیا۔

پھر میں نے پتھر کو ہاتھ لگا کر دیکھا، جل رہا تھا۔ میں نے اپنے جوتے اور موزے اُتار دیے۔ کیمرہ مین نے اپنے چپل پھینک دیے۔ سب اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور دوسرے کام کرنے والے ننگے پاؤں ہو گئے۔

سارے دن اس جلتی ہوئی دھوپ میں، ان جلتے ہوئے پتھروں پر "چاؤلی چمارن" ننگے پاؤں چلتی رہی، دوڑتی رہی۔ بھاری کدال سے پتھر توڑتی رہی، مگر جب لنچ کی چھٹی ہوئی تب بھی مینا کماری نے سینڈل نہیں پہنے۔

شام ہوتے ہوتے ان نازک ننگے پیروں کا کیا حال ہوا وہ مینا کماری نے کسی کو نہیں بتایا۔ مگر ہمارے پیروں پر کتنے چھالے پڑ گئے، کتنے پیر پتھروں سے رگڑ کھا کر چھل گئے، لہولہان ہو گئے وہ ہم میں سے سب کو آج بھی یاد ہے۔

سو یہ تھی فلم اسٹار مینا کماری، جس کی موت پر ساری فلمی دنیا اور لاکھوں فلم دیکھنے والے آج آنسو بہا رہے ہیں۔

اسے اپنے آرٹ سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ ایسا عشق جو پاگل پن کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ یہی اس کا مرض تھا اور یہی اس کی دوا تھی۔ سات برس ہوئے لندن کے بہت بڑے ڈاکٹروں نے اس کے جگر کا معائنہ کر کے اس کے دوستوں، رشتے داروں سے کہہ دیا تھا کہ وہ سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن وہ پانچ چھ برس تک اور زندہ رہی، مرض سے لڑتی رہی اور جب نہ صرف "پاکیزہ" مکمل ہو گئی بلکہ کتنی ہی دوسری تصویریں سب مکمل ہو گئیں تو اس نے ملک الموت کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور صرف چالیس برس کی عمر میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔

کام کرنے میں وہ انتھک تھی۔ فلم اچھا ہو یا برا، ڈائرکٹر بڑا ہو یا چھوٹا وہ اپنا کام محنت و محبت سے کرتی تھی۔ کمزور فلموں میں اپنی باکمال اداکاری سے جان ڈال دیتی تھی۔ صبح سے رات تک، رات سے صبح سویرے تک لگاتار شوٹنگ کر سکتی تھی۔ زکام ہو، کھانسی ہو، بخار ہو، وہ انکار نہیں کرتی تھی۔

یہ سب کرنے پر بھی اس کی اچھی اور یادگار فلمیں گنی چنی ہی ہیں۔

بات یہ ہے کہ فلم ایک ایسا آرٹ ہے جسے بہت سے کلاکار مل کر جنم دیتے ہیں۔ صرف ایک آرٹسٹ فلم کے فنی معیار کو بلند نہیں کر سکتا۔ ہمارے ہاں سو میں سے نوّے کس قسم کے ہوتے ہیں، یہ سب کو معلوم ہے اور مینا کماری کو بھی اس کا احساس تھا، لیکن کسی فلم میں اسے تھوڑا سا بھی موقع مل جاتا تھا تو وہ اسی میں جان لگا دیتی تھی۔ پھر بھی مینا کماری کی ستر فلموں میں سے دس بارہ فلمیں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن میں اس کی آخری تصویر "پاکیزہ" خاص طور سے یادگار رہے گی۔

یہ تو ہوئی مینا کماری۔ مشہور فلم اسٹار مینا کماری۔ جس کے نام سے فلمیں بکتی اور سینما کے ٹکٹ گھروں پر بھیڑ لگتی تھی (اور آج بھی لگتی ہے)۔

مگر اس مینا کماری کے اندر کئی اور مینا کماریاں چھپی ہوئی تھیں۔

ایک روسی گڑیا ہوتی ہے جس کے اندر کئی اور گڑیاں چھپی ہوتی ہیں۔ ایک گڑیا کے اندر دوسری گڑیا۔ دوسری گڑیا کے اندر تیسری گڑیا۔ تیسری کے اندر چوتھی۔ جیسے پہاڑ کے چھلکے کے نیچے سے ایک اور چھلکا نکلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک گڑیا میں سے دوسری گڑیا نکلتی رہتی ہے۔

ایک اداکارہ تو مینا کماری تھی جو فلم کی جھوٹی اوپری دنیا میں بھی اپنے رول میں اتنی کھو جاتی تھی کہ پھر اسے دنیا کی کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ جو اچھی ایکٹنگ اس لیے نہیں کرتی تھی کہ اسے لاکھوں روپے ملیں گے، نہ اس لیے کہ اس کے فن کی تعریف ہوگی بلکہ اس لیے کہ اس کی اداکاری سے اس کی روح کو خوشی ہوگی، من کو شانتی ملے گی۔

اور اس اداکارہ مینا کماری میں ایک حساس، نازک مزاج شاعرہ موجود تھی جو چھپ کر اپنی تسکین قلب و روح کے لیے شعر کہتی تھی اور جس نے زندگی کے آخری سال میں اپنی غزلوں کو خود گا کر ریکارڈ کرایا۔

اور اس رومانی مزاج کی شاعرہ کے اندر وہ بچی چھپی ہوئی تھی جسے ماں باپ نے مہ جبیں کا نام دیا تھا اور جس نے کبھی بڑی غریبی کا بچپن بتایا تھا اور جو گڑیا کھیلنا چاہتی تھی اور ہنڈولے میں بیٹھنا چاہتی تھی اور ہنڈکلیا پکانا چاہتی تھی، شادی کر کے گود میں بچوں کو کھلانا

چاہتی تھی، لیکن جسے گھر کی اقتصادی مشکلات نے بچپن کی خواہشوں، اُمنگوں اور آرزوؤں کو خیر باد کہہ کر سات برس کی عمر میں فلم ایکٹنگ کو اپنا ذریعہ معاش بنانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اور آج کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری عمر مینا کماری اسی مہ جبیں کو تلاش کرتی رہی۔ وہ معصوم بچی جو اس کے من کے اندھیرے میں چھپی بیٹھی رہی اور جس بچی کے من میں نہ جانے کتنے سپنے، کتنی آرزوئیں، کتنی اُمنگیں چھپی تھیں۔ اور شاید مینا کماری کی روح کی بے چینی، اس کی شاعرانہ بادہ خواری، اس کی غم انگیز تلخ مسکراہٹ، اس کی اداکاری میں جو گہرائی، سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا وہ سب اسی تلاش کی دین تھی۔

مگر آج وہ تلاش ختم ہو گئی ہے۔

مینا کماری اور مہ جبیں مر کر ایک ہو گئی ہیں۔

صرف ایک افسانہ باقی رہ گیا ہے اور چند دل کش افسردہ یادیں!

○○○

عصمت چغتائی
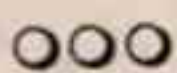
دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑبڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ 'گھر کی مرغی دال برابر' والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور وہ ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا؟ یہ ادب نہیں پھکڑ، مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہوں گی۔ یعنی بے پڑھے رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خودستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یوں ہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون 'یکہ' نظر آیا۔ میں اور رحیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہوگیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آگئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منھ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار؟ تھے بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں۔" اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ

غائب ہوگئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان ہی کی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے:

''تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں...'' اور انھوں نے چیتھڑا لو ہمارے منھ اُتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجھلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہوگئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالاں کہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ خدا وہ شخص جب کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے، میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ ''مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو۔'' اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے اس لیے جی چاہتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہوگئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ اُفوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان کی رلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں، وہ اندوہ ناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لیے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے ناہموار دانت اور لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک، دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا۔ پتلی پتلی کھچی جیسی ٹانگیں

جن کے سر پر ورم جیسے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں، بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیوں کر ہنستا تھا، معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے، نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا جبار و قہار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمہ کا عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی نہ رلا سکا۔ اس دکھ میں جلن، ہنستے نہیں ہنساتے رہنا، کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے ''زندہ لاش۔'' خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جان دار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اُٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! اس میں کتنی جان تھی۔ منھ پر گوشت نام کو نہ تھا۔ مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آجانے سے چہرہ خوب صورت ہو گیا تھا، کنپٹیاں بھر گئی تھیں، پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرہ پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آگئی تھی۔ جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اُٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اُٹھتی تھی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اُٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بے کس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آجاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص، پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ 'خانم' پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں، ان میں اتنی جان ہی کب تھی۔ مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا، کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہم زاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی 'خانم' اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لیے 'خانم' کچھ بھی نہیں، لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھائی جان، نانی اماں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھتنی، بہشتی۔ یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی بچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لیے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم چلتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ 'خانم' کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابھی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

''گھر پا بہادر'' جس کا پہلا ٹکڑا 'روح لطافت' میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہم زاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروا لیتا ہے وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا، لیکن ہم زاد چوریاں کرتا، شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا، مگر ہم زاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیے نا جینے کے لیے!

شروع سے ہی روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی؟ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا مگر بے بس۔ سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انھیں بھی انسان سمجھے۔ انھیں بھی کوئی ڈانٹے۔ انھیں بھی کوئی زندہ لوگوں

میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصا گھر میدان جنگ بن گیا، اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے اور کمزور و لاچار، ہر دم کا روگی، تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا اور کیا چاہیے؟ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا، ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنالینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا انھیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی ''سانپ جنا تھا میں نے!''

مرنے سے پہلے قابلِ رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں، جی چاہتا تھا کہ جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے۔ ہزاروں کہانیوں اور انسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بھی اسے کوئی پیار کرے، بیوی پوجا کرے، بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی۔ مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے، ورم بڑھ گیا، آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہاران کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پُر ہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے،

آج سے ۴۴ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰ راگست کو صبح شمیم نے آ کر کہا "منے بھائی ختم ہو رہے ہیں اُٹھو۔"

"وہ ختم نہ ہوں گے۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو۔" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کم بخت تجھے یاد کر رہے ہیں۔" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔

"ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے...... ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابھی انھیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجے سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

"منے بھائی" میں نے ان پر جھک کر کہا۔ ایک لحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جاں ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منے بھائی......" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں ناممکن، وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لیے تو وہ مر کر ہی جیے اور نہ جانے کتنوں کے لیے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کا پیغام "دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو۔" یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی، وہ جھوٹے تھے۔

ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا، بیوی کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ ملاؤں کے فتووں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرا جا رہا ہوگا مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی۔ نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے مگر کوئی اسے رلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی، باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی، کولھے میں امرود برابر پھوڑا، آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہوگئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے، "یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن پہنچیں۔" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہیے، پتھر کا کلیجہ ہو مرتے وقت جملے کسنے کے لیے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن! بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی، اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے، خیالات بدل گئے ہیں، ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہمارا دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری، سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے۔

نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دکھ میں ٹھٹھا لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے، زندگی کے ہر معاملہ میں دکھ کو ہنس کر نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو، اس سے دوستی۔ ''کھرپا بہادر'' میں جو ''شاہ لنگران'' کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اسی میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن، بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے، وہی قصے ''سوانہ کی روحیں''، ''مہارانی کا خواب''، ''چمکی'' اور ''ریڑے'' بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی، بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چوں کہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی، خصوصاً ''کولتار'' تو بالکل رڈی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی رنگ میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے۔ ''شریر بیوی'' تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے میں بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

''چمکی'' ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا، تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ! وہ ''چمکی'' کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا اور پھر خود مصنف کی زندگی۔ کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہم زاد ہوتا تھا جو اُن کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں، یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔

جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں 'گل بکاولی'، 'زہرہ عشق' وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انھیں پرانی کہہ دیا گیا، لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اُتار چڑھاؤ، پنڈلیوں کی گاؤدی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے، وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ ''نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں 'اماں کھانا' معلوم ہوتا ہے۔'' یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ''ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری، مصوری، قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی 'الف لیلہٰ' کا رنگ غالب آ گیا۔

انھیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے ''یہ عورت پیارے جھوٹ بولتی ہے۔'' انھیں شکایت تھی کہ میں بہت اُلٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں۔ اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً 'جھوٹ' کہا کرتے تھے۔ جہاں انھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے، پھر ''قصر صحرا'' لکھنے لگے۔ وہ ان کی گپوں کو 'قصر صحرا' کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے ''سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔''

وہ یہ بھی کہتے کہ ''جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو 'قصر صحرا' ہے۔''

اس پر ماموں کہتے:

"ارے زندہ لاش کو منع کرو یہ کفر ہے۔" اس پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انھیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا، لیکن کہتے تھے "دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزے دار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزے دار ہے۔"

کہتے تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر بنوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی۔"

انھیں دھوکے باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے "دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں۔ عقل چاہیے ان چیزوں کے لیے۔"

انھیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا، مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کا۔ عموماً پیسے دے کر ڈھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انھیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انھیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے، اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لیے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مداح تھے اور امام حسینؓ کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ کھڑے ہیں، ادھر سے یزید لعین آیا، آپ کے پیر پکڑ لیے، گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا، پھر ہم کیوں لڑیں۔"

سیاست سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے "بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کم بخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔" بہت سال ہوئے کچھ مضامین 'ریاست' میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں بحث کم کردی تھی اور کہتے تھے:

"بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہٰذا چپ ہی رہو۔" پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے۔ "یہ پرانی بات ہوگئی اب پردہ روکے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم کر چکے۔ اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔" لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے، تو فرماتے: "یہاں کون سی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا۔ کیوں کہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں۔" کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ سب انھیں 'باغی' اور 'دوزخی' کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے اُلجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ 'دوزخی' کا کیا ٹھکانا۔

○○○

عصمت چغتائی
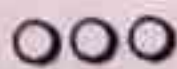
منٹو میرا دوست، میرا دشمن

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی، جیسی کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی، لیکن یہاں تو وہ ''نیا آدمی'' منٹو تھا جس سے پہلی بار ملنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا ''چلو واپس چلیں، شاید منٹو گھر پر نہ ہو۔'' مگر شاہد نے میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے، کیوں کہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔''

یہ لیجیے میرے پرسو دُرّے۔ ایک تو منٹو، اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی سوچا۔ مجھے کھا تو نہیں جائے گا! ہونے دو جو اس کی زبان کی نوک پر ڈنک ہے۔ میں بلبلہ تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چرچراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اُکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

''آیئے آیئے۔'' بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اُکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا، لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھنچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل

آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر کھدر کا کرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

''ارے میں سمجھتا تھا کہ آپ نہایت کالی، دبلی، سوکھی، مریل سی ہوں گی۔'' اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

''اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دبنگ قسم کے گمبھیر چنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہوگے۔''

میں نے سوچا رسید دیجے چلو کہیں یہ ایک دم ہاپٹے پر نہ لے لے۔

اور دوسرے لمحہ ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اُٹھایا ہو اور اسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات اُلجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا، لہٰذا دوسری ملاقات کے لیے اُٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہمارے جبڑے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر جملے کترتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اُٹھتا ہے اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق، جھکّی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں، میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں، جنھیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی، ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انھیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے، سنجیدگی سے مسکراتے، طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم

میں پھراتے اوہی نازک نازک ہاتھ پیر، سر پر ٹوکرا بھر بال، پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ پیتے پیتے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی۔ اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی۔ نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔

''یہ بالکل غلط۔'' اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

''آپ کج بحثی کر رہی ہیں۔''

''حماقت ہے یہ۔''

دھاندلی ہے۔ عصمت بہن۔''

''آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''بس یوں ہی، عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا۔''

''تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں؟''

''نہیں تو، وہ کیسے جانا آپ نے؟''

''اس لیے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے، چڑاتے اور مارتے پیٹتے رہے یا پکڑ کر پٹواتے رہے۔'' منٹو زور سے ہنسا۔

''تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا۔''

''تو اتنا یاد رکھیے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوش گوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟''

''علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے، تمہیں ٹی بی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے نہ مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا، اور اب تو بس میں ڈاکٹر کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو مسمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں۔''

''یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔''

''کون بزرگ؟''

''میرے بھائی، عظیم بیگ، نو من مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔''

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے۔ شاہد، جو ہماری جھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے، بھوک سے تنگ آچکے تھے۔ ملاڈ پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

''ذرا اس برنی سے آچار نکال لیجیے۔'' منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا اور کرسی پر اُکڑوں بیٹھے۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگزاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے ''پہلے آپ'' کہے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا، جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ گرما گرم مباحثہ چلتا رہا، منٹو گھوم پھر کر ''لحاف'' کے بخیے ادھیڑنے لگتا، جو اُن دنوں میری دُکھتی رگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت ٹالنا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ مجھے ''لحاف'' لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں ''لحاف'' کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مصر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ''لحاف'' سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی، نہایت کھل کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بے ہودہ بات دھڑ سے اس معقولیت اور بھول پن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

''صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

''صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔''

''آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

بہت یاد آ رہی ہے۔ تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے۔'' میں نے کہا۔

''ارے.... کیا سمجھتی ہیں اس کے بغیر سو نہیں سکتا۔'' وہ اپنی اصلیت پر اُترنے لگا۔

''نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔'' میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

''آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟'' میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

''محبت؟'' وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ ''مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔'' اس نے کڑوا منھ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ ''میں محبت کا قائل نہیں۔''

''ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''نہیں۔''

''اور آپ کے کبھی گل سوئے بھی نہیں نکلے۔ خسرہ بھی نہیں ہوئی، مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔'' وہ ہنس پڑا۔

''محبت سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے، بہن اور بیٹی سے بھی... بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے۔ ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔'' وہ بیٹے کے خیال پر اُچک کر کرسی پر اونچا ہو گیا۔ ''خدا کی قسم اتنا سا پیروں چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا۔ گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی درازوں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا۔'' عام باپوں کی طرح منو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا۔

''آپ یقین کیجیے چھ سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینے کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی، رات کو بس پڑی سوئی رہتی۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلوا لیتا، اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ بچے کو دودھ پلوانے سے پہلے یوڈی کلون یا

اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیے۔ نہیں تو بچے کے منھ میں دانے ہو جاتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مردوا ہے جو بچے پالنے میں مشتاق ہے۔

"مگر وہ مر گیا۔" منٹو نے مصنوعی مسرت چہرہ پر لا کر کہا۔ "اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج اس کے پوتڑے دھوتا۔ نکما ہو کر رہ جاتا۔ مجھ سے کوئی کام تھوڑا ہوتا۔ سچ سچ عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا۔"

چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ "صفیہ آنے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا، آپ کا اس سے مل کر۔"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گھٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں، جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا اور طعنے دینے لگا۔ اس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سن لی تھیں وہ شریر بچوں کی طرح بولا۔

"توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔"

"صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔"

"اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی امید نہ تھی کہ یوں محلے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی، شادی کی رات کیسی گزری۔ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا، توبہ ہے۔" وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً لگام لگائی۔ "حد ہے منٹو صاحب! میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ ارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندی کیا ہے۔ بچہ کی پیدائش دنیا کا حسین ترین حادثہ ہے اور یہ کانا پھوسی ہی تو ہمارا ٹریننگ اسکول ہے۔ کیا سمجھتے ہیں آپ،

کیا کالج میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کہتے رہے۔ محلے کی عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔"

"یہ صفیہ سخت جاہل ہے۔ ادب ودب کچھ نہیں سمجھتی، ہر بات پر تھوتھو کرتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے۔ آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کرکے کہ قورمے میں کتنی ہلدی، اُردکی دال کے دہی بڑے..."

"اے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔" صفیہ نے ہیبت زدہ ہو کر کہا۔

اور منٹو لڑ پڑا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہیے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ "میرا ایک راجپوت دوست تھا۔ وہ گھی اور ہلدی پی کر جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا۔" اور ہم مصر تھے کہ آپ کا دوست گھی اور ہلدی چھوڑ کر کیچڑ پیتا تھا۔ ہم کسی شرط پر ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادہ سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جارہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے، دماغ میں جھاڑو سی دی جارہی ہے، اور بعض اوقات بحثیں اتنی طویل اور گھن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں الجھ گئی ہیں اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی۔ مگر دونوں بھنے جاتے، الجھے جاتے، بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا، مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا۔ آنکھیں مور پنکھوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے، منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حماقت میں شاہد کو پکارتا اور جنگ، ادب یا فلسفہ سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے کہ "تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے۔ اب وہ ہمارے پاس نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں، وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔"

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی۔ ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے۔ جو اَب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خودداری رعونت کی سرحدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا اور اگر ان دوستوں کے سامنے، جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو، کوئی اس کا مذاق بنا دے تو وہ بری طرح چڑ جایا کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں تو پلے کے ہیں ایک دوسرے کو کہہ سن سکتے ہیں مگر ''عام لوگوں'' کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑی اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے۔ ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر میرا جلد ہی اس تصنع سے دل اُکتا جاتا اور اس کا بھی۔ اور پھر چلنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی۔ اور گولیوں کی سی تندی آ جاتی۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو یوں الجھا دیکھ کر مزہ لینے لگتے اور ہم پھر جل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لیے نہ کہ ان کے لیے بٹیر بن کر لطف پیدا کرتے۔ منٹو کی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُلٹی سیدھی بحث کر لیں مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہیے اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہوگا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا۔ مگر مجھے عموماً مورچہ سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح پھنکارنے لگتا۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور جان کو آ جاتا تھا۔

''میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن، میں بالکل نشہ میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں، آپ شرط لگایئے۔''

"میں شرط نہیں لگاؤں گی کیوں کہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے... اور آپ نشے میں ہیں۔"

کیسا کیسا منٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں اور اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے۔ صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی۔ مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور سوائے شرط لگانے کے گلوخلاصی نظر نہ آتی تو ہار کے مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

منٹو کو خودستائی کی عادت تھی۔ مگر عموماً میرے سامنے، اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادیب نہ مانتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سلگ اُٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا۔ ایک سرے سے ان کی وجود کو ہی سم قاتل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لیے۔

"بکواس کرتے ہیں یہ لوگ۔" وہ جل کر کہتا "جو یہ کہتے جائیں بس اس کا اُلٹا کرتے جاؤ، یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں۔" وہ کبھی اتنا چڑ جاتا کہ میں اسے تسلی دینے کو کہتی: "جب آپ کو یقین ہے کہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ کیجیے مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجیے۔ مگر وہ بھنّاتا رہتا۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

"مقدمہ دائر کریں گے۔"

میں نے کہا "کون۔"

کہنے لگے۔ "ہم یعنی میں اور آپ۔ اُس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے۔ ایسا ادب سے ملک کو بچانا چاہیے۔ اب اس کم بخت

سے پوچھو کہ کیسی الٹی بات کر رہا ہے۔ ایک تو وہ اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے، دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں، اسے نوٹس دلوا رہا ہوں کہ ہرجانہ دے۔'' پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجب قسم کی بات تھی جو سمجھ میں نہ آئی۔ جب اس کا تذکرہ کیا، یہی کہا ''بڑا بدمعاش لفنگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوائی ہو۔''

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا۔ میں نے کہا ''کیا کروں گی مل کر، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ۔''

کہنے لگے ''ارے جب ہی تو ملا رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش برا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''منٹو صاحب لفنگا، شریف، بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید ویسی نہیں۔''

''آپ بنتی ہیں۔'' منٹو نے برا مان کر کہا۔ ''جبھی تو آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی۔''

''میں بھی تو عورت ہوں۔'' میں نے فکرمند بن کر کہا۔ اور وہ کھسیانا ہو گیا۔

''میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔''

''مگر آپ کی بہن بھی عورت ہو سکتی ہے۔'' منٹو نے قہقہہ لگایا۔

''ہو سکتی ہے! یہ خوب کہا۔'' مگر منٹو کو ضد ہو گئی۔ آپ کو اس سے ملنا پڑے گا، دیکھیے تو سہی۔

''میں اسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کم بخت پر عاشق نہ ہونا پڑے۔''

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دنیا کے ساتوں عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ منٹو کا میدان ہے۔ وہ دنیا کی ٹھکرائی گھورے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکال لاتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اسے شوق ہے، کیوں کہ دنیا کے سنوارنے والوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ ان کی عقل اور فیصلہ پہ بھروسہ نہیں۔ وہ ان کی شریف اور پاک باز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دلہن سے میل اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھاٹن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ ''بو'' میں حالاں کہ جسم ہی جسم ہے۔ غور سے دیکھیے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ عیش پرست طبقہ کی پھٹے ہوئے دودھ کی طرح پھٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقے کی تصنع سے دور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اس بت کو، جس کی دنیا پوجا کرے، زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا ''یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبروریزی کی۔'' اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں، اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

''سب جھوٹ!'' میں دھاندلی کرنے لگی۔

''ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جاسکتا ہے۔''

''مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جاسکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سن کر چلے آتے ہوں گے۔''

''مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر۔''

''گانا سننے۔'' میں نے چڑایا۔

''جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے۔ پھر بھی میں نے کہا۔

''میں نہیں یقین کرتی۔''

''وہ کیوں؟'' وہ اُٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

''بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں۔''

''بھئی خدا کی قسم، میں کہتا ہوں میں گیا ہوں۔''

''خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اسے نہ گھسیٹیے۔''

''اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک نہیں بلکہ...''

''مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

اور منٹو وہیں پھسکڑ مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی دلوائی، میں نے دومنٹ میں صفیہ کو چت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں۔ اور اگر گئے ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔

صفیہ چپ سی ہو گئی۔ ''اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آ گئے یا...'' وہ عجب گومگو میں رہ گئی۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بری طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں اور میں نے کہہ دیا آج ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں۔

ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کی جبلّی تلخی۔ اگر بس چلتا تو میرا منھ نوچ لیتا۔

صفیہ نے بسور کر کہا ''بہن مان جاؤ۔'' شاہد نے کہا ''بس اب گھر چلو۔'' منٹو نے شاہد کی ٹانگ لینی شروع کی۔ اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا۔ خاصا ہنگامہ ہو گیا۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا" چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی وقت، آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں سور کا دودھ پیا۔" مگر میں نے اور چڑایا۔

"آپ جائیں وائیں گے نہیں یوں ہی بانکلا برج پر گھوم کر آجائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ۔"

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید ہی بجھی ہو۔ غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

"پھر کیسے یقین دلایا جائے۔"

میں نے کہا" ہمیں یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلیے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" صفیہ بگڑی: "تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے۔ تم ہی جاؤ۔"

"جائے گی کیسے نہیں۔" منٹو غرایا۔

"چلو چلو..." صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے۔ منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا" مگر اب تو مان جاؤ۔"

میں نے کہا" قطعی نہیں۔"

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا جو اس نے رنڈی کے بارے میں لکھا، وہ اس کے اپنے اصول اور یقین کی بنا پر ہے کیوں کہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا بھی ہوگا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہوگا جو باوجود یہ کہ موری کا کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور برے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انھیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا اندازہ لگاتا تھا، خوشیا جیسے ڈھیٹ اور نکمے انسان کی رگ حمیت بھی پھڑک سکتی ہے، "گوپی ناتھ" جیسا رقیق انسان بھی دیوتاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے۔ بلند و مہان دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں۔ قومی رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ ڈور ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دانت پیس کر بولا۔

''آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔''

''اب جانے بھی دیجیے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے۔''

''بتا بھی دیجیے۔ ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں، نکال بھی دیجیے۔''

''آپ جھینپ جائیں گی۔''

''قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی۔''

''تو آپ عورت نہیں۔''

''کیوں کہ عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے، چاہے جھینپ آئے نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی آپ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔'' میں نے مسکا لگایا۔

''قطعی نہیں... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔''

''تو پھر کہیے نا وہ جھینپا دینے والی بات۔''

''نہیں اب غصہ اُتر گیا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''اچھا دوستی ہی میں سہی، بتائیے وہ کون سی خطرناک بات تھی۔''

''کچھ نہیں... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا۔''

''بس۔'' میں نے نا اُمید ہو کر کہا۔

''یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا۔'' نادم ہو کر بولا۔

''مجھ پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ میں نے ایسی کیم شحیم گالیاں سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپّڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں۔ مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔'' اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشاں ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کرلوں پھر واپس ملاڈ جاؤں۔ دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا، جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھلائے

لیٹی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لیے سٹاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے، اور ناک پر گرتے کا
دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

''یہ کیا کررہے ہیں۔'' میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

''کرکٹ کھیل رہا ہوں۔'' منٹو نے بڑی بڑی مور پنکھ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔

''یہ لیجیے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کرلیں گے آپ لوگ تو روٹھے
بیٹھے ہیں۔'' میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔

''ارے!'' صفیہ اُٹھ بیٹھی۔ ''آؤ آؤ۔''

''کاہے کا جھگڑا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں۔ بس جیسے تم سے
اُلجھتے ہیں مجھ سے بھی اُلجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام۔ میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔
میں نے بہت روکا تو اور لڑے، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے۔'' صفیہ نے
بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانسنا شروع کیا۔ ''صبح ہی صبح
میونسپلٹی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول حلق میں جھونکی اب آپ ارمان
نکال لیجیے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔''

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا بگھارنے
چلی گئی۔ برف لاکر منٹو نے تولیہ دیوار پر مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور
اکڑوں بیٹھ گیا۔

''سنائیے۔'' اس نے حسبِ عادت کہا۔ ہانڈی کے بگھارنے سے مجھے زور سے
اُبکائی آئی۔

''افوہ یہ صفیہ کیا مردہ جلا رہی ہے۔'' میں نے ناک بند کرکے کہا۔ منٹو نے چونک کر
مجھے دیکھا، سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا باورچی خانے میں۔
صفیہ چیختی رہی اور اس نے بھر لوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آ کر وہ سہما سہار سان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔ میں بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز میں بولا۔

''آپ کے پیٹ میں بچہ ہے؟'' جیسے بچہ میرے نہیں خود ان کے پیٹ میں ہو۔

''میں نے فوراً تاڑ لیا جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی بھگار سے اُبکائی آتی تھی۔''

''منٹو صاحب خدا کے لیے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو۔'' میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

''ارے واہ۔ اس میں کیا برائی ہے، ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں۔'' وہ لپک کر نیچے گیا اور کُرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

''صفیہ ارے صفیہ۔'' وہ چلّایا۔ صفیہ دھوئیں سے اَٹی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی ''کیا ہے منٹو صاحب کتنا چلّاتے ہو۔''

''ارے بے وقوف۔ ان کا پیر بھاری ہے۔'' اس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

''اُف گندگی کی انتہا ہے۔ جبھی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں۔'' میرے اس بگڑنے پر منٹو صاحب خوب چہکا۔ اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

''پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے کھرونچے نہیں پڑیں گے۔''

''نہار منھ سیب کا مربہ کھانے سے اُبکائیاں نہیں آتیں۔''

''کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا۔''

''جاپے میں برف نہ چبایئے گا۔ نلے سوج جاتے ہیں، کیوں صفیہ؟''

''ہو منٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو۔'' صفیہ کھسیا کر رہ گئی۔

اور جب سیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی۔ مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا۔ وہ دیر تک مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل پگھل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی پیدا ہوگئی۔ پونا سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا۔ میں فوراً گئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر دوسرے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر پوتڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور بغیر ہوا کا تھا۔ منٹو نے اس لیے بدل لیا کہ اس کا فرش گندہ تھا۔ بچی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی اور مٹی چاٹ جاتی۔ یہاں نکہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالاں کہ نکہت چند ہفتوں کی تھی۔

''مجھے بچے سخت ناپسند ہیں۔'' منٹو سنجیدگی سے کہتا۔ ''جان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت انھیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔'' وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بھتیجی مینو اسے بڑی پیاری تھی گھنٹوں اس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اس کے لیے املیاں توڑ کر نیچے سے گرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیما کو پاٹ پر بٹھا کر ''شی شی'' کرتا اور بچوں کا بہت شائق تھا کیوں کہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی، معلوم ہوا۔ صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی ''میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے، مگر وہ کہاں سنتے ہیں۔'' منٹو مع نند اجی اور خورشید انور کے آگئے۔

''یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی۔'' ہاتھ میں بوتل اور گلاس لیے تینوں درآئے۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ طے ہوا بہت بھوکے ہیں۔ ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں، ریل کا وقت گزر گیا۔ کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھالیں گے۔ بس آٹا دال دے دو، خود باورچی خانے میں جا کر پکالیں گے۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانے پر چڑھائی کر دی۔ ''منٹو آٹا گوندھنے لگے۔ نند اجی انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو

آلو چھیلنے کو دے دیے گئے جو چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مصر تھے اور پھر بوتل بھی باورچی خانے میں آ گئی۔ لوگ پھسکڑا کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے کچے پراٹھے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکالی اور پھر جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا جاتا۔

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ معقول آمدنی ہو، پینا پلانا ہو، قہقہے ہوں اور بے فکریاں، ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ لاہور میں بھی لطف آ گیا۔ خوب دعوتیں اُڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے۔ جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت بچنے لگے۔

''میرے پیر بڑے بھدے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوب صورت جوتے۔'' میں نے کہا۔

''اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔'' مگر ہم نے کئی جوڑے جوتے خریدے۔

''آپ کے پیر بہت خوب صورت ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔''

''بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں۔'' میں نے رائے دی۔

''بہ خدا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' منٹو نے چہک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

''محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچوں بیوی سے محبت ہے۔''

''میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے۔''

''ہاں... میں سمجھ گیا۔'' منٹو نے دو، ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا'' کشمیر میں ایک چرواہی تھی۔''

''پھر...؟'' میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارہ دیا۔

''پھر کچھ نہیں۔'' وہ ایک دم بچاؤ کے لیے تن گیا۔

''آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں۔''

''کون گدھا شرما رہا ہے۔'' منٹو نے واقعی شرما کر کہا... بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

''بس جب وہ مویشی ہانکنے کے لیے اپنی لکڑی اوپر اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا۔ روز ایک کمبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے۔''

''کہنی...؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں... میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی، اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ مجھے دکھاؤ۔ تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اور بولی کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ روہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پر اڑ گیا۔ اور آخر کو بڑی ردوکد کے بعد اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹنوں میں منھ دے لیا۔''

''کیا تھا اس کی ہتھیلی پر۔'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''مصری کی ڈلی! اس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔''

''پھر آپ نے کیا کیا۔''

''میں دیکھتا رہ گیا۔'' وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

''پھر...؟''

''پھر وہ اُٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیض کی جیب میں پڑی رہی۔

پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں۔''

''اور لڑکی...''

''کون سی لڑکی...؟'' وہ چونکا۔

''وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھمادی۔''

''اسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔''

''کس قدر پھس پھسا ہے آپ کا عشق؟'' میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا۔ ''مجھے تو بڑے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی اُمید تھی۔''

''قطعی پھس پھسا نہیں۔'' منٹو لڑ پڑا۔

''بالکل رڈی.... تھرڈ ریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا۔''

''تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلاّ اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا۔'' وہ بگڑا۔

''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ڈلی کڑ کڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے۔''

یہ وہی منٹو تھا۔ فحش نگار۔ گندہ ذہن۔

جس نے ''بو'' لکھی تھی۔

جس نے ''ٹھنڈا گوشت'' لکھا تھا۔

لیکن مرزا غالب میں چودھویں بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے۔ جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف وہ ''نیا قانون'' لکھتا ہے اور دوسری طرف ''بو''.... دونوں میں وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟.... ایک ہی بات ہے۔

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے کے بعد اس کوٹھی کے وہاں اس کوٹھی میں کیے جانے لگے۔ منٹو اس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی، اسے ملتی تھی کہ اس کی فلم ''آٹھ دن'' کامیاب نہ ہوئی، نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکرجی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم ان کے خلاف ہو گیا۔

''بکواس ہے مکرجی۔ فراڈ ہے پکا!'' وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لیے سینریو ڈپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ ''اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی، اشوک کمار ہیرو، بس پھر دیکھیے گا۔''

ایک کہانی منٹو کی زیرِ غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اسے مجبور کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اُتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اسے میری کہانی ''ضدی'' پسند آ گئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گزرا۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر! نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگی۔ ادھر کمال امروہی ''محل'' کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار قطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا

تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیوں کہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی ''ضدی'' کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی قطار میں ''ضدی'' بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی اُدھیڑ بن کیا کرتا کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر، کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا:

''آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا۔''

''آپ کی کہانی میں اس کا رول رومانٹک نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا۔''

اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر ادبی زبان سے، یہاں اپنی فکر پڑی تھی۔ اور وہی ہوا کہ ''ضدی'' اور ''محل'' بن گئیں۔ منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا، بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اُدھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اسے پاکستان بلانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بددل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر وہ بھی اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔ پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور

خوب صورت قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر بلایا تھا۔ ''ضدی'' ختم ہوگئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ برے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے۔ اس نے بلایا تھا، ایک سینما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا۔ مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا ''کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو۔''

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہوگئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا، بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہوگئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے، نہ میٹنگیں ہوئیں، نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں اگر مکرجی سے کہہ کر بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو۔ مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سنیں کہ جی اُوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا۔ اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے، یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا ہے اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے۔ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں، جو نہ دُکھتا ہے نہ رِستا ہے خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اڈلفی چیمبر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پہلوٹھی کے بچے کی باتیں۔ یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لیے ڈرتی ہوں اور میرا قلم خشک ہو جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اس پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمہاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رہی۔ یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے ''منٹو صاب'' کی صفیہ رہیں۔ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بدروئی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموش گیسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروّتی اور لاپروائی سے تمہارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں۔ دم تو گھٹ جاتا تھا۔ کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا۔ کیا بچیاں اپنے باپ کو پاگل، مفلس، شرابی سمجھتی تھیں۔ اس نے تمہیں تنگ دستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم۔ نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا۔ اس نے انھیں عیب کی طرح چھپایا۔ اسے غرہ

تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے جبھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ہے اور اس کا قلم بے کسی سے کھسنتار ہتا ہے۔

تم عاجز تو نہیں آ گئیں ادیبوں سے! یوں ہی خود گھسیٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں!...اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ تو بہن یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم وبیش یہی انجام جو زیادہ حساس ہوتے ہیں، وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور ڈھیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اسے مرنے دیا۔ میری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یوں ہی مجھے بھی مرجانے کی اجازت ہوگی۔ اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے، چندے جمع کریں گے اور ان جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آسکے گا۔ وقت گزر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے۔

○○○

حمیدہ اختر حسین رائے پوری
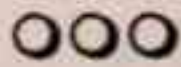
ہمارے مولوی صاحب

(بابائے اردو مولوی عبدالحق)

کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ۲ر جون ۱۹۳۵ء کو اختر حسین رائے پوری نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھامنے کی خواہش کا اظہار میرے والد ظفر عمر مرحوم سے کیا اور ۲ر جون ۱۹۹۲ء کو انہی ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

نصف صدی پہلے، بلکہ آج بھی کوئی لڑکا اپنا پیغام خود تو نہیں دیا کرتا، یہ کام بزرگوں کے کرنے کا ہوتا ہے۔ نفسِ مضمون کچھ نرالے انداز سے یوں تھا:

محترمی تسلیم

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

میں ایک وہ بندہ ناچیز ہوں جس کا دنیا میں کوئی نہیں پر علم اس کا اوڑھنا بچھونا ضرور ہے۔ آپ کی صاحب زادی حمیدہ عمر کے لیے درخواست ہے۔ اگر قبول کرلیں تو زہے نصیب اور رد کر دیں تو شکوہ آپ سے نہیں بلکہ اپنے رحیم و کریم خدا سے ہوگا۔

فقط
اختر حسین

والد صاحب ان حضرت کی اس بے باکی اور انداز پر حیران ہوئے اور ضرور تلملائے ہوں گے۔ اپنے بڑے بیٹے شوکت عمر کو خط دکھاتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہاں وہ اس لڑکے کو خوب اچھی طرح جانتے ضرور ہیں مگر اپنی کوئی رائے نہیں دیں گے۔ مولانا عبدالحق کے ساتھ ایک سال سے کام کر رہے ہیں ان کو ایک خط لکھ کر معلوم کر لیں، پھر جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔

والد صاحب ان کو خط لکھ کر دریافت کرتے ہیں، مولوی صاحب کا یہ جواب آتا ہے:

ڈیر ظ۔ ع (ظفر عمر)

مجھے کل ہی آپ کا مورخہ ۱۰ر جون کا خط موصول ہوا۔ یہ دوبارہ اورنگ آباد روانہ کیا گیا تھا۔ ہاں سید ا۔ ح (اختر حسین) میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اس دوران مجھے ان کو سمجھنے کا کافی موقع ملا۔ میں یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے ان کے کردار اور ان کی صلاحیتوں کے بارے میں بہت اعلیٰ رائے قائم کی ہے۔ یہ ایک عالمانہ ذہنی رجحان کے نوجوان ہیں اور ان تمام نوجوانوں میں جن سے زندگی بھر میرا سابقہ رہا ہے، ان میں یہ قابل ترین ہیں۔ یہ صرف انگریزی اور اردو ہی کے اچھے عالم نہیں بلکہ سنسکرت، ہندی، بنگلا اور گجراتی زبانوں کا بھی علم رکھتے ہیں اور اردو ہندی کے بہت اچھے لکھنے والوں میں ہیں۔ یہ انتہائی مہذب و شائستہ ہیں، نہایت روشن خیال نوجوان ہیں۔

یہ ادبی کاموں کے لیے فطری میلان رکھتے ہیں، میرے خیال میں اس کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا کوئی رجحان نہیں ہے اور ان کو مجبور کرنا کہ کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں ان کی مکمل تباہی کا سامان ہوگا۔

فی الحال وہ میرے ساتھ اردو لغت کے کام میں مصروف ہیں۔
جو میری نگرانی میں ترتیب پارہی ہے۔ اس کے بعد یہ بطور پیشہ
صحافت کو اختیار کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر انھیں
کافی مدد ملی جو میں انھیں دینے پر تیار ہوں، یہ بہت کامیاب ہوں گے
اور ہندوستانی صحافت میں نام پیدا کریں گے۔

میں ان کے خاندان کے متعلق صرف اسی قدر جانتا ہوں کہ
والد سے کوئی تعلق نہیں، مگر اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں بلکہ سوتیلی
والدہ کا ہاتھ ہے۔ آپ چاہیں تو بہت آسانی سے اختر کے رشتہ کے
ماموں وحید الحق صدیقی جو علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرار ہیں یا دوسرے
ماموں س۔و۔ا۔ رضوی سی۔ آئی۔ اے جو سی۔ پی گورنمنٹ مجلس قانون ساز
کے صدر ہیں ان کے ذریعے ہر طرح کی معلومات اور تحقیقات
کر سکتے ہیں۔

میں نے ان کے کردار اور صلاحیتوں کے بارے میں سچی اور
صحیح رائے آپ کو بتادی ہے۔ اختر اپنے ملک کی خدمت کی شدید لگن
رکھتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی صلاحیت ان کے اندر
بدرجۂ اتم موجود ہے۔

میں تو ان کے اس اعلیٰ مقصد میں ہر طرح کی حوصلہ افزائی
کروں گا۔ ہرگز اختر کو ان کی طبیعت اور ارادوں کے خلاف کوئی اور
پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کروں گا۔ اپنی تمام آزادروی اور روشن
خیالی کے باوجود وہ دل آویز ادب اور آداب کے مالک ہیں، بزرگوں
کے لیے عزت اور احترام کرنے کا بڑا ڈھب بھی ہے۔ میں اختر کو
دماغی اور دلی صفات کی وجہ سے بے حد پسند کرتا ہوں اور دل سے
ان کی قدر کرتا ہوں۔

میں یہ سب آپ کو بڑی رازداری سے لکھ رہا ہوں جیسے حمیدہ میری اپنی ہی بیٹی ہو۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کو اس معاملے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے اور فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اختر کو دامادی کا شرف بخشیں۔ اگر آپ ان کو باریابی کی اجازت دیں تو بلاشبہ ان سے مل کر آپ میرے اندازوں کی تصدیق کریں گے۔

عبدالحق

والد صاحب اس خط کو وصول کرنے کے بعد بغیر کسی معتبر معلومات کے میرا رشتہ اختر کے ساتھ کرنے کی منظوری کا خط روانہ کر دیتے ہیں۔

اس طور مولوی صاحب کی عظیم اور شفیق شخصیت مجھ پر سایۂ فگن ہو جاتی ہے۔

دوسرا خط[2] مولوی صاحب یوں لکھتے ہیں:

ڈیر ظ۔ع (ظفر عمر)

آپ کا خط مورخہ ۲۷ رجون وصول ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی رضامندی پر کن الفاظ میں اپنی خوشی اور تشکر کا اظہار کروں۔ میں آپ کے فیصلہ پر بہت خوش ہوں۔ اختر آپ کے اس قدر مشفقانہ خط سے بہت متاثر ہوئے۔ کچھ دیر تو وہ ایسی خوشی و مسرت کے عالم میں رہے کہ میں ذرا گھبرا سا گیا۔ یہ حقیقت ان کے کردار کی عکاسی کرتی ہے، درحقیقت اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ آپ یقین رکھیں اور مطمئن رہیں وہ آپ کے لائق داماد ثابت ہوں گے۔ میں آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ ہم دونوں آپس میں گفت و شنید کے بعد اس فیصلہ پر پہنچے ہیں کہ شادی کرسمس کے ہفتہ یعنی عید کے فوراً بعد یعنی ۲۹ ردسمبر ۳۵ء کو ہو۔ اس صورت میں، میں ان کے ہمراہ آ کر اس پُر مسرت شادی میں شرکت کر سکوں گا۔

میں اور اختر آپ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ شادی کی رسومات
تا حد امکاں کم سے کم ہونی چاہئیں۔ ہر طرح کی نمود و نمائش کے اختر
بہت خلاف ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

عبدالحق

مجھے جو انھوں نے پہلا خط لکھا اس میں یہ لکھا کہ ''میں نے جب یہ سنا کہ تم کھانا اچھا پکاتی ہو تو بے حد خوش ہوا۔ اس دن کا منتظر ہوں، جب تمہارے ہاتھ کا پکایا کھانا کھا سکوں گا۔ بڑی عمر پر آ کر اچھے کھانوں کا شوق سب کو ہو ہی جاتا ہے۔''

ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے والدہ نے بڑی توجہ سے مجھے آٹھ دس نفیس اور لذیذ چیزیں پکانا سکھا دیں۔ ورنہ میں تو مطلق کوری تھی۔ گاہے گاہے مولوی صاحب مجھے کتابوں کا پارسل بھی روانہ کرواتے رہے اور خط بھی لکھتے رہے۔

۲۹ دسمبر ۳۵ء کو دس بجے دن کی گاڑی سے برات لے کر مولوی صاحب پہنچ رہے ہیں۔ ان کے شایان شان انتظامات کیے گئے تھے۔ ریل کے فرسٹ کلاس کے ڈبے جہاں پر رکیں گے ان کے سامنے سرخ قالین بچھا ہوا ہے ایک طرف پولیس کے بینڈ والے کھڑے ہیں دوسری طرف خاندان کے بزرگ اور شہر کی معزز شخصیات۔ ریل آ کر رکتی ہے، دروازہ کھلتا ہے، سب سے آگے مولوی صاحب کچھ کودنے والے انداز سے اترتے ہیں، پیچھے سے اختر اور ان کے دس دوست۔ ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف، سبط حسن، مجاز، ساغر نظامی، ذکاء اللہ خاں، بشیر الدین، علی گڑھ یونیورسٹی کے لائبریرین اور ہندو دوست مہندر، رام لال، تیسرا نام بھول گئی۔ سب یکے بعد دیگرے کود کود کر اُتر جاتے ہیں اور مولوی صاحب اور اختر جو گا رہے ہیں اس میں ہم نوا ہو گئے:

للا روپیہ لائیو ہے
للا کی شادی کر دیں گے
کر دیں گے بھئی کر دیں گے

(درمیان کا بول بھول گئی)

لائق دولھا لائیوں ہیں

جاہل لڑکی لے لیں گے بھئی لے لیں گے (ساتھ میں زوردار تالیاں)

بینڈ والے باذاق تھے اسی دھن کو بجانے لگے۔ سب حق حیران یہ ماجرا دیکھ کر اپنی اپنی نظریں نیچی کیے کھڑے ہیں۔ والد کی شرمساری کا کچھ اندازہ کر کے مولوی صاحب کہتے ہیں: ''ظفر عمر دیکھو بھئی یہ بڑی خوشی کا موقع ہے یہ کوئی عام سی شادی تو نہیں اور ہاں اختر سے تو ملو!''

براتی موٹروں میں بٹھائے جاتے ہیں۔ بھائی شوکت عمر اپنے ساتھ اختر، ڈاکٹر اشرف اور سبط حسن کو بٹھاتے ہیں۔ راستے میں پوچھا کہ مولانا صاحب کو یہ کیا ہو گیا تھا تم سب کے ساتھ گا رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ سبط کا یہ کہنا تھا: ''خوشی کا موقع تھا کوئی مجلس تو تھی نہیں اور مولانا کی رائے گاڑی سے اترنے سے پہلے بنی کہ جلدی سے کوئی تک بندی کر لیں اور گاتے ہوئے گاڑی سے اتریں پھر ذرا ظفر عمر کی بوکھلاہٹ دیکھنے میں آئے گی! اختر کی شادی ہے کچھ ایسی ہو کہ لوگ ساری عمر یاد رکھیں۔''[۳]

بھائی شوکت عمر کا سارا انتظام تھا۔ براتیوں کے لیے بڑے رنگا رنگ خیمے لگوائے گئے تھے۔ پہلے مولوی صاحب کو ان کے خیمے میں لے گئے پھر اختر کو اور باقی سب کو کہ نہا دھو کر تیار ہوں تو وہ گھر میں سب کو لے کر جائیں اور خود کوٹھی کے برآمدے میں منتظر کھڑے تھے کہ دیکھا مولوی صاحب ہر خیمے کے پردے کو لمحہ بھر کے لیے ہٹا کر جھانکنے کے بعد واپس اپنے خیمے میں چلے گئے۔

خاصی دیر ہو گئی تو بھائی شوکت عمر ان سب کو بلانے گئے۔ ہر خیمہ خالی۔ سفر کے کپڑے سب کے پلنگوں پر اُلٹے سیدھے پڑے ہوئے ہیں یعنی سب نہا دھو چکے ہیں۔ پر ہیں کہاں؟ دور امرودوں کے باغ میں کچھ گانے کی سی آواز سن کر لپکتے ہوئے ادھر گئے۔ وہاں بھی سب کے سب نہیں ہیں اور مولوی صاحب تو ہنسی سے دوہرے ہوئے جاتے ہیں۔ ذکن، اختر، مجاز کوئی دھن نکال رہے ہیں، ان کو دیکھ کر سب چپ ہو گئے۔ جب انھوں نے

دریافت کیا کہ گھر میں نہ آ کر باغ میں کیوں آ گئے؟ تو مولوی صاحب کا جواب کہ ''امرود ان کا سب سے مرغوب پھل ہے، تازہ تازہ توڑ کر کھانے کی بات ہی کچھ اور ہے۔'' جب یہ کہا گیا کہ ان کو کچھ گانے کی آواز سی آ رہی تھی تو فوراً سب بول اُٹھے کہ'' گانا اور کھانا ہم سب کو بہت بھاتا ہے۔'' کیا کہہ سکتے تھے بے چارے شوکت عمر۔ ''اچھا اب چلیں اندر سب لوگ منتظر ہیں آپ سب کے۔''

مولوی صاحب اندر آئے تو بالکل سیریس موڈ میں سب سے ملے اور اختر کو ملایا۔ چائے پیتے رہے اور ادھر اُدھر کی بات چیت کرتے رہے۔

ایک بجے کہا گیا کہ کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ پُر وقار انداز سے وہ پہلے کھڑے ہوئے اور ان کے پیچھے باقی سب۔ کھانے کا کمرہ بہت بڑا تھا۔ ۲۴ لوگوں کی میز لگی ہوئی تھی چاروں طرف سرخ وردی میں بینڈ کے بیگ پائپر اپنی نفیری لیے اسٹیچو کی طرح منتظر کھڑے ہیں کہ براتی بیٹھ جائیں تو یہ اپنی ہلکی دھن میں شہنائی کا راگ بجانا شروع کریں۔ سب بیٹھ گئے، بیرے سفید وردی اور اونچی کلاہ میں کھانے کی ڈشیں پیش کرنے لگے۔ کھانا پلیٹوں میں لے لیا۔ نفیری بجنے لگی۔ مولوی صاحب ایک دو منٹ خاموش ہاتھ میں چھری کانٹا پکڑے رہے پھر بولے: ''بھئی اس توں، توں پی پی میں کھایا تو کچھ جائے گا نہیں تو چلو پی ہی لیں۔'' یہ کہہ کر سامنے رکھی ٹماٹر ساس کی بوتل کھول کر غٹ غٹ پینے لگے اور ساتھ ساتھ سب براتی! والد صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے بینڈ والوں کو باہر چلا جانے کو کہا۔ تب ٹماٹر ساس کی بوتلیں واپس میز پر رکھ دی گئیں اور بالکل سیریس موڈ میں بات چیت کرنے لگے۔ کھانا ختم ہوا، کافی کا دور چلا، ایک دم کھڑے ہو کر اختر کا ہاتھ پکڑا اور سب سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''چلو چلو اپنے اپنے تمبو میں، ہم تو بنجارے لوگ ٹھہرے دو گھڑی پیٹھ سیدھی کر لیں۔'' میرے ماموں سید حامد حسین (جنرل شاہد حامد کے والد) سے مڑ کر کہتے ہیں کہ ان کے خیمے میں جو نیلے رنگ کے دو کیبن ٹرنک رکھے ہوئے ہیں وہ حمیدہ کے لیے ہیں ان کو وہاں سے اندر پہنچا دیں اور شام کی چائے چار بجے ان کے ٹینٹ میں بھجوا دی جائے۔

مہمان آنا شروع ہو گئے۔ بعد مغرب نکاح پڑھایا جائے گا۔ مولوی صاحب کے ساتھ مع دولھا کے سب براتی تشریف لاتے ہیں۔ سامنے ایک تخت پر گاؤ مسند لگی ہوئی ہے جس پر دولھا کو بٹھایا گیا۔ سامنے والے صوفے پر مولوی صاحب اور دیگر حضرات۔ مولوی صاحب مجاز سے مخاطب ہو کر دبی آواز میں کہتے ہیں: ''میاں چونچ آپ تو میرے پاس آجائیں۔'' سننے والوں نے شکر ہے یہ سمجھا کہ جوش بلائے جارہے ہیں۔ کچھ نے ادھر اُدھر دیکھ کر آپس میں یہ بھی کہا کہ ''مگر جوش صاحب ہیں کدھر؟'' مجاز ان کے پاس آئے تو ڈکن کو اختر کے پاس بھیج کر مجاز سے کچھ آہستہ آہستہ کہا اور پاس بٹھالیا۔

ہمارے زمانہ میں تب یہ نہ ہوتا تھا کہ مہر پہلے سے طے کرلیا جائے نہ ہی چھپے ہوئے نکاح کے فارم ہوتے تھے۔ محفل ہی میں سر جوڑ کر مہر طے پاتا اور نکاح نامہ قلم سے لکھ لیا جاتا تھا۔

میرے ماموں سید حامد حسن صاحب ان کے نزدیک آکر مؤدب ہو کر ان سے دریافت کرتے ہیں۔ مولانا آپ مہر کا طے کردیں تو مولوی صاحب ذرا گھبراہٹ ظاہر کرتے ہوئے دریافت کرتے ہیں، ''حامد حسین تم یہ کس مہر کا نام لے رہے ہو۔ ہم تو اختر کی شادی حمیدہ کے ساتھ کروانے آئے ہیں۔'' وہ دو قدم پیچھے ہو کر آگے بڑھتے ہیں یہ کہتے ہوئے: ''مولانا شادی تو حمیدہ ہی سے ہو رہی ہے۔ مہر کوئی لڑکی نہیں بلکہ مہر تو وہ رقم ہے جو نکاح کے وقت مقرر کی جاتی ہے۔'' اب مولوی صاحب سیدھے تن کر بیٹھتے اور با آواز بلند فرماتے ہیں: ''تو یوں کہو نا کہ تم لوگ لڑکی بیچ رہے ہو۔ بولو کیا بولی لگائی ہے تم نے اس بے چاری لڑکی کی؟'' میرے ماموں کچھ پیچھے ہو جاتے ہیں۔ جن مہمانوں نے یہ سنا وہ حق حیران کہ یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ پھر ہمت باندھ کر قریب آکر کہتے ہیں کہ جو بڑی بہن اور بہو کا ہے یعنی یہ... مولوی صاحب نے جیب سے چیک بک نکال کر چیک فوراً لکھ میرے ماموں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انھوں نے قاضی صاحب کے خطبہ نکاح پڑھنے کے بعد جب پوچھتے ہیں حمیدہ بنت ظفر عمر... وغیرہ وغیرہ آپ کو قبول؟ تو مولوی صاحب جھٹ سے کہتے ہیں: ''قبول نہ ہوتی تو یہاں تک آتے ہی کیوں ہوتے۔'' قاضی صاحب مولوی صاحب کی شخصیت اور

دبدبہ سے ناواقف تھے۔ بگڑ کر کہتے ہیں: ''دیکھیے بڑے صاحب آپ خاموش رہیں اس کا جواب خود دولھا میاں دیں گے۔'' تو مولوی صاحب جھٹ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئے۔
میرے ماموں نے اندر آ کر مسکراتے ہوئے وہ چیک اماں کو لا کر دے دیا۔ ریل سے باراتیوں کے اُترنے کا انداز اور گانا وہ اپنی بہن کو سنا چکے تھے۔ اماں بھائی سے لپٹ کر رو پڑیں۔ بھائی جان یہ کس قسم کے لوگ ہیں مجھے تو اس لڑکی کی خیر معلوم نہیں دیتی، اور ان بزرگوار نے سمجھا کیا ہے۔ کوئی مہر لینے کے لیے تو لکھوایا نہیں جاتا۔ چیک ہاتھ میں پکڑ کر چار ٹکڑے کر دیے۔ سامنے رکھی ہوئی پان کی چاندی کی تھال کو اُٹھا کر اس میں رکھ کر بولیں آپ جا کر مولانا کو یہ واپس کر آئیں۔ انھوں نے انکار کیا کہ نا بابا میں تو یہ لے جا کر دینے سے رہا وہ بھری محفل میں جانے اب مجھے کیا کہہ بیٹھیں۔ اماں نے بھائی کو قسم دی کہ آپ مولانا صاحب کو دے کر آئیں۔ وہ آئے، پرے کھڑے ہو کر تھالی چیک کے ساتھ ان کے ہاتھ میں تھما کر جلدی سے سرک گئے۔ مولوی صاحب مسکرائے اور ایک ایک ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ کر منھ سے ''پھو پھو'' کر کے ادھر اُدھر اُڑا دیے۔ کسی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا، بندہ ایک سہرا لکھ کر لایا ہے پیش خدمت ہے۔ اب مولوی صاحب کراری آواز میں فرماتے ہیں: ''سہرا آپ کس خوشی میں پڑھیں گے؟ خوش ہونے کے حق دار ہم ہیں کہ دلہن لے جا رہے ہیں۔ ہم سہرا خود لکھ کر لائے ہیں۔ ہاتھ کے اشارہ سے اختر، ذکن اور سبط کو بھی اپنے پاس بلا لیا باقی تو پہلے ہی سے ان کے ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ سب ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سب یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اب براتی آخر کیا کرنے والے ہیں کہ سہرا گایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب تال دے رہے ہیں:

ایک بنجارا یار ہمارا
پھرتا تھا یوں مارا مارا!
جیسے ہو اک مرغ بے چارہ
ڈھونڈے سہارا ڈربے کا

......

یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مندر کی مندر کی ۔۔
(تالیوں کی گونج)

......

بہن کھلونا، بھائی تماشہ
آگے تانگہ پیچھے گھوڑا
خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا
(تالیوں کی گونج)

یہ پڑھ کر آپ لوگ ہنس رہے ہیں نا! بھئی یہ تو بابائے اردو کی تک بندی تھی!!

میں تو آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ اگر آج کل کے موڈرن زمانے میں بھی کوئی ایسی برات اور ایسے براتی آجائیں تو لڑکی والے یقیناً ڈنڈے لے کر ان پر پل ہی تو پڑیں! مگر یہاں واسطہ تو مولوی عبدالحق صاحب سے تھا۔ جن کا ڈنکا اس وقت سارے ہندوستان میں بجتا تھا اور ان کی عزت اور شہرت ہر طرف یوں پھیلی ہوئی تھی کہ ہر کسی پر رعب اور دبدبہ ان کا نام سن کر طاری ہو جاتا تھا۔ یہ زمانہ ان کے پورے عروج کا تھا۔ ہر مہمان دم بخود تھا۔ میرے والد، چچا، ماموں، بھائی شوکت عمر خفت سے گردنیں جھکائے ہوئے۔

''کھانا میزوں پر ہے تشریف لے چلیں۔'' براتی بھولے انداز سے ادھر ایسے چل پڑے جیسے کوئی خاص بات ہی نہ کی ہو۔ اب وہ اپنی پُر وقار شخصیت کے ساتھ لوگوں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

کھانے کے بعد میرے بھائی شوکت عمر کو جانے کیا سوجھی کہ مولوی صاحب سے کہا اندر چل کر وہ میرے جہیز کا سامان دیکھ لیں تاکہ جہیز رات ہی کو بند کر دیا جائے۔

مولوی صاحب اور شوکت عمر کمرے میں داخل ہوئے سامنے ہی تانبے کی پتیلیوں کا ایک کونے میں ننھا منا سا مینار دیکھ کر پوچھتے ہیں: "یہ کس لیے ہیں؟" "کھانا پکانے کے واسطے۔" "تو کیا ان کے گھر میں نہیں۔" یہ کہہ کر اپنی چھڑی سے ایک کو جو ٹہوکا دیا تو یکے بعد دیگرے وہ سب دھم دھم کر کے نیچے گر گئیں۔ میز پر پان دان، خاص دان پر نظر پڑتے ہیں برہم سے ہوئے ہٹاؤ ہٹاؤ ان واہیات چیزوں کو۔ ساتھ ہی ایک طرف لحاف، توشک، رضائیاں نظر آ گئیں پوچھتے ہیں، "یہ الم غلم کیا ہے؟"

"جی بستر ہوں گے۔ یہ سب کچھ تو ہر لڑکی کو دیا جاتا ہے۔"

"جو دسیوں لڑکیاں تمہارے گھر میں ہیں ان کو دے دینا ہمارے ساتھ صرف حمیدہ کے کپڑے اور ذاتی استعمال کا کچھ سامان جائے گا۔" مولوی صاحب بے زار سے ہو کر باہر نکل آئے۔

ناشتہ کے بعد ہم سب اور وہ کالپی روانہ ہوئے۔ دریائے کالپی اورئی سے ۱۲ میل دور حسین علاقہ میں سے نیچی نیچی پہاڑیوں سے گزرتا ہے۔ دریا کے ایک طرف پہاڑی پر ایک ریسٹ ہاؤس تھا، ڈھلان پر پھلوں کے باغات پھر کھیتوں کا سلسلہ دریا تک پھیلا ہوا۔ جاڑے میں ہمالیہ کے برفانی مقامات سے پچاسوں طرح کے لاکھوں پرندے دریا میں اپنا بسیرا دو ماہ تک اختیار کر لیا کرتے ہیں۔

مولوی صاحب کی پہلے سے فرمائش ہو گئی تھی کہ لنچ وہاں کھانا چاہتے ہیں اور اس علاقہ کی سیر کریں گے۔

اختر سے بھائی جان نے راستے میں کہا، "خدارا تم لوگ اب کوئی عجوبہ حرکت مزید نہ کرنا والد صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ آج تو انسانیت کے دامن کو پکڑے رہنا۔" جواب میں اختر نے کہا، "شوکت ذرا تم ہمیں انسانیت لا دو تو ہم دامن ہی نہیں بلکہ گریبان بھی پکڑ لیں گے۔"

کالپی پہنچ گئے۔ جب بھائی جان نے مجھے مولوی صاحب سے ملایا کہ "یہ حمیدہ ہیں،" میں نے جھک کر آداب کیا۔ دوپٹہ خوب اچھی طرح اوڑھے ہوئے تھی۔ جھک کر میرا منھ

دیکھتے ہی فرماتے ہیں، ''یہ تو ذرا سی لڑکی ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں شاردا ایکٹ میں ہم لوگ دھر نہ لیے جائیں۔'' (اس وقت میں بے انتہا دبلی تھی)۔ مولوی صاحب والدہ سے ملے تو والدہ نے حال احوال دریافت کر کے بڑے پُر وقار انداز سے اتنا کہا، ''برائے مہربانی آپ اور اختر صاحب اس سیدھی سادی لڑکی سے صرف اتنا مذاق روا رکھیے گا جس حد تک اس کا کچا دماغ سمجھ پائے۔''

''وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا فی الحال ہم حمیدہ کو لے کر ندی کے کنارے تک ہو آئیں کھانے کے وقت تک لوٹ آئیں گے۔''

پہاڑی سے نیچے اُترنے لگے تو تالیوں نے خبردار کیا کہ آج کل کئی جوڑے چیتے کے ادھر اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں لہٰذا آگے نہ جایا جائے۔ مولوی صاحب میرا اور اختر کا ہاتھ پکڑے ہوئے یہ کہتے ہوئے چلے کہ یوں تو چیتوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ہرنوں کے غول اور بارہ سنگھوں کی ڈار چوکڑیاں لگاتے دیکھ کر کچھ دیر کھڑے، بہت خوش ہوئے۔ ایک کھیت میں ایک بوڑھا برگد کا پیڑ کھڑا تھا اس کے چاروں طرف ایک پکا چبوترا بھی تھا جس پر ایک مورتی رکھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب لپک کر آگے بڑھے اور جھک جھک کر اس کو سلام کرنے لگے۔ جب اختر نے کہا دیوی کو سلام نہیں نمسکار کرتے ہیں تو ہنس کر بولے ''میں تو 'زبان بے زبانی' کے برگد صاحب کو شکریہ کا سلام کر رہا ہوں ان ہی حضرت کے طفیل تو ہم کو ایک لڑکی ملی ہے۔'' اب میں نے پہلی بار نظر اُٹھا کر سر اونچا کر کے مولوی صاحب کو دیکھا۔ سفید داڑھی اور سر کے بال۔ روشن آنکھیں جن میں شفقت جھلک رہی تھی۔ پوچھتے ہیں، ''دیکھ لیا اچھی طرح۔ ہوا تو نہیں لگا؟''

میرا جواب یہ تھا، ''یہ لگا کہ آپ سے شفقت، محبت اور دوستی ملے گی۔'' ہنس پڑے کہنے لگے، ''اختر یہ بات اچھی ہے کہ اس لڑکی کے منہ میں زبان بھی ہے۔'' پھر اسی چبوترے پر کچھ دیر لیٹ کر سامنے کا نظارہ کر کے خوش ہو کر بولے کہ کیا رائے ہے یہاں زمین خرید کر ایک چھوٹا سا کاٹج نہ بنا لیا جائے تا کہ ہر سال دنیا والوں سے چھپ کر یہاں آئیں اور قدرت سے قریب ہو کر سکون سے کچھ وقت گزار سکیں۔''

ہم جیسے ہی دریائے کالپی کی سیر سے واپس آئے کھانا لگا دیا گیا۔ کھاتے وقت والد صاحب سے مخاطب رہ کر مولوی صاحب ان صاحبان کی خیر و عافیت معلوم کرتے رہے جو مشتر کہ جان پہچان کے لوگ تھے کہ یک دم ان کو یوسف زماں (خلیق الزماں صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی) کی ان دو لڑکیوں کا خیال آ گیا جن کو یوسف زماں صاحب نے اللہ کو پیارے ہوتے وقت والد کی سرپرستی میں سونپ گئے تھے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ ان لڑکیوں کو بی اے کروانے کے بعد لندن بھجوا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے بھی راہ ہموار کی گئی۔ اب وہاں قیام پذیر ہیں۔ تو خوب ہنس کر بولے "شاباش ہے ظفر عمر کہ درجن بھر اپنے ٹبر کو پالتے ہوئے، دسیوں کنبے کے لڑکے لڑکیاں اور دوستوں کی اولاد کو 'نیلی چھتری' کے چھپر کے نیچے رکھ کر دنیا کے لائق بنایا اور خود بھی زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہو، یہ تمہارا دم خم ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کب کا پاگل خانے پہنچ چکا ہوتا۔"

شام کی چائے پی کر واپس 'اورئی' آ گئے۔ رات کو ۹ بجے حیدرآباد کے لیے روانگی تھی۔ کھانا جلد ہی کھا لیا گیا۔ اسٹیشن پہنچے، ریل آ کر رکی۔ جو چار سیٹر ڈبہ بک کروایا تھا وہ تو چھ سیٹر نکلا۔ اس میں ایک بنگالی جوڑا مع اپنے دو عدد بچوں کے پہلے ہی سے براجمان تھا۔ مولوی صاحب اور اختر دونوں کا موڈ خراب سا ہو گیا، اس وقت کچھ کیا نہ جا سکتا تھا۔ سامان رکھ دیا گیا۔ ہماری تین سیٹیں نیچے کی تھیں چوتھی پر وہ دو بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر دونوں میاں بیوی۔ مولوی صاحب کافی دیر ہاشمی فرید آبادی پر گرم ہوتے رہے کہ بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے، بکنگ ان کے ذمے کی تھی وغیرہ وغیرہ۔ ریل چھک چھک کرتی جب چل دی تو میں باہر کھڑکی سے سر نکال کر بے اختیار رونے لگی۔ اب یہ احساس اجاگر ہوا کہ لو میں تو بابل سے ہزار میل دور جا رہی ہوں۔ مولوی صاحب میرے پاس آ کر اپنا دست شفقت میری پیٹھ پر رکھ کر کہتے ہیں، "سنو! ہم کو سمندر، دریا اور جھرنوں کا پانی بہت اچھا لگتا ہے مگر یہ آنکھوں کا بہتا پانی قطعی پسند نہیں۔ چلو سر تو اندر کرو اور اپنے ڈبے کی آب و ہوا اور دیگر ہم سفروں پر غور کرو اب ہم کو ان سے نبٹنا ہے۔" میں حیران کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ اختر دوسری سیٹ پر چپ چپ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ان کے کان میں جا کر کہا وہ ہنس

پڑے "خوب خوب۔" میں ابھی بھی اپنے خیالوں میں گم صم بیٹھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ریل پوری اسپیڈ پکڑ چکی تھی میں اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے سر جھکا کے نیچے ہی دیکھ رہی تھی کہ ان دو بنگالی بچوں کی زوردار چیخیں نکلیں، باپ اوپر سے گردن جھکا کر بنگالی میں کچھ پوچھتے ہیں اور بچے کچھ بتا کر مولوی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میں اور مولوی صاحب تو بنگلا سمجھ نہ سکے، اختر بری طرح ہنس رہے ہیں۔ مولوی صاحب اپنی سیٹ پر دراز اخبار ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ اب اوپر سے دونوں ماں باپ مولوی صاحب پر نگاہیں جمائے ہوئے مجھے نظر آئے۔ ایکا ایک پھر بچے زور سے چیخ مارتے ہیں۔ اب کی وہ گھگی کے عالم میں اختر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جلدی سے میں نے سر گھما کر دیکھا تو مولوی صاحب دونوں ہاتھوں سے چونچ بنائے منھ ٹیڑھا کیے بچوں کو ڈرا رہے ہیں۔ میں خود اب اختر اور مولوی صاحب سے ڈرنے لگی، دور ہو بیٹھی کہ الٰہی خیر ان دونوں کے مزاج تو تلے اوپر نہیں ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بچے مولوی صاحب کو دیکھ دیکھ کر چیخ رہے ہیں اب کی میں نے ان کو دیکھ ہی لیا کہ دونوں ہاتھوں کی چونچ بنائے ان کو گھما کر منھ ہولناک طریقہ سے آڑا ترچھا کر رہے ہیں۔

اوپر سے بنگالی بابو پوچھتے ہیں کہ "بڑا شاحب آپ کیا کرتا ہے اور بچوں کو کیسے ڈراتا ہے؟ کیا آپ پاگل آدمی ہے؟"

"تو اور کیا باہر ڈبہ پہ لکھا دیکھا نہیں کہ اس ڈبہ میں دو پاگل بھی سفر کرے گا۔" اب دونوں ہی ہاتھوں کی چونچ بنائے منھ آڑا ترچھا ان کی طرف دیکھ کر کر رہے ہیں۔ بچے بلبلا رہے ہیں اور ماں باپ جھٹ بستر لپیٹ کر نیچے آ کر بچوں کا بستر گول کر نیچے سیٹ سے ٹین کا ٹرنک کھینچ کر دروازے کے پاس بیٹھ گئے پیٹھ کو ہماری طرف کر کے سینے پر بچوں کو دبکائے بیٹھ گئے، تو مولوی صاحب اور اختر منھ سے ہولناک آوازیں بلند کیے جاتے ہیں۔ اب تو میں خود بھی ڈر کے مارے کانپ اٹھی کہ آخر کیسے لوگ ہیں یہ؟ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا مجھ پر اپنا رعب اور ڈر طاری کرنا چاہتے ہیں۔

"بی حمیدہ دیکھ لو ہم کو کچھ ناگوار لگے تو یہی حشر تمہارا بھی کر دیں گے۔"

"گربہ کشتن روزِ اوّل باید" والی بات کی جا رہی ہے۔ نہیں نہیں میں تو ایسے ڈروں گی نہیں ورنہ زندگی اجیرن نہ ہو جائے گی؟ ٹھیک ہے نہلے پر دہلے کا استعمال کر کے دکھا دوں گی۔

ریل رُکی، دروازہ کھول، دونوں بچوں کو لے کر کھٹاک سے اُتر گئے۔ قلی نے سامان اُتار لیا۔ نہ جانے غریب کس ڈبے میں جا بیٹھے ہوں گے۔ اختر اور مولوی صاحب بچوں کی طرح ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔ بولے، "اگر ایسا نہ کرتے تو پرسوں صبح تک ہم تو سچ مچ پاگل ہو جاتے!" جب اطمینان کا سانس بھر کر مولوی صاحب اپنی سیٹ پر بیٹھے تو ان کو اپنا حقہ یاد آیا۔ اور شاید اس کے تمبا کو کی خوشبو کا تصور کیا ہو تو ناک میں درحقیقت کوئی اور ہی سی خوشبو آئی۔ ناک چڑھا کر، لمبی سانس کھینچ کر، میری طرف دیکھ کر دریافت کرتے ہیں" یہ کھانے کی کہاں سے بو آ رہی ہے؟"، "والدہ نے کل کے لیے کھانا ہمارے ساتھ کیا ہے پتیلیاں سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی ہیں،" میں نے جواب دیا۔

اُچھل کر اُٹھ بیٹھے کہ اب اس سے بھی ہم کو نبٹنا ہو گا۔ ریل ہلکی ہوئی۔ جھٹا جھٹ پتیلیاں دروازے کے پاس کھینچ کر رکھ لیں، دروازہ کھول کر آواز دے رہے ہیں "کسی کو کھانا چاہیے؟" کوئی نہ آیا تو قلی کو آواز دی کہ جلدی یہ سامان اتارو جب وہ تینوں پتیلیاں اتار چکا تو دروازہ کی جلدی سے چٹخنی لگائی اور کھڑکی سے پکار کر کہا، "جاؤ یہ سب لے جاؤ موج کرو۔" بتی بجھا کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ صبح میری آنکھ خود سے کبھی نہ کھلتی تھی جب تک مجھے ہاتھ سے ہلا کر کوئی اٹھا نہ دے۔ دن کے نو بج گئے تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ آنکھ میری یوں کھلی کہ مولوی صاحب اپنی چھڑی سے میرے پاؤں کو ہلکے ہلکے کونچ رہے ہیں۔ ہڑبڑا کر اُٹھی کچھ وقت یہ سمجھنے میں لگا کہ کہاں ہوں۔ بولے، "یوں کام نہیں چلے گا سارا مزا کرکرا کر دیا۔"

بھوپال کی پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج خاص انداز سے نکل رہے تھے۔ سوچا اب دن سورج کی روشنی میں دو انجانے انسانوں کے دوبدو بیٹھ کر گزارنا ہے۔ خطوں اور افسانوں والے اختر کو تو خوب جان گئی تھی پر یہ والے اختر تو نہ جاننے کے برابر تھے۔ خیر

جیسے تیسے دن گزرا، رات گزری، گاڑی رُکی۔ مولوی صاحب اور اختر کے بہت سے دوست اسٹیشن پر موجود تھے مگر اب بھی کوئی خاتون نظر نہ آئیں۔ لمبے موٹے موٹے بیلے چنبیلی کے گجرے ہم دونوں کے گلے میں سب ہی نے پہنائے۔ سب لوگ مولوی صاحب کو ہاتھ میں گجرے تھماتے رہے پھر دونوں نے اپنے اپنے حصے کے گجرے میرے گلے میں ڈال دیے، کس قدر بوجھ گیا۔ اسٹیشن سے موٹر میں روانہ ہوئے، کچھ دیر بعد اختر نے اشارہ کیا وہ سامنے جو پہاڑی نما ٹیکری پر کوٹھی ہے وہ "نادر منزل" ہے۔ گیٹ اور کوٹھی میں آدھ فرلانگ کا فاصلہ، سڑک ایک بہت بڑے لان کے ساتھ گھومتی ہوئی پورچ تک آئی لان کے ساتھ پھولوں کی کیاریاں کھلے ہوئے پھولوں سے بھری۔ لان کے اوپر ایک طرف بہت بڑا گھنا برگد کا درخت۔ جس کے چاروں طرف جالی سی بے تحاشا بڑا چڑیوں کا پنجرہ۔ اس کے چار حصوں میں چار قسم کی خوب صورت چڑیاں۔

آج جمعہ تھا نئے سال کا پہلا دن، نیا گھر، نئے لوگ اور ان کا ہر انداز ہی نیا!! یہ سوچتی ہوئی موٹر سے اتری۔ سامنے ہی چار ملازمین کھڑے ہیں شیرو، بشیر، محبوب، نور الٰہی۔ سب نے جھک کر سلام کیا ایک ایک ہار پہنایا۔ سامان دوسری موٹر پر آرہا ہے مولوی صاحب نے بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہا کہ اندر چلو اپنے گھر میں، پہلے بڑا ڈرائنگ روم، پھر ایک بڑا سا ہال کمرہ جس میں دیوار کے چاروں طرف کتابوں کی بہت اونچی اونچی الماریاں، درمیان میں ایک لمبی میز اور بہت کرسیاں۔ اس پر بے شمار طرح طرح کے رسالے اور اخبارات وغیرہ تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ کبھی یہ اس کوٹھی کا کھانے کا کمرہ ہوتا ہوگا۔ اور اب لائبریری ہے۔ اس کے ساتھ جو کمرہ تھا اس کو تھوڑا سا جھانکا یا کہ یہ ان کا اپنا دفتر ہے۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی الماریاں ایک طرف ان کا لکھنے کا ڈیسک۔ کچھ فاصلے سے ایک آرام دہ کرسی جس کے قریب تھال میں پیچوان رکھا ہوا۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر ایک ساوار، چائے کی پتی کے ڈبے اور چند پیالیاں اور ایک چائے دان پڑا تھا۔ یہاں جو کتابوں کی الماریاں تھیں ان کی کتابیں بہت بوسیدہ سی لگیں۔ ان میں تالے لگے تھے۔ مولوی صاحب خود ہی بول پڑے یہ سوچ رہی ہو کہ کس قدر پھٹی پرانی کتابیں ہیں۔

یہ سب صدیوں پرانے، انمول کتابوں کے نسخے اور مسودے ہیں۔ پھر ایک اور کمرے کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں عابد حسین اور دوسرے والے میں جانے کیا نام لیا۔ چلتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے رُکے دروازہ اس کا کھلا تھا کہا کہ یہ احتشام الحق صاحب کا ہے۔ میرے کان اس نام کو سن کر کھڑے ہوئے کہ والد صاحب نے آنے سے پہلے مجھے بتایا کہ اپنے عزیز دوستوں احتشام الحق، قاضی عبد الغفار اور سروجنی نائیڈ وکو آج ہی خط لکھ کر ڈال چکے ہیں اور یہ تینوں تمہارا بہت خیال رکھیں گے۔

یہ کمرہ دیکھ کے اندازہ لگایا کہ یہ دوسرے کمرے سے مختلف ہے۔ فرش پر ایک جازم بچھی ہوئی تھی، سامنے نیچا سا ڈیسک نما شے، لمبے لمبے کاغذ، پیلی رنگت کے ہر طرف کچھ تہہ شدہ اور کچھ کھلے ہوئے تھے۔ ایسے تین کمروں کی طرف مولوی صاحب نے اشارہ کیا کہ یہ کاتبوں وغیرہ کے ہیں۔ پھر بڑے ہال کمرے سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہو کر کہا یہ اختر کا آفس ہے۔ یہاں صرف دو نیچی الماریاں اور ڈیسک اور کرسی تھی۔ الماریوں میں موٹی موٹی طرح طرح کی زبانوں کی ڈکشنریاں تھیں۔ میز پر وہی لمبے اور پیلے ٹائپ شدہ کاغذ طریقے سے تہہ کیے رکھے ہوئے تھے۔ چق کو ہٹا کر برآمدے میں داخل ہوتے وقت مولوی صاحب نے کہا: ''آج تو تم کو آفس دکھا دیا اب یہ تمہارے لیے علاقہ ممنوعہ رہے گا، نہ تم کبھی ادھر جاؤ گی اور نہ اُدھر سے کوئی ادھر آئے گا۔'' یک بارگی زبان سے نکل گیا ''تو کیا آپ اور اختر بھی ادھر نہ آئیں گے؟'' یہ سن کر اپنی چمکتی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ارے اختر تو ہمارے ساتھ ہیں نہیں، وہ کدھر کو چل دیے! سوچ کر چپ رہی۔ برآمدے میں ایک چھوٹی سی کھانے کی میز اور چار کرسیاں تھیں ادھر اُدھر چند مونڈھے۔ الٹے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولوی صاحب نے کہا کہ وہ ان کا اپنا سونے کا کمرہ ہے اور سیدھے ہاتھ کی طرف تم دونوں کا۔ ''جاؤ اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔'' میں نے خواہش ظاہر کی کہ جب آپ نے سب دکھا دیا تو اپنا کمرہ بھی دکھا دیں۔ مولوی صاحب کے کمرے میں ایک مسہری، درمیان میں دیوار کے ساتھ لگی لوہے کی کیبنٹ، دوسری طرف ایک چھوٹا ڈیسک اور دو نیچی نیچی کتابوں کی الماریاں ان پر کچھ بوتلوں میں خشک میوہ،

باہر کے بسکٹوں کے چند ٹن، دواؤں کی چند بوتلیں، ساتھ میں ڈریسنگ روم اور غسل خانہ۔
کمرے سے باہر آتے وقت دروازے کے قریب والے برآمدے کی دیوار کے ساتھ ایک پتلی لمبی سی میز ہے، اس پر کچھ پیالیاں، چائے دانی اور کئی طرح کے چائے کے ڈبے، ایک ویسا ہی ساوار جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی یعنی کہ پانی چائے کے لیے گرم ہو رہا ہے۔
مولوی صاحب برآمدے کے دوسرے سرے پر لپک آئے اس کمرے کے دو دروازے برآمدے میں کھلتے تھے جن پر چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ چق ہٹا کر آواز لگائی "رائے پوری صاحب تم سے ملنے کوئی صاحبہ آئی ہیں!" اور مڑ کر چل دیے۔ اختر نہا رہے تھے۔ میں نے پورے کمرے پر نظر ڈالی تو لگا اس کا سب فرنیچر بالکل نیا عمدہ قسم کی ٹیک کا ہے۔ دو مسہریاں، ایک چھوٹا سا ڈیسک، کرسی، دو نیچی سی کتابوں کی الماریاں، ایک کونے میں دو آرام دہ کرسیاں، سامنے وکس پالش سے جھل جھل چمکتی میز اس پر ایک ۵۵۵ سگریٹ کا کاٹن اور ایش ٹرے۔
کمرہ بڑا کشادہ، قالین بہت عمدہ نیلے رنگ کا، ایک پھول دان میرے ڈیسک پر اور ایک الماری پر تازے گلاب کے پھول رکھے ہوئے۔ آگے بڑھے تو بڑا سا ڈریسنگ روم، دو کپڑوں کی الماریاں، ایک ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ میں اسٹول، بیچ میں میرے دو ٹرنک اور ہم دونوں کے تین سوٹ کیس رکھے تھے۔ اختر نہا کر نکل آئے مجھ سے کہتے ہوئے کہ آپ نہا دھو کر برآمدے میں آجائیں تو گرم گرم چائے مولوی صاحب پلائیں گے۔

میں جب برآمدے میں آئی تو نہ وہاں مولوی صاحب اور نہ اختر۔ برآمدے کی تین سیڑھیاں اُتر کر دس فٹ چوڑی زمین پر لال بجری بچھی ہوئی، پھر ساتھ ہی ڈھال شروع ہو جاتی ہے۔ جس پر پہلے پھولوں کی کیاریاں، پھر ہری گھاس پھر زمین کوئی ۲۵ فٹ لیول کی ہوئی۔ آگے جا کر زمین ڈھلوان تھی جس پر گنجان جھاڑیاں، اکا دکا اونچے اونچے پیڑ۔
مولوی صاحب ہیں ٹیسٹ والے انسان۔ پیچھے سے دو انسان یک بہ یک "ہو" کی آواز نکالتے ہوئے وارد ہوئے میں اچھل ہی تو پڑی۔ خود مولوی صاحب نے اپنے ہاتھ سے مختلف ڈبوں میں سے تھوڑی تھوڑی پتی نکال کر چائے دانی میں ڈالی میں بغور دیکھتی رہی تاکہ شام کو میں چائے دم کروں۔ چائے دانی پر ایک چھوٹا تولیہ ڈھانک دیا۔ تھوڑی دیر بعد

مجھ سے پوچھا ''ہلکی چائے یا تیز؟'' میرے منہ سے جانے کیوں یہ نکل گیا'' چائے اور چاہ جیسی بھی مل جائے۔'' مسکرائے پھر پوچھا،'' اور دودھ کتنا؟''
'' بہ قدر اشک بلبل'' ہنس کر بولے،'' تم کو فارسی آتی ہے؟'' ہاں تھوڑی سی۔''
'' اختر یہ لڑکی خاصی چٹ پٹی ہے ذرا بچ کر رہنا ہوگا۔'' اندر کمرے میں گئے ایک گڈی نوٹوں کی میرے ہاتھ میں دے کر ساتھ ہی ڈیسک کے خانوں کی چابیاں تھما کر فرمایا:'' سب نوکروں کی تنخواہیں دینا اور بشیر کو کھانا پکانے کو بتادیا کرنا۔''

خود تو اندر چلے گئے اختر اخبار پڑھتے رہے۔ میں نے اتنے ڈھیر سے نوٹ کبھی اپنے ہاتھ میں لیے نہ تھے۔ نہ مجھے معلوم کہ ملازموں کی تنخواہیں کیا ہیں اور کھانے میں ان دونوں کو پسند کیا ہے؟ خیر اختر سے پوچھ لوں گی۔ اندر جا کر دراز کھولی۔ پیڈ، سادے لفافے، ٹکٹ دار لفافے، قلم سب ہی کچھ رکھا ملا۔ والدہ کی ایک تاکید یاد آئی کہ جب تم کو گھر چلانے کے لیے روپیہ دیا جائے تو ایک پر'' لفافہ برائے قرض'' دوسرے پر'' اشد ضرورت کے لیے'' لکھ کر تھوڑے روپے اس میں رکھ دینا آخر ماہ میں اگر ضرورت ہو تو لفافے سے قرض لے کر پہلی کے بعد لفافے کا قرض واپس کر دینا۔ اشد ضروری کو صرف ضرورت پر ہاتھ لگانا۔ میں نے بے گنے کچھ ایسا ہی کیا۔ رات کا کھانا بعد مغرب کھایا گیا۔

دوسرے دن صبح بشیر میرے پاس آ کر کھانا پکانے کا پوچھتا ہے،'' آج رات کیا پکایا جائے۔'' '' بھئی پہلے تو دن کے کھانے کی بات کرو۔'' میں نے کہا تو وہ میرا منھ دیکھنے لگا۔ بولا مطلب یہ ہے کہ'' اختر میاں یا مولوی صاحب نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ ہمارے گھر میں دن کا کھانا کھایا نہیں جاتا بس رات کا بتادیں۔'' '' بشیر جو تم نے پرسوں پکایا وہی آج پکالو۔'' '' مگر آپ لوگ یہاں پرسوں کب تھے؟'' '' ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے تم اپنی مرضی سے پکالیا کرو مجھے کیا معلوم یہ دونوں کون سی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ اپنی تنخواہ لے لو اور بتادو کہ کس کو کیا دوں؟'' وہ میرا منھ دیکھ کر مسکرا پڑا کہ ان صاحبہ کو کچھ بھی خبر نہیں۔ اس نے مجھے گھبرا کر کہا،'' یہ اس گھر میں کبھی نہیں آسکتے۔'' '' وہ کیوں؟'' '' آپ مولوی صاحب سے

پوچھ لیجیے گا۔ آج تو آپ کی فرمائش بھلے پوری کر دوں گا، کمرہ بند کر کے کھائیے گا۔ بیج اور چھلکے کاغذ میں لپیٹ کر ٹوکری میں رکھ دیجیے گا۔"

کل ہی اختر سے مولوی صاحب کہہ چکے تھے کہ وقت بہت ضائع ہو چکا ہے کام کی پوری پابندی ہونا چاہیے اور جو بھی جس بات کے اوقات ہیں اس میں فرق نہ آئے۔ صبح پانچ بجے یا تو خود سے اختر اُٹھے ہوں گے یا مولوی صاحب نے آواز دے کر اُٹھایا ہوگا۔ دونوں سیر کر کے آگئے۔ اختر نہانے غسل خانے میں چلے گئے مولوی صاحب نے چق اٹھا کر جھانکا میں اوندھی پڑی سو رہی تھی۔ دیر تک سونا ناگوار گزرا، یا چھیڑنے کے موڈ میں ہوں۔ میز پر سے کتابوں کا ڈھیر اُٹھا کر میرے اوپر لاد دیا۔ میں نہ اُٹھی نیچے رکھا ہوا صندوقچہ کمر پر ساتھ ہی کرسی دو پائے ادھر دو اُدھر میرے اوپر رکھ دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بڑے بوجھ تلے دبی جا رہی ہوں۔ الٹی تو لیٹی تھی دکھائی دیتا تو کیسے۔ زور لگا کر اُٹھی تو آڑم دھڑم کرسی گری صندوقچہ گرا اور سب کتابیں۔ اختر غسل خانے سے پکار پکار کر کہے جائیں حمیدہ بیگم خیر تو ہے یہ چیزیں کیوں اچھال رہی ہیں؟ جواب دیا "جو آپ مجھ پر لاد گئے تھے ان ہی سے چھٹکارا حاصل کیا ہے؟" "کیا کہہ رہی ہیں؟" اختر تیار ہو کر کمرے میں آئے، غور سے گری ہوئی کرسی، صندوقچہ اور کتابیں دیکھتے رہے۔ اچھا میں سمجھا۔ یہ کہہ کر برآمدے میں تیز قدم سے نکل کر مولوی صاحب کے کمرے کا رُخ کیا۔ لحہ بھر میں بات کی نزاکت کو سمجھ کر میں دوپٹہ اوڑھتی ہوئی ان کے پیچھے لپکی، وہ مولوی صاحب کے کمرے میں داخل ہو کر تنے کھڑے ہیں کہ غسل خانے سے نکلیں۔ تو میں بھی اندر داخل ہو کر ذرا زور سے بولی، "آپ حد کرتے ہیں۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ مولوی صاحب نے کیا ہے میں تو آپ سے مذاق کے طور پر ایسا خود ہی کر رہی تھی۔ خود تو آپ لوگوں نے مذاق اور تفریح، بھری محفل میں روا رکھی وہ تو ٹھیک تھا۔ ایک ذرا سا میں نے صندوقچہ اور کرسی گرا دی تو مولوی صاحب سے پوچھ گچھ کرنے چلے آئے۔" مولوی صاحب نے سب کچھ اندر سے سن ہی لیا تھا۔ سوکھا سا منھ بناتے باہر آئے اور کہا دیکھو تم دونوں آپس میں لڑو بھڑو تو شکایت میرے پاس لے کر نہ آنا۔ اختر اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔ جاتے ہوئے میں نے

مڑ کر دیکھا تو آنکھوں سے جیسے شفقت کے لپکے سے ظاہر ہو کر کہہ رہے ہیں ہم تم دوست دوست۔

مولوی صاحب نے ناشتہ اور چائے پی کر چند کش پیچوان سے کھینچے اور مسکراتے رہے۔ پہلے اختر چق اُٹھا کر اپنے دفتر میں چلے گئے پھر خود اُٹھے یہ کہتے ہوئے، ''تم نے کس مزے سے مجھے باگڑ بلے سے بچالیا۔'' ''کیا کہا آپ نے؟'' ''اختر کا ایک یہ نام ہے اور بھی بہت سے ہیں۔'' دفتر چلے گئے۔ ایک بجے جب بشیر ٹرے میں شربت اور ایک سیب رکھ کر لائے تو ساتھ ہی کاغذ میں لپٹے دو بڑے بڑے شریفے بھی تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اب پھر کبھی شریفے نہیں لائے گا ورنہ اس کی تو چھٹی ہی کر دی جائے گی۔

کیا ہی شریفے تھے پاؤ پاؤ بھر کے۔ خوش ہو کر شریفے کھانے لگی دروازے میں چٹخنی لگانا بھول گئی۔ مولوی صاحب یا تو پنکھا اپنے کمرے سے لینے آئے یا کسی خیال کے تحت میری خبر لینے کو چق اُٹھائی تو میں بیٹھی شریفے کھا رہی تھی۔ اس قدر گھبرا کر بولے ''ہائیں یہ کیا کر رہی ہو؟ کون لایا؟'' شریفہ میرے ہاتھ سے ٹرے میں گر تو گیا پر ہمت کر کے پوچھا: ''اس میں آخر کیا برائی ہے؟'' ''میں بتاتا ہوں، اپنا منھ ایک طرف کو خوب ٹیڑھا کر کے مولوی صاحب نے کہا'' یہ ہو جاتا ہے،'' (یعنی لقوہ ہو جاتا ہے)۔ منھ سے نکل گیا'' تو پھر میرا ہی منھ ایسا ہو جائے گا اور کسی کا تو نہیں۔'' ''تم سمجھ رہی ہو کہ ایک لقوہ زدہ لڑکی کو ہم اپنے گھر میں رکھے رہیں گے؟ فوراً ٹکٹ کٹوا کر ظفر عمر کے پاس روانہ کر دیں گے۔'' میں سوچتی رہ گئی کہ اب تو یہ کھانے میں نہ آئیں گے۔ دوسرے دن کوئی دس بجے باہر باغ کی کیاری کے پاس کھڑی کچھ پھول توڑ رہی تھی کہ دیکھا کہ کوئی صاحب بالکل دوہری کمر، صاف براق رنگ، سفید جھک کرتا پاجامہ، ہاتھ میں اسی قدر باریک سی چھڑی جس قدر خود باریک اور نازک سے تھے، کوٹھی کی دیوار کے پاس آتے آتے رک رک دور ہی سے کہتے ہیں، ''میں احتشام الحق (شان الحق حقی کے والد) ہوں۔ ظفر عمر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ان کی بیٹی کا خیال رکھوں۔ میں تمہارا چچا ہوں کوئی تکلیف ہو کچھ چاہیے ہو تو بے تکلف مجھے بتا دینا۔ ٹھیک ہو نا بیٹی؟'' ''آداب! جی بالکل مزے میں ہوں، ہاں ایک تکلیف ہے کہ یہاں

شریفے نہیں آسکتے آپ مجھے لا دیا کریں، مگر دیں گے کیسے؟'' اس پر بڑے میاں نے کہا، ''اسی کیاری میں کاغذ کی تھیلی روز رکھ دیا کروں گا۔'' وہ واپس چلے گئے ان کو دیکھ کر سوچ رہی تھی اگر زور کی ہوا چلی تو یہ اڑ جائیں گے۔

رات کے کھانے کے بعد مولوی صاحب نے پوچھا، ''حمیدہ یہ بتاؤ تم اپنے گھر میں شاموں کو کیا کرتی تھیں؟'' میری شاید شامت اعمال ہی تو تھی کہ بتادیا کہ ''شام کو بیڈمنٹن کھیل لیتی تھی اور بعد مغرب کبھی تاش کھیلا کرتے تھے کبھی پچیسی۔'' ''تو پھر تم یہاں بھی یہی کرنا۔'' ''پر وہ کیسے؟'' ''بتاؤں گا۔''

تیسرے دن شام کی چائے کے بعد مولوی صاحب نے تین بڑے چھوٹے بنڈل اپنے کمرے سے اُٹھا کر، لا کر سامنے رکھ دیے، کھول کر دیکھا ایک میں تین عدد بیڈمنٹن کے بلے، ایک ڈبہ میں شٹل کاک، ایک پیکٹ میں دو گڈی تاش اور ایک میں پچیسی کی بساط اور کوڑیاں!!

خوش ہی تو ہوگئی پوچھا، ''یہ بیڈمنٹن تین آدمی کھیل کیسے سکتے ہیں۔ دو کھیل سکتے ہیں۔ ہاں تاش اور پچیسی تین لوگ ضرور کھیل سکتے ہیں۔'' ''اچھا ہم نے تو تاش کھیلے نہیں چلو ہم دونوں کو سکھاؤ۔'' ''کیا آپ دونوں تاش کھیلنا نہیں جانتے؟'' ''جن کے پاس فاضل وقت ہوتا ہے وہی یہ سب چیزیں کھیلا کرتے ہیں'' مولوی صاحب بولے۔ میں نے پتے بانٹے، سمجھانا شروع کیا، یہ عاقل لوگ جب کچھ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں تو جھٹ سمجھ لیتے ہیں۔ چند ہاتھ کھیلے مگر لڑتے جائیں کہ آپ بے ایمانی کر رہے ہیں۔ وہ کہیں تم بے ایمانی کر رہے ہو۔ پھر یہ اعلان کر کے کھڑے ہوگئے کہ کل چھکا مل کے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا چھکا مل کدھر ہیں؟ یہ جو تمہارے شوہر نام دار ہیں۔ ان کے بہت سے نام ہیں۔ دوسرے دن میں نے بیڈمنٹن کو کھیل کر سمجھایا۔ اس کو اختر کبھی کھیل چکے تھے مگر ایسا بن کر مونڈھے پر چڑھے بیٹھے دیکھتے رہے کہ آج ہی دیکھ رہے ہوں۔ آج صرف سبق سکھا گیا۔ مگر یہ تاکید کہ کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ سارے شہر میں مشہور ہو جائے گا کہ عبدالحق تاش پتہ، پچیسی اور بیڈمنٹن کھیلنے لگے!! جس بھی شام کو بیڈمنٹن، اختر اور وہ کھیلتے تو

لڑائی ایسی ہوتی کہ مولوی صاحب بلالے کر ان کے پیچھے بھاگتے۔ ظاہر ہے اختر تیز بھاگتے تو دور سے گھما کر ریکٹ اچھال اچھال کر مارتے کہ وہ ٹوٹ جاتا۔ تاش کھیلنے میں ایسی لڑائی ہوتی کہ اس کی گڈی پھاڑ دی جاتی۔ پچیسی کی بساط کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا۔ دوسرے روز اور تو آ ہی جائیں گے۔ میری جان غضب میں ان کی سی کہوں تو وہ بگڑے جاتے ہیں، ان کی بات کو درست کہوں تو وہ بگڑ رہے ہیں۔ شام آتی تو میری جان نکلنے لگتی مگر ان دو عظیم ہستیوں کو بچکانہ موڈ میں دیکھ کر خوش بھی بہت ہوتی۔ اختر جز بز ہوتے کہ میں نے کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ رات کے پڑھنے کا لطف ملیامیٹ ہو گیا ہے۔ مولوی صاحب کا جواب ہوتا، ''شکر ہے کہ کچھ دیر آنکھوں کو آرام مل جاتا ہے اور دماغ جو پڑھ پڑھ کر پچپچا ہو گیا ہے وہ روبہ صحت ہو رہا ہے!''

پہلی بار جب سروجنی نائیڈو کے لڑکے بابا اور مسز نائیڈو سے ملنے کو جانے لگے تو مولوی صاحب اختر کو بار بار کہے جاتے دیکھو لڑکی کو ان کے کتے سے کٹوا کر نہ لے آنا پھر یہ باؤلی ہو کر گھر میں گھومتی پھرے گی ہم دونوں کو تو ضرور کاٹ کھائے گی۔ اختر مجھ سے کہتے، ''ان کی باتوں میں نہ آیئے ان کو کسی کو ڈرانے میں مزا آتا ہے۔''

پہلی بار جب قاضی عبدالغفار کے ہاں گئے تو ان کی اعلیٰ نسل کی کتیا کے بچے کو دیکھ کر ایک بچہ مانگ لیا۔ بچے چھوٹے بہت تھے دو ہفتے بعد ماں سے الگ ہو سکیں گے۔ ''اختر تمہارا کیا خیال ہے۔ قاضی صاحب کی بیگم صاحبہ دینے پر رضامند ہیں۔ لے لوں؟'' اختر نے کہا کہ ''مولوی صاحب ہرگز ہرگز کتا نہ رکھیں گے۔ انھوں نے ایک کتا پالا تھا اس سے بہت مانوس تھے ایک شیر کا بچہ بڑے سے پنجرے میں پال لیا، اس نے ایک بار کتے کو پنجے میں ایسا دبوچا کہ وہ مر گیا۔'' ''ان سے اجازت میں لے لوں گی'' میں نے جواباً کہا۔

سروجنی نائیڈو کی سیامی بلی کا ایک بچہ ہم پہلے ہی لا چکے تھے۔ اس کی بڑی خاطر مدارات کرتے۔ میز سے برابر نیچے کچھ نہ کچھ ڈالتے رہتے اور کہے جاتے یہ تو دن بہ دن اور بھی بھتنا بنتا جاتا ہے۔

چند دنوں بعد جب مولوی صاحب نے پوچھا کہ کچھ تم کو چاہیے ہے؟ میں نے دو چھوٹے تخت کی فرمائش کر دی۔ ایک برآمدے کے لیے ایک اپنے کمرے کے لیے۔ ہنس کر کہتے ہیں، ''تو بڑی بی بن کر بیٹھنے کا ابھی سے شوق ہے۔'' دوسرے ہی دن تخت آ گئے۔ ایک برآمدے میں لگوایا تو شک بچھوا کر صاف چادر لگوائی کچھ لحافوں کو لپیٹ کر اس کے گاؤ تکیے بنائے۔ مولوی صاحب شام کو چائے پی کر دھپ سے تخت پر لیٹ جاتے پیچوان قریب کروا کر زور زور سے کش لگاتے ہوئے اخبار پڑھتے جاتے۔ ذرا ذرا دیر بعد کہتے جاتے بھئی یہ تو بڑا آرام دہ ہے۔ آدھے گھنٹے بعد اختر ان کو اُٹھ جانے کو کہتے کہ اب ان کی باری ہے۔ چھوٹا موٹا جھگڑا اسی بات پر ہو جاتا۔ روز ہی مدراس کی کانفرنس کے لیے جانے کا ذکر آ جاتا۔ باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ دو ہفتے کے لیے جائیں گے۔ پھر میرا کیا بنے گا؟ ساتھ لے جائیں گے؟ اکیلے گھر میں چھوڑ کر نکل جائیں گے؟

اختر سارے دن اندر کا رُخ نہ کرتے مگر مولوی صاحب کئی بار چق ہٹا کر حال احوال ضرور پوچھ جاتے۔ ایک دن ان کو بتایا کہ قاضی صاحب کی بیوی اپنے کتے کا بچہ شاید مجھے دے دیں۔ مگر اختر کو کتوں سے شاید نفرت سی ہے کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔ بولے پھر تو تم اس کو ضرور لے آؤ۔ ہر بات میاں بنجول کی کیوں چلے؟ لیجیے کس آسانی سے معاملہ حل ہو گیا۔

ایک دن میں نے جب خود ان کو مچھلی کا سالن پکا کر کھلایا۔ بڑے خوش ہو کر کہا اس کا انعام وہ مدراس سے آ کر دیں گے۔ میں اداس ہو گئی کہ میرا کیا بنے گا؟ ایک دن اعلان کر دیا کہ اختر اور وہ کل دوپہر کی گاڑی سے مدراس جا رہے ہیں۔ ''تم اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ لو۔ صبح سے پہلے تم کو منظور یار جنگ کے ہاں پہنچا دیں گے۔''

دوسرے دن اختر نے اپنے کپڑے وغیرہ سوٹ کیس میں رکھے۔ میں نے اپنے کپڑے پہلے ہی رکھ لیے تھے۔ سوٹ کیس موٹر میں رکھ دیا گیا تھا۔ ناشتہ کرتے ہی کہا، ''جلدی چلو۔'' اختر اپنے دفتر کے کمرے میں کرسی پر بیٹھے شاید کچھ ضروری چیز لکھ رہے تھے مجھے دیکھ کر کھڑے ہوئے، اچھا خدا حافظ۔ مولوی صاحب نے موٹر میں بیٹھ کر پوچھا کہ

''آج تک تم نے یہ ہم سے کیوں نہ پوچھا کہ کہاں پہنچا دی جاؤ گی اور وہ لوگ کیسے اور کون ہیں؟'' مجھے رونا سا آرہا تھا جب یہ کہا کہ ''میں کیوں پوچھتی؟ میں ٹھہری ایک سوٹ کیس جس کو یہاں وہاں دھر دیا جائے گا۔ اس کو پوچھنے کا حق ہی کیا ہے؟'' بے چین ہو کر کہنے لگے مردوں کو کام سے ادھر اُدھر کبھی جانا ہی ہوتا ہے بھبت اچھے لوگوں میں اتنے دن رہ کر خوش ضرور ہو گی۔ تم نے یہ بھی دیکھا کہ وہ ''اکڑنوں شاہ'' کرسی پر ڈٹے بیٹھے رہے!'''' آپ کا ہی حکم ہوا ہوگا۔''

موٹر نواب منظور یار جنگ کی کوٹھی کے پورچ میں رُکی۔ برآمدے سے ایک بھاری بھرکم خاتون موٹر کے پاس آکر مولوی صاحب کو جھک کر سلام کرتی ہیں۔ مولوی صاحب جلدی کے مارے اُترے بھی نہیں، میں اُتر آئی۔ موٹر روانہ ہو گئی میں کھڑی ادھر کو دیکھتی رہی ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہے تھے اندر جاؤ۔ میں سارے دن گم سم سی سوچا کی کہ یہ دونوں بالکل ہی مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ یہاں وقت اچھا گزرا مگر اپنا گھر اور اس کے نرالے مکیں یاد بہت آتے رہے۔ تیسرے دن دونوں نے ایک ایک تار بھیجا، شکر کیا کہ یہ لوگ مجھے بھول نہیں گئے۔ واپسی پر اسٹیشن سے سیدھے مجھے لینے دونوں آئے مگر موٹر سے نہ اُترے، کہا جلدی سے بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گئی۔ راستے میں مولوی صاحب نے پوچھا، ''تمہارا دل تو درجنوں عورتوں میں رہ کر بہت ہی خوش ہوتا رہا ہوگا۔'''' اپنا مردانہ گھر بہت یاد آتا رہا'' میں نے کہا۔ وہ ہنسنے لگے ''سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارا دل بھی اپنے گھر جلد واپس آنے کو چاہا کرتا تھا اور یہ بھی خیال آتا کہ قاضی صاحب کے ہاں سے کتے کا بچہ بھی لانا ہے۔ اب بڑا ہو گیا ہوگا۔''

اختر نے اوپری طور سے پھر مخالفت کی کہ مولوی صاحب نہ لانے دیں گے۔ ان کو کتے بالکل ناپسند ہیں اس پر مولوی صاحب نے بالکل ضدی بچوں کی طرح کہا، ''ہم لائیں گے ضرور لائیں گے اور آج ہی شام لائیں گے۔'' دن میں کسی سے دو برتن، ایک چین، برش، ایک چھوٹی سے کھٹلیا اور گدہ منگوالی گئی۔ شام ہوتے ہی مجھے موٹر میں لے کر قاضی عبدالغفار صاحب کے یہاں گئے، برآمدے میں کھڑے کھڑے چند باتیں کر کے

بچے کو لے کر آ گئے۔ اب اس کے نام پر دونوں میں خاصی بحث وتکرار ہوئی آخر "نازی" نام طے پا گیا۔ نازی کے مقابلہ میں بے چارہ "لاما" اور بھی گیا گزرا لگنے لگا۔ مگر اختر جان کر "لاما" کی تعریفیں کرتے اور نازی کو پاس نہ آنے دیتے تاکہ مولوی صاحب کی توجہ نازی کی طرف زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے۔ ایک بار نازی برآمدے سے نیچے سیمنٹ کے گملے پر گرا پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی ڈاکٹر نے پٹی باندھ کر ہدایت کی کہ دو دن تک اس کو ہرگز کھڑا نہ ہونے دیا جائے۔ جمعرات کی شام تھی۔ مولوی صاحب کرسی کھسکا کر نازی کی کھٹولی کے پاس اپنا اڈا جما کر بیٹھ گئے۔ ایک ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھا ہوا کہ یہ کھڑے ہونے کی کوشش نہ کرے، کبھی پانی کا برتن منھ کے سامنے کریں کبھی دودھ کا۔ کھانا آیا تو کہا، "پہلے تم کھالو تو اس کے اوپر ہاتھ رکھ کر بیٹھ سکو پھر میں کھاؤں گا۔ اختر سے تو کہوں گا نہیں، وہ جانے اس کی چٹنگی ہی کاٹ لیں اور یہ گھبرا کر کھڑا ہو جائے!" اختر دور سے کھڑے مسکراتے رہے۔ ان کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں کاش لاما کا بھی پیر ٹوٹ جائے۔ ادھر سے جواب کہ "وہ تو اب آپ چھڑی مار کر ضرور اس بے چارے کو لنگڑا کر دیں گے۔" میں نے سوچا کہ آخر ساری رات یہ ایسے بیٹھ کر کیوں کر گزاریں گے؟ میں نے مولوی صاحب کو رائے یہ دی کہ آپ کچھ دیر بعد کمرے میں لیٹ کر سو جائیں میں نازی کے پاس بیٹھتی ہوں۔ ایک بجے رات کو آپ کو جگا دوں گی۔ تو کہا تم جاگ تو لو گی تب تک؟ جی۔ آنکھوں میں کیسی اداسی سی چھائی ہوئی تھی، بار بار اس پر ہاتھ پھیریں اور کہیں کہ "کاش یہ بول سکتا اور اتنا بتا دیتا کہ کس نے اس کو دھکا دے کر گرایا، اختر نے یا "لاما" نے؟ ایک بجے رات کو آواز دی کھٹ سے اُٹھ بیٹھے، برآمدے میں آ کر اس کے اوپر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ خوش ہو کر بولے، "اس کا انعام تم کو کل دوں گا۔" ناشتے کے بعد اپنے کمرے کی کیبنٹ سے ایک ڈبیہ نکال کر لائے میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ڈبیہ بہت پرانی معلوم ہوئی، چاندی کی کٹاؤ دار، گو کالی ہو گئی تھی پھر بھی بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ کھولا تو اس میں بارہ عدد مٹر کے دانوں کے برابر سچے آب دار موتی تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سچے اور جھوٹے موتی کی پہچان ہی نہ تھی۔ میں نے تو ڈبیہ قیمتی سمجھی۔ شکریہ کے بعد ان کو چھیڑنے کو کہا، "سچ سچ بتائیے کہ آپ نے کس کے لیے یہ ڈبیہ

اور موتی لیے تھے؟'' ماتھے پر بل پڑے آنکھوں میں اداسی نظر آرہی تھی، ''تم نے یہ کیوں پوچھا؟'' ''ڈبیہ بہت پرانی جو ہے۔'' ''یہ سچ ہے کہ کسی کو دینے کے لیے بہت عرصہ پہلے لیے تھے پر دیے نہیں کیوں کہ اس کو اس قابل نہ سمجھا۔ پھر پینتیس سال سے یہ ڈبیہ یوں ہی پڑی رہی۔ اختر سے نہ کہنا وہ میرا مذاق اڑائے گا۔'' ''میں کیوں ان کو بتانے لگی دوستوں کی باتیں بتائی تو نہیں جاتیں'' میں نے کہا۔ ہنس پڑے۔ میں آکر سوگئی۔ جمعہ کو سارا دن نازی کے پاس بیٹھے رہے۔ سیر کو نہ جانا ایک بہت عجیب بات تھی۔

مولوی صاحب کو سید ہاشمی فرید آبادی کی والدہ سے بہت عقیدت تھی۔ مہینے میں کسی جمعہ کی شام کو ضرور جاتے مجھے بھی ایک بار ساتھ لے کر گئے۔ کیا حسین بڑھیا تھیں۔ بولیں تو جیسے موتی بکھر رہے ہوں۔ کیا ہی بامحاورہ زبان اور تکلم کا انداز تھا۔ مولوی صاحب ہر بار کوئی نیا لفظ اپنی گرفت میں ضرور کر لاتے اور اختر سے کہا جاتا کہ وہ دیکھیں یہ ڈکشنری میں رہ تو نہیں گیا، اور جب کبھی مولوی صاحب میرے کہے ہوئے اوٹ پٹانگ لفظ سن کر خوش ہو کر کہتے شاید یہ لفظ ڈکشنری میں آیا نہیں تو اختر بگڑ اُٹھتے کہ مولوی صاحب آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ انھوں نے تو ''گھپولا'' بولا اور آپ سچ مچ ڈکشنری کا گھپولا کروانا چاہتے ہیں۔ سیریس ہو کر کہتے اس میں برا ماننے کی بات نہیں۔ حمیدہ بول چال کی زبان کی ماہر ضرور ہے۔ اختر کبھی ماننے کو تیار نہ ہوتے۔ اس بار جو مولوی صاحب ہاشمی صاحب کی والدہ سے ملنے گئے تو انھوں نے کہا، ''میاں عبدالحق آپ نے حد کر دی بہو بیاہ کر لائے دو مہینے ہو گئے ولیمہ آج کرتے ہیں نہ کل۔ لوگ منتظر بیٹھے ہیں باتیں ملا رہے ہیں۔''

آخر یہ ولیمہ کیا ہوتا ہے؟ جب ان کو بتایا تو کہا آپ کو پہلے ہی بتا دینا تھا کون سی بڑی بات ہے۔ مگر یہ صرف زنانہ ولیمہ ہوگا۔

رات کے کھانے کے بعد مولوی صاحب بہت ہنس کر بولے، ''مابدولت آج ایک اعلان کرنا چاہتے ہیں۔'' ''پوچھا وہ کیا؟'' ''ایک دعوت ولیمہ کھلائی ہے وہ اس جمعرات کو کریں گے، لیکن صرف خواتین مدعو کی جائیں گی وہ بھی چائے پر۔'' دعوت نامے چھپوائے گئے، روانہ کیے گئے۔ یہ سب ہاشمی صاحب کے ذمے تھا اور چائے کا انتظام بھی۔ دوسو مہمانوں

کے لیے ہمارے برآمدے کے سامنے اور ڈھال سے اُتر کر جہاں بیڈ منٹن کورٹ بنایا تھا وہاں میزیں، برتن وغیرہ دو بجے سے ہوٹل کے بیرے لگانے لگے۔ بلاوا پانچ بجے کا تھا۔

قاضی عبدالغفار صاحب چچی کے پیچھے پڑ گئے کہ ''بیگم تم تو چار بجے تک پہلے سے چلی جاؤ ذرا دیکھ لینا کہ حمیدہ ٹھیک سے تیار ہو اور کچھ زیور بھی پہن لے۔'' یہ بے چاری آ گئیں۔ سامنے تو دفتر تھا پیچھے کی سمت سے آئیں تو ظاہر ہے ان کو پہلے میزیں اور چائے کے برتن لگے نظر آئے۔ میں برآمدے میں کھڑی بیروں کو کچھ ہدایت کر رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر خوش ہو گئی پر وہ تو بڑی گھبرائی سی آواز میں بولیں۔ یہ چائے کے برتن کیوں لگے ہیں، بلایا تو کھانے پر سات بجے ہے۔ میں ہنس پڑی کہا آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ چائے پر بلایا ہے کہ دعوتی کھانے کی خوشبو گھر میں کئی دن بھری نہ رہ جائے۔ انھوں نے بٹوہ کھولا اور دعوت نامہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ بار بار پڑھوں، چھپا ہوا تو وہی تھا جو چچی کہہ رہی تھیں۔ گھبرا کر پوچھا کہ اب ہوگا کیا؟ اور یہ ہوا تو کیسے؟ بھئی جو بھی اور جیسے بھی ہوا اب تو بات مولوی صاحب کی عزت کی ہے تم اختر میاں کو فوراً بلا کر دعوت نامہ دکھاؤ کہ وہ کھانے کا انتظام کروائیں اور وہ خود مولوی صاحب کو بتائیں۔ بھئی میں تو جاتی ہوں سات بجے آ جاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں پلٹ گئیں۔ کچھ دیر کھڑی سوچا کی میں خود تو باہر جا کر مولوی صاحب سے کہہ نہیں سکتی اب اختر کے دفتر کی چق کو ہٹا کر پکارا، ''سنیے، اندر آئیے۔'' وہ میری آواز سن کر اچھل سے گئے۔ ''خیر تو ہے،'' ''بس خیر ہی تو نہیں ورنہ بھلا آفس سے میں آپ کو کیوں بلاتی۔'' وہ اندر آئے۔ کارڈ ان کے ہاتھ میں دیا بغور پڑھا ماتھے پر بل سے اُبھرے اطمینان سے برآمدے سے نیچے اُتر کر ہیڈ بیرے کو بلا کر کہا کارڈ چھپنے میں کوئی غلطی ہو گئی کھانے کا چھپ گیا آپ چائے کا سامان فوراً اُٹھوا کر واپس ہوٹل لے جائیں اور دو سو لوگوں کے کھانے کا بندوبست کریں آپ کے ہوٹل سے اتنا انتظام اتنی جلدی میں نہیں ہو سکتا تو اور دو ایک ہوٹل سے بھی لے لیں۔ مینو یہ ہونا چاہیے۔ کھانا ٹھیک آٹھ بجے میزوں پر آ جانا چاہیے۔'' پھر برآمدے میں آئے مجھے صرف اتنا کہا کہ ''شکر کیجیے کہ چچی پہلے سے آ گئیں اور یہ عقدہ کھل گیا ورنہ مولوی صاحب کو کیسی شرمساری اُٹھانی پڑتی۔'' چق اُٹھا،

اپنے دفتر میں جا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ بھی تو نہ کیا کہ مولوی صاحب کو جا کر صورت حال بتا آتے۔

مولوی صاحب نے دفتر ہی میں چائے آج پی لی اور ٹھیک پانچ بجے پورچ سے ہوتے ہوئے لان کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک جاتی سڑک پر ٹہلنے لگے۔ میں برآمدے سے نیچے اُتر کر ان کی کمرے کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کو گیٹ تک جاتے اور پھر واپس پورچ کی طرف آتے دیکھ کر پریشان ہوتی رہی۔ وہ اپنی گھڑی کو دیکھ رہے ہیں یعنی سوا پانچ بج گئے، ساڑھے پانچ بج گئے کوئی مہمان نہیں آیا۔ یہ بے قاعدگی کی مجال! گھبرا کر اندر برآمدہ میں آئی چق اُٹھا کر دیکھا، اختر اب یہاں کیوں ہوتے کمرے میں لیے اخبار پڑھ رہے تھے۔ پوچھا کہ ''آپ نے مولوی صاحب کو بتایا نہیں وہ تو بڑی تیزی سے پھاٹک تک جاتے اور آتے ہیں اور گھڑی دیکھ رہے ہیں۔''

آپ خود چلی جائیں میں کیوں ان سے کچھ کہوں میں نے تو دعوت کرنے کو نہیں کہا تھا۔ مضمون خود اپنے قلم سے لکھ کر دیا تھا۔ اب وہ غصہ میں پورے سات بجے تک یوں ہی شیر ببر کی طرح ٹہلتے رہیں گے اور پھر جانے کیا حرکت کریں۔'' اختر کی آواز میں غصہ تھا نہ ہی چہرے پر بلکہ مسکرا رہے تھے۔ ایک بار ہمت کر کے باہر نکلی۔ مولوی صاحب کی پیٹھ میری طرف کو منھ پھاٹک کے رُخ پر تھا۔ قدم تیز تر ہو چکے تھے۔ دور لان کے آخری سرے کی جھاڑیوں کے درمیان سید ہاشمی صاحب کا سر بس نکلا نظر آیا دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اشارہ کر رہے ہیں کہ اندر جاؤ۔ میں سچ مچ ڈر گئی کہ جب ایک اتنا کیم شیم انسان ڈر کر یوں چھپا ہوا ہے یا شاید کوئی چھڑی پڑ چکی ہے۔ فوراً واپس آ گئی۔ کھانے کے دیغ آ چکے تھے۔ بیرے برتن لگا ہی چکے تھے اب پونے سات ہو گئے ہیں۔ میں ان کے کمرے کے کونے کی دیوار سے یوں لگی کھڑی ہوں کہ مولوی صاحب کو پھاٹک کے گیٹ پر جاتے ہوئے بخوبی دیکھ سکتی ہوں۔ ایک موٹر گیٹ میں داخل ہونے لگی۔ مولوی صاحب نے اپنی جریب گاڑی کے بونٹ پر دو بار ماری اور جو بھی کہا ہو وہ پیچھے کی طرف ہوئی اور فراٹے بھرتی روانہ ہو گئی۔ اب پھاٹک کے درمیان کھڑے ہیں موٹریں دنا دن آتیں اور واپس جاتی نظر آتی رہیں۔

میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ اختر بے نیازی سے لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ یک بارگی اُٹھ کر برآمدے میں کھڑے ہو کر ہیڈ بیرے کو بلا کر کہتے ہیں۔ آپ اپنا سامان اُٹھا کر لے جائیں کل صبح چائے اور کھانے کا بل مولوی صاحب کو دے کر اپنی رقم لے جایئے گا۔ مولوی صاحب اندر آ گئے۔ کمرے میں شیروانی اُتار کر، برآمدے کی کرسی پر بیٹھ کر محبوب کو آواز دے کر کھانے کا کہتے ہیں۔ محبوب نے بتایا کہ گھر میں کھانا تو پکا نہیں دیغ کا لے کر آتا ہوں۔ اختر یہ سنتے ہی کمرے کی چق اُٹھا کر کہتے ہیں، "آج کوئی کھانا نہیں کھائے گا۔" مولوی صاحب کہتے ہوئے "ایک رات نہ کھایا تو کیا میں مرجاؤں گا۔" اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کوٹھی کے پیچھے کوکلوں پر دیغیں رکھی ہوئی تھیں جا کر کہہ آئے کہ ان سب کو اوندھا کر کے کھانا گرا دو۔ کتے، بلیوں کی ہی دعوت ہو جائے۔ میں دل میں اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرا کر چور چوری اب اختر سے بھی ڈر رہی ہوں۔ میں مولوی صاحب کے کمرے کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے کہ والدہ کا یہ جملہ یاد آیا کہ "بھوکا سید اور بھوکا شیر برابر کے ہو جاتے ہیں۔" خود سیدانی تھیں ان کا تجربہ اپنے بھائیوں اور والد کا شاید یہ ہی رہا ہو۔ اُٹھی میز پر پیالیاں بسکٹ کا ڈبہ رکھا اور پکار کر کہا آج تو میں چائے دم کروں گی۔ گو آپ مجھے کہہ چکے ہیں کہ بدنیت انسان کی دم کردہ چائے آپ نہیں پیا کرتے آیئے اندر کمرے سے اور وہ پنیر کا ڈبہ اور پستے بھی لے آئیں۔ اپن دونوں مل کر چائے پئیں گے۔ بسکٹ اور پنیر اڑائیں گے اور آپ کا "باگڑ بلا" آج بھوکا سوئے۔ میری ان باتوں پر مولوی صاحب کا پارہ یک دم نیچے گر گیا بچوں والی معصومیت سے چہرے پر آنکھیں دمکاتے ہوئے اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔ میں نے چائے دم کر کے "ٹی کوزی" سے چائے دان ڈھانک دیا تھا، بھوک میں چائے اچھی لگی۔ تیسری پیالی میں بھی چائے بنا کر، دو بسکٹ درمیان میں ان کے پنیر رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور میز پر رکھ، یہ کہتی ہوئی باہر آ گئی "چائے ٹھنڈی نہ کر دیں۔" ذرا ہی دیر بعد اختر پیالی لیے آ گئے اور بولے، "کیا ایک پیالی چائے اور مل سکتی ہے؟" "یہاں بیٹھیں تو چائے ضرور مل جائے گی۔" بیٹھ گئے، کلکتہ میں کسی کانفرنس کا ذکر ہونے لگا۔ اختر نے مولوی صاحب سے پوچھا، "خطبہ صدارت ختم کر لیا

ہوتو کل صاف کرلیا جائے۔" میں اچھل پڑی کہ کانفرنس کا مجھ سے کوئی ذکر تک نہیں کیا گیا
اور اب جانے کدھر کو دھر دی جاؤں گی۔ دونوں مختلف امور پر باتیں کررہے ہیں۔ نہ ان کو
کوئی غصہ ہے نہ ان کو۔ یہ دو عظیم انسان اب اپنے اپنے عالمانہ میدان میں گھریلو اور عام
انسانوں کے رسم رسومات کے قصوں سے نکل چکے ہیں۔ ایک دم مجھے خیال آیا، "بھئی واہ
کیا برات لے کر اترنے کا انداز تھا، کیا ہی نکاح کی محفل تھی اور یہ ولیمہ بھی خوب ہی رہا۔"
ہنسی آگئی۔ پوچھتے ہیں، "ہنس کیوں رہی ہو۔" "بس ایسے ہی۔" "تو جاؤ سو جاؤ ہم کو ابھی
بہت سے موضوع پر باتیں کرنا ہیں۔" میں کپڑے بدل کر یہ سوچتی ہوئی سوگئی۔ کون بھول
سکتا ہے، اختر حسین کا نکاح اور ولیمہ۔ ان میں شرکت کرنے والے سب ہی اللہ کو پیارے
ہوگئے۔ بس ایک بشیرالدین صاحب اور قاضی صاحب کی بیگم صاحبہ علی گڑھ میں۔ مہندر اور
رام لال صاحب کلکتہ میں۔

چچا احتشام الحق میرا خاموشی سے، خفیہ انداز سے کتنا خیال رکھا کرتے۔ شریفے
ان کے ساتھ مختلف چیزیں جیسے کھٹیاں کبھی کبھی کچوری یا ایسی ہی اور شے حسب وعدہ کیاری
میں رکھ جاتے۔ ایک بار ان سے کہا چچا میری چوڑیاں اب سب ٹوٹ گئیں۔ دوسرے دن
تین ناپ کی چھوٹی، منجھولی اور بڑی چوڑیاں بھی لے آئے کہ جانے ہاتھ میں کون سی
آئیں گی۔!!

ادھر کلکتہ روانہ ہونے سے ایک دن پہلے مجھے بتایا گیا کہ کل شام کو سوٹ کیس میں
کپڑے رکھ کر بالکل تیار رہنا منظور یار جنگ کے گھر بس آٹھ دن رہنا ہوگا۔ اب کی میں نے
بہت کہا کہ قاضی صاحب یا سروجنی نائیڈو کے ہاں رہ جاؤں مگر نہ مانے۔ اب کی دونوں
مل کر موٹر میں جا کر وہاں چھوڑ آئے۔ وہاں کے رہنے کی مزے دار تفصیل "ہم سفر" میں
پڑھیے گا۔ یہ پوری کتاب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے جانے کیسے مجھ سے تین ماہ میں
ایک درجن قلم اور چند رجسٹر بھیج کر لکھوائی۔ خواہش کردی تھی کہ رجسٹر جوں ہی ختم ہو ان کو
روانہ کردوں۔ سو میں یہی کرتی رہی۔ اب پورے نو ماہ میں پہلا رجسٹر مجھے واپس بھیج
دیا ہے۔ ہنوز تین عدد ان کی تحویل میں ہیں اگر جلدی پڑھ کر املے وغیرہ کی غلطیاں درست

کر کے بھیج دیں تو میری زندگی میں آجائیں گے۔ ان کے حکم کے بموجب پہلا رجسٹر صہبا لکھنوی صاحب کو دے دیا ہے کہ وہ قسط وار "افکار" میں چھپواتے رہیں اگر میں نہ رہی تو آپ سب جانیں، اسے کتابی شکل میں چھپوادیں اس میں آپ کو بہت سا تاریخی مواد جو نظروں سے پوشیدہ رہا ہے پڑھنے کو ملے گا۔

کلکتہ سے واپسی پر دونوں ہی میرے لیے ویسی ہی عمدہ ساڑھیاں لائے جیسی مدراس سے مدراسی ساڑھیاں لائے تھے۔

چند دن بعد اختر کو ملیریا بخار آگیا خوب ہی جاڑا لگتا ہے اس میں۔ مولوی صاحب اور میں رضائیاں اُڑھاتے گئے۔ ڈاکٹر آئے ملیریا کی دوائیں دے گئے، دس بجے رات کو تھرمامیٹر لگایا تو بخار ایک سو چار ڈگری تھا میں جلدی سے ایک پیالے میں برف اور پانی لائی، تھوڑا سا کولون ڈالا، رومال اس میں گیلا کر کے نچوڑ کر اختر کے ماتھے پر رکھنے لگی۔ مولوی صاحب نے اچھل کر رومال میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ "یہ کیا کرتی ہو؟ کیا بے چارے کو مار ڈالنا چاہتی ہو، اتنی سردی لگ رہی ہے اور تم برف کا کپڑا سر پر رکھ رہی ہو!" سمجھایا کہ "یوں بخار کم ہو جائے گا اماں ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں اور ہم کو بھی انھیں نے بتایا ہے۔"

مولوی صاحب پریشان ہو ہو کر اختر کو دیکھ رہے ہیں۔ کبھی گھور کر مجھے دیکھتے جیسے کہنے والے ہوں کہ اس کو کچھ ہو گیا تو تم کو مار ہی ڈالوں گا۔

بیس منٹ بعد تھرمامیٹر نے ایک سو دو بخار بتایا تو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ "بھئی واہ یہ تو جادو ہو گیا۔ ہم کو پہلے کیوں نہ بتایا تھا؟" "پہلے میں یہاں تھی کب۔" "تم کو پہلے ہی یہاں آجانا چاہیے تھا۔" مولوی صاحب سے میں نے جھٹ کہا۔ "اب آپ جا کر لیٹ جائیں۔" مگر نہ مانے کہ "یہ بخار پھر تیز ہوگا۔ کبھی ایسی اُلٹ پلٹ بولتا ہے کہ تم ڈر جاؤ گی۔" سچ ہی تو کہہ رہے تھے کپڑا برف کا رکھنا بند کر دیا ایک گھنٹے بعد بخار پھر تیز ہوا اور یہ کہے جائیں:

"اندر پاگل باہر پاگل
سب گھر دیوانہ
فقط اختر حسین دانا"

مولوی صاحب کہنے لگے، ''سنا اشارہ نیلی چھتری شوالوں کی طرف ہے۔''
بمبئی میں کوئی میٹنگ ہے مولوی صاحب کو خطبہ صدارت پڑھنا ہے، لکھ کر مجھے دیا کہ ذرا پڑھنا کوئی زبان کی غلطی تو نہیں؟ اختر جل بھن کر کہتے ہیں۔ کیوں ان کا دماغ خراب کرتے ہیں۔ یہ اور آپ کے لکھے میں غلطی پکڑیں؟'' بھئی میں تو یہ کہوں کہ تم بھی اپنا مسودہ دکھا لیا کرو فائدہ میں رہو گے کہ یہ جو بولتی ہیں اصل زبان یہی ہے۔'' میں نے بھی سوچ لیا کہ اختر کی غلطی پکڑ کر ہی رہوں گی۔ اختر کا مسودہ چوری سے پڑھا۔ بھاگی ہوئی مولوی صاحب کے پاس گئی کہ'' ذرا سنیں تو سہی وہ جو بڑے زباں داں بنتے ہیں اور مجھ پر ہمیشہ ہنستے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔ دیکھیے ذرا یہاں پر جھومر ناک میں پہنا دیا ہے!!''
بڑے خوش ہوئے کہا'' کیا رائے ہے؟ ہم ان کی توجہ ادھر نہ دلائیں اور یہ یوں ہی چھپ جائے تا کہ تا مرگ جھومر اس حسینہ کی ناک میں جھومتا رہے، لیکن تم بھی کچھ نہیں کہنا۔'' وہ جھومر آج بھی ناک میں جھوم رہا ہے۔ میری اور مولوی صاحب کی دوستی بڑھتی جا رہی تھی جیسے گیاں گیاں ہوں۔ اختر کا وہ اتنا لحاظ کرتے نظر آتے کہ میرے دل و دماغ پر ان کا رعب بن سوچے بڑھتا رہا۔ کبھی کبھی مولوی صاحب سے کہہ بیٹھتی آخر آپ اختر کی ہر بات کیوں مان جاتے ہیں، ہم دونوں کی کچی کر کے وہ ہمیشہ اپنا پلہ اونچا کر لیتے ہیں۔ ہنس پڑتے اور کہتے،'' یہ جو اینٹھو خان ہیں ان کا کوئی بھروسہ نہیں جانے کب اور کدھر کو نکل پڑے، نہ جانے کس بات پر روٹھ جائے۔ تم بھی اس بات کا خیال رکھا کرو۔''
کھانے کے بعد تاش پچیسی کا کھیل یوں نہ ہوتا کہ اختر باہر شطرنج کھیلتے یا سبط حسن، عزیز احمد اور محی الدین صاحب یعنی ہم خیال دوستوں کی صحبت میں چلے جاتے مولوی صاحب بڑی خوشی سے اجازت دیتے۔ پہلی بار جب جانے لگے مجھے برا سا لگا تو ذرا ڈپٹ کر بولے یہ کیا جاہل لڑکیوں کی طرح منہ پھلا لیا شطرنج تو بڑا دماغی کھیل ہے اور ہم خیال لوگوں سے مباحثہ دماغی غذا ہے۔'' میری جہالت کا اعلان تو اسٹیشن ہی پر آپ نے بہ بانگ دہل کر دیا تھا۔'' میں نے جل کر کہا۔ ہنس پڑے،'' لڑکی تم اب تک بھولی نہیں۔'' اور جب اختر چلے جاتے تو خود تو برآمدے کے تخت پر لمبے لمبے دراز ہو کر پیچوان کی مہنہ نال ہونٹوں میں

داب کر کش لگاتے اور چھیڑ کر کوئی بات ایسی کہتے کہ میرا تفصیلی بیان جوان کو کوئی کہانی لگتا غور سے سنا کرتے۔ بڑا خوش ہوتے کہ مجھے وقت کا گزرنا معلوم بھی نہ ہوتا۔ اختر واپس آجاتے۔ ایسی ہی کسی شام کو میں نے مولوی صاحب سے کہا، ''ایک بات پوچھوں سچ سچ جواب دیجیے گا۔'' بولے، ''ضرور پوچھو۔'' ''یہ بتائیں کہ کیا آپ نے سچ مچ کبھی شادی نہیں کی اور کیوں نہ کی؟'' ذرا دیر توقف کیا سامنے کی طرف دیکھتے رہے۔ بولے، ''شادی تو ایک بار ۱۷ سال کی عمر میں ہوئی مگر میں نے نہ کی، کرائی گئی۔ والد صاحب کا حکم ہوا اس کو پورا ضرور کیا۔ رات کو سامنے کے دروازے سے داخل ہوا غسل خانے کے دروازے سے نکل کر فرار ہو گیا۔ یہاں حیدرآباد آگیا۔ برسوں بعد گھر والوں کو اتا پتا معلوم ہوا۔ یہاں آکر انجمن ترقی اردو ایک ڈبہ میں بند تھی اس کو گود لے لیا اسی کو پالتا پوستا رہا۔ کبھی اور کسی طرف دھیان ہی نہ گیا۔'' منھ سے میرے بے ساختہ نکل گیا کہ ''میری بڑی خیر ہوئی کہ ریل چل رہی تھی اختر اُتر نہ پائے۔'' ''اگر اُترتا تو ٹانگیں نہ جھاڑ کر رکھ دیتا۔'' ''تو وہ موتی کی ڈبیہ جو آپ نے مجھے دی، وہ کسی کے لیے تھی نا؟'' بس چپ ہو کر جلدی جلدی کچھ کش لے کر دھواں اڑاتے رہے۔ میں دل میں سوچتی رہی وہ کوئی بدنصیب ہوگی جس نے ایسے عظیم انسان کو ہاتھ سے جانے دیا۔ ان کی آنکھوں کی گہرائی اور اُداسی برداشت نہیں ہو رہی تھی تو توجہ ہٹانے کو کہا، ''آپ دونوں تو سیر سپاٹوں کو نکل جاتے ہیں ایسے موقع پر مجھے آئندہ قاضی صاحب کے ہاں چھوڑ جائیں یا سروجنی نائیڈو کے پاس، کیسے مزے کی باتیں کرتی ہیں۔'' ''نابابا، قاضی صاحب کا کتا تم کو کاٹ کھائے گا اور سروجنی تمہارے دماغ میں الابلا بھر دیں گی۔ یہ شاعر لوگ بڑی ایران توران کا ملاتے ہیں۔''

اختر واپس آکر کپڑے بدل کر لیٹے ہی تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے سے ہائے وائے کی زوردار آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ہم دونوں دوڑے، ان کے کمرے میں گئے تو غسل خانے کے پاس فرش پر بیٹھے ہوئے ''ہڈی ٹوٹ گئی ٹوٹ گئی'' کہہ رہے ہیں۔ گر پڑے تھے۔ محبوب کو بلا کر لائے بڑی مشکل سے پلنگ پر لٹایا۔ شیرو کو روانہ کیا، وہ ڈاکٹر لے کر آیا۔ اس نے پاؤں کی انگلیاں ہلا جلا کر، ٹخنہ گھمایا۔ ایک چیخ ان کی نکلی۔

ڈاکٹر نے کہا، ''ہڈی تو نہیں ٹوٹی ہے۔ ٹخنہ بری طرح مڑا ہے کوئی پٹھا مروڑ کھا گیا ہے۔ تین دن اس پر زور قطعی نہ پڑے'' الاسٹک بینڈج باندھی۔ درد کی گولیاں دیں کل آنے کا کہہ کر چلے گئے۔

مولوی صاحب کو گرم گرم چائے پلائی گولی ذرا ٹھہر کر کھائیں گے۔ سر کو ادھر سے اُدھر تکلیف میں کر رہے ہیں۔ ہم دونوں ادھر اُدھر بیٹھے ہیں۔ بولے، ''پٹی سے بہت کچھ درد میں کمی لگ رہی ہے۔ اب میں تو پرسوں بمبئی جا نہیں سکتا اختر کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ میرا خطبہ صدارت پڑھ دینا۔'' ''میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا میں ہی فالتو رہ گیا ہوں؟'' ''یہ بھی تمہاری ٹریننگ کا حصہ ہوگا تم کو انجمن چلانی جو ہے۔''

اختر بگڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ''آخر آپ یہ خیالات اپنے دماغ میں کیوں جمائے رکھتے ہیں۔ بار بار کہہ چکا کہ میں ایک آزاد بندہ ہوں وقت آنے پر یہاں سے چل پڑوں گا۔ میں ابھی تار بمبئی دے کر اس اجلاس کو ملتوی کرواتا ہوں۔ ہاں کل اورنگ آباد جا کر ڈکشنری کی شروع چھپائی کو دیکھ آؤں گا۔ شمیم صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' مولوی صاحب نے بڑی اُداسی اور گہری نظروں سے اختر کو دیکھ کر سر میری طرف موڑ کیا، آنکھوں سے ایسا لگا جیسے کہہ رہے ہوں، ''دیکھا اور سنا تم نے۔'' شیرو پھر بلائے گئے۔ تار لکھ کر دیا کہ ڈاک خانے جا کر دے آئے۔ محبوب سے کہا گیا دروازے کے پاس لیٹ جائے کوئی ضرورت ہوئی تو آواز دے دیں گے۔ محبوب کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اگر درد زیادہ ہو تو آ کر ان کو اُٹھا دے تا کہ دوا کی دوسری گولی دیں۔

اختر دوسرے دن اورنگ آباد روانہ ہونے سے پہلے مجھے ڈھیر ساری ہدایات دے گئے کہ مولوی صاحب کتنا ہی دفتر تک جانے کی ضد کریں ہرگز نہ جانے دوں۔ محبوب کو ہر دم کمرے کے باہر بیٹھنے کو کہا۔ مولوی صاحب نے اس پر بھی دن میں پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کام کیا۔ دوپہر کو آرام کر کے شام سے اخبار لیٹ کر پڑھتے رہے۔ مجھ سے چائے بنوا کر پی۔ رات کا کھانا سات بجے کھانے اور پیچوان آجانے کے بعد محبوب کو کسی بات پر جھاڑا۔ ''دور ہو یہاں سے جاؤ اپنے کوارٹر میں۔ مجھے اب خاص تکلیف نہیں۔ کوئی ضرورت دروازے کے

پاس سونے کی نہیں۔" جب وہ نہ ٹلا تو ہاتھ میں چھڑی اُٹھا کر دھمکایا کہ "مجھے کوئی قیدی سمجھتا ہے؟" وہ ڈر کر تیز قدموں سے برآمدے کے نیچے اُترا میں نے لپک کر کہا، "اختر صاحب کے دفتر والے کمرے میں لیٹ جاؤ جب سو جائیں تو برآمدے میں بستر گھسیٹ لینا۔ ہرگز کوارٹر میں نہ جانا ورنہ اختر صاحب تمہاری شامت بلادیں گے۔"

کمرے میں جا کر درد کی گولی دی کہ کھالیں۔ "کیوں کھالوں؟" یہ کہہ کر تسلے میں پھینک دی۔ "میرے چوٹ کب آئی تھی۔ ایک ذراسی ایکٹنگ کی زندگی میں پہلی بار اور جس لیے کی وہ کام بھی نہ بنا، اختر بمبئی نہ گئے، بچوں کی ٹریننگ کرنا آسان تو نہیں۔" جلدی جلدی پٹی کھول ڈالی نیچے اُتر کر دونوں پاؤں پر کھڑے ہو گئے پھر کبھی ایک پر کبھی دوسرے پر زور دے کر خوب ہنس رہے ہیں۔ میں حق حیران ہو کر ان کو دیکھ رہی ہوں تو کہنے لگے، "کیا سوچ رہی ہو کہ میں پاگل تو نہیں ہو گیا؟"

"مولوی صاحب آپ نے حد کر دی جب کل سب کو پتا چلے گا تو آپ کی کیا رہ جائے گی۔ اختر پرسوں واپس آئیں گے تو ان سے کیا کہیں گے؟"

"کسی کو معلوم کیسے ہوگا؟ لو میں پھر پٹی باندھے لیتا ہوں۔" بیٹھ کر جلدی جلدی اوندھی بوندھی پٹی لپیٹ لی۔ "اس پٹی کو صبح ڈاکٹر صاحب دیکھ کر پوچھیں گے کہ کیوں کھولی؟ آپ کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔ گھبرا اُٹھے۔ "ہاں یہ تو ہے۔ پھر کیا کروں؟"

"کھولیں پٹی مجھے دیں۔" میں نے پوری پٹی پہلے کس کر لپیٹی پھر ان کے پاؤں پر figure of eight کے طریقے سے باندھنا شروع کی۔ وہ جھک جھک کر دیکھا کیے۔

"ارے یہ تو تم نے ڈاکٹروں والی پٹی باندھ دی۔ تم کو یہ کیسے اس طرح باندھنا آئی؟"

"اماں نے سکھائی۔"

"ایک تو یہ تمہاری اماں بقراط سقراط سے کم نہیں دوسرے تم خود ان سے دو ہاتھ آگے ہوتی جاتی ہو، بھئی دیکھو میں اب سیدھا سیدھا لیٹ جاتا ہوں۔ کل دن بھر بھی مجبوراً لیٹ کر کام نبٹالوں گا مگر تم اختر سے کہنا نہیں، عورت پیٹ کی بڑی ہلکی ہوتی ہے۔"

"اچھا اب چلیں اپنے کمرے میں یا کہیں تو پڑھ کر سنا دوں۔"

"بس وہی پڑھنا لکھنا تھک جاتا ہوں اس سے، تم سیدھی طرح برآمدے سے مونڈھا لاکر، اس پر بیٹھ کر اتنا تو بتاتی جاؤ کہ آخر تمہارے ابا اپنی ایک ٹانگ کدھر پھینک آئے تھے؟"

"توبہ کریں کوئی اپنا ہاتھ پاؤں پھینک کر آیا کرتا ہے؟"

"تو پھر ہوا کیا تھا؟"

ایسا ہوا کہ جب میں تین دن کی تھی تو ابا شیر کے شکار کے لیے ترائی کے جنگلات میں ہاتھی پر گئے۔ ایسے علاقوں میں جب پوسٹنگ ہوئی تو ہاتھی بھی رکھا کرتے تھے۔ یوں تو شیر کے کار پر جاتے تو دو چار لوگ اور بھی ہوتے اب کی صرف ان کا فیل وان ہی تھا (بڑی تفصیل سے "ہم سفر" میں اس سچے حیرت انگیز قصے کا ذکر آپ کو ملے گا یہاں اختصار سے کام لینا پڑ رہا ہے) شیر دکھائی دیتا ہے دونوں گولی بندوق میں بھرتے ہیں۔ شیر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے نالہ کے اس طرف۔ ہاتھی سے اتر کر نالہ پھاندتے ہیں کہ کسی پیڑ پر چڑھ کر شیر پر نظر رکھیں۔ ہاتھی وان نے بندوق سے کارتوس نکالا نہ تھا۔ جب وہ نالہ پھلانگتا ہے تو گولی چل جاتی ہے اور ابا کے ٹخنے پر لگ جاتی ہے۔ زمین پر گر پڑتے ہیں، خون کا فوارہ سا چل پڑتا ہے۔ ہاتھی وان گھبرا کر جنگل میں بھاگ جاتا ہے۔ ابا بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ جب ہوش آتا ہے تو دیکھتے ہیں ہاتھی اپنی سونڈ میں رامو (فیل وان) کو لپیٹے لا رہا ہے۔ مالک کے پاس لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ ابا نے کہا یہ جانور ہو کر مالک کا وفادار اور تو انسان ہو کر انسان کی مدد نہ کر کے بھاگ جاتا ہے۔ اب یہ ہاتھی تجھے زندہ نہ چھوڑے گا اگر جو میں کہتا ہوں وہ نہ کیا، صافہ اپنا پھاڑ اور تین جگہ پر کس کر گرہ لگا، پیر کو چوتھے ٹکڑے میں لپیٹ کر مجھے ہاتھی پر ڈال اور اسٹیشن لے جا اور ریلوے پولیس سے کہنا کہ مجھے لکھنؤ لے جائیں۔ اس نے ایسا ہی کیا، ریلوے اسٹیشن وہاں سے چالیس میل دور تھا۔ ہاتھی اسٹیشن پر اکیلا رہ گیا اور ہمارے گھر کا رُخ کیا۔ رات کو صرف ہاتھی واپس آتا ہے۔ ابا کے گھوڑے نے ہنہنانا اور شکاری کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔"

مولوی صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے، آنکھیں ڈبڈبا سی رہی تھیں کہنے لگے۔

"یہ جانور تو انسانوں سے ہزار گنا بہتر ہوتے ہیں۔ اپنی کلی بے زبانی کے ساتھ کس طور سے اپنے مالک کے لیے پریشانی کا اظہار کرنے لگے۔ پھر کیا ہوا؟"

"باقی کل پر اُٹھا رکھتی ہوں اب تو دس بجنے والے ہیں اچھا خدا حافظ۔"

"تو باقی نہیں سناؤ گی میں اختر سے کہوں گا کہ جب پشاور جائیں تو قصہ خوانی میں تم کو بیٹھا کر آواز لگائیں کہ آج ایک خاتون قصہ خواں آئی ہیں آؤ لوگو قصہ سنو۔"

میں واقعی ڈر گئی کہ ان دونوں سے کوئی بعید بھی نہیں کہ ایسا ہی کر ڈالیں۔ پھر بیٹھ کر باقی قصہ سنا دیا کہ کیا حالت ہوئی ابا کی۔ ایک وقت اسپتال کے ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ وہ ختم ہو گئے۔ سفید چادر اُڑھا دی گئی۔ کوئی قبر کی زمین کے لیے چلا گیا۔ کوئی کفن کے لیے، کوئی میری خالہ کے گھر کہ آ کر لاش کو لے جائیں۔ اتنے میں ابا کے سرجن دوست حمید دیکھنے آتے ہیں۔ لاش سے لپٹ کر سینہ پر سر رکھ کر رونے لگتے ہیں ان کو ہلکی سی دل چلنے کی آواز آتی ہے۔ اماں کو کمرے سے باہر کر کے غسل خانے سے آپریشن تھیٹر میں داخل ہو کر ہتھوڑا نما اور آری جیسی شے لیے بھاگ کر آئے۔ کھانا کھانے کی میز کا پٹرا ران کے نیچے رکھ، بالکل جیسے پیڑ کاٹا جا رہا ہے کاٹ دیتے ہیں۔ نبض پکڑ کر سینہ پر کان لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کچھ دیر میں دل اور پلس چلتی ہوئی پاتے ہیں۔ دس منٹ بعد پورا یقین ہو جاتا ہے کہ ابا زندہ ہو چکے ہیں۔ اسپتال کے ڈاکٹروں کو اطلاع کر دیتے ہیں کہ باقی کام وہ کر لیں۔ ابا ٹھیک ہونے لگتے ہیں۔ دوست سے اصرار ہے کہ وہ فیس نہ لیں گے تو کچھ فرمائش ہی کریں۔ سرجن حمید ابا سے ان کا عربی گھوڑا شاید یہ سوچ کر مانگ لیتے ہیں کہ اب ظفر عمر تو کبھی اس گھوڑے پر بیٹھ نہ سکیں گے۔ چنانچہ گھوڑا لکھنؤ کے اسپتال، سائیس اور زو کے آدمی کے ساتھ لایا گیا۔ ابا کا پلنگ کمرے سے پانچ سیڑھیاں اُتار کر کمپاونڈ میں رکھ دیا گیا۔ دور سرجن حمید اور دوسرے لوگ کھڑے ہیں، گھوڑا پلنگ کے پاس آ گیا تو اشارہ سے سائیس اور زو کے آدمی کو بتا دیا۔ گھوڑے کی حالت یہ ہے کہ آنکھوں کے نیچے کا گوشت آنسو سے گل گیا ہے، سوکھ کر کانٹا ہو چکا ہے پلنگ کے چاروں طرف پھرتا ہے پھر اپنی گردن نیچے کر کے سر ابا کے

سینہ پر رکھ دیتا ہے۔ وہ اس کے سر اور گردن پر ہاتھ پھیرتے جاتے اور آہستہ آہستہ اس سے کچھ کہہ رہے ہیں، وہ چار قدم چل کر اب ان کے پاؤں کی طرف آکر پاؤں پر سر رکھتا ہے گھبرا کر سر ہٹا کر دیکھتا ہے۔ گو چادر پاؤں پر پڑی ہوئی تھی۔ پھر سرہانے آتا ہے ابا نے چادر اپنے پاؤں پر کھینچ کر اس سے کچھ کہا ہو۔ ادھر دیکھ کر ان کے سینہ پر اپنا سر رگڑ رہا ہے۔ وہ پیار سے گردن پر ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ سرجن حمید کو آواز دے کر بلاتے ہیں ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ کر ہاتھ پھیرتے رہے۔ گھوڑا بغور کبھی ان کو کبھی ابا کو دیکھ رہا ہے۔ انھوں نے پاؤں کی طرف اشارہ پھر کیا یعنی اب میں تم پر بیٹھ نہ سکوں گا۔ ڈاکٹر حمید سے کہا اب آپ اس کی گردن پر ہاتھ پھیر سکتے ہیں، وہ سر جھکا لیتا ہے۔ سائیس سے کہتے ہیں زین کس دو، وہ کسوا لیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اب آپ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر گھر اسے لے جائیں۔ بے چوں و چرا وہ ان کو بیٹھنے دیتا ہے۔ مڑ مڑ کر جاتے ہوئے ابا کی طرف دیکھتا ہے۔ میں تو خیر یہ سب سنا کر رو پڑی تھی، مولوی صاحب کے آنسو بھی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ ہمارے مولوی صاحب صرف انسان دوست نہ تھے بلکہ جانوروں کے بھی دوست تھے۔ اتنا یہ سب سن کر بولے۔

''کاش اس دنیا میں انسان کم ہو جائیں یہ جانور بڑھ جائیں، جاؤ بیٹی اب سو جاؤ۔'' اور وہ خود پلنگ پر بیٹھے کسی اور ہی دنیا میں جیسے پہنچ گئے۔ جاتے وقت محبوب سے کہا اپنا بستر برآمدے کی طرف کر لو میں نے گولی درد کی دے دی ہے۔

تیسرے دن اختر آ گئے اور مولوی صاحب بستر سے کھڑے ہو گئے تھوڑا لنگڑا کر چلنے لگے۔ جب میری اور ان کی نظریں چار ہوتیں تو ان کی بچکانا حرکت پر ہنسی سی آنے لگتی۔ ایک بار بناوٹی گرج دار آواز میں بولے، ''لڑکی مجھ پر ہنس رہی ہو تھوڑا سا لنگ کھاتا جو چل رہا ہوں اور تمہارے ابا؟''

اختر بول پڑے، ''آپ کیسی بات کہہ گئے۔ کسی کی دل شکنی کر کے مزا کیوں لیتے ہیں؟''

کیسے مزوں سے یہ سارا وقت گزرا، ان نئے قسم کے لوگوں میں اور ان کی حرکات میں۔ ایسا مگن رہتی کہ گھر خط لکھنے کا ہوش ہی نہ آتا۔ اپریل میں ابا کا خط آتا ہے مولوی صاحب کے

پاس کہ میری سب سے بڑی بہن منور بیگم جو ہماری آپا تھیں صرف ۲۷ سال کی عمر، دو سال ٹی بی میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئیں۔ ان کی والدہ ہفتہ بھر میں واپس علی گڑھ جا رہی ہیں، حمیدہ کو وہاں بھیج دیجیے۔

مجھے صرف اتنا بتایا کہ تمہاری آپا کی طبیعت زیادہ خراب ہے سب علی گڑھ جا رہے ہیں، اگلے ہفتہ مجھے دہلی جانا ہے تم اگر چلنا چاہو تو پہلے تم کو سیدھا علی گڑھ پہنچا کر دہلی لوٹ آؤں گا۔ بے حد خوش ہوئی۔ کہنے لگے، ''تم شاید اب تک بازار نہیں گئیں نہ کچھ خریدا۔ بڑی اچھی اچھی چیزیں ملتی ہیں۔'' کیسے بازار جاتی روپے ہمیشہ کم پڑ جاتے تھے، مجھے تو ہر بار لفافے سے قرض لینا پڑتا تھا۔ پہلی پر لفافے کا قرضہ واپس کرنا ہوتا تھا۔ ''کیوں اختر تم کو کچھ روپے نہیں دیتے۔'' ''دیتے ہیں۔ وہ بھی گھر میں جب خرچ کر دیتی ہوں تو لفافے سے قرض لیتی ہوں۔'' مولوی صاحب کی آنکھیں حیرت سے اور بڑی ہو گئیں۔ بھویں سکڑ گئیں بولے، ''تو یہ قرض ہے اور لینے اور دینے کا طریقہ آج ہی سنا ایسا کیوں کیا؟'' ''اماں نے جو کہا تھا۔ گھر چلانے کو جب رقم دی جائے تو ایسا کرنا۔ بس اس چکر میں پھنسی رہی۔'' ''پھر تم نے جب ہی مجھے کیوں نہ بتایا میں خود لفافوں میں پہلے ہی رکھ دیتا۔ اچھا اب ضرور بازار ہو آؤ۔ گھر والوں کے لیے یہاں کے تحفے بھی خرید لینا۔''

کبھی باتوں باتوں میں مولوی صاحب مجھ سے پوچھ چکے تھے کہ تمہارے ہاں ''عید'' اور ''بکرعید'' کیسے منائی جاتی ہے؟ میں نے بتا دیا تھا۔ بولے، ''پرسوں 'بکراعید' ہم بھی منائیں گے۔'' ''تو کیا بچ قربانی کروائیں گے۔'' کسی بے گناہ کی ہم جان تو لینے سے رہے بھئی۔ یہ رسم میری سمجھ میں کبھی نہ آئی، یہ تو حج کے ارکان میں ہے۔ حج پر جو نہ جائے تو صرف بکرا کاٹنا کیوں؟ پہلے سب اور ارکان تو ادا کرے۔ میں سوچنے لگی کہ یہ دونوں کس طور بکراعید منائیں گے؟ چھ بجے اُٹھ جانا ہے۔ چائے پی کر اختر اور وہ نماز پڑھنے جائیں گے! سنا تھا کہ یہاں عیدین کے موقع پر تخت پر رات ہی کنارے کنارے سب کے کپڑے رکھے جاتے ہیں، فرش پر جوڑے کے سامنے سب کے جوتے چپلیں۔ صبح آئی تو دیکھا برآمدے میں بس بالکل ویسے ہی میری ساری بلاؤز، اختر اور مولوی صاحب کا کرتا پاجامہ، نیچے دونوں کے

جوتے اور میری چپلیں رکھی ہوئی تھیں۔ مولوی صاحب نے مسز نائیڈو کو فون کر کے کہہ دیا تھا۔ ان کے درزی نے میرے بلاؤز پہلے بھی سے تھے۔ مولوی صاحب کے پیار کے ساتھ میری چھوٹی چھوٹی ضرورت کا اس طرح خیال رکھنے پر خوشی کے آنسو آنکھوں میں آ گئے۔ کہا ہم دونوں پیدل جا رہے ہیں۔ قریب ہی تو جگہ ہے۔

اس کے تیسرے دن مولوی صاحب مجھے لے کر روانہ ہوئے علی گڑھ کے لیے۔ راستے بھر طرح طرح کی کہانیوں کی طرح کے میرے بہن بھائیوں کے قصے سنا کیے۔ پھر بولے، "بھئی یہ جو تمہارے زاہد بھائی سب سے دلچسپ ہیں انھیں سے ہماری ملاقات نہ ہوئی۔ کب لندن سے واپس آئیں گے؟" کبھی اختر کے متعلق باتیں کرنے لگتے۔ تعریفوں کے پل باندھتے، "بھئی زندگی بھر میں نے مختلف قسم کے کاموں کو ایسی سرعت سے کسی کو کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی مجھے شبہ سا ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی جنات تو چھپا ہوا نہیں۔ کس سرعت سے اس کا دماغ مشکل سے مشکل نکتے کا صحیح فیصلہ کرتا ہے پھر ٹس سے مس ہرگز نہیں ہوتا، دوسروں کو اپنی صحیح اور کھری بات ماننے پر جھکا لے گا اور خود کبھی نہیں جھکتا، تم کبھی اس سے حجت نہ کرنا پھر تو اکڑ اور تن کر لو ہا لاٹ ہو جاتے ہیں۔ سچی اور کھری بات فوراً مان لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔" میں نے آتے آتے ایک ٹوکرا شریفوں کا ان سے خفیہ، ریل کے ڈبے میں رکھوا لیا تھا۔ بھوپال کا اسٹیشن آیا۔ لوگ ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ایک صاحب سے کہا آپ کے گھر کے لیے ایک ٹوکرا شریفے لایا ہوں۔ ان کو قلی بلا کر اُتروا لیں۔ میں حق دق ان کا منھ دیکھتی رہ گئی۔ کیسے ان صاحب سے کہتی کہ یہ تو میرے ہیں۔ ریل جب چل پڑی تو ان سے کہا، "آپ کو کیا حق تھا کہ دوسرے کی چیز کسی کو تھما دیں؟ اور آپ کو معلوم کیسے ہوا؟" "اس کی بو سے اسی لیے ٹوکرا دے دیا کہ علی گڑھ جا کر تم سب سے زیادہ کھاتیں اور پھریوں ہو جاتیں۔" (اپنا منھ خوب ٹیڑھا کر لیا۔)

مولوی صاحب چند گھنٹے 'نیلی چھتری' میں رُکے۔ میری والدہ سے بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ "مجھے امید ہے حمیدہ نے آپ کو کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا ہوگا؟" ہنس کر بولے "شکایت کا موقع تو ہم دونوں نے اس کو بہت دیے،

مگر کبھی اس نے نہ برا مانا اور نہ دل پر لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی ذات سے ہمارے گھر میں تازہ ہوا کے جھونکے سے آگئے ہیں۔ آپ نے بہت اعلیٰ تربیت بیٹی کو دی!!"

ان کے جانے کے بعد جب والدہ نے خوش ہو کر بتایا تو میں خوشی سے بانسوں چڑھ گئی۔

دس ہی دن بعد مولوی صاحب نے اختر سے کہا، "بھئی گھر تو بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ بہت ہو لیا۔ تم چند دن علی گڑھ رُک کر حمیدہ کو لے کر آجاؤ۔" جب واپس پہنچی تو فرما دیا کہ اب ایک سال سے پہلے نہیں جاؤ گی۔

اختر بڑی اسپیڈ (تیزی) سے اپنے ذمے لیے کام کو کرتے رہے۔ دفتر کے اوقات میں سوائے دو بار کے کبھی اندر نہ آئے۔ مولوی صاحب بے شک ہر روز چند بار اندر آکر ضرور پوچھ جاتے۔ میرا ہر دن خوشیوں بھرا گزر رہا تھا۔ اختر کی ایک چڑ بنا رکھی تھی!

یہ جو پنچو ہے کھڑا!!

اس کو ماردوں تڑا!!

تو رہ جائے پڑا!!

اس کی توڑ پر اختر نے کچھ ایسی ہی بے معنی سی چڑ ان کے لیے بنائی تھی۔ اس وقت یاد نہیں آرہی شاید آگے جا کر یاد آجائے۔ جس دن بھی خود کچھ پکا دیا بے حد خوش ہو کر کھایا اور دوسرے دن چپکے سے بڑے پیارے سے ننھا منا تحفہ ضرور دیا۔ ان تحفوں کی نوعیت ایک پیڈ، کچھ لفافے، چند پینسلیں!! کبھی فاؤنٹین پن، کبھی کوئی کتاب۔

وقت گزرتا گیا۔ دسمبر کا مہینہ آگیا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ تم دونوں کی شادی کی سال گرہ زوردار مناؤں گا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اب یہ غضب نہ کریں۔ کہیں ولیمہ والا حال نہ ہو جائے اس کا۔ کچھ کبیدہ خاطر ہو کر کہتے ہیں، "بات کو بھول جانا چاہیے ورنہ جینا حرام ہو جاتا ہے۔" ادھر تو میرے اختر راتوں کو بھی اکثر دفتر جا بیٹھتے۔ مولوی صاحب مجھ سے کہتے، "یہ کام کی جان کو آگیا ہے۔ کیا کچھ پریشانی لاحق ہے اختر کو؟" "یک سوئی میں انسان کام زیادہ کرتا ہے پریشانی میں دماغ پراگندہ ہوتا ہے، کام نہیں کیا جاتا۔" میں کہتی۔ سر ہلا کر کہتے ہیں، "کوئی بات ضرور ہے۔"

جنوری ۱۹۷۳ء کا شروع ہفتہ ہے۔ اختر کئی دن سے چپ چپ سے رہتے۔ رات کو تاش یا پچیسی کھیلنے سے صاف انکار۔ میں اور مولوی صاحب کھیلتے ضرور مگر بے دلی سے کہ جب لڑائی بھڑائی نہ ہو رہی ہو تو مزا کیا خاک آتا۔ ایک دن بولے، ''تم کیسی بیوی ہو کہ چہرے مہرے کو دیکھ کر سمجھ نہیں رہیں کہ اس میں ایک عجیب سی خاموشی اور اُداسی جو آئی ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ پھر ان سے منھ کھول کر پوچھو نا۔'' ''بہت بہتر۔''

میں موقع کی تلاش میں رہی۔ ایک دن جب اختر کاغذات دیکھ کر کچھ پھاڑتے رہے کچھ جیسے ایک طرف رکھ رہے تھے۔ تو ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ ''یہ سب کیا کر رہے ہیں اور کیوں؟ مولوی صاحب آپ کی طرف سے بڑے پریشان ہیں ان کو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ فکر مند ہیں۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں کہ اپنی پریشانی مجھ کو بتائیں؟'' اچھل سے پڑے کہ مولوی صاحب کو یہ احساس ہو رہا ہے۔ ''ہاں حمیدہ میں فکر مند ضرور ہوں کہ اب میرا وہ سارا کام جو مجھے یہاں موجود رہ کر کرنا تھا ختم ہو گیا اب میں دہلی جا کر اپنا اخبار نکالنا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب کے ساتھ میں اسی وعدہ سے آیا تھا کہ پھر وہ اخبار کا ایک سال کا خرچ اُٹھانے کے ذمہ دار ہوں گے، لیکن ان کی شفقت اور محبت تمہارے آجانے کے بعد اور بھی بڑھ گئی، بے حد مگن رہنے لگے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے کیسے کہوں کہ ہم دونوں کو جانے کی اجازت دیں جب کہ اب میں مزید یہاں رک بھی نہیں سکتا۔'' میں نے کہا، ''اگر یہ بات ہے کہ آپ سے کہا نہیں جا رہا تو مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ پہلے میں بات کروں گی۔ ان کو جو ایک دھکا سا لگے گا اور غصہ بھی آئے گا اس کو آپ نہ دیکھ سکیں گے۔ پھر دو ایک روز بعد آپ بات کر لیجیے گا۔'' اطمینان کی سانس لی اور کہا، ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

چند دن بعد جب اختر اپنے دوستوں سے ملاقات کے لیے گئے، مولوی صاحب کھانے کے تخت پر لیٹ کر حقہ پیتے میں اخبار دیکھ رہے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ ایک دم اخبار رکھ کر بولے، ''پچیسی لے آؤ نا۔'' ''جی نہیں آج تو نہ کھیلوں گی۔ آپ سے کچھ باتیں ہو گی۔'' ''پھر چلو وہی کرو۔''

میں نے جب دھڑکتے ہوئے دل کو کڑا کر کے کہا، ''مولوی صاحب مجھے ذرا ایک بات بتائیں کہ اگر کوئی کسی سے وعدہ کرے تو کیا اس کو پورا ہی کرنا چاہیے؟'' وہ بولے، ''میرے خیال میں ہر شریف انسان اپنے وعدہ کی پاس داری ضرور کرتا ہے۔'' ''یہی تو میں اختر سے کہے جا رہی ہوں۔'' اُٹھ کر بیٹھ گئے گھبرا کر پوچھتے ہیں، ''کیسا وعدہ اور اس کی پاس داری؟'' ''آپ نے جو اختر کو علی گڑھ سے لاتے وقت کیا تھا؟ آپ نے جو اپنے ہاتھ سے لکھے خط ابا کو اور مجھے بھیجے تھے اس میں بھی لکھا ہوا ہے کہ اختر کی آپ صحافت کے سلسلے میں پوری مدد کریں گے۔'' اُلجھ کر بولے، ''آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''پہلے تو خود آپ نے کہا کہ اختر کھویا سا پریشان سا کیوں ہے ان سے پوچھو، وہ میں نے پوچھ لیا۔ ان کی پریشانی یہ ہے کہ آپ سے کیسے اور کیوں کر کہیں کہ اب وہ دہلی جا کر اخبار نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کو یہ خیال بے حد بے چین رکھ رہا ہے کہ آپ کو رنج ہوگا ہم دونوں کے جانے سے۔ دہلی جانے کی خوشی سے اجازت نہ دیں گے شاید اپنے وعدہ سے غصہ کے مارے منکر ہی ہو جائیں۔'' ماتھے پر بل ڈالے، بھویں سکیڑے کچھ دیر خاموش رہ کر اور سر کو ادھر اُدھر ہلا کر بولے ''اس کا تو ابھی سوال ہی نہیں آ سکتا۔ میں تو خود انجمن کو دہلی منتقل کرنے کے مراحل میں ہوں۔ ساری کارروائیاں ہو جائیں پھر دہلی تینوں ساتھ ساتھ چلیں گے، تب وہ اپنا اخبار شوق سے نکالیں۔ میری ہر مدد ہر طرح سے حاضر اور موجود رہے گی۔''

میرا ان سے یہ کہنا تھا، ''نہیں مولوی صاحب آپ ان کو اب جانے کی خوشی خوشی اجازت دے دیجیے۔ سال سوا سال میں آپ انجمن کو لے کر دہلی آ جائیں گے۔ تب تک اخبار جم جائے گا اور ہم پھر آپ کے پاس ہوں گے۔'' مولوی صاحب جھلّا کر بولے، ''اور اتنے عرصہ میں یہاں اکیلا جھک مارتا رہوں؟ اختر اگر ناسمجھی کی سوچ رہے ہیں تم تو اپنے ہوش سے کام لو، خیر میں تو کسی گنتی ہی میں نہیں مگر یہ راجا رانی، لاما، نازی اور چڑیوں کا کیا قصور ہے؟'' یعنی اتنے صدمے کی کیفیت میں بھی مولوی صاحب کو ان بے زبان جانوروں کے احساسات مدنظر تھے۔ ''آپ کے ہوتے ہوئے وہ ہماری کمی محسوس نہیں کریں گے۔'' سر کے درد کا بہانہ کرے اُٹھنے لگے۔ میں نے کہا میں تیل لا کر لگاتی ہوں۔ بڑا برا سا منھ بنا کر

کڑواہٹ سے کہا، ''جی مجھے تیل نہیں لگوانا۔'' حالاں کہ جب کبھی سر میں درد محسوس کرتے اور میں ان کے سر میں تیل لگاتی تو ان کو بہت اچھا لگتا۔ کبھی کہتے کہ تم تو تیل مالش بھی کر کے کما کھا سکتی ہو مگر افسوس کہ لڑکیاں تیل مالش کے پیشہ میں نہیں۔ اختر بھی جھٹ سے نیچے بیٹھ کر ان کی باری کے حق دار بن جاتے۔ ''یوں درد کو دور کر دینا آپ کو کیسے آیا؟ کہہ دیں گی کہ اماں نے سکھایا!!''

مولوی صاحب اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ اختر آئے، ان کو اپنی بات چیت جو مولوی صاحب سے کی تھی بتا دی۔ کہتے ہیں یہ بہت اچھا کیا آپ نے اب میں کل ان سے بات کر لوں گا۔ دوسرے دن رات کے کھانے کے بعد بات چھیڑی۔ خاموش چپ چاپ سنتے رہے پھر یہ کہہ کر اپنے کمرے میں اُٹھ کر چلے گئے، ''مناسب تو یہ تھا کہ ساتھ ہی دہلی چلتے۔ ہزاروں بکھیڑوں سے میں تنہا کیسے نمٹوں گا؟'' اور اختر نے یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کا رُخ کیا، ''تو یہ کیوں نہیں صاف صاف کہتے کہ آپ اپنے وعدے سے پھر گئے۔ مگر میں پھر بھی دہلی جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح اخبار ضرور نکالوں گا۔'' میں برآمدے میں بہت دیر بیٹھی سوچا کی کہ اس مسئلہ کو کس طور نبٹوں؟

تیسرے دن اختر نے اعلان کر دیا کہ وہ دو روز کو اورنگ آباد شمیم صاحب سے ملنے جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے اتنا کہا کہ ''شمیم کو اتنا سمجھاتے آنا کہ وہ عملے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی گرفت نہ کیا کریں، تھوڑا بہت چیزوں اور پیسہ کے نقصان پر اتنی سختی اور گرفت کرنا چھوڑ دیں۔ وہ سب لوگ برس ہا برس سے جس روش پر چلنے کے عادی ہیں وہ اب کیوں کر بدل دیں گے؟ ان کی اپنی ایمان داری کام میں خلل پیدا کرتی ہے سب لوگ ان سے شاکی ہو کر جان بوجھ کر رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔'' اختر کا جواب یہ تھا کہ ''میں نے پہلے ہی آپ کو ان کے مزاج سے آگاہ کر دیا تھا تو آپ کا کہنا تھا کہ پریس کے حالات اور اخراجات بہت زیادہ ہوئے جاتے ہیں مجھے اب ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ اتنی ضد کر کے آپ نے ان کو بلوایا اب آپ جانیں اور وہ جانیں۔ میرے کہے سے شمیم صاحب بدل نہیں سکتے۔''

اختر چلے گئے مولوی صاحب کی اُداسی سے میرا دل کٹا جاتا تھا، رات کے کھانے کے بعد بلا کر، پاس بٹھا کر مجھ سے یوں باتیں کیں۔

"حمیدہ اس ضدی، ہٹی اور سر پھرے کو بس ایک ہی ترکیب سے یہاں رُکنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ تم دہلی جانے سے انکار کر دو۔" میرا ظاہر ہے جواب یہی ہو سکتا تھا کہ "میں کس طرح انکار کر سکتی ہوں۔ جہاں بھی وہ جائیں گے اور جو بھی وہ کریں گے مجھے تو ان کا ساتھ دینا ہی ہے۔"

"میں تم کو جانے کی اجازت یوں نہیں دے سکتا کہ ظفر عمر سے تمہارا ہاتھ مانگا تو اختر کی شادی انھوں نے تم سے کر دی، میرے اوپر تمہاری ہر طرح کی ذمہ داری ہے، تم کو کیا خبر کہ اختر نے اخبار اگر نکالا تو اس کا اور خود ان کا کیا حشر ہوگا؟ یہ اپنے اخبار میں انگریزوں کے خلاف اتنا کچھ لکھے گا کہ جیل پہنچ جائے گا، اخبار بند ہو جائے گا اور تم کو پریشانیوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔"

مولوی صاحب کی باتوں کا میں نے یہ جواب دیا، "میں ہر حال میں ان کا ساتھ دوں گی۔ اگر جیل چلے گئے تو فخر سے سر اونچا ہوگا۔ اخبار کو میں خود چلاؤں گی۔" "تو تم کو اپنے متعلق اتنی غلط فہمی ہے کہ اخبار چلاتی رہیں گی۔ تم نے زندگی میں کوئی تکلیف اٹھائی نہیں، پیسوں کا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے اختر کا آگے پیچھے کوئی ہے جس پر سہارا لے سکو؟"

"خدا آپ کے دم کو سلامت رکھے کہ ان کے سر پر ایک مشفق باپ کا سایہ ہے۔ آپ کو اپنے لائق اور قابل بیٹے کی راہ کا ہر روڑا پتھر ہٹانا ہی زیب دے سکتا ہے۔" مولوی صاحب بولے "اچھا یہ بات ہے۔ ہاں غلطی میری تھی جو سمجھ بیٹھا تھا کہ تم دونوں زندگی بھر میرے پاس رہو گے۔ جاؤ اپنے کمرے میں مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" میں بڑی اداس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اختر واپس آئے تو مولوی صاحب نے دریا گنج کے کسی پریس کے نام ایک خط ان کے ہاتھ میں پکڑا کر کہا، "اب خوش۔"

اختر خط پڑھ کر مسکرانے لگے۔ بس یہ کہا، "شکریہ اب میں دہلی کے لیے آج سیٹیں بک کرائے لیتا ہوں۔ ذرا ہم گھر جمالیں تو آپ جلدی ہمارے پاس آئیں۔" مولوی صاحب نے جل بھن کر کہا، "جیسا حکم سرکار کا۔"

ہمارا مختصر سا سامان بندھ گیا۔ شاموں کو اختر اپنے دوستوں کو خدا حافظ کرنے نکل جاتے، دن میں مجھے موٹر پر مولوی صاحب نے قاضی عبدالغفار، بابا، سروجنی نائیڈو اور منظور یار جنگ کے ہاں بھیج دیا۔ شام کو گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ صبح مولوی صاحب نے شاید خود اکیلے چائے پی لی ہو، سارے دن کمرے میں رہے۔ اندر سے دروازہ کھولیں ہاں ناں کچھ نہیں کہتے پھر ایک گرج دار آواز میں بولے "جاؤ۔ جاؤ نا مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو، دیکھو نازی کو اگر ساتھ نہ لے گئیں تو اچھا نہ ہوگا۔" میں ڈر گئی کہ جیسا وہ تین چار دن سے بار بار کہے جاتے تھے کہ نازی کو ہمیں دہلی لے جانا ہی ہے۔ میں جی اچھا کہہ دیتی مگر ایک بار یہ خیال نہ آیا کہ ہم اس کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے مگر اس وقت جس انداز سے انھوں نے فرمایا اس نے مجھے بے بس کر دیا کہ یہ گویا ان کا حکم ہے، جس کی سرتابی کی گنجائش نہیں۔ اختر مجھ سے بار بار آ کر کہیں کہ "آپ نہ کہیں ان سے دروازہ کھولنے کو، میں ان کو خوب جانتا ہوں کہ وہ غصہ میں ہیں ساتھ ہی غمگین، ہرگز وہ باہر نہ آئیں گے، نہ آنے دیں گے۔" اختر کے چہرے پر کچھ کم اداسی نہ تھی۔ "اس بدبخت نازی کو ہمارے سر منڈھ کر کبھی کبھی خوب خوش ہوا کریں گے کہ ہم کو خوب تنگ کر رہا ہوگا اور اپنے لیے اس کی موجودگی یوں نہ برداشت کر سکیں گے کہ بہت سی یادیں ان کو ہر روز ہی آجایا کریں گی۔ لاما تو اب بلیوں کا عاشق زار ہو ہی چکا ہے۔ بیش تر ان کے فراق میں باہر رہتا ہے اور دیکھ لینا راجا، رانی کو کہیں بھیج دیں گے۔" "یہ ظلم تو وہ ہرگز نہ کریں گے۔" "اچھا شرط لگالیں، اور ہاں وہ چڑیاں، پنجرے کھول کر یہ سب اڑا دیں گے۔"

شام آگئی۔ سامان موٹر میں دوبارا اسٹیشن چلا گیا تھا۔ اب ہم کو بھی روانہ ہونا ہے۔ ہم دونوں دروازے کے پاس گئے۔ مجھ سے تو کچھ کہا بھی نہ گیا کہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اختر نے ذرا کانپتی سی آواز سے کہا۔ "مسافر تجھے جانا ہی پڑے گا۔" جلدی سے دہلی کا رخ پکڑیے گا اور اپنے بچوں کے پاس ٹھہریے گا۔ خدا حافظ۔"

اس گھر میں کیسی خوشی خوشی داخل ہوئی تھی اور آج کتنے بھاری دل سے روتی ہوئی یوں جا رہی ہوں جیسے بیٹی بدا ہو کر سسرال سدھارتی ہے!

دو سیکنڈ کوپے میں نازی نے وہ اچھل کود مچائی کہ توبہ بلوادی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے آنکھ چار کرنے کی ہمت نہ کر پاتے۔ سارا راستہ جیسے تیسے کاٹا، کبھی اختر کہہ اُٹھتے کہ ''مولوی صاحب یہ کر رہے ہوں گے وہ کر رہے ہوں گے۔'' رات کو میں نے کہا کہ ''اداس سے لیٹے پڑھ رہے ہوں گے کہ ان کے کھیل کود کے دن گئے۔''

دہلی آگئے۔ شاہد احمد صاحب (''ساقی'' والے) نے دریا گنج میں ایک فلیٹ لے کر کچھ موٹا جھوٹا ضرورت بھر کا کرایہ کا فرنیچر رکھوا دیا تھا۔ چند دن میں ہم جم گئے۔ آتے ہی تار اماں کو دے دیا کہ ایک باورچی اور گھر کا سامان روانہ کر دیں۔ تیسرے دن ایک ٹھگنے سے داڑھی والے باورچی (ابراہیم کے ابا) بستر ے، برتن وغیرہ کے ساتھ آگئے۔ اختر نے اخبار کے ڈیکلریشن کے لیے درخواست حکومت ہند کو بھیج کر پہلے مولوی صاحب کو خط لکھا، ''ایک ماہ کے اندر اندر وہ آئیں۔ گھر چھوٹا سا مگر دل بڑا سا ہے۔ نازی کو ساتھ کر کے آپ نے ہم سے پورا پورا بدلہ لے لیا۔ کہاں آپ کی کوٹھی اور کمپاؤنڈ اور کہاں یہ فلیٹ اور پھر آپ کی غیر موجودگی، سر اُٹھا اُٹھا کر غم زدہ نگاہوں سے مجھ سے جانے کیا کیا پوچھتا ہے، آپ کے آنے تک رسالہ کا ڈمی چربہ تیار کر لوں گا تا کہ آپ دیکھ کر اپنی رائے دے سکیں۔''

جب مولوی صاحب کا خط آیا تو اس میں کوئی گلا یا شکوہ نہ تھا۔ یہ ضرور لکھا کہ لاما ''میاؤں۔ میں آؤں؟'' راتوں کو کرتا رہتا ہے۔ دو تین دن میں دھڑا دھڑ اختر نے مضامین کی فرمائش کے لیے خط لکھ ڈالے اور قلم اور رجسٹر لے کر لکھنے بیٹھ گئے۔

ایک ماہ بعد جب مولوی صاحب دہلی تشریف لائے تو ہمارے پاس ٹھہرے۔ تیس پرچوں کی پوری شکل نکل آئی تھی۔ نازی تو ان کو دیکھ کر بس دیوانہ سا ہو گیا۔ ان کی ٹانگوں میں لپٹ رہا ہے، کبھی گود میں چڑھا جاتا ہے۔ کبھی منہ چاٹے لیتا ہے کہ وہ جز بز ہو کر ہٹاتے جاتے ہیں۔ 'جہاں نما' کے مضامین جو اختر نے خود لکھے یا ترجمے کیے اور کتنے ہی بڑے لوگوں پنڈت سندر لال کا مضمون، پریم چند کا تازہ افسانہ، ٹیگور اور اقبال، مجاز وغیرہ کی نظمیں مگر ہائے نازی؛ وائے نازی! ایک بارگی مولوی صاحب نے جھنجھلا کر پکارا ''کڑک مرغی۔ کڑک مرغی۔ ادھر آؤ۔'' بڈھن خانسامہ دوڑا ہوا سامنے آکر کھڑا کہہ رہا ہے، ''جی سرکار۔''

ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے کہ پہلی بار ان کے حلیہ کو جیسے دیکھا ہو۔ چھوٹا قد، چگی داڑھی، پھولا اور ڈھیلا جسم۔ درحقیقت کڑک مرغی کا خطاب ان پر پورا اُتر رہا تھا۔ ذرا ڈپٹ کر فرمایا، ''فوراً 'نازی' کو یہاں سے لے جاؤ۔ کہیں جا کر چھوڑ آؤ۔'' وہ کالر پکڑ کر دوسرے میں لے گیا۔ جب شام کی چائے کے وقت نازی کو بسکٹ دینے کو آواز لگائی تو وہ نہ آیا پھر آواز دے کر 'کڑک مرغی' بلوائے گئے کہ بھئی اب اس غریب کو کھول دو تو وہ کہتے ہیں ''سرکار آپ حکم دیا تھا کہ کہیں چھوڑ آؤ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اس کو چھوڑ آیا۔'' چائے ابھی آدھی ہی پی تھی گھبرا کر کھڑے ہوئے، چلو اختر جلدی چلو، نازی کو ڈھونڈ کر لائیں۔ شیروانی پہن جلدی جلدی دونوں نیچے اُتر گئے رات کو آٹھ بجے خالی ہاتھ بڑے اُداس واپس آئے۔ اختر کا بیان تھا کہ ''مجھے تو کون شکل سے پہچانتا مگر ان کے جانے اور پہچانے بیسیوں لوگ رستے بھر ملا کیے، بڑے ادب سے مولانا کہتے ہوئے آگے بڑھتے اور یہ ''نازی نازی'' پکارتے بن جواب دیے تیز تیز کبھی ادھر کبھی اُدھر کو مڑ جاتے شاید کل اخباروں میں یہ خبر چھپ جائے گی!!''

دوسرے دن پریس پر گئے جو سب سے اچھا کاغذ ہو سکتا تھا اس کو پسند کر کے ہدایت کی کہ رسالہ میں یہ استعمال ہوگا۔ واپسی پر اختر سے فرمائش کی کہ فلاں دکان سے حقہ کا تمباکو لا دیں۔ وہ ادھر کو گئے خود فلیٹ میں آ گئے، مجھے پاس بلا کر بٹھا کر بڑی شفقت سے کہا، ''دیکھو جب کبھی کوئی ضرورت ہو تو مجھے لکھ دیا کرنا۔ تم کو خبر ہے کہ پنجروں کے دروازے کھلے رہ گئے اور سب چڑیاں اڑ گئیں، راجا اور رانی کی نگاہوں میں بڑی اداسی نظر آتی، تم تو روز ان کو اپنے ہاتھ سے تازی تازی گھاس لے جا کر دیا کرتی تھیں نا، تو وہ تم کو بہت یاد کرتے تھے، میں نے ز و کو دے دیے۔ میں روز سیر کے لیے باغ عامہ جب جاتا ہوں تو ان سے ضرور ملتا ہوں، دونوں مزوں میں ہیں اور وہ تمہاری سروجنی نے ٹھیک ہی تم کو بتایا تھا کہ پودوں میں جان ہوتی ہے وہ پیار کے ہاتھوں کو محسوس کرتے ہیں۔ جب تم نے مجھے بتایا تھا تو میں نے کہا تھا نا یہ سب کہنے کی باتیں ہیں مگر وہ بات سچ ہی تھی۔ تمہاری کیاریوں کے پودے سب ہی سوکھ سا کھ گئے ان کو تم یاد آتی ہوگی۔'' جیب میں سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر مجھے

دیا کہ یہ تم رکھ لو۔" "اس میں ہے کیا؟" "کچھ روپے ہیں تمہاری شادی سے پہلے جو تمہارے کمرے اور ڈریسنگ روم کے لیے فرنیچر خریدا تھا اور وہ بڑا قالین، اسی دکان دار کو بلا کر اس کو واپس دے دیا۔ جو بھی اس نے روپے دیے وہ اس لفافے میں ہیں۔" میں ذرا گھبرا کر پیچھے کو سرک کر ہو بیٹھی اور کہا، "میں ہرگز ان کو نہ لوں گی۔ اختر کس قدر ناراض ہوں گے مجھ پر۔" "وہ کون ہوتے ہیں ناراض ہونے والے وہ تو میرا تحفہ تھا تمہارے لیے اس کے واپس کر دینے پر یہ روپے بھی تمہارے ہیں۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہا، "آپ ضد نہ کریں میں یہ لے نہیں سکتی۔" ہنس کر بولے، "تو تم نہ لو" لفافہ برائے قرض'، لفافہ برائے اشد ضرورت' کے لیے ان کو دے دو۔ اس طرح تم نے تو نہ لیے لفافوں نے لیے!!" ان کے اس پیار سے حکم دینے کو ٹال نہ سکی۔ پھر کہا، "حمیدہ مجھے بڑا ڈر سا لگ رہا ہے کہ اگر اخبار کے لیے سرکار نے اجازت نہ دی تو اختر پر کیا گزرے گی اور خدا بہتر جانے وہ منھ اُٹھا کر کدھر کا رُخ کرے۔ اگر کلکتہ چلے گئے تو مسلمان اور اردو زبان ایک بہت بڑے عالم کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے گی۔" میرا یہ جواب تھا کہ "ہمیشہ، روشن پہلو کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ تاریکی سے دامن بچا کر گزر جانا چاہیے۔" خوش ہو کر بولے "شاباش بیٹی یہ ہوئی ہمت والوں کی سی بات!!"

اختر آ گئے تو پوچھتے ہیں، "کیا رازداری کی باتیں دونوں کر رہے تھے؟"

"ہم میاں پنچوں کو کیوں بتائیں۔" ہم دونوں خوش ہو گئے کہ اب ان کے دل پر ہمارے آنے کا ملال نہیں رہا اور ہمارے اپنے دلوں پر سے جیسے کوئی پتھر ہٹا دیا گیا ہو.... رات کی گاڑی سے وہ واپس حیدرآباد چلے گئے۔

ایک خط میں پریشانی کا اظہار ہے کہ "اب تک ڈیکلریشن کیوں نہیں ملا۔ آخر وہ حیدرآباد سے کس قسم کی معلومات کرنا چاہتے ہیں۔"

اختر اس بیچ میں برابر انجمن کا کام بھی کر کے بھیجتے رہے۔ جب تین ماہ بعد پتا چلتا ہے کہ اجازت نہیں ملی تو مولوی صاحب بہت فکر مند ہو کر لکھتے ہیں جلد دہلی آنے کی کوشش کریں گے۔ پھر مستقبل کے متعلق بات کریں گے۔ اختر بڑے ہی چپ اور

اُداس رہتے۔ مجھ سے کہا، ''جن جن کے مضامین وغیرہ آئے تھے آپ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں۔''

جون ۱۹۳۷ء میں فلیٹ چھوڑ کر سامان 'نیلی چھتری' میں رکھ ہم دونوں کوٹ گڑھ (یہ جگہ شملہ سے ۸۰ میل پر ہے۔ اس وقت کوئی سڑک نہ تھی پگڈنڈی پر پیدل یا ٹٹو پر ہی جا سکتے تھے۔ موٹر یا بس کا کیا سوال تھا) روانہ ہوئے۔ اختر کے ایک بہت عزیز دوست ان دنوں اپنی بہن بہنوئی (جو فارسٹ آفیسر تھے) کے پاس آئے ہوئے تھے۔ ان کے بلاوے پر وہاں چلے گئے۔ اس کا تکرم میں نے اس خیال سے لگایا کہ اختر کے دل کی اداسی جنگلات، پہاڑوں، جھرنوں اور جہلم دریا کی پُر شور وانی کی خوش کن آواز سے کچھ دور ہو ہی جائے گی۔ بعد میں آگے کوئی پروگرام بنا سکیں گے۔

اس حسین علاقہ میں قدرت سے قریب تر ہو جانے کا اثر اختر پر ایسا ہوا کہ وہ اخبار کا غم بھول گئے مگر میں برابر فکر مند کہ ان کو کیا مشورہ دوں! ایک رات دو بجے یہ دماغ میں خیال آیا کہ اگر ولایت جا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے آئیں تو بہت سی راہیں کھل جائیں گی۔ اسی وقت اٹھا کر جب اختر سے کہا تو انھوں نے ہنس کر کہا، ''کیسے خواب دیکھ رہی ہیں، جانے کے لیے بہت وسائل چاہیے ہوتے ہیں اور پھر سرکار مجھے پاسپورٹ یہ کیوں دے گی۔ سو جایئے۔''

میں نے دوسرے دن والد صاحب کو ہردوئی تار دیا کہ فوراً پاسپورٹ کے دو فارم بھیج دیں۔ چند روز بعد فارم آگئے۔ اختر کو بڑی مشکل سے ان کو بھرنے پر راضی کیا کہ میرے ابا ضرور پاسپورٹ دلوا سکیں گے۔ ایک ماہ بعد جب ہم ہردوئی واپس آئے تو اختر کی بات سچی نکلی۔ لکھنؤ سے جواب آچکا تھا کہ دہلی سے وائسرائے کی سکریٹریٹ سے اجازت اس لیے نہیں ملی کہ اختر کا ریکارڈ ان کی نظر میں ٹھیک نہیں!!! اختر نے مجھ سے صرف اتنا کہا، ''مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ پاسپورٹ نہیں ملے گا۔ اب کل میں ایک دن کو وردھا رُکتا ہوا حیدرآباد جاتا ہوں۔ مولوی صاحب سے کام کے متعلق بات کر کے بمبئی چلا جاؤں گا وہاں پاؤں نہ جما سکا تو کلکتہ جا کر 'مول چند اگروال' کے اخبار میں پھر کام شروع کر دوں گا تب آپ وہاں آجائیں۔''

اختر دو دن ہمارے گھر رُک کر 'وردھا' (گاندھی جی کا جہاں آشرم تھا، سروجنی نائیڈو آج کل یہاں گاندھی جی کے پاس تھیں) سے ہوتے ہوئے حیدرآباد مولوی صاحب کے پاس چند روز کے لیے، اورنگ آباد شمیم بھائی سے ملنے چلے گئے۔ اختر کے روانہ ہونے کے دوسرے دن ہی میں نے والد صاحب سے کہہ دیا کہ "آپ کچھ نہ کر سکے، اب میں خود لکھنؤ جاؤں گی (اس وقت عارضی کانگریس کی حکومت بن چکی تھی اور والد صاحب کے دوست پنڈت پنتھ یوپی گورنمنٹ کے وزیر اعلیٰ تھے) آپ بس پنتھ جی کو تار دے کر میرے آنے کی اطلاع دے دیجیے۔" والد صاحب میری ہمت اور عزم کو دیکھ کر خوش ہوئے کہا کہ "ٹھیک ہے، تم رات کی گاڑی سے چلی جاؤ۔ بس سیدھی ان کے گھر جا کر اپنی سی کوشش کر دیکھو۔ (اس کی تفصیل 'ہم سفر' میں آپ کو بڑی دلچسپ لگے گی) فی الحال قصہ مختصر یہ کہ پنڈت پنتھ جی کے پاس پہنچ جاتی ہوں۔ ان سے سب سے پہلے یہ فرمایش کرنا پڑی کہ مجھے فوراً ایک چپل بازار سے منگوا دیں کہ اسٹیشن سے تانگے میں آتے ہوئے پاؤں سے گر گئی۔ یہ رہے پانچ روپے اور وہ ادھر ناپ کی چپل ہے!! فرش پر پالتی مارے، بڑی بڑی گول گول آنکھیں والے گول مٹول پنتھ جی مجھے حیرت سے دیکھنے لگے تو میری نظر ان کے ماتھے کے تلک اور گلے کے جینو پر پڑی۔ تلک سے سروجنی نائیڈو کی بندیا یاد آ گئی۔ پنڈت جی نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ پاسپورٹ کا دینا یا نہ دینا صوبے کی گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ جب تک وائسرائے کے دفتر سے اجازت نہ مل جائے۔ میں نے ان سے پوچھا، "کیا سروجنی جی اور پنڈت جواہر لال بھی ابھی 'وردھا' میں گاندھی جی کے پاس ہیں؟" بتایا، "ہاں وہیں ہیں۔" "پھر سروجنی جی سے بات کروا دیجیے۔" بے چارے پریشان سے ہو کر سکریٹری سے کہتے ہیں، "فون ملا کر بی بی کی بات کروا دو۔" وہ فون ملا کر مجھے دیتے ہیں۔ "آپ کو اختر نے بتایا ہوگا کہ پہلے گورنمنٹ نے اخبار نکالنے کی اجازت نہ دی اور اب پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔" سروجنی جی نے جواب دیا، "اختر نے کوئی ایسا ذکر نہیں کیا۔ ایک دن رُک کر حیدرآباد مولانا کے پاس چلے گئے۔" میں اس وقت پنڈت پنتھ جی کے پاس بیٹھی ہوں۔ پاسپورٹ لینے آئی مگر آپ کے وزیر اعلیٰ بے بس ہیں۔ آپ یہ کریں کہ ایک تار وائسرائے کو

اپنی طرف سے اور ایک گاندھی جی کی طرف سے اور ایک جواہر لال جی سے بھی بھجوایئے،
پھر آپ تینوں کی بات رد نہ کی جائے گی۔'' سروجنی جی نے شفقت، محبت سے کہا،'' ایک شرط
ہے کہ پاسپورٹ مل جائیں تو دو روز کو 'وردھا' آشرم میں رکتی ہوئی حیدر آباد جانا۔'' دو روز
میں پنڈت جی کی کوٹھی میں دھرنا دیے بیٹھی رہی۔ صبح کو تار سے اجازت مل گئی، شام کو
پاسپورٹ میرے ہاتھ آ گئے۔ رات کی گاڑی سے واپس 'ہردوئی' کے لیے چل پڑی۔
دوسرے دن وردھا کے لیے روانہ ہوگئی۔ یہاں آشرم کا جو حال دیکھا اور گاندھی جی سے جو
بات چیت ہوئی وہ خوب ہی تھی ('ہم سفر' میں پڑھیے گا)۔ دوسری رات حیدر آباد کے لیے
چل پڑی۔ صبح دس بجے جب 'نادر منزل' پہنچی تو مولوی صاحب کی خوشی کی حد نہ تھی وہ سمجھ
رہے تھے کہ گھوم پھر کر ہم اب پھر واپس ان کے پاس آ گئے۔

''پہلے چائے کا ایک دور ہو جائے تو سب حال بتانا۔'' ''اختر کہاں ہیں؟'' ''وہ
باگڑ بلا جس کے پاؤں میں بلی بندھی ہوئی ہے۔ وہ تو اورنگ آباد بھاگ چھوٹا!''

''آپ کو بتایا ہوگا کہ پاسپورٹ نہیں ملے۔'' بولے، ''کیسے پاسپورٹ ایسا کوئی
ذکر نہیں کیا اختر نے۔'' اب میں نے بڑی تفصیل سے مولوی صاحب کو الف سے ی تک
حال سنایا۔ ان کا ہنستے ہنستے برا حال ہوا جا رہا تھا۔ جب بتایا کہ گاندھی جی کہہ رہے تھے کہ
مولانا صاحب ہم سے بہت خفا ہے وہ تو بس اردو کے چکر میں ناگ پور میں ہم سے بہت
حجت کرا، اور آپ کا شوہر تو بہت ہی تیز آدمی ہے۔ اصل میں سنسکرت پڑھ کر دماغ میں بڑی
تیزی آ جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔'' اور جب چپل والی بات بتائی تو مولوی صاحب کے قہقہے
نکل گئے اور جب گاندھی جی نے یہ بتایا کہ ہندو مسلمان سب ایک ہے۔ جھگڑا کیوں کرنا تو
میں نے پوچھ لیا پھر لکشمی پنڈت نے جب سید حسین سے شادی کر لی تو لکشمی جی کو اس وقت تک
بند کروا کر رکھا جب تک ان کے پھیرے نہ ڈلوا لیے، تو کہا، ''ہندو اور مسلمان، بہن بھائی ہیں
شادی کیسے ہو سکتا تھا۔'' اس پر مولوی صاحب بے ساختہ ہنس کر بولے، ''بڈھا کتنا چالاک
ہے جیسے لومڑی ہو۔ مگر ایک بات تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کو ایسی باتیں گاندھی جی سے یا پنڈت
پنتھ سے کرتے کوئی لحاظ نہیں آیا؟'' ''یوں کہ میری نظر میں صرف تین انسان ایسے ہیں جن کا

مجھ پر بڑا رعب پڑا ہوا ہے۔'' ''وہ کون؟'' ''ایک آپ، ایک ابا اور تیسرے اختر۔''
جھٹ سے کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں ''بندہ کورنش بجالاتا ہے۔''

''اچھا یہ سب چھوڑیں اب ذرا یہ پاسپورٹ تو دیکھیں۔ بس اب ہم دونوں چلے ولایت کو، اختر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیں گے اور آپ کی جاہل لڑکی بھی کچھ نہ کچھ ضرور پڑھے گی اور ہاں یہ بتائیے کہ اختر آ کر جب پاسپورٹ دیکھیں گے تو کس قدر خوش ہوں گے؟''

''اب تک تم نے اپنے میاں کو ذرا بھی نہ جانا۔ وہ کچھ بھی خوشی کا اظہار نہ کریں گے کہ تم کہیں، اپنے کو کچھ سمجھنے نہ لگو۔''

''ہاں آپ یہ بتائیں کہ یہ سارا باغ ایسا اتنی جلدی اجاڑ کیوں کر ہو گیا؟ چڑیاں کدھر گئیں؟'' ''اڑ گئیں۔'' ''آپ نے خود پنجرے کھول کر اڑا دیں نا؟ اور آپ اپنے کمرے میں شفٹ کیوں نہ ہوئے؟''

''اب ایسی باتیں کر کے منھ کا مزا خراب نہ کرو۔'' چہرے اور آنکھوں میں اداسی دیکھ کر چپ ہو گئی۔ مولوی صاحب کہنے لگے، ''وہ دونوں لفافے تو تمہارے پاس ہیں نا؟ لاؤ مجھے دو، ان کے میں بینک بھیج کر پونڈ کروا دوں ورنہ روپے وہاں بے کار ہوں گے۔'' اب وہ سیریس ہو کر بولے، ''پہلے یہ بتاؤ کہ سوچا کیا ہے؟ سفر کرتے وقت ٹکٹ لینا پڑتا ہے اس کے لیے روپے درکار ہوتے ہیں۔ پھر ولایت میں رہنے کے لیے بہت سے روپے ہونا چاہیے۔ اس سب کا بندوبست کیا؟'' ''اس کی تو کوئی فکر کی بات نہیں کہ اختر انجمن کا کام کر کے بھیجتے رہیں گے'' اور ''وشوامتر'' اخبار کے لیے لکھیں گے اور میرا تو بندوبست یوں ہے کہ جیسے ہر لڑکی کے والدین کرتے ہیں۔ اگر لڑکی باہر جائے تو ٹکٹ لے کر دیتے ہیں اور پھر سے جیب خرچ ملنے لگتا ہے۔'' ''یہ کس نے بتایا؟'' ''ابا نے۔'' اس پر مولوی صاحب ہنس کر کہتے ہیں، ''ظفر عمر پولیس والے بھی ہیں اور جاسوسی ناول نویس بھی۔'' ''اس کا یہاں کیا تعلق ہے؟'' ''کچھ یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ اختر جس قدر بھی انجمن کا کام کر کے بھیجا کریں گے فوراً اس کی اجرت بھیج دی جایا کرے گی۔ لیکن اب سچ سچ بتاؤ کہ تمہارا خرچ کیسے چلے گا؟'' ''یہ دیکھیے جو ابا نے چھ ماہ کا جیب خرچ اور ٹکٹ کے روپے دیے ہیں۔'' ان کو

دیکھ کر مولوی صاحب کے چہرے پر اطمینان سا نظر آیا۔ اختر شام کو واپس آ گئے ۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے ۔ پوچھا آپ یہاں کیوں آ گئیں؟ یہ پاسپورٹ لے کر ۔ وہی بات سچ نکلی کہ کوئی خوشی کا اظہار نہ کیا بس اتنا کہا، ''یہ بہت اچھا ہوا اب کل ہم کو بمبئی روانہ ہو جانا ہے۔'' مولوی صاحب نے کہا، ''چند دن تو دونوں رُک جاؤ۔''

تین دن بعد پھر ہم دونوں شفیق مولوی صاحب کو اداس چھوڑ کر چل پڑے ۔ جب کیا ہی اچھا زمانہ تھا کوئی روپے پیسے کی ، ویزے ، ہیلتھ سرٹیفکیٹ کی پابندی نہ تھی ۔ بس جیسے ریل یا بس کا ٹکٹ خرید ا جاتا ہے ویسے پانی کے جہاز کے ٹکٹ خریدے اور چل دیے۔ اختر نے بمبئی میں ایک فرنچ ڈکشنری اور دو شروع کی کتابیں جب خرید لیں تو مجھے معلوم ہوا کہ ہم لندن نہیں بلکہ پیرس جا رہے ہیں ۔ پندرہ دن کے سفر کے دوران اپنے کو اختر نے اتنی فرنچ خود پڑھا لی کہ پیرس پہنچ کر اپنی بات سمجھا سکتے تھے اور دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے۔ میری تو حیرت کی حد نہ رہی ۔ یونیورسٹی کھلنے میں ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔

خالدہ ادیب خانم جو ترکی کی مشہور و معروف ہستی تھیں ۔ ہندوستان چند ماہ کے لیے آئی تھیں ۔ والد صاحب اور مولوی صاحب دونوں ہی سے ان کی اچھی ملاقات ہو چکی تھی ۔ ترکی زبان کی بہت اچھی ادیبہ اور اتاترک کمال پاشا کے ساتھ ترکی کی جنگ آزادی میں دوسرے جنگ عظیم کے دور میں شانہ بہ شانہ رہی تھیں ۔ سیاست میں بڑا عمل دخل بھی تھا۔ عرصہ بارہ تیرہ سال سے پیرس میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہی تھیں ۔ ان کو والد صاحب اور مولوی صاحب نے ہمارے لیے خط لکھ دیے تھے، اس عظیم خاتون نے ہمارے ساتھ اور ہمارے بچے کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو صرف کوئی حقیقی ماں ہی کر سکتی ہے۔

پیرس پہنچ کر اختر انجمن کا بہت سا کام بھی کرتے اور ساتھ یونیورسٹی کی تعلیم بھی ۔ کوئی آٹھ ماہ بعد ایک دن بڑی موٹی اور بڑی سی کتاب کا پارسل اختر کے نام آیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ ڈکشنری کی جلد ہے مگر خود نہ کھولی ۔ اختر خود کھولیں اور میں ان کی خوشی آنکھوں سے دیکھ سکوں گی ۔ وہ شام کو آئے جلدی سے کھول کر مولوی صاحب کا پیش لفظ پڑھنے لگے ۔ میں بھی پیچھے کھڑی جھکی اس کو پڑھ رہی تھی اس میں ہر کام کرنے والے کا بڑی تحسین کے ساتھ ذکر تھا

سوائے اختر کے۔ ان کے ہاتھ جیسے کانپے اور ڈکشنری نیچے پاؤں کے پاس گرگئی۔ سامنے سے جوان پر نظر پڑی تو لگا جیسے گرتے ہوئے مجسمہ کا سفید چہرہ ہو۔ میرے اوپر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ پیڈ اور قلم ان کے سامنے رکھ کر کہا کہ ''بس آج سے آپ انجمن کا کام نہیں کریں گے، رازق خدا اور آپ کا علم ہے۔'' جس کیفیت میں وہ اس وقت تھے اتنا لکھ دیا کہ پڑھائی میں مصروفیت کی وجہ سے اب مزید کام نہ کریں گے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

میں نے خالدہ ادیب خانم کو جب یہ سنایا تو مجھ سے کہا کہ وہ اختر سے اس بارے میں بات کریں گی۔ جب اختر ان کے فلیٹ پر مجھے لے جانے کے لیے آئے تو ان کی گفتگو اختر کے ساتھ ہوئی، ''مجھے حمیدہ سے معلوم ہوا کہ جس ڈکشنری پر تم نے ڈھائی سال بڑی لگن اور محنت سے کام کیا اس پیش لفظ میں مولانا نے ہر ایک کا ذکر کیا سوائے تمہارے۔ حمیدہ نے ہمیشہ بنا بنایا حلوہ کھایا ہے وہ تو اس دنیا اور دنیا والوں سے بے پرواہ ہے مگر تم نے تو دنیا میں تھپیڑے کھائے اور ننھی سی عمر سے گرم سرد دیکھا مگر قدم بڑھائے آگے آتے رہے۔ علم کے شیدائی اور قوم و ملک کا دل میں درد بھرتے رہے۔ پھر جس انسان نے تم کو باپ والی محبت دی، استاد کی جگہ بھی لی۔ اس کا دیا ایک کڑوا نوالہ کھاتے وقت ایسے ہو گئے کہ اس سیدھی سادی لڑکی کے کہنے پر خط میں مزید انجمن کا کام نہ کرو گے لکھ ڈالا۔ مجھے تعجب ہے کہ تم جیسا انسان ایسی کمزوری دکھائے، بے سوچے سمجھے خط لکھ دیا، عدنان بے اور مجھ پر نظر کرو کہ آج بارہ برس سے زیادہ ہو گئے اپنے بچوں سے جدا، ملک سے دور جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم کو مصطفیٰ کمال سے کوئی گلہ اس لیے نہیں کہ وہ ہمارے ملک اور قوم میں تازہ تازہ خون کو ہر کسی کی رگوں میں دوڑا رہے ہیں۔ مولانا عبدالحق بھی کچھ ایسا ہی کر رہے ہیں، کسی بھی قوم کی صحت مند زندگی پر زبان سب سے زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ ایسے عظیم لوگ کچھ ذاتی انا یا انسانی کمزوری میں فرد واحد کو نقصان پہنچا بیٹھیں تو اس کو اپنے ملک اور قوم کے آگے ذرا بھی اہمیت نہیں دینا چاہیے اور رہا یہ کہ تم انجمن کا مزید اور کام نہ کرو گے تو میں دیکھوں کہ تم کیسے نہیں کرتے۔ کیا انجمن مولانا کی اپنی ملکیت ہے یا پوری قوم کی، تم جو بھی انجمن کا کام کرو گے اس کا فائدہ اردو زبان کو پہنچے گا اور قوم کو، دوسرے جو بھی اور جتنا بھی انجمن کا کام کرنے کی

تم نے ذمہ داری لی اس کو ذمہ داری کے ساتھ تم کرو گے اور بلکہ کچھ اور بھی زیادہ کر کے دکھانا، تب کوئی بات ہوئی۔ وقتی طور پر جانے کس جذبہ کے تحت مولانا نے اپنے مقام سے دس قدم نیچے کو چلے آئے تو اس کا جواب تمہاری طرف سے یہ ہونا چاہیے کہ تم بیس قدم آگے بڑھاؤ تا کہ وہ تم کو اور بھی زیادہ نظر اُٹھا کر دیکھیں، آج رات سے انجمن کا کام کرنے بیٹھ جاؤ۔'' اختر نے اتنا کہا، ''کاش خانم آپ سمجھ سکتیں کہ مجھ پر کیا گزری۔ میرا تو حبلہ گاہ ہی ٹوٹ گیا۔''
(یہی جملہ اختر نے 'گرد راہ' میں کہیں پر لکھا ہے۔)

لگ بھگ ہر روز تین بجے دوپہر کو خالدہ ادیب خانم ہمارے فلیٹ کے نیچے آتیں میں اوپر سے اُتر آتی پھر مجھے لے کر پیرس کے کسی باغ میں جاتیں۔ کیا کیا اور کیسی کیسی باتیں کیا کرتیں۔ ان کی شخصیت، ان کی شفقت و محبت میرے لیے مولوی صاحب کی طرح تھی۔ ایک دن کہنے لگیں، ''حمیدہ میں نے ڈکشنری کے پیش لفظ کے متعلق اور مولانا کے بارے میں بہت سوچا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انھوں نے ایسا جو کیا تو اپنی اس دلی چوٹ کا اختر سے بدلہ لے لیا جو ان کو اس وقت پہنچا ہوگا جب تم دونوں ان کو چھوڑ کر دہلی آ جاتے ہو۔ انھوں نے ضرور سوچ لیا ہوگا کہ وقت آنے پر اختر کے دل پر خود وہ بھی کوئی کاری ضرب لگائیں گے!! تم جب بھی مولوی صاحب سے ملنا تو ضرور پوچھنا، دیکھ لینا ان کا یہی جواب ہوگا اور پھر اسی دن مجھے خط لکھ کر بتا بھی دینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اختر، مولانا سے کبھی اس بات کے متعلق کوئی اشارہ تک نہ کریں گے۔ جس کا ان کو ملال رہے گا کہ جواب میں وہ یہ نہ کہہ پائیں گے پنچو جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ مجھے چھوڑ کے جاتے وقت احساس ہوا تھا کہ میرا دل کیسے دکھے گا۔

خالدہ خانم کا کہنا واقعی سچ نکلا۔ ہمارے بیس دن کے بیٹے کو اپنے زیر سایہ رکھ کر مجھ کو بھی اختر کے ساتھ لندن بھیج دیا کہ چھ ماہ والا 'مونٹی سری' کا کورس کر لوں۔ بچہ بہت علیل ہو گیا۔ پیرس سے اس کو لندن لائی۔ تین ماہ وہاں کے اسپتال میں رہا اور اس کو لے کر علی گڑھ آ گئی۔ جتنا وہ انجمن کے لیے کام کر چکے تھے دو ہفتہ سفر کے درمیان میں صاف کر، آتے ہی مولوی صاحب کو روانہ کر دیا۔ ان کو لکھا کہ اپریل کی فلاں تاریخ میں آئیں تا کہ کامران کے

عقیقہ میں شرکت کر سکیں اور بچہ کی علالت کا حال لکھا جس پر مولوی صاحب نے حیران ہو کر لکھا کہ ''کامران حسین کدھر سے آ گئے۔ نہ تم نے کبھی لکھا نہ اختر نے۔''

مولوی صاحب چند گھنٹوں کے لیے تشریف لائے اور کہا، ''بہتر ہو کہ میرے پاس آ جاؤ۔'' میں نے کہا کہ ''مولوی صاحب یہ بتائیں کہ آپ کس منہ سے یہ فرما رہے ہیں، اختر کی وجہ سے نا؟'' کہنے لگے، ''اور کیا۔'' میرا یہ جواب تھا کہ ''آپ نے اختر کے ساتھ اس قدر زیادتی کی آپ کا ضمیر جانے کس کس طور پر آپ کو برا بھلا کہتا ہوگا کہ اتنی شفقت، محبت اور قدر دانی کے بعد اس کی اتنی محنت کا صلہ آپ جیسے عظیم انسان اس طرح دیں جس کو ہرگز ایسا کرنا زیب نہیں دیتا۔'' مولوی صاحب کی آنکھیں دھندلا سی گئیں اور چہرہ تمتما گیا۔ مجھے گھور کر کچھ دیر دیکھتے رہے پھر بولے ''اس وقت جب تم دونوں مجھے چھوڑ کر چل پڑے تب یہ سوچنا تھا کہ مجھے کیا دکھ اور تکلیف ہوئی ہوگی؟ میں منع کرتا رہا مگر ایک نہ سنی۔ میں نے اس وقت سوچ لیا کہ اختر کے دل کو اسی قدر ٹھیس ضرور پہنچاؤں گا۔'' تو یہ مولوی صاحب آپ نے تو بچوں والی بات کی۔ ہمارا آپ کے پاس سے جانا کسی مقصد کے لیے کچھ برا نہ تھا۔ لیکن آپ جیسے عظیم ادب پرور، مفکر اور عالم ہستی کے لیے یوں حق تلفی کرنا اپنے آپ کو داغ دار کر لینے کے برابر ہوا۔ گو اختر ہرگز آپ سے خود نہ گلا کریں گے نہ شکوہ۔ آپ نے ان سے ایک باپ کو چھین لیا، ان کو تو زندگی میں پہلی بار باپ جیسی شفقت اور گھر ملا تھا جس کو کیا ہی بچکانہ انداز میں آپ نے ڈھا کر رکھ دیا۔'' مولوی صاحب کا سر کچھ دیر کے لیے جھک سا گیا۔ آنکھوں کی نمی کو چھپانا شاید مقصود تھا۔ بولے، ''تم تو ہمیشہ میرے ساتھ جھگڑے کرتی رہی ہو۔ اصل میں مجھے کہا ہی نہ تھا کہ میرے ساتھ چلو۔'' میں ان کے گلے سے لگ گئی اور رو پڑی تو وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ بھلا وہ آنسو کب برداشت کر سکتے تھے مجھے ہنسانے کے لیے وہی اپنے ٹیپ کے بند پڑھے:

جو کوئی ہم سے سیدھم سادھا
ہم بھی اس سے سیدھم سادھا
جو کوئی ہم سے ٹیڑم ٹاڑھا
ہم بھی اس سے ٹیڑم ٹاڑھا

اب ہم دونوں ہی ہنس پڑے اور ان کو بتایا کہ آج ہی خالدہ خانم کو خط لکھ کر آپ کی باتیں بتانا ہیں۔ انھوں نے مجھے تاکید کر دی تھی کیوں کہ انھوں نے بالکل یہی کہا تھا کہ جب پوچھوگی تو مولانا یہ کہیں گے کہ اس سے مراد اختر کے دل کو ٹھیس لگانا تھی۔ مسکرا کر بولے، ''خانم بڑی دور بین اور انسان شناس ہیں۔''

جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ انجمن کے کام کا روپیہ جو وہ بھیجتے تھے وہ غدر بود ہونے لگا۔ خط آنے بھی بند ہو گئے جس سے وہ قدرے پریشان ہوتے، میری پریشانی کا بھی خیال، تسلی بخش خط لکھتے۔

اختر ۱۹۴۱ء مارچ میں واپس آگئے۔ ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ مولوی صاحب دہلی سے یہاں کبھی کبھی ہمارے گھر آتے رہے۔ لڑکوں کی ضدوں کو جب اختر کو فوراً پورا کرتے دیکھتے تو خوب ہنس کر کہتے، ''یہ بڑے ہو کر اس کو ٹھیک کریں گے۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔'' میں ہر بار کہتی، ''خدا کے لیے مولوی صاحب یوں تو نہ کہا کریں۔''

ایک بار نواب لیاقت علی خاں کی دعوت پر مجھے کھڑا دیکھ کر ہاتھ میں پلیٹ لیے پاس آکر کہنے لگے، ''یہ دیکھو بھیک کا ٹھیکرا لیے ہوئے ہوں۔ (کھڑا کھانا تھا۔ سب ہی ہاتھوں میں پلیٹ لے کر کھانا لے رہے تھے) اور یہ تو دیکھو کہ دہلی میں اور یہاں جب بھی کسی انجمن کے کام کے لیے میں نے اختر سے ایک فون کر کے بلا کر کہا ہمیشہ اوّلین اہمیت دے کر اس کو کروا دیا مگر اب تک ایک بار یہ نہ پوچھا کہ ڈکشنری کے معاملہ میں میں نے ان کے ساتھ زیادتی کیوں کی؟'' ''میں نے تو برسہا برس پہلے آپ سے کہہ دیا تھا کہ اختر آپ سے کبھی کچھ خود نہ کہیں گے۔'' کڑوی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''اینٹھو خاں جو ٹھہرے!''

کراچی میں جب یہ سنا کہ مولوی صاحب بہت علیل ہیں اور بہت کمزور ہو گئے ہیں اور بالکل ہی کمرے میں لیٹے رہتے ہیں تو فوراً ہی ان کو دیکھنے کے لیے ان کی قیام گاہ کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی۔ میں نے اس شیر جیسے انسان کو کتنا ہراساں اور بے بس پایا کہ مجھے رونا آنے لگا۔ وہ آب دیدہ ہو گئے۔ میرے اس کہنے پر کہ آپ میرے ساتھ چلیں،

کمرے میں ملازم تھا اس سے کہا، ''جاؤ چائے بنا کر لے آؤ۔'' پھر جواب دیا، ''بھلا میں کہاں جا سکتا ہوں، میں تو ایک قیدی ہوں، پھر اگر انجمن کو چھوڑ کر جاؤں تو جو میری نادر کتابیں ہیں اور قلمی نسخے باقی رہ گئے وہ بھی شاید نہ رہیں۔'' میں سوچ میں پڑ گئی کہ مطلب کیا ہے؟ یہ عظیم انسان، محسن قوم و زبان اردو کسی کے قیدی ہو سکتے ہیں؟ ان کے چہرے پر تو میں نے ہمیشہ ہنسی دیکھی تھی میں یہ یہ والا چہرہ اور یہ دھندلی اور پپوٹے پھولی آنکھیں برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ان کو ہنسانے کے لیے میں نے حیدر آباد کی کچھ باتیں پوچھ ڈالیں جن کو وہ ہمیشہ ٹال جاتے تھے کہ وہ کیا باتیں تھیں؟

''اچھا اب اچھی اچھی باتیں کریں گے۔ اپن دونوں،'' وہ اب بتا دیں تا کہ آخر وہ 'چندن گوہ' ہمارے کمرے میں آپ نے کہاں سے اور کیوں کر داخل کیے تھے؟'' مسکرانے لگے، آنکھوں میں کچھ چمک سی ہو گئی۔ ''اچھا وہ۔ ہوا یوں تھا کہ آفس میں بیٹھا تھا۔ ایک صاحب ملنے آئے۔ وہ یہ سوچ کر کہ ان دنوں جانور اور پرندوں کا مجھے شوق ہو گیا ہے بتایا کہ کل ان کو ایک عجیب سا جانور پہاڑیوں میں ملا جس کو وہ کسی طور سے جکڑ جکڑا کر ایک بڑے سے بکس میں بند کر لائے ہیں۔ اس کا جسم تو دو فٹ ہے جیسے گرگٹ ہو اور دم مچھلی جیسی تین فٹ کی ہو گی۔ بس نایاب ہے۔ اس کی خصلت ہے کہ دن بھر چپ چاپ پڑا رہے گا مگر رات کو شکار کرنے نکل جاتا ہے اور دم ایسے ادھر اُدھر گھما کر مارتا ہے کہ یوں آواز آتی ہے جیسے کوئی زور سے ہنٹر کا پٹاخا کر رہا ہو۔ جب ان سے پوچھا یہ کیا کھاتا ہے؟ تو بتایا کہ مینڈک، گرگٹ اور چھپکلی وغیرہ۔ زو والے اس کو خریدنے کو تڑپ اُٹھے مگر میں نے سوچا کہ پہلے آپ سے پوچھ لوں اگر آپ رکھنا چاہیں تو حاضر کر دوں۔ ان کو اپنا کوئی کام مجھ سے کروانا تھا۔ میں نے اس خیال سے ہاں کر دی کہ اس کو برآمدے میں چڑھنے کے لیے کچھ گوشت کے ٹکڑے رات کو ڈال دوں گا اور جب وہ سٹاسٹ اپنی دم سے آوازیں نکالے گا اور تم دونوں ڈرو گے تو اچھا تماشا رہے گا۔ ان سے کہا کہ بعد مغرب میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس وہ بکس رکھ جائیں۔ محبوب سے کہا کہ 'لاما' رات کو بہت بھوکا ہوتا ہے کمرے کے پاس آ کر 'میاؤں میاں' سے سونے نہیں دیتا ایک پیالے میں چھوٹی چھوٹی بوٹیاں رکھ دے۔

جب یقین ہوگیا کہ تم دونوں سو گئے ہو تو پاس جا کر بکس کا ڈھکن کھول کر نیچے بوٹیاں ڈالیں سیڑھیوں پر اور برآمدے میں رکھیں۔ وہ سیدھا نکل کر گوشت کھاتا ہوا جب برآمدے میں آ گیا تو میں نے اپنا دروازہ بند کرلیا، وہ دم کو شپاشپ، تڑاخ تڑاخ کرتا پھرا، پھر تمہارے کمرے کے اندر۔ دروازہ ذرا سا کھول کر چاندنی رات میں میں نے دیکھا کہ وہ اندر چلا گیا۔ تم چیخ چیخ کر ''مولوی عبدالحق'' کہہ رہی ہو اور میں برآمدے سے پکار پکار کر کہتا جاتا کہ ''نیچے قدم نہ اتارنا میں نوکروں کو بلا کر لاتا ہوں۔ پھر کس مشکل سے اس کو واپس بکس میں بند کیا گیا اگر تب میں بتا دیتا تو وہ باگزبلا مجھے کھانہ جاتا۔'' ہم دونوں ہنسنے لگے۔ چائے آئی جب پی چکی تو کہا اب جاؤ۔ یوں میں ان کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ کر واپس آ گئی۔ میرا دل ان کے الفاظ سے کیسا دکھی ہوا سوچوں کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے ایسے عظیم اور قوم کے محسن کو قیدی ہونے کا احساس دلایا ہوا ہے؟ رات کے جہاز سے صومالیہ چلی گئی۔

۱۶راگست ۱۹۶۱ء کو ریڈیو پر خبر سنی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتقال ہوگیا۔

ہم دونوں پر جیسے بجلی گر پڑی ہو۔

کسی بھی قوم اور ملک کی شناخت اس کی زبان ہی سے ہوتی ہے۔ بابائے اردو کے احسانات جو پاکستانی قوم اور ملک پر ہیں وہ انشاءاللہ رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ اردو زبان آج جو دنیا کے ہر ملک میں اپنا پاؤں جما رہی ہے تو یہ وہی پودا ہے جس کی آب پاشی مولوی صاحب نے اپنے خونِ جگر سے کی۔ ہزاروں کو فیض یاب کرتے رہے اور اپنی اردو زبان کے شیدائی سپاہی انھوں نے ہی تو بنائے۔ ہزاروں کو زندگی کے گزارنے اور کچھ اردو زبان کے لیے کرنے کا ڈھب سکھا کر نسل در نسل اس سلسلہ کو جاری اور ساری رکھنے کے لیے تیار کیا۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا خیال بھی آیا کہ اب وہ شاید جنت میں بیٹھ کر بھی اپنی انجمن ترقی اردو کے لیے کام میں مصروف رہتے ہوں گے۔

اس علم دوست، اردو زبان کے عاشق اور انسان دوست کو میرا باادب سلام فرشتے پہنچا دیں۔ اے کاش پھر کبھی اب ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے محسن اور عظیم علم دوست کو آخری وقت دکھی دل سے دنیا سے رخصت کریں۔

حواشی:

۱۔ والد ظفر عمر مرحوم کی عادت تھی کہ اپنے ہر بچے کے خطوں کی فائل بنا کر رکھتے تھے اس خط کو بھی میں نے ان کی فائل میں دیکھا۔

۲۔ یہ خط بابائے اردو نے اپنے قلم سے انگریزی میں لکھ کر ٹائپ کروا کر بھیجا تھا۔

۳۔ میرے والد صاحب نے ایک ماہ قبل ہزار روپے کا ایک چیک مولوی صاحب کو یہ لکھ کر بھیج دیا تھا کہ اختر کا سوٹ اور شیروانی وغیرہ بنوا دیں۔ اس چیک کے چار ٹکڑے کر کے واپس بھیجا کہ تم نے مجھے اختر سے شرمندہ کیا۔ وہ خود نہیں بنا سکتے۔ سوچ لیا ہوگا کہ وہ بھی ظفر عمر کو شرمندہ کریں گے۔

۴۔ اختر کا ایک افسانہ ''میرے خوابوں کا مندر''۔

۵۔ اختر کا یہ افسانہ ''زبان بے زبانی'' جس کو پڑھ کر بہت اثر ہوا اور یہ ہی ہماری ملاقات کا سبب بنا۔

۶۔ اس کی تفصیل ''ہم سفر'' میں جو مجھ سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے جانے کیوں کر اور اور کیوں قلم بند کروالی، ملے گی۔

۷۔ بڑی تفصیل سے اس کا ذکر ''ہم سفر'' میں کیا گیا ہے۔

۸۔ والد صاحب نے اپنے پہلے جاسوسی ناول ''نیلی چھتری'' ہی کے نام پر کوٹھی کا نام رکھا تھا۔

○○○

قرۃ العین حیدر
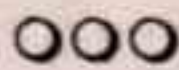
سید سجاد حیدر یلدرم

جو مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں یلدرم پر مضمون لکھوں، یہ میرے لیے ایک بڑا مرحلہ ہے۔ شخصیت نگاری، خصوصاً ان شخصیتوں کے متعلق کچھ لکھنا جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں، ایسے بھی بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ موت اور زمانے کا وقفہ، یہ دونوں چیزیں ایک دھند لکے میں انسان کو چھپا دیتی ہیں، اور عموماً یہ دھند لکا ذرا فاصلے سے بڑا رومانی اور خوب صورت دکھلائی پڑتا ہے۔ جب کبھی ہم اپنے مرحوم بزرگوں، عزیزوں یا اپنے بڑے لوگوں کو یاد کرتے ہیں تو بہت ہی ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کے لیے قلم اُٹھایا جاتا ہے۔ کچھ ان ہستیوں کے لیے عقیدت ہوتی ہے کچھ ان گزرے زمانوں کے لیے نوسٹلجیا جن میں یہ لوگ زندہ تھے۔ پھر ان خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اَب ناپید ہیں۔ طرح طرح کے مضمون ہوتے ہیں۔

آج کل یوں بھی ہوتا ہے کہ اس طرح اپنے کرداروں کو متعارف کیجیے جس سے ظاہر ہو کہ آپ ان کی کمزوریوں اور خامیوں کا مذاق اڑا کر دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہیں۔ گویا شخصیت نگاری بھی رہی اور 'ممدوح' پر ایک قسم کی ایکٹوٹی بھی ہو گئی۔

پھر اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک انجمن توصیف باہمی قائم کی جاتی ہے اور ایک دوسرے پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔

یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر بہت دلچسپ ہیں، لیکن اب کے اس رسالے میں اردو کے ان بڑے ادیبوں کے متعلق بھی تذکرہ کیا جا رہا ہے، جن کو ہم واقعتاً احترام کی نظروں

سے دیکھتے ہیں اور جو اَب ہماری محفل سے اُٹھ کر جا چکے ہیں۔ یلدرم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں ہم ایک چلتا پھرتا خاکہ نہیں لکھ سکتے اور یلدرم کے متعلق مضمون لکھتے ہوئے میں پوری کوشش یہ کروں گی کہ جو کچھ ان کے بارے میں آپ کو بتلاؤں اس میں محبت کا وہ عنصر نہ آنے پائے جو تصویر کو اسی رومینٹک دھندلکے میں چھپا دیتا ہے۔

لیکن لکھنا شروع کرنے سے ایک پریشان کن سوال پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کتنا ہی objective مضمون لکھوں، پر چوں کہ یلدرم کے پورے کردار میں کہیں پر بھی کوئی چھوٹی سی غیر اہم خامی یا کمزوری نہ تھی اس لیے مضمون پھر لامحالہ مبالغہ آمیز معلوم ہوگا۔ ایسے فرشتہ صفت قسم کے انسانوں کے بارے میں کچھ لکھنا واقعی بہت دشوار ہے۔

فرشتوں کی تصویروں میں رنگ نہیں ہوتا۔ محض نور ہوتا ہے جو اتنا دلچسپ نہیں۔ نور سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ رنگ فانوس ایسے دلچسپ اور دل کش ہوتے ہیں۔

مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ یلدرم کی تصویر میں رنگ بھی ہیں۔ کیوں کہ چودھری محمد علی ردولوی کی مانند یہ بھی ایک پورے زمانے، پورے دور کے نمائندے تھے۔ روایت کو نبھانے کے لیے میں بھی 'حالاتِ زندگی' سے مضمون شروع کر رہی ہوں اور اس لیے بھی کہ خاندانی اور معاشرتی پس منظر کو اجاگر کیے بنا یہ اندازہ نہ ہو سکے گا کہ یلدرم میں یہ خصوصیات کہاں سے آئیں؟

یلدرم کے خاندان کو ان سب چیزوں پر بڑا فخر تھا جو ایک زمانے میں انسانیت کا اعلاترین معیار سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی کلچر اور شرافتِ نفس۔ (اس کے علاوہ ان لوگوں کو اپنے نہایت کھرے قسم کے سید ہونے پر بھی سخت ناز تھا) سید حسن ترمزی یلدرم کے لگر سگر دادا تھے جو وسط ایشیا سے ہندوستان آئے۔ ترمز آج کل سویٹ ترکستان میں ہے، صدیوں تک اس گھرانے میں علم کی وراثت ایک نسل دوسری نسل کے ہاتھ سونپتی گئی۔ یہ سب عالم لوگ تھے۔ روایتی قسم کے مولوی اور کٹھ ملا نہیں تھے۔ لہٰذا علمیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی لہر بھی قائم رہی۔ زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ بیبیاں بھی پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ اسی گھرانے کی ایک بی بی سیدہ اُمِ مریم نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سیدہ اُمِ مریم کی بٹیا یلدرم کی ماں تھیں۔

یہ زمین دار لوگ تھے۔ دربار مغلیہ میں سہ ہزاری، پنج ہزاری منصب دار وغیرہ رہے (واضح رہے کہ فیوڈل خاندانوں کی Legend کے لازمی عناصر ہیں۔ دربار، جاگیریں، شعروشاعری۔ لیکن اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ معاشرے کی تہذیبی اقدار کو انھوں نے اپنے وجود سے کیا فائدے اور کیا نقصانات پہنچائے۔) غدر ۱۸۵۷ء میں یلدرم کے دادا میر احمد علی نے زور شور سے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ لہٰذا جاگیریں ضبط ہوئیں اور زوال آیا اور نئی پود کو انگریزی پڑھنا اور سرکاری ملازمتیں کرنا پڑیں۔ (یہ بھی کہانی کا طے شدہ مکمل پیٹرن ہے۔ لکھنؤ، دلی اور سارے اتر پردیش کے اَن گنت مسلمان خاندانوں کی ساری داستان مختصراً یہی ہے۔ محض ناموں کا فرق ہے) یہ انگریزی پڑھنے اور انگریزی کی ملازمت کرنے والے یلدرم کے باپ اور چچا تھے۔

یلدرم کے باپ خان بہادر سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی یعنی یلدرم کے چچا خان بہادر ڈاکٹر سید کرار حیدر یوپی میں سول سرجن تھے اور انیسویں صدی کے آخر میں صوبے کے مشہور ڈاکٹروں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں گھوڑے سے گر کر ان کا انتقال ہوا۔

یلدرم ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گنگا کے کنارے کھیلنے کودنے میں گزارا۔ بہت نارمل قسم کا پرانے فیشن کا ان کا بچپن رہا ہوگا۔ یعنی ایسا بچپن جس میں ابھی بڑوں پر چائلڈ سائیکولوجی کے اسرار و رموز کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ یلدرم کے باپ جن کے رعب اور دبدبے سے سارا بنارس تھر تھر کانپتا تھا اپنے بچوں کے لیے ان کے رفیق بھی تھے اور فلاسفر بھی۔ انھوں نے اپنی اولاد کو سب سے پہلا سبق یہ پڑھایا کہ دوسروں کی دل آزاری عظیم ترین گناہ ہے۔ یلدرم اور ان کے تینوں بھائیوں کی زندگیاں اس نصیحت کی کامل تفسیر ہیں۔

سید جلال الدین حیدر ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے جاگیردارانہ پس منظر اور خود اپنے وسیع اختیارات اور اقتدار کے باوجود ان کے مزاج

میں کسی قسم کا تکبر یا رعونت نہ تھی۔ ان کی پُرشکوہ شخصیت، انصاف پسندی اور کٹر اصول پرستی کی وجہ سے لوگ ان سے خائف رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شفقت، نیکی اور دردمندی کی وجہ سے عوام کو ان سے بے اندازہ محبت بھی تھی۔ ان کی زندگی ہی میں بنارس میں انھیں مہاتما اور دیوتا سمان سمجھا جاتا تھا اور ساتھ ستر برس گزرنے کے باوجود آج بھی وہاں ان کا نام ایک طرح کی تقدیس اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

جب یہ بچے بڑے ہوئے تو خان بہادر صاحب نے انھیں علی گڑھ بھیج دیا اور یلدرم اور ان کے بھائی ایم۔اے۔او کالج میں داخل کیے گئے۔

سجاد حیدر یلدرم کی زندگی کے واقعات آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے والے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری عمر بہت خاموشی اور نرم روی سے گزاری۔ 'انا' ہم سب کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ بعض دفعہ یہ کمزوری بہت کارآمد ہوتی ہے۔ ورنہ کوئی کلاکار اپنا اظہار نہ کرتا۔ (لیکن زیادہ تر یہ 'انا' یا بقول مولانا ابوالکلام آزاد 'ایغو' کس قدر کھل جاتا ہے اور دوسروں کے لیے کتنا صبر آزما ثابت ہوتا ہے) بہرحال یلدرم میں یہ انوکھا پن تھا کہ آرٹسٹ ہونے کے باوجود ان میں اس 'ایغو' کا فقدان تھا اور اس وجہ سے انھیں زندگی میں بہت نقصان اُٹھانا پڑے۔

اس Humility پر ہمیں قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں نے بہت کچھ سکھانا چاہا ہے، اور بڑے انسان کی سب سے بڑی نشانی یہی ہے۔

۱۹۰۱ء میں یلدرم نے بی۔اے کیا اور سارے صوبے میں سیکنڈ آئے (اس زمانے میں علی گڑھ کالج الٰہ آباد یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ یہ ریاضی میں بے حد کمزور تھے۔ اس لیے ایک مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سارے صوبے میں فرسٹ آئے لیکن ریاضی میں فیل ہو گئے۔ اس زمانے میں ریاضی انٹرمیڈیٹ کے لیے لازمی مضمون تھی۔[۱])

یلدرم یونین کے سکریٹری اور پریزیڈنٹ رہے۔ تقریر بہت عمدہ کرتے تھے۔ لباس ہمیشہ انگریزی اور بہت اعلیٰ درجے کا پہنتے تھے۔ مولانا محمد علی ان کے کلاس فیلو تھے۔ اس زمانے میں ایک اور دوست عبدالرحمٰن صدیقی[۲] علی گڑھ آن پہنچے۔ لکھنؤ کے چودھری

نعمت اللہ بھی اسی کلاس میں تھے۔ انھوں نے بعد میں قانون میں بہت نام پیدا کیا۔ آج سے نصف صدی قبل کے علی گڑھ کے ان مشہور "کھلنڈروں" کی زندگی بہت دلچسپ اور بھرپور رہی ہوگی۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہمیں یلدرم کی مشہور طویل نظم "مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں" میں ملتی ہے، جو انھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں لکھی تھی:

ایک صاحب اودھ میں رہتے تھے | مرزا پھویا سب ان کو کہتے تھے
کیا کہوں تھا کہاں چمن ان کا | لکھنؤ تھا کبھی وطن ان کا
گھر سے نکلے نہ تھے تمامی عمر | ساری بھونرے ہی میں گزاری عمر
خیر سے تھا ابھی شباب شروع | عمر کا بیسواں تھا باب شروع
چین تھا دن کو لطف راتوں میں | وقت کٹتا تھا یوں ہی باتوں میں
کہ فلک ہوگیا خلل انداز | تجھ سے سمجھے خدا ارے دم باز

وہ یوں ہوا:

قوم میں سب سے اعلیٰ و اولےٰ | محسن الملک، محسن الدولہ
دردِ قومی کے اس معالج نے | یعنی سکریٹری کالج نے
سارے شہروں کا جب کیا دورہ | لکھنؤ بھی مشرف اس سے ہوا
دھوم تھی اک فصیح آیا ہے | نیچری فوج ساتھ لایا ہے
وقت تقریر اس کا طرزِ بیاں | کہ شرر بارگاہِ نور فشاں
جادو کرتا ہے سحر کرتا ہے | مہر کرتا ہے قہر کرتا ہے

جب ہوئے دوست ان کے سارے بضد
تب تو مرزا کے والدِ ماجد
جا کے جلسے میں خود شریک ہوئے
کر گیا ان پہ جادو اپنا کام
ایک دم یہ تہیا کر بیٹھے
بس علی گڑھ میں مرزا جا کے پڑھے

چنانچہ مرزا پھویا علی گڑھ بھیج دیے گئے۔ جو کچھ ان پر وہاں بیتی اس کے بعد:

اک عریضے کی یوں بنا ڈالی — قبلہ ام مدظلہ العالی
اوّلاً مجرا عرض کرتا ہوں — حال پھر اپنا عرض کرتا ہوں
ہو کے رخصت جناب سے پہنچا! — کیا کہوں اس جگہ پہ کیا دیکھا
یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا — ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا!
جنس ہر اک نئی، دکان نئی — اور تو اور، ہے زبان نئی
بو تلعم کی ہو ذرا سی بھی — اس کو کہتے ہیں یاں پہ عیاشی
عطر میں گر کبھی جو کپڑے بسائیں — فوراً عیاش آپ کہلائیں
دوڑتے، کودتے، اچھلتے ہیں — بھول کر بھی نہ سیدھے چلتے ہیں!
کوئی مارے چھلانگ تو یہ خوش — ٹوٹ جائے جو ٹانگ تو یہ خوش

ہوگئی میری جان بھی بیکل
جب وہ چیخے 'بریک ان ٹو ڈبل'

چند اور شکایات کے بعد خط کے آخر میں:

اس لیے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبیہ دیا سلائی کی — پڑیا اک نیلی روشنائی کی
اک برش جوتا صاف کرنے کا — اور برانگو بھی ساتھ تھوڑا سا
دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

سر عبدالقادر مرحوم نے کہیں پر ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے جب یہ ابھی مدیر مخزن نہ تھے اور کسی انگریزی اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور یلدرم ابھی بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی یلدرم سے پہلی مرتبہ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے یہاں علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ حاجی صاحب نے سجاد سے میرا تعارف کرایا۔ جب میں حاجی صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے آیئے میں آپ کو ایک دلچسپ چیز دکھاؤں۔ آپ شبلی غم زدہ کو مشق سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟ مولانا شبلی اس

وقت حاجی صاحب کے مہمان تھے اور اسی بنگلے کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں سے جھانک کر انھیں دیکھ سکتے تھے پر وہ ہمیں نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا کبھی اس کا ایک سرا منھ کے قریب ہوتا تھا جیسے فکر سخن میں ہیں۔ معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کو اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک جائز یا مناسب تھا۔ مگر اس کا کبھی افسوس نہ ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی، اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے بہت بھایا کہ مولانا کو فکر سخن کرتے دیکھنے سے ان کو جو لطف آیا اس میں انھوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔ مولانا شبلی اپنے شاگردوں میں غم زدہ کے نام سے اس لیے مشہور تھے کہ وہ فارسی اشعار میں اپنے نام کے ساتھ 'غم زدہ' لکھا کرتے تھے۔

علی گڑھ ان دنوں گویا آکسفورڈ کا موڈل بنا ہوا تھا۔ تھیوڈور بک پرنسپل تھے۔ آرنلڈ اور نکلسن انگریزی کے استاد تھے۔ پروفیسر چکرورتی اور ڈاکٹر ضیاء الدین ریاضی پڑھاتے تھے۔ مولوی عباس حسین عربی کے استاد تھے اور مولانا شبلی فارسی پڑھایا کرتے تھے۔

یلدرم فارسی میں بہت اچھے تھے۔ لہٰذا شبلی کے بہت پسندیدہ شاگردوں میں سے تھے۔

خوش حال خاندانوں کے لڑکے جو یہاں سے نکلتے ان کو اب مسلمانوں کے نئے معاشرے کی قیادت کرنا تھی۔ جداگانہ مسلم سیاسی پلیٹ فارم کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ (علی گڑھ درس گاہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے دس سال قبل قائم کی جا چکی تھی) وائسرائے اور گورنر صاحبان آ کر اسٹریچی ہال میں ان نوجوانوں کو خطاب کرتے۔ ان کی تقریروں میں مسلمان قوم کی بے اندازہ تعریفیں ہوتیں۔ پھر یہ نوجوان باہر آ کر سول سروسوں میں لیے جاتے۔ وائسرائے ہند سے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات اور تقسیم بنگال وغیرہ کے مسائل پر گفت و شنید کرتے۔

یلدرم کے سامنے بھی یہی راستے تھے۔ یا یہ قانون پڑھنے کے لیے ولایت جاتے، واپس آ کر بیرسٹری کرتے۔ ہائی کورٹ کے جج بنتے یا قوم کی قیادت کرتے اور آخر میں کسی

ہندوستانی ریاست کے دیوان بن جاتے۔ ان کے گھر والوں کے سامنے بھی یہی پروگرام تھا، لیکن اس کے بجائے آپ ایک سہانی صبح بغداد بھاگ لیے اور کئی سال تک سلطنت عثمانیہ اور مشرقی یورپ میں گھومتے رہے۔

زمانہ طالب علمی سے ان کو ترکی سے ذہنی لگاؤ ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں ہی انھوں نے ترکی زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ بی۔اے کے بعد ابھی یہ علی گڑھ میں ہی مقیم تھے اور ایل ایل بی کے لیے پڑھ رہے تھے جب برطانوی فارن آفس سے کسی نے ان کے ایک انگریز پروفیسر کو لکھا کہ بغداد کے برطانوی قونصل خانے کے لیے ترکی زبان کے ترجمان کی ضرورت ہے۔ پروفیسر نے ان سے ذکر کیا۔ آپ نے ترکی پہنچنے کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً چل کھڑے ہوئے۔

اسی زمانے میں انھوں نے ترکی ادب کی طرف توجہ کی، ۱۹۰۲ء میں انھوں نے احمد حکمت کے ایک ''ثالث بالخیر'' کا ترجمہ کیا۔ کتاب کے شروع میں ۱۴راگست ۱۹۰۲ء کی تاریخ کے ساتھ 'التماس مترجم' کے عنوان سے یہ سطور یلدرم نے لکھیں:

> ''میں اس ترجمے کو بہت دھوم دھڑکے سے پیش نہیں کرنا چاہتا اور نہ اس جرم کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے ناول کا ترجمہ کیا اور اس طرح پبلک کے مذاق کو ایک مضر شے کی طرف راغب کیا۔ قصوں کے ترجمے آج کل بہت ہو رہے ہیں مگر سب انگریزی سے، اور اس کے عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی سے بھی کس قسم کے ناولوں کے ترجمے ہو رہے ہیں۔
>
> میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصل نقشہ بھی ہمیں نظر آجائے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کی میں اردو میں اس لیے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش

آ رہا ہے وہ انھیں بھی پیش آ چکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے
معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب
کہاں ہیں۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا مگر ترکوں کا
طرزادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرزِ تحریر کا
ایسا معقول میل ہے کہ میں نے لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے۔ گفتگو
انوکھی تو ضرور ہے لیکن سنیے تو سہی:

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اس وقت یلدرم کی عمر کوئی اکیس یا بائیس سال کی تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے
اور دوسرے نوجوانوں نے 'مخزن' میں لکھنا شروع کیا۔ 'مخزن' کا یہ ابتدائی دور اردو جدید تاریخ
میں بہت اہم حیثیت کا مالک ہے۔

بیسویں صدی کے اوّلین برسوں میں جیسے یہ ایک نئی صبح ہو رہی تھی جس کے اجالے
میں نئی نئی چیزیں منظر میں نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ ملک میں ایک نیا دور (نہایت بے ہودہ
لفظ ہے) مطلب یہ کہ ایک عہد نو (لاحول ولاقوۃ) شروع ہو چکا تھا۔ یہ بالآخر ایڈورڈین
عہد تھا۔ ادب کے میدان میں بڑی گہما گہمی تھی۔ انگلستان کے ادب میں اس وقت امپریلزم،
سوشلزم اور Aestheticism کی دھارائیں ساتھ ساتھ بہہ رہی تھیں۔ ایک طرف
کپلنگ صاحب جو تھے وہ Rule Britannia کے نغمے پر سر دُھن رہے تھے۔ دوسری
طرف برنارڈ شا اور ان کی سوسائٹی کی اشتراکیت کا تصور دماغوں پر رفتہ رفتہ قبضہ جما رہا تھا۔
ساتھ ساتھ ڈبلو بی ایٹس کی مشرقی اور کیلٹک اسرار پسندی اور آئرش قوم پرستی کا چرچا تھا
او سکر وائلڈ اور ان کے ساتھی جمالیات کے نظریوں کی موشگافی میں جٹے ہوئے تھے۔
جی۔ ایم ہوپکنز جدید شاعری کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ پیرس میں الگ اودھم مچی ہوئی تھی۔
جدیدیت کے سارے نئے 'ازم' تہلکہ بپا کر رہے تھے۔ دوسری طرف مقدس سلطنت روس
میں مہاتما تالستائی نے تھک کر آخر میں یہ سوال کیا تھا کہ ''اب کیا کرنا چاہیے؟'' اور ''خود سوچو
اور جواب دو۔'' اور ایک نیا نام سامنے آ چکا تھا... میکسم گورکی۔

گھر پر، بنگال میں عظیم ناول لکھے جا رہے تھے۔ ٹیگور نے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس سے ہمارے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کو کون بڑے فن برائے زندگی کی ضرورت تھی۔ انھوں نے آئیڈیلزم کو اپنایا۔

اسی وقت یلدرمؒ نے لکھنا شروع کیا تھا۔

یلدرم کی رومانیت خالص مغربی (اور ترکی) رومانیت تھی۔ انھوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ چلمن کے پیچھے سے جھانکنے والی سرشار کی سپر آرانہ تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہمراہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انھوں نے اپنے قصوں کی لڑکیوں کو لکھنؤ اور دلّی کی حویلیوں کی چہار دیواری سے نکال کر بمبئی کی چوپاٹی پر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنے کی تمنا کی۔ اسی لیے انھوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس وقت ایران اور مصر بہت ہی پس ماندہ تھے۔ ترکی میں یورپین اقوام کے قرب کی وجہ سے زندگی کی لہر زیادہ تیز ہو چکی تھی۔ یلدرم نے جن ترکی ڈراموں کا ترجمہ کر کے ان کی ہیروئینوں کو اردو پڑھنے والوں سے روشناس کرایا (زہرا، حمرا، قمرا، بہیجہ وغیرہ) ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یلدرم کی آئیڈیل لڑکیاں تھیں۔ یہاں پر میں سر عبدالقادر مرحوم کی تحریر پھر نقل کرتی ہوں جس سے آزادیِ نسواں کے بارے میں یلدرم کے خیالات کا کچھ پتہ چلے گا۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

> "۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا حالی تھے اور سجاد حیدر بھی اس میں شریک تھے۔
> ایک دن جب جلسے کے بعد اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد آتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کئی ایک چکر اپنے گرد لگائے جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں۔ مجھ سے کہنے لگے۔ کچھ نہ پوچھیے میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے پوچھا کچھ بتاؤ تو کیا دیکھا ہے۔ کہنے لگے ایک ایسی خاتون[۵] سے مل کر آ رہا ہوں جو آزادی کی حامی ہیں اور خود آزادی پر عامل ہیں۔"

بغداد کے بعد ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے میں ہوگیا۔ یہاں یلدرم ترکی کے نئے ادب کی تحریک اور نئے لکھنے والوں اور سیاسی انقلابیوں کے بہت قریب رہے۔ اسی زمانے میں نوجوان وطن پرستوں نے ینگ ٹرک پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ یلدرم خود بہت پکے انقلابی تھے۔ یہ برطانوی فارن آفس کے ملازم تھے اور غلام آباد ہند کے باشندے تھے، لیکن عالم یہ تھا کہ ینگ ٹرک پارٹی کی اوّلین میٹنگ آپ کے گھر پر ہی منعقد کی گی اور خفیہ پولیس اور جاسوسوں کی نگرانی کے باوجود مستقل انڈر گراؤنڈ قسم کے جلسے اور کارروائیاں آپ کے یہاں ہوتی رہیں۔

یلدرم کی یہ انقلاب پرستی رومانیت کے جذبے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر ینگ ٹرک پارٹی کے ساتھ کام کیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ بعد میں ساری عمر کبھی بھولے سے اس کا ذکر نہ کیا۔ میرے خیال میں ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سنسنی خیز شہرت حاصل کرنے کے لیے بعد میں ہمیشہ کے واسطے لیڈر قوم اور غازی وغیرہ بن جاتا۔ وہی ''ایغو'' کا فقدان۔

یلدرم سلطنت عثمانیہ میں کئی سال رہے۔ قسطنطنیہ کے بعد ان کا دوسرا پسندیدہ شہر بوڈاپسٹ تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم سے قبل کا یورپ تھا۔ یہاں پر ہر طرف رومان ہی رومان تھا (وی آنا کے امپریل اوپیرا میں واگز کی نسل کے ساتھی ہیوگو ولف ابھی موجود تھے۔ سائبلس اپنی موسیقی کمپوز کر رہے تھے۔ برلین میں استراس تھے۔ پیرس میں Debussy نے موسیقی میں امپریشنزم کی بنا ڈالی تھی۔ یہ یورپ اگست ۱۹۱۴ء میں ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔)

جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ قبل یلدرم کا تبادلہ امیر یعقوب خان کے سابق امیر کابل کے اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کی حیثیت سے ہندوستان کا کر دیا گیا اور یہ قسطنطنیہ سے وطن واپس آئے۔ امیر یعقوب خاں تیسری جنگ افغان میں شکست کے بعد انگریزوں کے اسیر کی حیثیت سے مسوری میں نظر بند تھے۔ یلدرم نے ترکی کے انقلابی ماحول کے بعد یک لخت خود کو ایک شکست خوردہ افغان بادشاہ کی معیت میں پایا۔ یہ کئی سال تک مسوری اور ڈیرادون (دہرادون) میں جلاوطن افغان بادشاہ اور شہزادوں کے ساتھ رہے۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۹۱۲ء میں یلدرم کی شادی ہوئی جب یہ ترکی سے تجالوٹے تھے تو ان کے دوستوں کے گروہ میں بڑی کھلبلی مچی تھی کہ یہ کیا سلسلے ہیں۔ یہ ضرور کوئی ترکن بیاہ کر کے وہاں چھوڑ آئے ہیں۔ جو اَب اگلے جہاز سے پہنچتی ہوگی۔ ترکی سے اتنا عشق اور ترکن سے شادی نہ کی۔ اکبرالہ آبادی نے اس پر ایک مزے دار قطعہ بھی کہا تھا، لیکن انھوں نے دوستوں پر واقعی یہ ایکٹوٹی کردی کہ کسی ترکن کے بجائے ہندوستان ہی میں بیاہ کیا۔

اتر پردیش میں ایک اور خاندان سادات ہے جو یلدرم کے گھرانے کی طرح صدیوں سے علمیت اور کلچر کا گہوارہ رہا ہے۔ ملکہ نور جہاں کے عہد میں جب ایرانی عالموں اور مصوروں نے جوق در جوق ہندوستان میں آنا شروع کیا، اسی زمانے میں نیشاپور ایران کا یہ خاندان جہاں گیر کے دربار میں مدعو کیا گیا اور یہاں رام گنگا کی وادی میں انھیں معافی کی زمینیں یعنی 'باون گاؤں' مع نوابی کے خطاب کے عطا کیے گئے۔[۵] دربار میں زیادہ تر علمی کام ان کے سپرد رہے۔ خصوصاً حکومت کا نظم و نسق اور محکمہ مالیات کے عہدے۔ اس قبیلے میں کئی کافی دلچسپ ہستیاں گزری ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نعمت خاں عالی تھے جو شہنشاہ اورنگ زیب کے وزیر تھے اور مذہب کے اختلاف کی وجہ سے مستقل ایک دوسرے سے دلچسپ نوک جھونک رہتی تھی۔ یہ اثنا عشری شیعوں کا گھرانہ تھا، لیکن چوں کہ یہ بھی عقلیت پرست عالم لوگ تھے اور جاہل قسم کے مولوی نہ تھے۔ لہٰذا ان کے یہاں تعصب یا تنگ نظری کا دور دور گزر نہ تھا۔ اسی لیے جب صوبے کے ایک مشہور اور راسخ العقیدہ سنّی خاندان کے لڑکے کا پیغام خان بہادر سید نذرالباقر کی بڑی لڑکی نذر زہرا بیگم کے واسطے آیا تو اسے منظور کر لیا گیا۔

نذر زہرا بیگم اور ان کی چھوٹی بہن ثروت آرا بیگم کو ان کے باپ نے پردے ہی میں گورنوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ خان بہادر نذرالباقر کی بہن، والدہ افضل علی ایک معاشرتی ناول ''گودڑ کا لال'' تصنیف کر چکی تھیں۔ نذر زہرا بیگم کے پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی میر افضل علی[۶] ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی کتاب ''تخیلات'' اب گم نام اور نایاب ہے۔

امیر کابل کے انتقال کے بعد فارن آفس سے یلدرم کی خدمات یوپی سول سروس میں منتقل کردی گئیں۔ ۱۹۲۰ء میں ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا اس وقت یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار کی حیثیت سے ان کی خدمات سول سروس سے مستعار لے لی گئیں۔ ۱۹۲۸ء میں ان کو حکومت نے پھر واپس بلالیا اور جزائر انڈمان و نکوبار کے ریونیو کمشنر کی حیثیت سے پورٹ بلیر بھیج دیا گیا۔ ہندوستان واپس آکر یلدرم غازی پور اور اٹاوے کے ضلعوں میں تعینات رہے۔ ۱۹۳۵ء میں خرابی صحت کی بنا پر وقت سے پہلے ریٹائر ہوگئے۔

بقول ان کے ڈیرادون سارے پنشن یافتہ بوڑھوں کا روحانی وطن تھا۔ یلدرم ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لیے ڈیرہ دون چلے گئے۔ یہیں انھوں نے اپنا کریر شروع کیا تھا اور اکثر یہاں آکر رہا کرتے تھے۔ یہیں پر انھوں نے ایک خوب صورت کوٹھی بنوا رکھی تھی جس کا نام 'آشیانہ' تھا۔

ڈیرہ دون میں ان کے بہت سے دوست پہلے سے ریٹائر ہوکر مستقلاً رہ رہے تھے۔ صاحب زادہ سعید الظفر خاں جو کنگ جارجز میڈیکل کالج لکھنؤ کے پرنسپل تھے (ڈاکٹر رشید جہاں ان کی بہو تھیں) مولوی عنایت اللہ سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن اور ان کے بھائی انجینئر ضیاء اللہ (یہ دونوں شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے بیٹے تھے) آج ان سب کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مسلمان اور ہندو دوست تھے۔ پھر بوڑھے جلاوطن افغان شہزادوں کا پورا قافلہ تھا۔ یہ بوڑھے شہزادے بڑے جذباتی تھے۔ یہ یلدرم کے پاس آکر گھنٹوں بیٹھے رہتے اور گزرے زمانوں کو یاد کرکے روتے۔ ان کی بہت قلیل پنشن انگریز سرکار نے مقرر کر رکھی تھی اور ان کے پاس صرف ان کا ماضی تھا۔ یلدرم ان سے بڑی محبت سے ملتے اور ان کے دکھ سکھ میں کام آتے۔

۳۵ء ہی میں یلدرم حج بیت اللہ کے لیے گئے اور خوش خوش وہاں سے واپس آئے۔ ملازمت کے زمانے میں یہ اکثر چھ چھ مہینے کی رخصت لے کر انگلستان، یورپ اور ترکی وقت گزار آتے تھے۔ اب ان کو فرصت تھی اور ان کا ارادہ تھا کہ مستقل سیاحت میں مشغول رہیں گے۔ ۳۸ء میں شدید بیمار پڑے۔ ان کی آنکھ کے عین اوپر پیشانی پر کاربنکل نکلا تھا۔

ان کے چھوٹے بھائی نے جو صوبے کے مشہور ڈاکٹر تھے، ان کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی انھیں کسی نے کراہتے نہیں سنا۔ آپریشن کے بعد یہ پھر بشاشت سے اُٹھ بیٹھے اور لکھنؤ واپس آکر اپنے مشغلوں میں مصروف ہوگئے۔ یلدرم خالی کبھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد برابر کسی نہ کسی مصروفیت میں لگے رہے۔ ملازمت کے زمانے میں بھی بہت سی غیر سرکاری ذمہ داریاں ان کے اوپر تھیں۔ وہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے بہت سرگرم سکریٹری اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے ممبر اور صدر رہے۔ یونیورسٹیوں کے ممتحن تھے۔ ان کی صحت کمزور ہوتی جارہی تھی مگر یہ ہرنئی مصروفیت خندہ پیشانی سے قبول کرلیتے اور کبھی انکار نہ کرسکتے۔

یلدرم کا حلقۂ احباب حیرت انگیز طور پر وسیع تھا اور سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ مولانا شوکت علی، انڈین پولیٹیکل سروس کے انعام الحق دہلوی مرحوم، پٹنے کے نواب زادہ مرتضیٰ علی خاں مرحوم، مراد آباد کے سر محمد یعقوب مرحوم، عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم، لکھنؤ کے سرسید وزیر حسن ؒ اور مشتاق احمد زاہدی دہلوی، ان کے بے حد چہیتے دوست تھے۔ ویسے ان کے احباب کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ مجھے معلوم نہیں اور کتنے لوگوں سے ان کی دوستی تھی۔ بہت سے لوگوں کو... جنھیں میں نے بالکل اجنبی سمجھا، یلدرم کا نام آتے ہی واقعتاً آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ ادیبوں کے حلقے میں بھی ان کے دوست تھے۔ ان سے کسی دشمنی یا رنجش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ منشی پریم چند ''زمانہ'' کان پور کے ایڈیٹر، دیانرائن نگم، قاضی عبدالغفار، سرتیج بہادر سپرو مرحوم، میر غلام بھیک نیرنگ، سر شیخ عبدالقادر، علامہ تاجور نجیب آبادی، سرسید رضا علی، مولانا ابوالکلام آزاد ان کے عزیز دوستوں میں تھے۔ نئی نسل میں یلدرم کو خواجہ غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی پر بہت ناز تھا۔

یلدرم ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب کہ ملک نے بہت بڑے بڑے آدمیوں کو جنم دیا تھا اور اپنے یہاں کے اس موجودہ ہولناک قحط الرجال کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ برصغیر کی یہی مسلمان قوم تھی جس نے قومی جدوجہد کے ان سپہ سالاروں بدرالدین طیب جی، رحمت اللہ سیانی، حسن امام، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، علی برادران،

مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، آصف علی اور مولانا آزاد کو پیدا کیا تھا اور جس نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن، سید امیر علی، سید محمود، پٹنے کے خدا بخش، سر شاہ محمد سلیمان اور علامہ عبداللہ یوسف علی جیسے عالموں کو پروان چڑھایا تھا۔

یلدرم کو اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے بے اندازہ محبت تھی۔ ان کے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ منجھلے بھائی سید نصیر الدین حیدر بھی پرانے علیگرین تھے۔ یہ بھی پی سی ایس میں تھے اور بعد میں راجپوتانہ کی ریاست ٹونک میں وزیر تھے۔ خان بہادر ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر، یلدرم کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ یوپی میں سول سرجن تھے اور لارڈ ولنگڈن اور لارڈ لنتھگو کے اعزازی فزیشن تھے۔ یلدرم کی وفات کے تین سال کے اندر اندر ان دونوں نے بھی انتقال کیا۔ ان تینوں بھائیوں میں آپس میں اتنی محبت تھی جو آج کل ذرا کم دیکھنے میں آتی ہے۔

یلدرم کو اپنے سارے خاندان سے، جو ماشاءاللہ بہت بڑا ابھرا پرا خاندان ہے، بہت اُنسیت تھی۔ یہ گھنٹوں بڑی بوڑھیوں، عزیزوں حتیٰ کہ دور کے رشتہ داروں کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے اور ان کے دکھ سکھ میں شریک رہتے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو انھوں نے اپنے ہاں کے کلچر سے ورثے میں پائی تھی۔ یہ ہمارے دیس کے مشترکہ خاندان کے قدیم انسٹی ٹیوشن اور اس تربیت کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے خاندان کو ایک مقدس Entity سمجھا جاتا تھا۔

یلدرم کی روشن خیالی اور جدیدیت کا اثر یہ ہوا کہ ان کے خاندان کی، جو ایک قصباتی خاندان ہے، بے شمار لڑکیوں نے اس زمانے میں یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں۔ جب کہ ابھی مسلمانوں میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اتنی عام نہ ہوئی تھی جتنی اب ہے۔ یلدرم کی بھتیجیوں اور بھانجیوں نے آج سے پچیس تیس سال قبل کانونٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ یلدرم کی بیگم صاحبہ ہندوستان کی ان گنتی کی ہندو اور مسلمان خواتین میں سے ہیں جنھوں نے آج سے تیس سال قبل پردے کی رسم کو ترک کیا۔ کرامت حسین گرلز ہائی اسکول لکھنؤ؀ اور مسلم گرلز کالج علی گڑھ کے قیام اور ترقی کے سلسلے میں دوڑ بھاگ کی۔ کھادی کی قومی تحریک کے زمانے میں خواتین کے محاذ پر جدوجہد میں مصروف رہیں۔

یلدرم بہت پکے مسلمان تھے مگر مذہبی تعصب اور تنگ نظری کو بہت بڑا اخلاقی جرم تصور کرتے تھے۔ مختلف مذاہب کے فلسفوں پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ نماز کے پابند نہ تھے، لیکن کبھی کبھی نماز عشاء پڑھ لیتے تھے اور بچوں کی طرح خوش ہو کر کہتے تھے: ''آج ہم نے نماز پڑھی۔''

ترکوں کے لہجے میں ترکی اور ایرانیوں کے لہجے میں فارسی بولتے تھے۔ عربی بھی روانی اور شگفتگی سے بولتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مغربی طرز کی زندگی گزاری لیکن جدید 'کلب لائف' اور حد سے زیادہ مغربیت زدہ خواتین ان کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے دو بھائیوں کو ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر دسترس حاصل تھی، لیکن خود ان کو موسیقی کا بہت زیادہ شوق نہ تھا۔ گو بچوں کو موسیقی کی تربیت کے خیال سے انھوں نے رام پور دربار کے استاد یوسف خاں کو کئی سال گھر پر رکھا۔

یلدرم کا طریقۂ فکر حیرت انگیز طور پر سائنٹفک تھا (یہ چیز بدقسمتی سے ہمارے ہاں بہت ہی نایاب ہے۔ ورنہ ہماری سیاست، ہماری 'مذہبی' اور معاشرتی زندگی ہمارے بیش تر 'ادبی' اور 'جمالیاتی' نظریات میں وہ شدید بنیادی تضاد، وہ کنفیوژن، بر خود غلط قسم کا اعتماد اور ذہنی پراگندگی نہ ہوتی جو ہمیں اس وقت اپنے ملک کے ہر شعبے میں نظر آ رہی ہے اور جس کے فقدان کی وجہ سے گرتے گرتے اب تو ہم بالکل پاتال میں جا پہنچے ہیں)، ہندو مسلم سوال اور اردو ہندی، ہندوستانی کے مسئلے پر آج سے اٹھارہ سال قبل یلدرم نے ۳۶ء میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے سالانہ اجلاس کے لیے جو مقالہ لکھا تھا اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا تھا وہ وقت عنقریب آ جائے گا اور جلد آنا چاہیے جب مذہب سے قطع نظر، جغرافیائی اور ریجنل بنیادوں پر ان مسائل کو حل کیا جائے گا۔ رسم الخط کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ملک کے شمال مغربی حصے میں عربی رسم الخط اور باقی سارے ہندوستان میں لامحالہ دیوناگری اسکرپٹ کا استعمال ہوگا۔ اس سلسلے میں جذباتیت سے کام لینا غلطی ہے۔ انتہا درجے کی خرابی بصر کے بعد ہم آج بھی پاکستان میں یہ طے نہیں کر پائے ہیں اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اب ریجنل بنیادوں پر زبانوں کی تقسیم و ترویج کے نظریے کا پرچار کر رہی ہے۔

آخر میں یلدرم کے متعلق رشید احمد صدیقی کے ایک مضمون کا اقتباس درج کر رہی ہوں حالاں کہ مضمون ایسے بھی بہت طویل ہو گیا ہے:

''اپنے رفقا اور طلبا سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر 'بحثنے' کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شاعر نہیں ہوسکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں۔ ان کی دل افروز شاعری اور انشا پردازی تمام تر ان کی دل آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں ایسا کوئی فن نہیں جو انسان سے اونچا اور اس سے علیٰحدہ ہو۔''

''یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے، اور علی گڑھ کے اس زمانے کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ نہ اب جب زندگی سوائے خوش باشی کے سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بہت

'جب سے اب تک زمانے کے رویے اور روانی میں بہت کچھ فرق آ گیا ہے۔ کیسا کچھ فرق۔ جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے اب ان پر رونے والا کوئی نہیں، لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوا۔ یہ ان کی سیرت کا، شخصیت کا بہت اہم اور مہتم بالشان پہلو ہے۔ انھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں، ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیروزبر کر سکتی تھیں، لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد و امید آفرینی تھی کہ ان کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے۔ انھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحب آفتاب احمد خاں، نواب مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا۔ سازش کسی سے نہ کی۔ میرے نزدیک یہی ایک یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالے پانی میں بھی، لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آتی ہے نہ روشنی، اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے، الّا شعر و ادب سے۔

اس یونیورسٹی میں شعر و ادب کے دیوانے میں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی اور سجاد حیدر یلدرم۔ ترکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ میں ترکی سے واقف نہیں ہوں، لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاندار ہے یا اس میں آپ کی شائبہ 'خوبیٔ' تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک دفعہ جھوم ہی تو گئے۔ آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی اور چہرہ جگمگا اُٹھا۔ کہنے لگے جناب... ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے؟ ہماری آپ کی نہیں ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا، یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے۔

آپ کی تو کہیں نہیں ہے، مسکرائے اور بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے انھیں کی ہو سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے، نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے۔ اس میں ترک تازی ہے۔ سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے۔ نامق کمال کا مشہور ڈرامہ ''جلال الدین خوارزم شاہ'' میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کیا تھا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ نہیں لکھتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا تھا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے، وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہیں۔

ترکی انشا پردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ بس گیا تھا کہ اردو کے مضامین لکھنے میں بھی ان کا قلم ترکی تال وسم قبول کر لیتا تھا۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے۔ اردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مداح تھے اسی زمانے میں ایک فارسی مجلہ ''ایران شہر'' برلین سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے۔ سربہ مہر بہت سارے لفافے، کاغذات کے کچھ منتشر اجزا، ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے چلے آرہے تھے۔ میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آرہا تھا۔ اس کی خبر سجاد صاحب کو

نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی۔ ہموار، کسی قدر تیز چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے تھے۔ نگاہ نیچی تقریباً عمودی، دس بارہ قدم چل کر اک ذرا کی ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے اک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر سرگرم رفتار ہو جاتے۔ اس پران کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ "سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو۔ وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے، اور پھر چل دیتا ہے۔" اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے: "سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی، اس کی تعریف نہ کرو گے۔" اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آرہا۔ سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اُٹھالیا۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اُٹھالیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لفافے نے مفارقت کی، وہ بھی میں نے قبضے میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالے کے مطالعے میں منہمک رہے۔ سید صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہنچا۔ آفس پہنچ کر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کیے۔ معلوم تین لفافے گم ہیں۔ چونک پڑے اور تھوڑی دیر سخت متفکر رہے۔ میں نے تینوں لفافے کچھ وقفے سے واپس کیے۔ سید صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ فوراً کیوں نہ دیے۔ اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی، میں نے کہا آپ مطالعے میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے فرمایا۔ خوب یاد دلایا۔ یہ ملاحظہ فرمائیے۔ "ایران شہر" ہے۔ ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور

کیسے اچھے اور جان دار مضامین و نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے اسے برلین سے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پائے اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ "بتِ سنگی" سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت مسدود رہے گی۔ میں نے کہا سید صاحب بتِ سنگی کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے بتِ آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقول شخصے:

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا: یہی تو ستم ہے۔ آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بھس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کر دی۔ میں نے عرض کیا۔ سید صاحب! اکبر نے کہیں بھس نہیں ملائی صرف بھس میں چنگاری لگائی ہے۔ ہنسے۔ پھر فرمایا۔ اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی 'تم' کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو کبھی ذاتی رفعت اور منفعت کا وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہیں پایا۔ نہ ان کے منہ سے ایسے الفاظ سنے جو مذاق سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے۔ یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے، بغیر کسی ارادے یا

تکلف کے۔ یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں
دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے
جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اسی حد تک
ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو اعظم سمجھی جاتی ہے۔

شعر و ادب کا ان کو ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے
رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے اور اچھی اور بے تکلف انگریزی
لکھتے تھے۔ یہ بات ان کے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے۔
سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہوتا کم سواد
ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور
شخصیت میں اس درجہ تک یک رنگی اور توازن ہو۔۔۔''

اس اقتباس کے بعد میں مضمون ختم کرتی ہوں۔ یلدرم نے ۱۱راپریل ۱۹۴۳ء کو
رات کے دو بجے دفعتاً حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کیا۔ اس وقت وہ بالکل
تندرست تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی افغانستان میں چند ماہ گزار کر آئے تھے۔

اور اس وقت ان کی یہ تمنا بھی پوری ہوگئی کہ ان کی اَنت سے کی بیماری یا طویل
علالت سے دوسروں کو پریشانی یا تکلیف نہ ہو۔ یلدرم لکھنؤ کے عیش باغ کے قبرستان میں
سپرد خاک کیے گئے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

☆☆☆

حواشی:

۱۔ کس قدر خوف ناک زمانہ رہا ہوگا۔

۲۔ کالج سے نکلنے کے بعد انھوں نے ساری عمر پُرخلوص اور انتھک سیاسی جدوجہد میں گزاری۔ پاکستان بننے
کے بعد گم نامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حال ہی میں کراچی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ انتقال سے

کچھ عرصہ قبل انھیں مشرقی بنگال کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ انہی عبدالرحمن صدیقی کے والد نے ان کی طالب علمی کے زمانے میں بمبئی کے ایک یتیم لڑکے کی پرورش اپنے ذمے لی۔ پھر یہ لڑکا وظیفہ لے کر ولایت گیا۔ وہاں آئی سی ایس میں لے لیا گیا۔ ہندوستان واپس آکر ملازمت کی۔ پھر آئی سی ایس سے استعفیٰ دے کر بقیہ عمر فلسفہ، اسلام پر کتابیں لکھنے میں گزار دی اور قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ کیا۔ قرآن شریف کے اس مترجم نے بھی حال ہی میں گم نامی اور گوشہ نشینی کے عالم میں انگلستان میں انتقال کیا اور اپنی وصیت میں اپنا سارا روپیہ لندن یونیورسٹی کے بھارتی طالب علموں کے لیے وقف کر گیا۔ اس یتیم لڑکے کا نام عبداللہ یوسف علی تھا۔

۳۔ شبلی اسی زمانے میں ترکی گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ کر انھوں نے ایک نظم لکھی جس میں کچھ یہ تھا کہ میں نے ملک کے ماحول کو وہی پایا جیسا پہلے تھا۔ اس پر کلاس کے کسی شریر لڑکے نے اسی بحر میں یہ شعر لکھ کر نوٹس بورڈ پر لگا دیا:

شبلی غمزدہ با صورتِ نداف کہ ہست

رنگ او تیرہ و تاریک ہمیں است کہ بود

شبلی نے کلاس میں یہ شعر دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ جس ذہین لڑکے نے یہ شعر کہا اپنا نام بتا دے۔ بھلا کسی کی شامت آئی تھی جو بتاتا۔ بعد میں سیاسی نظریات میں اختلاف کی بنا پر یہ علی گڑھ سے چلے آئے اور ندوۃ العلما لکھنؤ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

۴۔ سید سجاد حیدر نے یہ ترکی زبان کا تخلص اختیار کیا تھا۔ ترکی میں "یلدرم" کے معنی برق کے ہیں۔

۵۔ غالباً یہ کانگریس پریذیڈنٹ بدرالدین طیب جی کے گھرانے کی کوئی خاتون تھیں۔

۶۔ ۴۷ء تک یہ بھی بڑے غرے ڈبے والے لوگ تھے۔

۷۔ یہ پنجاب میں اسسٹنٹ انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ ۳۷ء میں لاہور میں چالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

۸۔ یہ سجاد ظہیر کے والد تھے۔

۹۔ لکھنؤ کا مشہور 'مسلم اسکول' جو اَب بہت بڑا کالج ہے۔

۱۰۔ لیتھو کی چھپائی۔

ooo

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

پنڈت جواہر لال نہرو

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ بہت ہی اہم اور خوش گوار تھا۔ ترک موالات اور تحریک خلافت کی مہم بڑی شدت سے جاری تھی۔ ہندو مسلمان ......شیر وشکر ہو کر شہروں، قصبوں اور اہم مرکزوں کے دورے کر رہے تھے اور ہندو مسلمان کی ملت، موانست، یک جہتی اور وطن دوستی کے بڑے پُر کیف اور خوش گوار مناظر ہر جگہ دیکھنے میں آرہے تھے۔ یہ دور ہندوستان کی قومی یک جہتی کا زرّیں دور کہا جا سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) اعظم گڑھ بھی ان سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کا بڑا اہم مرکز بن گیا تھا۔ مختلف اوقات میں یہاں ہندو اور مسلمان لیڈر برابر آتے رہتے، گاندھی جی جب اپنے دورہ میں اعظم گڑھ آئے تو ان کے قیام کا انتظام تو اور جگہ تھا مگر وہ خود شبلی منزل آئے۔ ایسے وقت آئے کہ اہل دارالمصنفین ایک کھلی جگہ پر مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے اور ساتھ آنے والوں کو باادب اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ انھوں نے دارالمصنفین کے کتب خانہ کو لالٹین کی روشنی میں دیکھا تھا، جب دارالمصنفین کے ایک رفیق نے ان کے سامنے دستخط کے لیے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی انھوں نے اپنا دستخط اردو میں کیا۔

پنڈت موتی لال نہرو جب کبھی اعظم گڑھ کے دورے پر تشریف لاتے تو دارالمصنفین ان کا بے تکلف مہمان خانہ ہوتا۔ اس زمانہ میں یہاں کا مہمان خانہ ایک کچا بنگلا ہوتا، لیکن وہی عام بنگلا پنڈت جی موصوف کو اتنا پسند تھا کہ فرماتے: ''مجھ کو اس کچی عمارت میں جو سکون

حاصل ہوتا ہے وہ اور کہیں حاصل نہیں ہوتا۔" وہ دارالمصنفین والوں کے ساتھ ہی کھانا تناول کرتے۔ ان کو مرغ مسلّم بہت پسند تھا، اس لیے جب وہ تشریف لاتے تو دسترخوان پر بیٹھتے تو مرغ مسلّم کی پوری پلیٹ اپنی طرف کھینچ لیتے اور فرماتے: "میں بلاشرکت غیرے اس کا مالک ہوں۔" اور پھر پوری پلیٹ ان کے کام ودہن کے لیے وقف ہو جاتی۔ ایک بار مہمان خانہ کے برآمدے میں تشریف فرما تھے تو ایک صاحب آئے جن کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا، جو سر پر کوری ہانڈی لیے ہوئے تھا، وہ کیلے کے پتے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پنڈت جی کو خیال ہوا کہ اس کے لیے کوئی تحفہ ہے، اس لیے بہت ہی بے تکلفانہ انداز میں بولے: "لاؤ کیا لائے ہو کھولو۔" جب ہانڈی کھولی گئی تو انھوں نے دیکھا کہ اس میں سجاؤ دہی ہے، یہ دیکھ کر ہنسے اور فرمایا میرے کھانے کی چیز نہیں ہے، یہاں مالوی جی بھی آئے ہوئے ہیں اور وہ جہاں ٹھہرے ہوئے ہیں وہاں لے جا کر یہ ان کو دو (پنڈت جی کے ساتھ مالوی جی بھی اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے تو ان کو دارالمصنفین شبلی منزل) میں ٹھہرنے کی دعوت دی گئی تھی، لیکن پنڈت موتی لال نہرو نے کہا کہ اس سرزمین کے چپہ چپہ پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی آواز بلند کی گئی ہو وہاں مالوی ٹھہرنا پسند نہ کریں گے۔ پنڈت موتی لال سے مالوی جی کی بڑی بے تکلفی تھی۔ یہ سن کر انھوں نے پنڈت موتی لال جی سے ہنس کر کہا "کیا بے ہودہ باتیں کرتے ہو۔"

پنڈت موتی لال نہرو کو یہاں کے لوگوں سے بڑا لگاؤ تھا جس کا اظہار ان کے حسب ذیل دو خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم جو اس وقت دارالمصنفین کے ناظم تھے، لکھے تھے:

آنند بھون، الٰہ آباد

۱۶/اکتوبر ۱۹۲۸ء

مکرمی جناب سید صاحب! تسلیم

جو طوفان بے تمیزی اس وقت برپا ہے، اس کے انسداد کے لیے آپ کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب کو

اس لیے تکلیف دی گئی تھی کہ بعد مشورہ تدابیر مناسب اختیار کی جاویں۔ چنانچہ جیسی توقع تھی، مولوی صاحب نے اپنا حصہ کام کا بخوشی منظور فرمایا، اور اب پورے پورے کمربستہ ہیں۔ آپ کی امداد کے دو مواقع جلد پیش آنے والے ہیں۔ ایک تو کانفرنس دسنہ جو ۲۷؍اکتوبر کو منعقد ہوگی اور دوسرے اس کے بعد ۳؍نومبر سے ۶؍نومبر تک ایک مرتبہ دہلی کا سفر اختیار کرتا ہے۔ پہلے موقع پر سنا جاتا ہے کہ مجمع کثیر ہوگا اور ہر خیال کے اصحاب موجود ہوں گے۔ وہاں اگر اچھی فضا قائم ہوگی تو نہایت مفید ہوگا۔ دہلی میں آل انڈیا کمیٹی کی میٹنگ ہے اور اس کے ساتھ ہی کانفرنس کمیٹی کی بھی میٹنگ ہوگی۔ وہاں جماعت علماء سے ضرور گفتگو کی نوبت آوے گی۔ ان اصحاب کا جواب ہمارے پاس سوائے آپ کے اور مولانا ابوالکلام صاحب کے اور نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ضرور موجود ہوں گے، لیکن آپ کی موجودگی بھی لازمی ہے۔ تکلیف تو ہوگی مگر بالفعل اس معاملہ سے زیادہ اہم کوئی قومی معاملہ نہیں ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس تکلیف کو ضرور برداشت فرمادیں گے۔ اردو رپورٹ ۲۳؍کو شائع ہوگی فوراً ابلاغ خدمت ہوگی۔

مخلص

موتی لال نہرو

....

آنند بھون، الٰہ آباد

۲۴؍ستمبر

مکرمی جناب مولانا صاحب تسلیم!

متفقہ فتوئی علمائے ہند کے جواب کی نقل جو متعلق کونسل ہے ہم رشتہ ارسال خدمت ہے۔ جہاں تک میں اس جواب کو سمجھا ہوں

اس کا تعلق ایسی کونسلوں سے ہے، جن میں جا کر معاونت حکومت کی جائے، دوران تحقیقات کمیٹی سول نافرمانی بعض صاحبان نے کونسلوں میں جانے پر اس غرض سے زور دیا ہے کہ وہاں ہر امر کی جو گورنمنٹ کی طرف سے پیش ہو مخالفت کی جاوے، بشرطیکہ کثرت ایسے ممبران کی ہو کہ جو تارکین معاملات ہوں۔ اس کا اثر لازمی یہ ہوگا کہ گورنمنٹ کی طرف سے جو قانون یا تجویز ہوگی اس کو کونسل کثرت رائے سے خارج کرے گی۔ گو یہ صحیح ہے کہ گورنر یا گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ کثرت رائے ممبران کے خلاف کسی قانون یا تجویز کو اپنے حکم سے بعض صورتوں میں نافذ کردے یا نافذ ہونے سے روک دے، مگر اس میں ممبران کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایسی حالت میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ فتویٰ علمائے کرام کونسل میں اس غرض سے بھی جانے کا مانع ہے کہ وہاں جا کر ہر امر میں خواہ وہ اچھا ہو یا برا، گورنمنٹ کی مخالفت کی جاوے اور گورنمنٹ کی کل کاروائی جو بذریعہ کونسلوں کے ہوتی ہے مسدود کردی جاوے۔ جن صاحبوں نے اس غرض سے کونسل میں جانے کی رائے دی ہے ان کا قول یہ ہے کہ یہ عمل عین ترک موالات ہے کہ جو فریق ثانی کے گھر میں گھس کر کیا جائے گا اور کسی طرح داخل معاونت حکومت نہیں ہے۔ اس کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ زیادہ تر مجھے جناب کی رائے کی اپنے اطمینان کے لیے ضرورت ہے، لیکن اگر اجازت ہوگی تو اس کا حوالہ رپورٹ کمیٹی سول نافرمانی میں جو میں تحریر کر رہا ہوں دیا جائے گا۔
اس قدر اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ بعض اہل اسلام صاحبان نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فتویٰ علمائے راہ نہ ہوتو ان کو کونسل میں جا کر گورنمنٹ کی مخالفت کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

دوسرا امر غور طلب فقرہ حرف و جواب مذکور کا ہے۔ اس کا اس قدر مضمون کہ حکومت کی وفاداری و طاعت شعاری و بہی خواہی کی قسم کھانا بھی ضروری ہے صحیح نہیں ہے۔ قسم وفاداری بادشاہ کی، نہ حکومت کی کھانا بھی لازمی ہے۔ یہ قسم اس حالت موجودہ میں کہ جب تجویز آزادی، کامل پیش کردہ مولانا حسرت موہانی تینوں جماعتوں سے (یعنی کانگریس، مسلم لیگ، خلافت) نامنظور ہو چکی ہے۔ ظاہر، ممنوع نہیں ہے۔ جب آزادی، کامل پر استدلال کرنے کا وقت آئے گا تو غالباً نہ کونسلوں میں جانے کی ضرورت رہے گی، نہ قسم کھانے کی۔ اس کے متعلق بھی رائے عالی سے مطلع فرمائیں۔ براہ کرم جواب سے جلد سرفراز فرمائیں، زیادہ شوق۔

خاکسار

موتی لال نہرو

۱۔ اس خط پر حاشیہ نہیں لکھا ہوا ہے۔

۲۔ جواب کے سلسلے میں کتاب "بزم رفتگاں" حصہ دوم، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن، صفحہ نمبر ۴۲ پر دیکھیے۔

....

پنڈت موتی لال نہرو نے دارالمصنفین سے جو ربط اور لگاؤ پیدا کیا، اس کو ان کے فرزند ارجمند پنڈت جواہر لال نہرو نے اور بھی زیادہ استوار اور مستحکم کر دیا۔ وہ بھی جب کبھی اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنفین ہی میں قیام کرتے جن لوگوں نے ان کو یہاں ٹھہرتے ہوئے دیکھا ہے، وہ اس کے متعلق بڑی لذیذ حکایتیں بیان کرتے ہیں۔ آزاد ہندوستان کا ہونے والا یہ پہلا وزیر اعظم یہاں آتا تو بڑی سادگی سے رہتا۔ وہ اپنی دھوتی خود اپنے ہاتھوں سے دھوتے، یہاں کے لوگوں سے بچوں کی طرح بڑے اخلاص اور محبت سے ملتے، لوگ تعجب کرتے کہ انگریزوں کی جابرانہ حکومت کے علی الرغم دارالمصنفین والے، ایک باغی لیڈر کو اپنے یہاں کیسے ٹھہراتے ہیں۔ وہ جب دارالمصنفین میں ہوتے تو سی۔ آئی۔ ڈی والے اس کی

چہار دیواری کے چاروں طرف متعین ہو جاتے، مگر یہاں کے لوگوں کو پنڈت جواہر لال نہرو سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ اس زمانہ میں انھوں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر تصویر بھی کھنچوائی جو اب تک محفوظ ہے۔ اس میں پنڈت جی ایک بہت ہی خوش رو، خوش اندام اور رعنا جوان نظر آتے ہیں۔

پنڈت جی کے اعظم گڑھ کے زمانہ قیام کی بہت سی دلچسپ باتیں یہاں کے لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ اعظم گڑھ آتے تو جہاں ان کے اور بہت سے مشاغل ہوتے، شہر میں کانگریس کے چندے کے لیے بھی مولانا مسعود علی صاحب کے ساتھ نکلتے اور لوگوں سے چندہ مانگتے۔ ایک مرتبہ یہ دونوں صاحب چندہ مانگتے ہوئے ایک دولت مند بزاز کی دوکان میں داخل ہوئے، وہ ان لوگوں کو دیکھ کر بہت گھبرایا کہ حکومت کے یہ باغی لیڈر کیسے اس کی دوکان میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب اس سے چندہ مانگا گیا تو بڑی مشکل سے ایک روپیہ نکال کر دیا جس سے یہ بہت مکدر ہو کر اس کی دوکان سے نیچے اُترے، وہیں ایک سبزی فروش سبزی بیچ رہا تھا، مولانا مسعود علی نے اس سے کہا کہ بھائی! تم بھی کچھ دے دو۔ سبزی فروش فرط تعظیم سے کھڑا ہو گیا اور اپنی تھیلی کھول کر کہا کہ ''سرکار! یہ دن بھر کی بکری ہے قبول کر لی جائے۔'' اور یہ کہہ کر ساری رقم چندے میں دے دی۔ پنڈت جواہر لال بہت متاثر ہوئے اور بولے کہ ہم کو عوام ہی کے ایثار اور اخلاص پر تمام تر بھروسا ہے اور ہم کو ہندوستان کی اس جنگ آزادی میں ان ہی کی مدد اور جذبۂ ایثار سے فتح حاصل ہو گی۔

ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا مسعود علی صاحب کے ساتھ ضلع اعظم گڑھ کا دورہ کر رہے تھے کہ اعظم گڑھ کی سرحد سے پار ہو کر دوسرے ضلع میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے غازی پور جانے کا قصد کر لیا، لیکن جب قریب کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی روانہ ہو چکی تھی، جہاں جانا تھا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک ٹرالی اسٹیشن کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی جس پر ایک مسلمان اوورسیر اپنے متعدد قلیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا مسعود علی صاحب نے ان سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے ان دونوں صاحبوں کو اپنی ٹرالی پر بٹھا لیا، اور ان کو ایک ایسے اسٹیشن پر پہنچا دیا جہاں سے ان کو غازی پور جانے

کے لیے دوسری گاڑی کے مل جانے کی امید تھی۔ احکامِ بالا کو اوورسیر صاحب کے متعلق رپورٹ دی گئی تو وہ نوکری سے فوراً معطل کر دیے گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ واقعہ آخر وقت تک یاد تھا، جب وہ وزیراعظم ہوئے تو اوورسیر صاحب کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے ایک صاحب زادے امجد علی صاحب غزنوی (وکیل، اعظم گڑھ) کو اپنے لطف و کرم سے نوازا۔ آج کل وہ یوپی اسمبلی کے ممبر ہیں۔

پنڈت جواہر لال جب اعظم گڑھ آتے تو مولانا مسعود علی صاحب ان کے لیے بہت ہی شان دار طریقہ پر جلسہ کا انتظام کرتے اور ہر طرح کا ضبط و نظم قائم کرنے کی کوشش کرتے۔ ایک بار ان کی آمد میں جلسہ ہو رہا تھا کہ ایک سانپ رینگتا ہوا جلسہ گاہ میں پہنچ گیا اس سے کچھ لوگ خوف سے ادھر اُدھر بھاگنے لگے، لیکن مولانا مسعود علی صاحب نے ڈایس پر سے اپنی گرجتی ہوئی آواز میں جب یہ کہا کہ جو جہاں ہے وہ وہیں اطمینان اور سکون سے بیٹھا رہے، کوئی اپنی جگہ سے ہرگز ہرگز کھسکنے نہ پائے تو پورا مجمع اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ پنڈت جی جلسہ کے اس نظم و ضبط سے متاثر ہوئے اور یہ واقعہ ان کے ذہن میں برابر محفوظ رہا اور کئی جگہوں پر اپنی تقریروں میں اس کا حوالہ دیا۔ یہاں تک کہ اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں کلیانی میں جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا، اس واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ دُہرایا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو دارالمصنفین کے علمی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے جب مولانا سید سلیمان ندوی کو 'عرب و ہند کے تعلقات' پر لکچر دینے کے لیے مدعو کیا تو ایک لکچر میں پنڈت جی بھی شریک ہوئے۔ اس سے متاثر ہو کر فرمایا کہ ایسے لکچر کسی قوم کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں۔

انتخابی دورہ کے سلسلہ میں ۱۹۳۷ء میں اعظم گڑھ آئے تو ان کے کھانے کا انتظام شبلی منزل (دارالمصنفین) ہی میں تھا۔ اس موقع پر کانگریس کے ایک مقامی کارکن نے کہا کہ پنڈت جی نے اپنی بیوی کی موت کے بعد سے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے ان کے کھانے میں گوشت کے بجائے صرف سبزی ہی ہو۔ چنانچہ کئی قسم کی ترکاریاں اور

سبزیاں، دسترخوان پر رکھی گئیں وہ دوپہر کو دورہ سے ایسی خراب موٹر سے آئے کہ سر سے پاؤں تک بالکل گرد آلود ہو گئے تھے۔ فوراً ہی غسل خانہ گئے، اپنے بیگ سے لسٹرین کی شیشی نکالی اور فرمایا کہ میں ہمیشہ اس کو اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اس کے چند قطرے پانی میں ڈال کر غرارہ کیا، ناک صاف کی اور منہ ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آئے تو ان سے کہا گیا کہ آپ نے تو اب گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے، اس لیے آپ کے لیے اب کی مرتبہ گوشت کی مختلف قسمیں تیار نہ کی جاسکیں۔ آپ کے لیے ترکاریاں ہیں اور بقیہ شرکائے دسترخوان کے لیے گوشت ہے۔ یہ سن کر پنڈت جی نے فرمایا کہ کم بختوں نے یہ مشہور کر کے کہ میں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا ہے مجھ کو ہر جگہ بھوکا رکھا ہے۔ کئی وقت کے بعد میں آج جی بھر کے کھانا کھاؤں گا اور یہ کہہ کر گوشت کی پلیٹ اپنی طرف کھینچ لی اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا لیکن اس وقفہ میں شبلی منزل میں درشن کرنے والوں کا ایک ہجوم ہو گیا۔ شور و غل سن کر پنڈت جی باہر نکل آئے اور ایک خاص ادا کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ جب یہاں سے رخصت ہونے لگے تو ایسی موٹر پر بیٹھے کہ اندر سے صاف دکھائی نہیں دیتے تھے، مگر درشن کرنے والے تھے کہ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ یہ صورت دیکھ کر پنڈت جی غصہ میں موٹر سے باہر نکل گئے اور اس کے مڈگارڈ پر بیٹھ گئے بولے ''لو خوب درشن کرلو'' اور ڈرائیور سے کہا کہ موٹر چلاؤ۔ اس طرح مڈگارڈ پر بیٹھے اور گرد کھاتے ہوئے دور تک چلے گئے۔

قلعہ احمد نگر جیل سے رہا ہونے کے بعد ۱۹۴۵ء میں اعظم گڑھ آئے تو سہ پہر چائے کا پروگرام دارالمصنفین ہی میں رکھا گیا تھا، لیکن اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے سہ پہر کے بجائے آٹھ بجے رات کو تشریف لائے اور چائے پی کر اپنی وضع داری کا ثبوت دیا۔ چائے کے بعد دیر تک گفتگو کرتے رہے اور جب لوگوں نے دوسرا پروگرام بتایا تو فرمایا ''ٹھہرو جی بہت دنوں کے بعد آیا ہوں، مجھے اطمینان سے گفتگو کرنے دو۔''

وزیر اعظم ہونے کے بعد اعظم گڑھ آنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن دارالمصنفین کے لوگوں سے برابر اپنا تعلق قائم رکھا۔ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی بھوپال میں

مقیم تھے۔ اسی زمانہ میں کسی مفسد نے ڈھاکہ پہنچ کر یہ افواہ پھیلا دی کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے اہل وعیال ڈھاکہ آرہے تھے مگر سرحد پر ہندوستانی پولیس نے ان کو گرفتار کرلیا ہے۔ غلط خبر پاکستان کے اخباروں میں بھی شائع ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کو تار بھی دیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ لیاقت علی خاں نے مزید تصدیق کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کو تار بھیجا۔ اس سے پنڈت جی کو بڑی تشویش پیدا ہوئی اور انھوں نے فوراً ایک بڑا لمبا تار دارالمصنفین بھیجا کہ اصل صورت حال کیا ہے اور سید صاحب اور ان کے اہل وعیال کی خیریت پوچھی۔ یہاں سے ان کو تار دیا گیا کہ یہ خبر بے بنیاد ہے۔

وزیر اعظم بننے کے بعد ایک انتخابی مہم میں پنڈت جی مئو آئے تو مولانا مسعود علی بھی اعظم گڑھ سے ان سے ملنے کے لیے گئے لیکن ملنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ وہ ان کے قریب نہ پہنچ سکے۔ پنڈت جی نے ان کو دیکھ لیا اور ان کی طرف لپکے۔ ان سے ہاتھ ملانے کے بجائے، بہت گرم جوشی سے گلے ملے اور کہا کہ جلسہ میں چلو، میں آج بہت دلچسپ تقریر کروں گا۔ اس روز مئو میں ان کے دسترخوان کوان کے شرکا میں مولانا مسعود علی کا نام نہ تھا۔ پنڈت جی دسترخوان پر بیٹھے اور نظر دوڑائی تو مولانا مسعود علی کو نہیں پایا۔ فوراً انھیں خاص طور پر بلا بھیجا اور جب وہ آئے تو اپنے پاس بٹھایا۔

دارالمصنفین کی مالی حالت ۱۹۴۷ء کے بعد بہت خراب ہوگئی۔ حیدر آباد اور بھوپال سے اس کو جو سالانہ امداد ملتی تھی وہ بند ہوگئی۔ تقسیم کی وجہ سے جو انتشار پیدا ہوا اس سے اس کی کتابوں کی تجارت پر بڑا اثر پڑا۔ ان سب باتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ ادارہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوگیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اس پریشانی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ادارہ کو مالی بحران سے نکالنے کے لیے بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو شبلی منزل کے بار بار قیام کے زمانہ کی تمام باتیں یاد تھیں، ان کو یہاں کے علمی اور تحقیقی کاموں سے بھی شروع ہی سے دلچسپی تھی اس لیے انھوں نے دارالمصنفین کے لیے کوئی مستقل سالانہ گرانٹ کی پیش کش کی، مولانا مسعود علی نے بے تکلفانہ انداز میں کہا کہ ہمارے یہاں گورنمنٹ سے گرانٹ لینے کی اب کوئی روایت نہیں رہی ہے۔ حالاں کہ برطانوی حکومت کی

طرف سے بھی یہ پیش کش ہوتی رہی ہے، اس لیے ہم اس وضع داری کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، آپ اس کو ختم ہونے نہ دیں۔ پنڈت جی نے اس شانِ بے نیازی کو بہت پسند کیا اور ساٹھ ہزار کی گراں قدر یک مشت رقم وزارت تعلیم کی طرف سے دلوا کر اس کی وقتی پریشانیوں کو دور کیا۔

مولانا مسعود علی دہلی جاتے اور جب بھی ان سے ملنے کی خواہش کرتے تو ان کو وہ اپنے یہاں ضرور بلاتے اور دونوں میں بے تکلفانہ باتیں ہوتیں۔ وہ مولانا مسعود علی کی ظرافت آمیز باتوں کو بہت پسند کرتے اور ان سے بہت محظوظ ہوتے۔ ایک بار پنڈت جی مولانا کے ساتھ اپنی کوٹھی کے زینہ پر ایک ایک زینہ چھوڑ کر چڑھ رہے تھے کہ مولانا کو مخاطب کر کے کہا: ''دیکھو! مجھ پر سن وسال کا کوئی اثر نہیں ہے اور ایک ایک زینہ چھوڑ کر اوپر چڑھتا چلا جا رہا ہوں۔'' دونوں میں اتنی بے تکلفی تھی کہ مولانا مسعود علی نے یہ سن کر کہا: ''پنڈت جی! اگر میں وزیر اعظم ہوتا تو ایک زینہ کیا دو دو زینے چھوڑ کر اوپر چڑھ جاتا۔'' پنڈت جی ہنس پڑے۔

ایک موقع پر پنڈت جی نے مولانا سے اپنی ورزش کا ذکر کیا اور کہا: ''میں ابھی تک سر کے بل کھڑے ہو کر ورزش کرتا ہوں، اس سے مجھ کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ تم بھی یہ ورزش کرو۔'' مولانا نے جواب دیا: ''میں تو مسلمان ہوں، جو اَب تک اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہ سیکھ سکا ہو، وہ سر کے بل کیسے کھڑا ہو سکتا ہے۔'' پنڈت جی اس فقرے کو سن کر بہت ہنسے۔

ایک بار پنڈت جی نے مولانا مسعود علی کو اپنے یہاں کھانے پر بلایا، جس میں موجودہ وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور اندرا گاندھی بھی تھیں۔ پنڈت جی اور مولانا دونوں پچھلی صحبتوں کی پرانی باتوں کو یاد کر کے محظوظ ہو رہے تھے، اندرا گاندھی بہت ہی شوق سے یہ باتیں سن رہی تھیں۔ بیچ میں لال بہادر شاستری نے کچھ کہنا چاہا تو پنڈت جی نے کہا: ''ارے یہ تمہارے ہوش سے پہلے کی باتیں ہیں۔'' کھانا ختم ہوا تو پنڈت جی نے گڑ منگوایا اور مولانا سے کہا: ''یہ انڈونیشیا سے خاص طور پر میرے لیے آیا ہے، تم بھی کھاؤ۔ یہ مجھے بہت پسند ہے۔'' جب گڑ کھا چکے تو اندرا سے کہا کہ غلام محمد (پاکستان کے گورنر جنرل) نے

جو سردہ بھیجا ہے، وہ بھی لاؤ کھایا جائے۔ سردہ آیا تو مولانا مسعود علی بولے: ''کیوں پنڈت جی! آپ تو غلام غلام محمد کے بھیجے ہوئے سردے خود کھائیں اور دوسروں کو کھلائیں، مگر ہم اعظم گڑھ میں غلام محمد کا نام لیں تو ہم کو پاکستانی قرار دے کرسی. آئی. ڈی کے حکام معلوم نہیں کس کس طرح پریشان کریں۔'' یہ سن کر پنڈت جی ہنسنے لگے۔

اسی موقع پر مولانا نے پنڈت جی سے کہا کہ آپ ہمارے ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے لائف ممبر بن جائیں۔ پنڈت جی نے پوچھا: ''کتنی رقم ادا کرنی ہوگی۔ مولانا نے بتایا کہ ایک ہزار۔ پنڈت جی نے کہا میں اس ادارہ کا لائف ممبر تو شوق سے بن جاؤں لیکن میرے پاس اتنی رقم نہیں بچتی کہ میں ایک مشت یہ رقم ادا کرسکوں۔ ہاں کئی قسطوں میں ادا کرسکتا ہوں۔ پھر اپنے نجی اخراجات کی تفصیل بتائی۔ مولانا نے یہ سن کر کہا: ''تو پھر آپ اس کے لائف ممبر بننے کی زحمت نہ فرمائیں۔'' لیکن پنڈت جی نے کہا کہ جب تم نے کہہ دیا ہے تو میں لائف ممبر ضرور بنوں گا اور پھر کئی قسطوں میں ایک ہزار کی رقم بھیجی۔

اس کے کچھ دنوں کے بعد دارالمصنفین پر غیر متوقع طور پر عجیب وغریب الزام عائد کیا گیا کہ دارالمصنفین میں ایک رائفل کلب قائم ہے جس میں دو سو عورتیں رات کو رائفل کے ساتھ پریڈ کرتی ہیں۔ یہ مضحکہ خیز رپورٹ سن کر کلکٹر سے کہا گیا کہ یہ ممکن بھی ہے۔ جب کہ اس کے پھاٹک کے ٹھیک سامنے کسان سبھا اور پرجا سوشلسٹ پارٹی کا دفتر ہے اور اس کی پشت پر تھوڑے ہی فاصلہ پر ضلع کانگریس کا آفس ہے۔ اس کے کچھ روز کے بعد مولانا مسعود علی کسی کام سے دہلی گئے تو پنڈت جی سے بھی ملے اور اس رپورٹ کا ذکر کیا۔ اس پر پنڈت جی کہنے لگے کیا لغویات سنائی۔ پنڈت جی سے اس بات چیت کا چرچا بعد میں شہر اعظم گڑھ میں پھیلا اور دارالمصنفین کی تاریخ اور سرگرمیاں جب ضلع حکام کو معلوم ہوئیں تو پھر اس رپورٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

مولانا مسعود علی جب کوئی خط پنڈت جی کو لکھتے تو وہ اس کا جواب اردو ہی میں دیتے اور بعض اوقات اپنے دست خاص سے لکھتے۔ ان کے ایک خط کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

از دہلی

۱۵ر جنوری ۱۹۵۷ء

پیارے بھائی مسود علی[۱]

تمہارا ۱۶ر جنوری کا خط ملا۔ اس میں کچھ بھوپال کے چناؤ کے بارے میں لکھا ہے۔

میں پرسوں دہلی سے باہر جارہا ہوں اور قریبا ایک ہفتہ باہر رہوں گا، پھر ایک دو دن کے لیے آکر فوراً باہر چلا جاؤں گا۔ اس لیے میرا کسی ڈیپوٹیشن سے ملنا مشکل ہے۔ علاوہ اس کے میں نے اس چناؤ کے معاملہ میں بہت کم دلچسپی لی ہے۔ نہ مجھے وقت ہے اس کے لیے اور نہ کچھ طبیعت ہی پسند کرتی ہے۔

میں تمہارا خط لال بہادر شاستری کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ ان کاموں میں لگے ہیں اور کافی محنت کر رہے ہیں۔

میں نے ابھی ان تیس ناموں کو دیکھا ہے جو کہ انگریزی خط میں لکھے ہیں۔ ان میں سے دو صاحبوں سے میں واقف ہوں اور کچھ بہت زیادہ ان کے حق میں میری رائے نہیں ہے۔ کچھ میں ان کے خلاف بھی نہیں ہوں۔

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہاری طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ جب کبھی دہلی آؤ تو ضرور ملنے آنا۔

تمہارا

جواہر لعل نہرو

۱۔ مسعود کے بجائے وہ ''مسود'' لکھتے اور بولتے بھی تھے۔

مولانا مسعود علی کی آنکھوں کی روشنی موتیابند کی وجہ سے کم ہوگئی تو انھوں نے آپریشن کرایا۔ پنڈت جی کو معلوم ہوا تو ان کی خیریت دریافت کی اور لکھا کہ آپریشن کے

سلسلہ میں خرچ کا خیال نہ کرنا، جو بھی خرچ ہوگا اس کا انتظام ہو جائے گا۔ پھر ایک اچھی رقم بھی ان کے پاس بھیجی۔

راقم کو بھی پنڈت جی کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا۔ میں نے پہلی بار ان کو ۱۹۲۸ء میں دیکھا، جب وہ خوب توانا اور تندرست جوان تھے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ان کی انگریزی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ تقریر کے بعد جب وہ پروفیسر حبیب کے بنگلا پر گئے تو طلبا نے ان سے مختلف قسم کے سوالات کیے جن کے جوابات انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ دیے۔ میں بھی اس نشست میں شریک تھا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں جب دہرہ دون میں تھا تو ان کی ایک تقریر سننے کے لیے جو ایک بڑے میدان میں ہو رہی تھی، بڑے ذوق وشوق کے ساتھ گیا۔ جب وہ ۱۹۳۷ء میں دارالمصنفین تشریف لائے تو میں بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ کھانے کے بعد وہ مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین کے سامنے ان کے فضل وکمال کے احترام میں اس طرح بیٹھے جس طرح کوئی بچہ کسی بزرگ کے سامنے بیٹھتا ہے۔ وہ منظر برابر آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ اپنی جیب سے کوئی چیز نکال کر منھ میں ڈالتے جاتے اور فرماتے کہ اس کے چبانے سے گلا صاف رہتا ہے۔ اس کے بعد جب ۱۹۴۶ء میں وہ اعظم گڑھ آئے تو دارالمصنفین میں ان کی شام کی چائے رکھی گئی تھی، لیکن (جیسا کہ پہلے ذکر آیا) وہ مختلف جگہوں کے جلسوں کے پروگرام کی وجہ سے گو رات کے ۸ بجے کے قریب آئے لیکن یہ نہ ہونے دیا کہ دارالمصنفین آنے کی روایت ختم ہو جائے۔ اس موقع پر حضرت سید صاحب بھی موجود تھے اور اس وقت پی. ای. این کے نائب صدر تھے۔ پنڈت جی اس کے ایک جلسہ کے افتتاح کے لیے جے پور بلائے گئے تھے۔ اس کا ذکر آیا تو سید صاحب نے فرمایا کہ میں اس جلسے میں جا رہا ہوں تاکہ اس محاذ سے بھی آواز بلند کروں۔ آپ بھی ضرور آئیں۔

میں ۱۹۵۲ء کے بعد جب جب بھی دہلی گیا تو دور یا نزدیک سے کہیں نہ کہیں جھلک ضرور دیکھ لیتا تھا۔

دہلی میں آزاد بھون کی عمارت کا افتتاح ہوا تو راقم بھی انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے ایک ممبر کی حیثیت سے اس جلسہ میں شریک ہوا۔ یہ جلسہ مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش یعنی ۱۱رنومبر کو رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اس جلسہ کی صدارت کررہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک تھے۔ ڈائس پر بیٹھے کسی سے سرگوشی کررہے تھے اور پروفیسر ہمایوں کبیر مہمانوں کے خیر مقدم کے سلسلہ میں تقریر کررہے تھے۔ تقریر میں ایک جگہ انھوں نے کہا کہ ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ مولانا آزاد کی پیدائش کی تاریخ تو معلوم نہیں لیکن انھوں نے خود اپنے حسن مذاق سے ۱۱رنومبر کی تاریخ مقرر کردی ہے۔ یہ سن کر پورے مجمع نے قہقہہ لگایا۔ پنڈت جی چوکنا ہوکر پروفیسر ہمایوں کبیر کا منھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ ادا بھی عجیب تھی، جلسہ کے بعد انڈین کونسل کے تمام ممبروں سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا۔

دہلی میں آزاد میموریل لکچر کا دوسرا لکچر ہوا تو اس کے لیے مشہور مورخ پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی مدعو کیے گئے تھے۔ لکچر کے بعد ڈنر تھا جس میں پنڈت جی بھی شریک تھے۔ کھانے سے پہلے تمام لوگوں سے فرداً فرداً بہت بے تکلفی سے ملے۔ میں بھی سامنے کھڑا تھا۔ انھوں نے مجھ کو پہچان لیا۔ میں آگے بڑھا تو وہ بھی آگے بڑھے اور مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) کا حال اور مولانا مسعود علی کی خیریت پوچھی۔ ڈنر بوفے تھا، میں پنڈت جی کے پیچھے ہوگیا کہ دیکھوں کھانے میں کن چیزوں کو پسند کرکے اپنی پلیٹ میں رکھتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے اپنی پلیٹ میں تندوری مرغ کا بڑا حصہ رکھا، پھر شامی کباب لیے، کچھ ٹماٹر کے ٹکڑے لیے اور پھر تندوری روٹی لی۔ اس کے بعد آرنلڈ ٹوائن بی کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھ گئے آخر میں آئس کریم کی کافی مقدار کھائی۔

آخری بار ان کو میں نے ۱۹۶۴ء کی جنوری میں دہلی بین الاقوامی اورینٹل کانگریس کے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے دیکھا۔ اس سے پہلے جب بھی ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کبرسنی کے باوجود کبھی بوڑھے، ضعیف اور ناتواں نظر نہیں آئے، لیکن اس مرتبہ میں ان کو نحیف، کمزور، جھکا جھکا، تھکا اور بوڑھا پایا۔ میرے قریب جو لوگ بیٹھے تھے ان میں کسی نے

کہا: ''محنت کرتے کرتے پنڈت جی بوڑھے ہو گئے ہیں، ان کو اب آرام کرنا چاہیے۔'' کسی اور نے کہا بین الاقوامی مسائل نے ان کو پریشان کر رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال تھوڑے دنوں کے بعد ان کی علالت کی خبر ملی اور جب مئی ۱۹۶۴ء کے آخری دنوں میں یکا یک ان کی وفات کی خبر دارالمصنفین پہنچی تو ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے خاندان کا ایک اہم رکن جاتا رہا۔ دارالمصنفین کا ذرہ ذرہ سوگوار تھا اور تمام لوگوں کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ دوسرے دن شہر میں ماتمی جلسہ تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جو یہ کہا ہے کہ ہندوستان میں تین عجائبات ہیں: ہمالیہ، تاج محل اور پنڈت جواہر لال نہرو، تو یہ بہت صحیح تھا۔ دارالمصنفین کے نمائندہ کی حیثیت سے مجھ سے بھی بولنے کو کہا گیا تو میری زبان سے نکلا: ''ابھی یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں تین عجائبات ہیں: ایک ہمالیہ، دوسرا تاج محل اور تیسرا جواہر لال، لیکن میری اپنی رائے ہے کہ ہمالیہ کی بلندی اور تاج محل کے حسن میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ جواہر لال کی ذات میں پوری ہو گئی تھی۔'' اور یہ وقتی جذبات ہی نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔

○○○

سید حامد

مسز اندرا گاندھی

(چند بکھرے ہوئے تاثرات)

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کے مشاہرے اور شرائط خدمت کی چھان بین کرنے اور اس کے بعد کمیشن کو اپنی سفارشات پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ اس کمیٹی نے مسئلہ پر غور وفکر کیا اور اساتذہ جامعات اور ماہرین تعلیم سے مشورہ کرنے کے لیے اپنے اراکین کو مامور کیا۔ میرے سپرد وہ سب کمیٹی کی گئی جو جنوبی ریاستوں کا دورہ کرے گی۔ کرناٹک کے دورے کے بعد ہم لوگ کیرالا آئے، ماہرین تعلیم کے ساتھ ٹری وانڈرم میں ہمارے مذاکرات کا آج دوسرا دن تھا۔ کیرالا یونیورسٹی میں اس ریاست کے تعلیمی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے میرے کان میں یہ روح فرسا خبر پھونکی کہ مسز گاندھی پر آج صبح ان کے مکان میں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور وہ نازک حالت میں انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لے جائی گئی ہیں۔

پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ مسز گاندھی باوجود ان نکتہ چینیوں کے جو وقتاً فوقتاً ان پر کی جاتی رہی ہیں، اس وقت ہندوستان کی سب سے قد آور اور اہم ترین شخصیت تھیں۔ ہندوستان کے پھوٹ ڈالنے والے اور فتنہ برپا کرنے والے عناصر اور رجحانات کو قابو میں رکھنا، ان ہی کا کام تھا۔ انھیں خدا نے وہ قامت اور بصیرت عطا کی تھی جو اتنے بڑے اور پُر پیچ ملک کی رہنمائی کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے بڑی حد تک بہ حیثیت وزیر اعظم اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا جس کی بنیاد ان کے عہد آفریں باپ نے ڈالی تھی۔ ذاتی ذہانت اور

اعلیٰ ظرفی اور بلندیٔ معیار کی بدولت وہ سارے ہندوستان کے لیے موجب احترام تھیں۔
ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی ترجمانی، اس ملی جلی تہذیب کی ترجمانی جس میں ہندوستان کی رواداری اور اس کا وسیع ظرف شامل تھے اور جو جدید مغربی تہذیب کی شائستگیوں، رعنائیوں اور علم طرازیوں سے بھی مستنیر تھی، جس قرینہ اور جمال کے ساتھ اندرا گاندھی نے کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ماضی، اس کے عبوری حال اور تابناک مستقبل کے لیے اس کے منصوبوں اور عزائم کی پیکر تھیں۔

نہرو خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ سونے کے نوالے اور سنہری شہرت کے ساتھ پیدا ہوئیں۔ ہر چند کہ بچپن میں ہی سانس انھوں نے سیاست کے ماحول میں ہی لی، لیکن منظر عام پر وہ کانگریس کے صدر (۱۹۵۹) کی حیثیت سے آئیں۔ بہ حیثیت صدر کے ان کی کارگزاری نے جمنا کی لہروں کو شعلہ بار نہیں کیا اور بہ حیثیت وزیر اطلاعات (۱۹۶۴) بھی انھوں نے کارگزاری اور کارسازی کے کوئی ہوش ربا نقوش محکمہ کے اوراق پر ثبت نہیں کیے۔ بہ ظاہر ایک نازک سی، کمزور سی، کم آمیز، کم آواز حسین خاتون سے زیادہ توقعات کی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ جب یہ سنا گیا کہ وہ جواہر لال نہرو کی جانشین ہوں گی تو خیر خواہوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوئے۔

لال بہادر شاستری جی کے تاشقند میں اچانک انتقال کے بعد جب اندرا گاندھی کو وزارت عظمیٰ کے لیے چنا گیا تو دلوں میں طرح طرح کے اندیشوں نے سر اٹھایا۔ ''اس برصغیر کی مہار ایک نازک سی خاتون کے ہاتھ میں دے دینا کہاں کی دانش مندی ہے، حد ہوگئی خاندان پرستی کی۔'' بعض نکتہ چینیوں نے کہا اور شروع شروع میں ایوان میں نئی وزیر اعظم کی کارگزاری اور گفتگو میں عدم اعتماد، ہچکچاہٹ اور لکنت کے انداز ہمدردوں کی حوصلہ شکنی اور عام ہندوستانیوں کی تشویش کے لیے کافی تھے، لیکن آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوتا گیا۔ نقشہ بدلتا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ بہ ظاہر نحیف و نازک خاتون خوش پوش، خوش اطوار، خوش بو، نفاست پسند خاتون، دل بھی رکھتی تھی اور دماغ بھی اور آہنی گرفت بھی، وہ دل جس میں جرأت تھی اور وہ دماغ جو روشن تھا اور جس میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی اور وہ ہاتھ جن کی

پکڑ کبھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کا سکہ بیٹھتا گیا۔ اس کی آواز اور انداز میں اعتماد اور گفتگو میں روانی آتی گئی اور پھر سیاست کی ڈوریاں سمٹ کر اس کے ہاتھوں میں آگئیں اور ان کے سروں پر جو رہنما اور وزرا اور بااثر اور مقتدر انسان تھے، ان کی حیثیت دیکھتے ہی دیکھتے کٹھ پتلیوں کی سی ہو گئی۔ اس نے سیاست کے گُر سیکھ لیے اور کہنہ مشق شاطروں کو پے در پے مات دی۔

اور وہ دن بھی آگیا جب اس کا قد اس پارٹی سے بھی اونچا ہو گیا جس نے اسے اعلیٰ وزارت کے لیے چنا تھا۔ وہ پارٹی اس کی ذات سے کسبِ اقتدار و اعتبار کرنے لگی۔ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۲ء میں اس کے شانوں پر کانگریس پارٹی نے عام چناؤ جیتا۔ ۱۹۷۲ء سے تین سال پہلے اس نے بینکوں کو سرمایہ داروں کے شکنجہ سے نکال کر قوم کے تصرف میں دے دیا تاکہ وہ خلق کی بھی خدمت کر سکیں۔ کانگریس کے فرسودہ اصنام کو توڑ کر اس نے نئی کانگریس کی بنا ڈالی۔ اس کے نکل آنے سے پرانی کانگریس میں جان ہی نہ رہی اور بڑے بڑے بت سر کے بل گر گئے، اور ایسا ایک بار سے زیادہ ہوا۔

باوجود زبان کی نرمی اور لہجہ کی شیرینی کے اس نے سب سے مناسب فاصلہ رکھا۔ جہاں کسی نے قریب آنے کی کوشش کی یا یہ ظاہر کیا کہ وہ وزیر اعظم کے مزاج میں دخیل ہے، وہیں اس کو اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا، کسی کی مجال تھی کہ اس کی نگاہ میں اپنی اہمیت کے پل باندھ سکے۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما اور ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اس کے دست نگر اور اس کی نگاہِ کرم کے طالب ہو گئے۔ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا۔ کیا مجال کہ دوسرے اُف بھی کر سکیں۔

ایک انگریزی میگزین نے اسے ہندوستان کی ملکہ (امپیریس آف انڈیا) کہا تھا۔ اس کے بہ ظاہر نازک ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت تھی۔ کہا جاتا تھا کہ کابینہ میں صرف ایک مرد ہے، اندرا گاندھی (اور وہ بھی مردِ آہن)۔

مسز اندرا گاندھی کے شانے اتنے فراخ نہ تھے جتنے ان کے عظیم باپ کے، اور نہ دل اتنا وسیع، نہ دماغ اتنا باخبر، لیکن انتظامی امور میں وہ ان سے زیادہ موثر تھیں۔ فیصلہ اور

کام کی راہ میں وہ تکلف، مروّت اور مراعات کو حائل نہ ہونے دیتی تھیں۔ فیصلہ کا نفاذ بے دریغ کراتیں اور چالاکی اور سینہ زوری اور سازش کرنے والوں یا وزارت عظمیٰ کے خواب دیکھنے والوں کی سرکوبی انتہائی شائستہ چابک دستی کے ساتھ کرتیں۔ زبان پر کوئی سخت لفظ نہ آتا، ملنے کی نوبت بھی نہ آتی اور سرکش اور سازشی کو پتہ چل جاتا کہ وہ آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا ہے۔ باریابی کے دعوے دار کو اچانک پتہ چلتا کہ دروازہ اس پر بند کردیا گیا ہے۔ سر ٹکرائے گا تو بھی نہ کھلے گا۔ جو معتوب یا مشتبہ ہو او وہ خواہ کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو، ہفتوں انتظار کرے تب بھی حاضری سے محروم رہے گا۔ اپنا سا منھ لے کر واپس چلا جائے گا۔ اس طرح لوگوں میں احساسِ تناسب بنا رہا اور مرکزی شخصیت کے وزن و وقار کی بالاتری پر آنچ نہ آئی۔

خفگی یا اختلاف کا اظہار براہ راست شاذ ہی ہوتا۔ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کم ہی کی جاتی۔ آپ باتیں کر رہے ہیں، کوئی بات اہم یا التفات کی مستحق سمجھی گئی تو سر اُٹھا کر دیکھ لیا۔ یہ آپ کی فراست پر منحصر ہوتا کہ اس اُٹھتی ہوئی نگاہ سے کیا نتائج اخذ کرتے ہیں اور ردِ عمل کی بابت کس قیاس کو راہ دیتے ہیں۔

اس نازک اور خوش اندام و خوش قطع عورت کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ دنیا میں کسی حکمران کو رات دن اتنے بڑے بڑے گوناگوں حوصلہ شکن سکون آشوب مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جتنے کہ ہندوستان کے وزیر اعظم کے حصہ میں آتے ہیں، لیکن اندرا گاندھی ان مسائل و مصائب سے ہمیشہ تازہ دم نکلیں۔ ایسے مسائل کے بوجھ کے نیچے مضبوط سے مضبوط کمر ٹوٹ جاتی لیکن یہاں جبیں پر شکن تک نہ آئی۔ وہی تازہ دمی، وہی تبسم نما سکون، وہی نفاست، وہی شادابی، وہی شگفتگی۔ گویا ایک نازوں کی پلی ہوئی خوش حال خاتون ہے جس کے چمن کو بادِ سموم اور جس کے دامن دل کو فکروں نے چھوا تک نہ ہو، جس کا منتہائے آرزو، خوش باشی اور خوش پوشی ہو، جس نے ڈرائنگ روم سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ جو شخص بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ کون ہیں ان سے ملے اسے گمان بھی نہ ہو کہ اس خاتون نے زمانہ کے سنگین سے سنگین، پُرآشوب سے پُرآشوب، جگر دوز سے جگر دوز مسائل سے

لوہا لیا ہے اور کسی ایسے ہی مسئلہ سے نبرد آزمائی کر کے ابھی ابھی آ رہی ہے۔ ریشم کی ڈوری مضبوط ہوتی ہے، سن رکھا تھا لیکن نہ اتنی مضبوط کہ فولاد شرمائے نہ اتنی قاطع کہ سیوف کو رشک آئے۔

اس خوب صورت چہرے کی پاکیزہ کشش کو ہزاروں دلوں نے محسوس کیا ہے۔ نہ معلوم کتنے دل اس انتہائی دل آویز مسکراہٹ سے کھل اُٹھے ہیں۔ وہ مسکراہٹ جو مونا لیزا کے تبسم کی طرح پُر اسرار نہیں لیکن اس سے زیادہ دل کش ہے اور اسے سادہ نہ سمجھئے، پُر کار بھی ہے اور رمز آلود بھی، کبھی اس میں پایانِ گفتگو کی آہٹ ملتی ہے، کبھی یہ دانستہ کوشش کہ جانے والا بے التفاتی کا گلہ کرتا ہوا نہ جائے۔ کبھی یہ بے محل بات کو ٹالنے کی تدبر ہے، کبھی دل موہ لینے کا حربہ، کبھی یہ فہمایش کہ ان چند لمحات سے زیادہ مقسوم نہیں ہیں، تشریف لے جایئے۔

ایمرجنسی کے دوران اہل نفاذ نے زیادتیاں کیں جس کا خمیازہ مسز گاندھی کو بھگتنا پڑا، لیکن وہ سپر انداز نہیں ہوئیں، اس وقت سب یہ سمجھتے تھے ان کا سیاسی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اس وقت بھی ان کے حوصلے پر آنچ نہیں آئی، نہ سکون نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ ان کی شخصیت کا یہ جادو تھا کہ ویرانہ میں رہتے ہوئے بے منصب و جاہ بھی اگر وہ کسی سفارتی جلسے میں چلی جاتیں تو سب لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ برسر اقتدار وزیر خارجہ کو چھوڑ کر۔

مصیبت اور معزولی کے ان آیام میں کچھ لوگوں نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کی خدمت میں برابر جاتے رہے۔ ایک روز بڑے امتنان کے ساتھ ایسے لوگوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شبنم کی بوندیں آہن کے حصار میں ہیں۔

راقم نے پہلی بار قریب سے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ اسی طیارہ سے جس میں وہ سفر کر رہا تھا بمبئی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد کئی ایک بار ان مجلسوں میں شریک ہوا جن کی وہ صدر تھیں۔ ان میں سے ایک مجلس قومی یک جہتی کونسل کی تھی۔ ذکر مسلم اقلیت کے اعتماد اور خوش حالی کو بحال کرنے کا تھا۔ اس مجلس میں غفور صاحب (اس وقت بہار کے وزیر اعلیٰ)

نے مذاکرہ میں شرکت کرتے ہوئے کہا تھا کہ محترمہ آپ کسی مسلمان کو صدر یا چیف جسٹس بنائیں یا نہ بنائیں مسلمانوں کو تھانوں میں مامور ضرور کر دیجیے کیوں کہ اس کا بڑا اثر مسلمانوں کے احساسِ سلامتی و احساسِ اختیار پر پڑے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری جب میں نے قبول کر لی تو وزیر اعظم سے ملنے گیا۔ رخصت کے وقت کہنے لگیں کہ آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ حوصلہ بڑھانے کا یہ ایک طریقہ تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

آساں روی اور طوائف الملوکی کے بعد نظم و ضبط اور قواعد و ضوابط کا نفاذ متاثرہ عناصر کو گراں گزرا۔ ہنگامہ برپا کیا کہ شیخ الجامعہ کے پیر اُکھڑ جائیں یا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ طلبا کے گمراہ سربراہوں نے کسی اشارے پر خاک و خون کی تیاریاں کیں۔ خود قلعہ نشین ہو گئے اور معصوم لڑکوں کو آگ میں جھونک دیا۔ پولیس کو دفاع میں گولی چلانا پڑی اور ایک معصوم عزیز کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہی ہو گیا جس کو بچانے کے لیے میں پے در پے جتن کرتا اور خطرے اُلٹاتا چلا آیا تھا۔ میں نے شدتِ غم میں استعفیٰ دینے کی ٹھان لی۔ یہ بات دلی پہنچی اور وہاں سے چشم زدن میں ڈبائی جہاں وزیر اعظم دورے پر گئی ہوئی تھیں۔ ابھی دلی سے یہ بات ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وزیر اعظم کا پیغام پہنچا کہ استعفیٰ دینے کا سوال نہیں ہوتا۔ ثابت قدم رہیے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے دور، اہم امور میں گھرے ہونے کے باوجود مسز گاندھی نے میری ڈھارس بندھانے اور سبک دوشی سے باز رکھنے کا یہ اہتمام کیا۔ یہی نہیں دوسرے روز منھ اندھیرے اس وقت کے وزیر داخلہ (حالیہ صدر جمہوریہ) وائس چانسلر کے مکان پر تشریف لائے، بہ ظاہر بہ چشم خود حالات کو دیکھنے کے لیے، بہ باطن اسی پیغام کو دہرانے کے لیے، چند ماہ بعد مسز گاندھی سے ملاقات ہوئی تو میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی اس خصوصی توجہ نے اس نازک وقت میں میرے دل کے تاروں کو چھو دیا تھا۔ اس سانحہ کے بعد طالع آزماؤں نے یونیورسٹی کو اپنے ذاتی یا سیاسی مقاصد کے لیے تسخیر کرنا چاہا۔ میں سدِراہ بنا ہوا تھا چنانچہ تین سال تک لگاتار ایک گروہ مجھے خلاف وزیر اعظم کے کان بھرتا رہا لیکن مسز گاندھی نے نہ رائے بدلی

نہ رُخ۔ میں نے البتہ ان سے معذرت کی کہ میری وجہ سے ان کو الجھن میں ڈالا جاتا ہے۔ راقم سطور کے متعلق ان کی جو کچھ رائے رہی ہو اس سے قطع نظر، ان کے انتظامی شعور نے اس کی اجازت نہیں دی کہ احتجاج کی رو میں کسی وائس چانسلر کو سبک دوشی پر مجبور کر دیا جائے۔

اس دردناک سانحے کے بعد یونیورسٹی کو بند کرنا پڑا تھا، جب کھولنے کا ارادہ کیا تو انتظامیہ نے حامی نہیں بھری۔ ریاستی حکومت کو یقین دلایا گیا تھا کہ یونیورسٹی کھلی تو بہت بڑا تصادم ہوگا۔ کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتے ہوئے احتجاج کر رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا، لیکن کون سنتا تھا جن حضرات نے یونیورسٹی بند کرانے کے ڈول ڈالے تھے ان کی انتھک کوشش تھی کہ یونیورسٹی کھلنے نہ پائے، لڑکوں کا ایک سال تو ضائع ہو ہی جائے۔ پھر دیکھیں وائس چانسلر کیسے رُکتا ہے۔ یہ گتھی بھی مسز گاندھی کے خاموش اشارے نے سلجھائی۔ وزارت داخلہ میں مجلسیں ہوئیں اور یونیورسٹی کھلی اور سکون اور امن کے ساتھ پڑھائی ہوئی اور ضائع ہوتا ہوا سال موت کے جبڑے سے نکال لیا گیا۔

یونیورسٹی کی اقامت گاہوں میں بڑا ہجوم تھا۔ ضرورت تھی ان میں اضافہ کی۔ ایک عرصۂ دراز سے کوئی ہوسٹل نہیں بنا تھا۔ کمیشن اور وزارت میں کون سنتا۔ یہاں بھی وزیراعظم کی ذاتی دلچسپی نے دروازے وا کر دیے اور اس زرِ خطیر سے جو منظور ہوا ایک نئے ہال کی خوب صورت عمارت کھڑی کر دی گئی جو علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہے اور جس میں سات سو طالب علموں کے لیے جگہ ہے۔

یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لیے ۱۹۶۶ء سے ہندوستان کے مسلمانوں نے جدوجہد شروع کی، قربانیاں دیں، یہاں کی تعلیمی فضا مکدر ہوگئی۔ احتجاج کر کر کے لوگ تھک کر بیٹھ گئے۔ مرادآباد میں فسادات ہوئے، پھر علی گڑھ شہر میں، اور بازیابیِ کردار کی مانگ دب گئی۔ اس وقت جب یہ مطالبہ ایک عرصہ سے فضا میں نہ تھا، اچانک یہ منظور کر لیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا، یہ بات ابھی صیغۂ راز میں ہے اور رہے گی، لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد بہت دیر تک یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائی کا حوصلہ کسی کو نہ ہوسکا۔ حالات کا یہ بھی ایک طنز ہے کہ ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ نے جس کے ذریعہ مسلمانوں کا

مطالبہ منظور ہوا اور روایتی کردار بحال کیا گیا۔ بالآخر ہدف اسی کو بنایا گیا جس کے لیے یہ ساری جدوجہد کی گئی تھی، نکتہ چیں خندہ زن ہیں کہ اقلیتی کردار کیا اسی کو کہتے ہیں:

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظ دارد
وای گر در پس امروز بود فردائی

پھر ایک وقت آیا کہ ساری مرکزی یونیورسٹیوں کے لیے ایک مشترک ایکٹ کی تجویز کی گئی۔ یونیورسٹیوں کی خود اختیاری معرض خطر میں پڑ گئی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے احاطہ میں کہرام مچ گیا کہ ایک ہاتھ سے روایتی کردار دیا گیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے واپس لیا جا رہا ہے۔ ایک بڑی ریلی ہوئی۔ راقم نے اس ریلی کی صدارت کی اور اس کا رُخ آئینی مانگ کی طرف موڑا اور کہا کہ ایک نمائندہ گروہ وزیر اعظم سے ملے، میں اس کی سیادت کو تیار ہوں۔ دوسری یونیورسٹیوں کی نگاہ بھی ہم پر تھی، چنانچہ بھان متی کے کنبہ کو لے کر راقم سطور مسز گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں تو یہ عالم تھا کہ تار باجا اور راگ بوجھا۔ میں اس اقدام کے مضمرات کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ انھوں نے انتہائی شگفتگی کے ساتھ بات کی تہہ تک پہنچنے کی خبر دے دی۔ ہامی تو نہ بھری لیکن ہم مطمئن واپس آئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن اس مشترک بل کا سراغ بھی کسی کو نہیں ملا۔ مسز گاندھی کے کام کرنے کا یہی انداز تھا۔ انھیں بات کی تہہ تک پہنچنے اور فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگتی تھی، لیکن اس کا اعلان دورانِ گفتگو کرنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں، ایک تو یہ کہ جب تک ان کا دفتر جس میں انھوں نے لائق ترین افسروں کو جمع کر رکھا تھا، تجویز کو چھان پھٹک کر دیکھ نہ لے، کوئی حتمی وعدہ کرنا بعد میں دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ دوسرے اس طرح وہ ملنے والوں کو ان کی جگہ پر رکھ سکتی تھیں تا کہ ضروری فاصلہ درمیان میں رہے اور گفتگو سوال و جواب یا برابری کی سطح پر بات چیت کی شکل، اختیار نہ کر لے ان کا طور ڈالفن کا سا تھا جس کی پشت بقول شیکسپیئر پانی میں رہنے کے باوجود تر نہیں ہوتی۔ اس بات پر اب اتفاق ہے کہ مسز گاندھی مشورہ بہتوں سے کرتی تھیں لیکن فیصلہ ان کا اپنا ہوتا تھا۔ ابتدا میں لوگ سوچتے تھے کہ ان کے مشیران کے لیے فیصلہ کرتے ہیں لیکن بعد میں یہ بات واضح ہو گئی کہ نہیں، فیصلہ کیا ہو اور کب ہو، یہ سب کچھ وہ

خود طے کرتی تھیں۔ فیصلوں کی ضمن میں ایک عالم ان کے انتخاب ساعت کا قائل تھا۔ صحیح وقت پر فیصلہ کرنے کے لیے ان کے پاس گویا ایک چھٹی حس تھی۔ بینکوں کو قومی تصرف میں لانے کا فیصلہ اتنا برمحل اور بروقت نکلا کہ اس نے ہندوستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا اور اس وقت سے ان کی سیادت کا سکہ چلنے لگا۔ بہت سی مثالوں میں سے یہ صرف ایک مثال ہے۔

ہر وہ شخص جو آگے بڑھنے اور لے چلنے کے لیے بے تاب ہو، وہ جمہوریت اور اہل کاروں کی آہستہ خرامی سے گھبرا جاتا ہے۔ کام اگر کرنا ہے تو ان تکلفات اور ضوابط اور لایعنی اور پُر تاخیر موشگافیوں کو بالائے طاق رکھنا ہوگا، اندرا گاندھی نے بھی یہی کیا۔

لیکن سارا اختیار جب ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ اپنے خطرات بھی ساتھ لاتا ہے۔ پھر انسان دوسروں کی رائے کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا اور رائے دینے والے بھی اپنی رائے کو صاحبِ اختیار کی رائے یا رجحان اور افتاد کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں۔ گویا صاحبِ اختیار آزاد اور پُرخلوص رائے سے خود کو محروم کر لیتا ہے۔ اسے جو مشورہ ملتا ہے وہ خود اس کے رجحان کی پھیکی سی نقل ہوتا ہے۔ اپنی ہی آواز کی گونج اس کے کانوں میں آتی ہے اور وہی بھلی لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک خطرہ اور پیش آتا ہے۔ صاحبِ اختیار جو دراصل عوام سے طاقت اخذ کرتا ہے، ان سے کٹنے لگتا ہے، دور ہو جاتا ہے، محصور ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ اندرا گاندھی کا ہاتھ عوام کی نبض پر تھا پھر بھی ان سے ان کا رابطہ وہ زندہ اور پیوستہ رابطہ نہیں رہا تھا جس کی بنا گاندھی اور نہرو نے ڈالی تھی۔ ان کو سلامتی اور تحفظ کے لیے ایک حد تک دامن کش اور روپوش رہنا پڑا۔

شروع میں کانگریس کے جن مکھیاؤں نے اندرا گاندھی کو وزیراعظم کی گدی پر اس امید کے ساتھ بٹھایا تھا کہ حکومت اندرا گاندھی کی ہوگی اور راج وہ کریں گے، انھیں مایوس ہونے میں دیر نہ لگی۔ یہ 'اتالیق' اسی سرعت کے ساتھ ہٹا دیے گئے جس سے نوخیز اکبر نے بیرم خاں کو اختیار اور راستہ سے ہٹا دیا تھا۔ اوّل تو وہ کام کرنے نہ دیتے، دوسرے نہرو کی بیٹی دوسروں کی تابع فرمان کب ہونے والی تھی، تیسرے وہ اصلاحات جو غریبوں اور کمزوروں کے حق میں تھیں کہنہ دماغوں کو راس کیوں کر آتیں۔

اشوک مترا نے جو ایک سبک دوش سول سروینٹ ہیں اور جنھیں شعبۂ اطلاعات میں اندرا گاندھی کے ساتھ کام کرنے کا اور ان کی مجلسوں اور مشوروں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسٹیٹ مین میں اپنے مضمون میں اندرا گاندھی کے بیکراں اختیارات کے مضر اثرات کا ذکر اس طور کیا ہے:

"۱۹۶۹ء میں کانگریس پارٹی کے جس وقت دو ٹکڑے ہوئے جس سے سول سروینٹ کے اس حق پر جو آزاد رائے دینے سے عبارت تھا، بندشیں لگنا شروع ہو گئیں۔ کلّی اتفاق یا کمٹ منٹ کی اصطلاح نے معاملہ کو اور سنگین بنا دیا۔ اندرا گاندھی یہ سمجھنے لگیں کہ حکومت کرنا ان ہی کا فرض اور حق تھا اور اسی اعتماد کے ساتھ ہندوستان کے وفاقی نظام کے ڈھانچے کو توڑا مروڑا گیا۔ مسز گاندھی کا کارنامہ زبردست اور ہیبت آفریں ہے۔"

اندرا گاندھی نے بہ حیثیت وزیراعظم ۱۶ سال کے عرصہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے ملک کے اتحاد پر جراحت نہ آنے دی۔ غریبوں اور کمزوروں کے لیے ان کا دل ہمیشہ پگھلتا رہا اور ان کا نصب العین غریبوں، پس ماندوں، مظلوموں کو علم اور خوش حالی سے روشناس کرانے کا تھا۔ انھیں اپنے عظیم باپ کی طرح جو گرم جوش تائید ملی، ان کی شخصیت میں جو کبریائی طاقت تھی، اس کا راز نہ صرف اس رومانی عقیدت میں تھا جو ہندوستانیوں کو نہرو خاندان سے تھی، وہ خاندان جو اپنے رنگ، روپ، قامت، جمال اور خدوخال کے لیے مشہور تھا، بلکہ اس احساس میں بھی کہ اتنے خوش حال اور آسائش خو افراد نے وطن کی آزادی کے لیے ساری آسائشیں اپنے اوپر حرام کرلیں اور ساری تکالیف کو گوارا بنا لیا۔ اندرا گاندھی کی پرستش اس لیے بھی کی گئی کہ وہ عورت تھیں۔ وہ عورتوں کے شعور اور امکانات کی علامت بھی تھیں، لیکن ان سب سے زیادہ جس چیز نے جواہر لال اور اندرا گاندھی کی شخصیتوں میں وہ کبریائی سحر بھر دیا جسے کیرزما کہتے ہیں وہ اہل ہند کے دلوں میں یہ احساس تھا کہ وہ ایک روشن مستقبل کا تصور رکھتے ہیں اور بشارت لائے ہیں۔

وہ دیانت، ذہانت، لیاقت، بصیرت سے لیس ہیں۔ وہ ریاستی، لسانی، مذہبی اختلافات اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہیں۔ وہ ملک کو عہد حاضر کے شانہ بہ شانہ چلانے کے خواب دیکھتے ہیں اور خواب کو تعبیر میں بدلنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کو وسائل اور سائنسی اور ٹیکنیکل انفرااسٹرکچر مضبوط کیا۔ وہ ایسی زبان بولتے ہیں جو ہندوستان میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اتنے خوش حال اور نفاست پسند ہونے کے باوجود عوام پر جان دیتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے ناوابستہ ممالک کی سربراہی اعتماد اور قابلیت اور قرینہ کے ساتھ کی۔

اشوک مترا نے ۱۹۶۰ء میں اندرا گاندھی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اس ڈھنگ سے کیا ہے: ''وہ شرمیلی اور لجائی ہوئی سی تھیں۔ حیا نے ان کے چہرے پر سرخی کی لہریں دوڑادی تھیں اور بولنے میں انھیں تامل تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی زندگی تنہائی اور حفاظت میں گزری ہو۔''

میں نے ملاقاتوں کے دوران ان سے بات چیت کا آغاز بالعموم انگریزی میں کیا۔ اس خیال سے کہ فاصلہ رکھنے اور ضابطہ کو نبھانے کے لیے بیرونی زبان کارآمد ہے اور مادری زبان میں قرب اور بے تکلفی کا پہلو آجاتا ہے، لیکن وہ ہمیشہ مجھے اردو کی طرف لے آئیں۔ شاید وہ ایک یوپی والے کی غیر مخلوط اردو سننا چاہتی تھیں جو شائستگی کے آداب اور معنویت کی پرتیں اور لطافت کی تہیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ انھوں نے گزشتہ چار سال کے دوران یونیورسٹی میں کبھی مداخلت نہیں کی لیکن اس کے وائس چانسلر کی مدد اور پشت پناہی میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اگر کوئی صلاح دینی ہوئی بھی تو براہ راست کبھی کچھ نہیں کہا:

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اندرا گاندھی کی عظمت کو ان کی زندگی میں تسلیم کرلیا گیا تھا۔ موت نے اس میں اضافہ کردیا۔

ان میں کام کی لگن اور ریاضت کی صلاحیت لامحدود تھی۔ ٹیلی ویژن پر ان کے معالج (معالج نہیں طبیب کہ ان کو علاج کی نوبت ہی نہ آتی تھی) نے بتایا کہ وہ روز سولہ سترہ گھنٹے کام کرتی تھیں۔ مشکلات کا وہ خیر مقدم کرتیں، چیلنج کو دوڑ کر قبول کرتیں۔

میری اندرا گاندھی سے آخری ملاقات ۲۶ را کتوبر ۱۹۸۴ء کو ہوئی تھی۔ ذاکر حسین کالج ٹرسٹ کی میٹنگ میں، بات بات سے شائستہ اور دل نواز شگفتگی اور خندہ جبینی مترشح ہو رہی تھی۔ وہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں علی گڑھ آ رہی تھیں، شاید اس روز جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں وہ یہاں ہوتیں لیکن ایسا ہونے کو نہ تھا۔ موت کے مظالم ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا۔

بہ حیثیت وزیر اعظم کے انھوں نے یونیورسٹی میں قدم نہیں رکھا۔ وزیر اعظموں میں وہی ایسی تھیں جنھیں یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار انھیں علی گڑھ آنے کی دعوت بھی دی۔ انھوں نے متبسم ہو کر ہامی بھر بھی لی، لیکن ہر بار آنا ٹل گیا کہ ایک گروہ کی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ نہ آئیں۔ وہ یہاں آتیں تو انھیں زبردست خیر مقدم سے نوازا جاتا۔ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائی جاتیں۔ علی گڑھ کی روایتی مہمان نوازی کو ان کی صنف اور دل پذیر شخصیت اور ان کے حسن و جمال سے ایڑ لگتی، اور وہ آتیں تو یونیورسٹی کو کچھ دے کر جاتیں۔ میں نے آخر میں انھیں لکھ دیا تھا کہ میں نے طے کر لیا ہے جب تک وزیر اعظم نہیں آتیں میں تقسیم اسناد کا جلسہ (کونووکیشن) نہیں کروں گا۔ انھوں نے سوچا کہ جانا چاہیے مگر نہ آسکیں، اور جو امید بندھی تھی وہ مایوسی میں بدل گئی۔

اندرا گاندھی اپنے باپ کی طرح نڈر تھیں۔ ذاتی خطرہ کا انھیں احساس تک نہ تھا اور محنت سے دامن چرانا ان کے تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ چیلنج کو بنا آنکھ جھپکائے قبول کرتیں۔ خطرہ میں کود پڑنا ان کی ادا تھی۔ ٹیلی ویژن پر ہی مسز سبھدرا جوشی نے بتایا کہ تقسیم کے ایام میں گھرے ہوئے اور ستائے ہوئے مسلمانوں کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ نکلتیں اور بے دھڑک ان مجمعوں میں چلی جاتیں جہاں ہر لمحہ ان کی جان کا جوکھوں تھا۔ ڈاکٹر ماتھر نے یہ بھی بتایا کہ ان کی نگاہ جزئیات پر تھی اور وہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مامور تھے خاص خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار دورے پر ڈاکٹر ماتھر کی سال گرہ پڑی۔ اندرا گاندھی نے ایک خوب صورت نظم اس موقع کے لیے لکھی، اور تبریک کے ہدیہ اور دل دہی کے وسیلہ کے طور پر انھیں بھیج دی۔

نہرو خاندان کی روایت کے مطابق انھیں اقلیتوں اور ہریجنوں اور آدی واسیوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح سے گہری دلچسپی تھی، لیکن باوجود ان کوششوں کے یہ لوگ تیرِ ستم کا نشانہ بنتے رہے۔ مسلمانوں نے اکثر ان کا ساتھ دیا لیکن کہا جاتا ہے کہ آندھرا پردیش اور کرناٹک کے انتخابات کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے کچھ بے نیازی برتنا شروع کردی۔ فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو گلہ مند کر دیا تھا۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی انھیں مسلمانوں کی زبان، تمدن اور اطوار سے دلچسپی تھی جس کا تقاضا ان کے بچپن کا ماحول اور ان کا سیکولر اور جمہوری مزاج کرتا تھا۔

مسز گاندھی کے قتل کی خبر پاکر خلقت سکھوں پر ٹوٹ پڑی۔ یہ جنوں نہیں تو اور کیا ہے۔ جو لوگ مارے گئے یا لوٹے گئے ان کا گناہ کیا تھا۔ دوسروں کے قصور کی سزا انھیں کیوں ملی۔ کیا انصاف اسی کا نام ہے؟

اندرا گاندھی کے ہمیشہ تازہ دم رہنے کے دو راز ہیں: کام میں انہماک اور کام کرنے کا حوصلہ اور اپنے اوپر غیر معمولی قابو اور ایک مرتب نظامِ زندگی۔ ہر چیز سانچے میں ڈھلی ہوئی، ہر چیز ناپی ہوئی، تلی ہوئی، مشکل کام قاعدے سے کیا جائے تو سہل ہو جاتا ہے، آسان کام بے قاعدگی سے کیا جائے تو زندگی خلش اور خلفشار میں گزرتی ہے۔ ان کی زندگی بہت مرتب اور منضبط تھی۔ اسی وجہ سے وہ مصروف رہتیں لیکن مصروف نظر نہ آتیں۔

۲ر نومبر کی شب میں تین مورتی اندرا گاندھی کے آخری دیدار کے لیے گیا۔ سارا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ خوب صورت چہرہ موت کے سایہ میں بھی خوب صورت لگ رہا تھا اور وہ تراشے ہوئے خدوخال اپنے یونانی زاویوں کو لیے ہوئے اس آہنی قوتِ ارادی کا اعلان کر رہے تھے جس نے ۱۶ سال تک ہندوستان کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دیا اور جس نے اقوامِ عالم کی انجمن میں ہندوستان کو مقامِ امتیاز عطا کیا۔
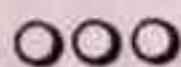
○○○

ساقی فاروقی

فیض احمد فیض

'زادِ سفر' کا ایک ورق

اگلے زمانے میں جن لوگوں کو کچھ بھی علمی ذوق ہوتا تھا وہ اپنے پاس ایک ایک بیاض رکھا کرتے تھے۔ کبھی اس کی تقطیع کتابی ہوتی جس کا شیرازہ عرض میں کاغذوں کو موڑ کر باندھا جاتا ہے، کبھی طول میں کاغذوں کو یہی کی طرح موڑ کر باندھتے۔ وہ ایک سادی کتاب ہوتی جو ہر وقت پاس رہتی۔ چھاپہ خانہ اس زمانے میں نہیں تھا، کسی خوش قسمت کو خود لکھ کر یا لکھوا کر کتابیں مل بھی جاتیں تو اس زمانے میں جب کہ ریل نہیں تھی اور اس طرح سفر آسان اور سہل نہیں تھا، کتابوں کو اپنے ساتھ ساتھ سفر میں رکھنا دشوار تھا اور رکھتے بھی تو سارا کتب خانہ کہاں کہاں لیے پھرتے۔ وہی سادی کتاب ساتھ رہتی۔ اسی وجہ سے اس بیاض کا ایک نام ''زادالسفر'' بھی تھا۔

سید عبدالحی
مصنف 'گلِ رعنا' لکھنؤ
۶ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ

فیض صاحب کے انتقال کے فوراً بعد، لندن کے ایک تعزیتی جلسے میں، جو تقریر میں نے کی تھی اس کے ابتدائی جملوں کو آج اس لیے دُہرا رہا ہوں کہ اپنا دکھ آپ تک پہنچا سکوں اور اس لیے بھی کہ ان افواہوں اور غلط فہمیوں کی تردید ہو سکے جو میری ایذا کے لیے بعض دل آزار معزز خواتین و حضرات، ہم عصروں نے پھیلا رکھی ہیں۔

معزز خواتین و حضرات:

ایک اندازے کے مطابق کم از کم تیرہ کروڑ اسی لاکھ سولہ ہزار نو سو دو افراد فیض صاحب کے نام سے واقف ہیں۔ ان میں سے پچاس فی صد ایسے ہیں جنھیں ان سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ دس فی صد ایسے ہیں جنھوں نے ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ ان میں سے پانچ فی صد ایسے بھی ہوں گے جن کے کاندھے پر مرحوم نے اپنا دل دار ہاتھ رکھ دیا ہوگا۔ اب وہ چلے گئے ہیں تو تیرہ کروڑ اسی لاکھ سولہ ہزار نو سو دو سینوں میں کہانیاں پھڑ پھڑا رہی ہیں۔ بڑا شاعر کیا کرتا ہے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر جب بڑا آدمی جاتا ہے تو کہانیاں ہی کہانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ افسوس کہ ضعف حافظہ کے باعث لوگوں نے حفیظ جالندھری مرحوم کی کوئی کہانی سنبھال کے نہ رکھی لیکن فیض صاحب والے اس سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں کے ہجوم میں ایک نہایت افسردہ، معمولی اور بے شمار میں بھی ہوں...

ابھی فیض صاحب میرے اندر ٹپ ٹپ کرتے ہوئے آنسوؤں کے پردے میں ہیں اس لیے ان کی شخصیت پر کوئی ڈھنگ کی بات کہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ جب یہ پردہ ہٹے گا اور دھند چھٹے گی تو اپنی ننھی منی داستان میں بھی سنا دوں گا جو چالیس پچاس ملاقاتوں پر مبنی ہے، جو ۱۹۶۴ء میں اسپینیرڈس اِن (Spaniard's Inn) لندن میں شروع ہوئی تھی اور ۱۹۸۴ء میں زہرا نگار اور ان کے میاں ماجد علی کے مکان پر ختم ہوئی اور یہ داستان بھی اس لیے کہ مجھے اپنی گستاخیوں پر ندامت ہو اور ان کی شخصیت کی بڑائیاں نکھر آئیں...

(فیض اکیڈمی، لندن، ۱۹۸۴ء)

اب کہ یاد کا چاند برج سکون میں ہے، داستان سنانے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ میرے ذہن میں مہینہ اور سنہ اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ تاریخ ترتیب تقریباً ناممکن ہے مگر کوشش کرتا ہوں۔ لندن آنے سے پہلے میں ان سے کبھی نہیں ملا۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو وہ جیل میں تھے اور میں اردو کالج میں سائنس کا طالب علم۔ یہ ۱۹۵۲ء تھا۔ یعنی میرے خاندان کی غربت کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب صرف روٹی اور چٹنی پر گزارا ہو تو رسالہ خریدنے کی جرأت کہاں سے آئے۔ صدر کے دو تین بک اسٹالوں کا روزانہ پھیرا کرتا تھا۔ میری

حریص نظریں دو چیزوں کی سخت متلاشی رہا کرتیں۔ منٹو کا نیا افسانہ اور فیض کی نئی نظم یا غزل۔ اس زمانے میں ان دونوں کی چیزیں صرف لاہور کے رسالوں میں چھپا کرتیں۔ فیض صاحب کا کلام جوں ہی چھپتا میں دو تین اسٹالوں کا چکر لگا کر حفظ کر لیتا۔ دوسرے دن کالج پہنچ کر اپنے دوستوں پر اپنی اوّلیت کی دھونس جماتا۔ مگر منٹو کے افسانوں کا معاملہ جدا تھا۔ ایک صفحہ یہاں دوسرا وہاں۔ اسٹال ختم ہو جاتے افسانہ ختم نہ ہوتا۔ زیادہ عرصہ ایک ہی جگہ پر مفت خوری کرنا خطرے سے خالی نہ تھا کہ اسٹال کے مالکوں کی آنکھوں میں بے زاری اور دشمنی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ اس لیے اپنے ایک اور غریب دوست کو ساتھ لے جاتا۔ پلان کے مطابق میں پہلا صفحہ پڑھتا اور اسٹال کے دوسرے کونے میں کھڑا وہ دوسرا صفحہ ہضم کرتا۔ پھر ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے اور اگلے اسٹال کی طرف روانہ ہو جاتے اور راستے میں پلاٹ اور کرداروں سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے۔ یوں صدر ہی کے اسٹالوں پر افسانہ ختم کر لیتے اور بولٹن مارکیٹ کے اسٹالوں پر جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ ایک بار 'امروز' نے فیض صاحب کی کسی نئی نظم یا غزل کی اطلاع دی، غالباً سویرا یا نقوش یا ادب لطیف میں چھپی تھی۔ مجھے اپنے کرب کا عالم یاد ہے۔ میں چکر لگا لگا کے تھک گیا مگر صدر کے اسٹالوں میں یہ رسالے نہیں ملے۔ یہ معلوم کر کے کہ تمام رسالوں کا ٹھیکہ طاہر نیوز ایجنسی (بولٹن مارکیٹ) کے پاس ہے میں کالج ختم کر کے وہاں پہنچ جاتا۔ صرف یہ پتا چلانے کہ بلٹی آئی کہ نہیں۔ آخر پندرہ دن کے چکر کے بعد انھوں نے بتایا کہ لاہور سے نئے رسالے آئے ہیں۔ بغیر رسالہ دیکھے ایسی انجانی خوشی ہوئی کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ پوچھا پہلے کس بازار میں یہ رسالے جاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا صدر میں۔ میں نے کچھ سفر ٹرام پر کیا۔ ٹکٹ کلکٹر کو قریب آتا دیکھ کر عالم حیرت میں اتر گیا اور پیدل چلتا ہوا رسالے تک پہنچا۔ آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ نظم تھی ''اے روشنیوں کے شہر''۔ مختلف اسٹالوں کی زیارت کے بعد نظم یاد کی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی نوٹ بک میں مصرعے لکھتا گیا۔ نظم مکمل کر کے سیدھا اردو کالج پہنچا۔ کوئی نہ تھا۔ صبح کی کلاسیں ختم ہو چکی تھیں۔ شام کے لوگ ابھی نہیں پہنچے تھے۔ میں ادھر اُدھر ٹہل کر وقت ضائع کرتا رہا کہ ناگہاں ابن انشا مرحوم نظر آئے۔ وہ ایم اے فائنل

میں تھے اور میں آئی ایس سی (انٹر میڈیٹ سائنس) کا طالب علم۔ میں نے جلدی جلدی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ فیض صاحب کی نئی نظم آپ نے دیکھی۔ کہنے لگے، آپ روشنیوں کے شہر کا ذکر تو نہیں کر رہے، میں نے کہا "جی ہاں..." کہنے لگے وہ رسالہ مجھے پچھلے ہفتے مل گیا تھا۔ مجھے سخت صدمہ ہوا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ابن انشا تو خاصے مشہور شاعر بن چکے تھے جب کہ مجھے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ ایک دو منٹ میرے پاس ٹھہر کر غالباً بابائے اردو سے ملنے انجمن ترقی اردو کی عمارت کی طرف چلے گئے اور میں کسی نئے شکار کی تلاش میں۔ فیض صاحب کی نظم کا ایسا نشہ تھا کہ میں ساری دنیا کو اپنی مستی میں شامل کر لینا چاہتا تھا، رقص کرنا چاہتا تھا۔ فیض صاحب کی شاعری کے عاشق لاکھوں ہیں مگر اتنی وحشت سے رم کتنوں نے کیا ہوگا۔ یہ باتیں قدرے تفصیل سے اس لیے لکھ دی ہیں کہ بعد میں ایک شاعر کی حیثیت سے جو اختلاف میں نے کیا اس کا پس منظر نمایاں ہو سکے اور مختلف اخباروں اور رسالوں میں گاہے گاہے جو ذاتی حملے اس تعلق سے مجھ پر ہوتے ہیں ان کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلے میں دو چار باتیں اور۔

اب ہم ۱۹۵۵ء میں ہیں۔ میری پہلی غزل "ادب لطیف" میں چھپ چکی تھی۔ ترقی پسندوں کی سانس اُکھڑ چکی تھی مگر نام نہاد ترقی پسند شاعری (یعنی وہ شاعری جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ رات کب ختم ہوگی، وہ سحر کب طلوع ہوگی) اخباروں رسالوں میں اب بھی اپنی بہار دکھا رہی تھی، اور یہ بدسرشت خزاں نصیب سیکڑوں شاعروں کو مار کر بھی نہیں مری اور آج بھی بعض مردوں کے یہاں زندہ ہے۔ فیض صاحب نے 'سحر'، 'شام'، 'مقتل'، 'دار'، 'سنگ'، 'لوح'، 'قلم'، 'صلیب' اور ایسے پچاسوں الفاظ کی قدر و قیمت کم کر دی تھی اور انھیں آفاقیت کے نگار خانوں سے گرفتار کر کے محدودیت کے زندانوں میں ڈال دیا تھا۔ یہ شاعری آسان تھی، اکہری تھی، جوشیلی تھی اور غیر ذاتی تھی۔ ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھنے والی تھی۔ میں نے بھی خوب مشق کی۔ ۱۹۵۸ء تک سو سوا سو نظمیں لکھ کر مقتلوں اور صلیبوں کے انبار لگا دیے۔ اس زمانے کے 'امروز' اور 'لیل و نہار' میں ہر ہفتے اپنی کسی نہ کسی نظم کا کمپا لگا کے 'سحر' کا انتظار کرتا (فیض صاحب دونوں کے چیف ایڈیٹر تھے)۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ زبان کی زنجیر اور ہاتھ کی گرہ کھل گئی۔ دوسرا یہ کہ اپنی اور دوسروں کی ایک پرت کی شاعری سے دل ہمیشہ کے لیے مکدر ہوگیا۔ میں نے 'شمشاد کی صلیبیں' کے سوا اپنی تمام نظمیں نذر آتش کردیں اور آج تک اس راکھ کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔

مگر ۱۹۳۶ء کی تحریک کو معاف کرنا اس لیے آسان ہے کہ اس نے ہمیں فیض جیسا البیلا شاعر دیا جس کی ساحرانہ اور دردمند شخصیت نے اپنی تمام فنی جمالیات کے ساتھ اس قسم کی شاعری کو ایک ایسے نقطۂ عروج پر پہنچایا کہ دوسرے ترقی پسند شاعر بونے نظر آنے لگے۔ بلکہ یہ کہنا بھی ناجائز نہیں کہ انھوں نے رجائی اور رومانی شاعری کے بیش تر امکان پورے کرکے دکھا دیے اور بقیوں کے لیے اس کا جواز تقریباً ختم کردیا۔

یہاں فیض صاحب کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث نہیں۔ اس پر میں تفصیلی طور پر کہیں اور لکھ چکا ہوں۔ میرا مسئلہ میراجی، راشد، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں بلکہ ان کے فوراً بعد اُبھرنے والوں انتظار حسین، ناصر کاظمی، سلیم احمد، منیر نیازی اور وزیر آغا جیسے لوگوں سے الگ تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ میں اپنی اس تقریر کا اقتباس پیش کروں جو میں نے سردار جعفری کو لندن میں خوش آمدید کرتے ہوئے ان کی سترہویں سال گرہ پر کی تھی:

> "جناب والا... میرا سیاسی مسلک آپ سے جدا نہیں ہے کہ کمیٹڈ سوشلسٹ ہوں بلکہ یہاں بسنے کے بعد اور بائیں کی طرف سرک گیا ہوں مگر شاعری میں صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبے کو متھنے کا قائل نہیں کہ میری کمٹ منٹ صحافت سے نہیں شاعری سے ہے جو پوری ذات کا مکمل اظہار مانگتی ہے..."

میں نے اپنا سیاسی مسلک اور شاعرانہ مذہب آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب آیئے ہم فیض صاحب کی طرف لوٹ چلیں۔ ۱۹۶۲ء میں انتظار حسین نے 'ادب لطیف' کی ادارت سنبھالی، اور ناصر کاظمی مرحوم سے صلاح و مشورہ کرکے مجھے دعوت دی کہ میں کوئی 'گرما گرم' مضمون لکھوں۔ عجب زمانہ تھا۔ میں ہمہ آتش رہا کرتا۔ مدیر کی 'گرما گرم' کی قید

غیر ضروری تھی۔ دو صفحے کا ایک مضمون ''میں سب کا مخالف ہوں'' لکھ کر بھیج دیا۔ اس پر نو دس مہینے تک واویلا ہوتا رہا۔ میرے خوب خوب لتے لیے گئے مگر انتظار حسین کے مزے آ گئے۔ یہ آگ ذرا مدھم ہوئی تو انھوں نے میری حمایت بلکہ میری تعریف میں دو صفحے کا مضمون لکھ کر بجھتے ہوئے شعلے پھر سے تیز کر دیے۔ میرے مضمون میں ایک فقرہ یہ بھی تھا: ''کیا ادیبوں میں کوئی ایسا نہیں رہا جو فیض کو سیاسی اعزاز اور ادبی اعزاز کا فرق بتا سکے۔''

فیض صاحب کو لینن پیس پرائز مل چکا تھا اور ۱۹۶۳ء میں جب میں لندن پہنچا تو وہ ایک مکان خرید کر یہیں بسے ہوئے تھے۔ آتے ہی میرے دوست عباس احمد عباسی مرحوم نے بتایا، ''تمہارا فقرہ فیض صاحب کو سنا چکا ہوں۔ وہ صرف مسکرا دیے تھے۔'' میرے مزید اصرار پر عباس نے یہ بھی بتایا، ''فیض صاحب نے یہ ضرور کہا تھا کہ بھائی... ی... ی یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔''

جنوری ۱۹۶۴ء میں ایک پروگرام کے سلسلے میں بی بی سی پہنچا تو عباس نے بتایا کہ ''ہیمپسٹڈ کے اسپنیر ڈس ان (ایک پب کا نام) میں شام کو فیض صاحب آئیں گے، پہنچ جانا تاکہ تعارف کروادوں۔'' میں کڑکڑاتی سردی میں کپکپاتا ہوا پہنچا تو عباس کے ساتھ غالباً تقی سید بھی بیٹھے ہوئے تھے اور بیئر چل رہی تھی مگر فیض صاحب وہسکی پی رہے تھے۔ جوں ہی عباس نے مجھے خوش آمدید کہا فیض صاحب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور نہایت گرم جوشی سے گلے ملے۔ آئندہ بیس سال تک ان سے یہاں وہاں ادھر اُدھر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اپنے طور پر گلے شکوے اختلافات سب کیے مگر ان کی گرم جوشی اور تپاک کبھی نہ بھولا۔ اس دن ان کی بے لوث محبت سے اس قدر مانوس ہوا کہ ڈیڑھ گھنٹے تک کچھ نہیں بولا بس میں نے ان کے استفسار پر یہ ضرور بتایا کہ حصول تعلیم اور تلاش معاش کے سلسلے میں آنکلا ہوں۔ ان کے سامنے میری خاموشی کا یہ پہلا اور آخری دن تھا۔

میں ان دنوں گولڈرس گرین کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ کار وار بھی نہیں خریدی تھی۔ ان کا قیام فنچلے میں تھا۔ ہمارے درمیان کوئی تین میل کا فاصلہ تھا۔ ہفتے میں ایک روز کبھی ٹیوب کبھی بس میں یہ فاصلہ طے کر کے انھیں کسی پب میں لے جاتا۔ ایک دو

گھنٹے کا ساتھ رہتا۔ میرے گرم گرم سوالات اور ان کے نرم نرم جوابات کا منظر آنکھوں میں ہے۔
یہ نشستیں مہینوں جاری رہیں۔ انھیں قریب سے دیکھنے اور بجھنے کا موقع ملا تو میرے، بہت سے
اندیشے جھاگ کی طرح... نہیں... انارکلی والے امتیاز علی تاج کی ''کل کی گڑیا'' کی طرح
بیٹھ گئے۔ وہ مجھ سے عمر میں ۲۵ برس بڑے تھے اور بین الاقوامی شہرت کے مالک، میں ایک
نوجوان شاعر جو ابھی اپنے استعارے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ انھیں بھی میرے مزاج کا
علم ہوگیا۔ شاید اسی لیے انھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری شوخیوں کو طرح دے دی تھی۔
۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء میں بعض ''راز نا آشناؤں'' نے فیض صاحب سے شکایت کی کہ دیکھیے
ساقی آپ سے اتنی گستاخی کرتے ہیں اور آپ کچھ نہیں کہتے۔ ان کا جواب بھی خوب تھا:
''ارے بھائی ساقی تو ساقی ہے نا...'' سنا ہے شکایت کرنے والے... 'Yes Sir' کہہ کر
خاموش ہو گئے۔ ان عزیزوں کو یہی نہیں معلوم کہ ادب میں سوال کرنا، بزرگوں سے اختلاف
کرنا یا ان کی خامیوں کی نشان دہی کرنا گستاخی یا بے ادبی نہیں۔ بلکہ

Yes Sir, Yes Sir,
Three bags full, Sir
You are great Sir

کہنا بدتہذیبی اور بدتمیزی ہے۔ یہ بات ان بدبختوں کو بتاتے بتاتے زبان سوکھ گئی۔ اب یہ
ہے کہ خدا مجھے صبر دے۔

اب جو باتیں یاد آرہی ہیں ان کی تاریخی ترتیب کی ذمہ داری اپنے حافظے سے
اُٹھا رہا ہوں۔ وہ باتیں نہیں دُہراؤں گا جو اپنے مضمون ''حسن کوزہ گر'' میں لکھ چکا ہوں مگر
اس سلسلے میں فیض صاحب اور ایلس کے ری ایکشن کا حوالہ ضروری ہے۔ ایک بار یہ دونوں
زہرا نگار اور ماجد علی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ (پہلے وہ یعنی فیض صاحب اپنے مکان
میں رہے، پھر اسے بیچ کر چلے گئے اور جب آتے اپنے اور راشد صاحب کے کالج کے دوست
محمد افضل مرحوم کے یہاں قیام کرتے مگر جب سے ماجد علی اور زہرا نگار لندن منتقل ہوئے وہ
انہی لوگوں کے فلیٹ میں ٹھہرتے کہ جگہ بھی مرکزی تھی اور آرام بھی زیادہ تھا)۔ ماجد علی کے

دوست صغیر صاحب نے ہم سب کو کھانے پر بلایا۔ وہیں پاکستان ایمبیسی کے وجاہت صاحب بھی موجود تھے جواب آزاد کشمیر میں پولیس کمشنر ہیں۔ بڑے مخلص آدمی ہیں۔ میرا بھی بڑا خیال کرتے ہیں۔ کہنے لگے، ''ساقی صاحب، اقبال کے بعد فیض صاحب کے علاوہ اور کون ہوا...'' قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں فیض صاحب نے انھیں روکا، ''ارے بھئی...ی...ی یہ تو ادھر کے آدمی ہیں نا...'' ان کا اشارہ راشد صاحب کی طرف تھا۔ میں نے کہا، ''فیض صاحب یہ آپ نے بڑی زیادتی کی۔ میں ادھر کا بھی ہوں اور اُدھر کا بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنا آدمی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ان سے وہ حکایت بیان کی جو مجھ تک سلیم احمد کے ذریعے پہنچی تھی اور یوں تھی۔ سر سید احمد خاں جس زمانے میں ہر مسلک کے مسلمانوں کی بقا کے لیے اپنے کالج کے واسطے چندہ جمع کر رہے تھے، کسی بدقماش یا بدمعاش نے ان سے سوال کیا، ''سر، اگر آپ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے وقت زندہ ہوتے تو کس کو ووٹ دیتے، حضرت عثمانؓ کو کہ حضرت علیؓ کو۔'' اس شر پسندی کا جواب ایسا تھا کہ سر سید کے دماغ کی زود بینی اور بذلہ سنجی دونوں کی داد واجب ہے۔ ان کا فقرہ یہ تھا، ''اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو اپنے لیے کوشش کرتا۔'' خوب قہقہہ پڑا۔ مگر ایلس نے مجھ سے کہا (اور یہ ہماری پہلی ملاقات تھی) ''ساقی جو باتیں تم نے میرے اور فیض کے سلسلے میں راشد والے مضمون میں لکھی ہیں، میں نے پورا مضمون تو نہیں پڑھا مگر فیض والا اقتباس 'دنیا دور' سے چرا کر 'نوائے وقت' نے نہایت تزک و احتشام سے چھاپا تھا، وہ نامناسب ہیں، صحیح نہیں ہیں۔'' میں نے جواباً اپنی گفتگو میں بتایا... ''ایلس آپ میرا Dilemma سمجھنے کی کوشش کریں، راشد صاحب تو یہ باتیں بتا کر چلے گئے، میں مضمون لکھنے بیٹھا تو اپنے آپ سے بہت اُلجھا، جو باتیں میرے شعور کا حصہ تھیں انھیں جھٹک کر ذہن سے کیسے نکال دوں، نہ لکھوں تو راشد کی ساری شخصیت کا احاطہ کیسے ہو، لکھوں تو آپ کی اور فیض صاحب کی خست سامنے آتی ہے، غرض پاکستان جا کر اعجاز بٹالوی، ضیاء جالندھری اور حمید نسیم سے Check کیا، انھیں بھی راشد صاحب نے یہ واقعات بتا رکھے تھے، سو اس حصے کو مضمون سے نکالنا میرے اختیار میں نہ رہا۔'' پھر میں نے ۱۹۴۷ء کے بعد کے سب سے اچھے غزل گو

ناصر کاظمی کا مصرع پڑھا، "اے بے گسی، گواہ رہنا..." ایلس کی تشفی نہیں ہوئی اور میں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ "جب بھی آپ کے میاں پر مضمون لکھنے کی نوبت آئی And I owe him an article میں آپ کا اعتراض قلم بند کردوں گا کہ واقعات کے دونوں رُخ سامنے آجائیں۔" فیض صاحب خاموش رہے تھے اس لیے مجھے سخت تعجب ہوا۔ جب ۱۹۸۳ء میں وہ آخری بار لندن آئے اور میں ان سے ملنے زہرا نگار کے یہاں پہنچا تو شکوہ سنج ہوئے، "ساقی ہمیں بالکل یاد نہیں کہ ہم راشد کو بلا کر بھول گئے یا انھیں اپنے یہاں مدعو کر کے دوسروں کے یہاں لیے لیے پھرے؟" میں اپنے صوفے سے اُٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھا، ان کا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا تا کہ یہ Great old man میرے خلوص کی گرمی کو محسوس کر سکے۔ میں نے کہا، "جواب بعد میں، پہلے یہ بتایئے کہ نو دس سال بعد یہ بات ایک دم سے آپ کو کیسے یاد آگئی۔" کہنے لگے، "ہم نے تمہارا راشد والا مضمون ہی نہیں پڑھا تھا، رات اس کی جستہ جستہ باتیں ظفر الحسن کی کتاب میں دیکھیں تو اس کا ذکر کر رہے ہیں۔" زہرا نگار کی آنکھوں میں شریر چمک دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میری اس عزیز بہن نے رات یہ کتاب فیض صاحب کے حوالے کر کے مجھے کھانے پر اس لیے بلایا ہے کہ میری بے کسی کا تماشا دیکھ سکیں۔ میرے پاس کوئی نیا جواب تو تھا نہیں۔ وہی باتیں دُہرا دیں جو پانچ سات سال پہلے ایلس کے اور ان کے سامنے کی تھیں جنھیں یہ بالکل بھول چکے تھے۔ ان کا آخری جملہ لکھ کر اس قصے سے درگزر کرتا ہوں۔ "چلو دعوت دے کر ہم تو بھول سکتے تھے مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایلس بھی بھول گئی ہوں۔"

اس بھولنے پر ایک اور قصہ یاد آیا کہ بھولتا نہیں۔ لندن میں سات آٹھ سال پہلے تک غیر ادبی غل غپاڑے نہیں ہوتے تھے۔ اردو پڑھنے لکھنے والوں میں ایک غیر مرئی سکون تھا... Main Stream کے لوگوں میں بنے بھائی بہت پہلے رہ کر جا چکے تھے اور اب صرف گاہے گاہے اپنی بیٹی نجمہ اور داماد علی باقر سے ملنے آنکلتے۔ جب بھی آتے بلوا لیتے۔ میں حسبِ مزاج اور ان کی توقع کے مطابق ان سے خوب نوک جھونک کرتا۔ وہ نہایت صبر سے میرے جوش کی آگ پر اپنے عالمانہ استدلال سے پانی چھڑکتے۔ اپنی جوانی یاد کرتے،

اپنی یورپی محبوباؤں کے قصے سناتے۔ علی باقر مسکراتے اور نجمہ کہتی جاتیں کہ ''اب کے یہ سب باتیں امی کو ضرور بتاؤں گی۔'' غرض کہ ہم ایک دوسرے کو اپنے Points of view سے آگاہ کرتے مگر قائل کوئی نہ ہوتا۔ ایک بار رضیہ آپا آئیں اور اپنے میاں کے دفاع میں (جیسے میاں کو کسی دفاع کی ضرورت ہو، آخر کو ہندوستانی چہیتی بیوی تھیں نا) میری ایسی خبر لی کہ مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ بنے بھائی نے کہا، ''اس لڑکے (میں ۳۵۔۳۶ سے کم کا نہ تھا) کی جان کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔'' پھر دونوں نے مجھے گلے لگا کر رخصت کیا۔ بعد میں علی باقر اور نجمہ نے بتایا کہ میرے جاتے ہی ''امی اور ابا'' نے میری شاعری اور شخصیت کی دل کھول کر تعریف کی۔ دروغ بر گردن اولاد مگر اس زمانے میں پیٹھ پیچھے تعریف کرنے کا رواج تھا۔ غرض میرے اور بنے بھائی کے گھرانے کے درمیان ایک ایسی اٹوٹ محبت قائم ہو گئی جو مرتے دم تک جاری رہے گی۔ میں باہر سے اپنی تلوار کی طرح سخت سہی مگر اندر سے بریشم کی طرح نرم بھی ہوں۔ شاید۔ اور 'شاید' میں کیا مضائقہ ہے۔

بنے بھائی کے انتقال کے بعد میں دلی پہنچا تو رضیہ آپا نے کھانے پر بلایا۔ میرے یار غار اور جدید ادب کے ختین نقاد محمود ہاشمی اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کے مجھے ان کے یہاں چھوڑ آئے۔ رضیہ آپا گلے لگا کر اس طرح ڈھک ڈھک کر روئیں کہ میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ میں دو تین گھنٹے بیٹھ کر چلنے لگا کہ دوسرے دن لاہور پہنچنا تھا۔ انھیں تاکید کر دی کہ اپنے بکھرے ہوئے افسانوں کا مجموعہ مرتب کر کے مجھے بھیج دیں تاکہ پاکستان میں کہیں چھپوا دوں۔ انھوں نے شرط لگائی کہ دیباچہ میں لکھوں۔ میں نے کہا اس سے بڑا اعزاز کیا ہوگا۔ دو تین مہینے بعد نجمہ آئیں تو مسودہ لیتی آئیں۔ اس کے ساتھ رضیہ آپا کی چٹھی بھی تھی۔ اس میں وہی تاکید کی کہ دیباچہ میں ہی لکھوں۔ ایک زمانے میں کئی افسانے میں نے لکھے تھے اور سیکڑوں کہانیاں پڑھی تھیں۔ فکشن کی تنقید پر بھی اچھی نظر تھی مگر برسوں سے شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا اس لیے اس دیباچے کے لیے مواد جمع کر رہا تھا کہ کوئی بات نکال سکوں کہ فیض صاحب لندن آئے۔ رضیہ آپا کی کتاب اور اپنے دیباچے کا ذکر ان سے اس لیے کیا کہ وہ کسی بھلے پبلشر سے چھپوا دیں۔ کہنے لگے، ''بھئی... ی... ی رضیہ کی کتاب کا دیباچہ

تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں نا۔'' میں نے کہا، ''مگر انھوں نے تاکید کی ہے کہ میں لکھوں۔'' بولے، ''تو تم بھی لکھ دو، ہم بھی لکھ دیں گے۔'' میری کہاں مجال کہ ان کے دیباچے کے ساتھ اپنا دیباچہ بھی چھپواتا۔ مسودہ انھیں دے آیا۔ غضب یہ ہوا کہ وہ کہیں رکھ کر بھول گئے۔ میں نے رضیہ آپا کو سارا ماجرا لکھ کر بھیج دیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے انتقال سے پہلے دلّی میں ان سے ملنے گیا تو بہت بیمار تھیں۔ چلنے لگا تو انھوں نے میرے دونوں بازوؤں پر امام ضامن باندھے اور صرف اتنا کہا، ''اگر فیض سے دیباچہ لکھوانا ہوتا تو میں مسودہ نہیں بھجواتی۔'' میں نے کہا، ''آپ مجھے جی بھر کے ذلیل کر لیں۔ آپ کو اپنی شرمندگی کی داستان کیا سناؤں۔ بس مجھے صدق دل سے ایک بار معاف کر دیجیے اور مجموعہ دوبارہ مرتب کر کے بھیج دیجیے، آنکھوں سے لگا کر رکھوں گا۔'' انھوں نے اپنی موہنی مسکراہٹ کے ساتھ وعدہ کر لیا۔ میں مطمئن ہو کر چلنے لگا تو نجمہ اور علی باقر کے سامنے کہنے لگیں، ''اور ہاں دیباچے میں جدیدیوں کی خوب خبر لینا۔'' میں نے کہا۔ ''رضیہ آپا جدید تو میں بھی ہوں۔ اپنی خبر کیسے لوں گا۔'' بولیں، ''تو، دوسرے قسم کا جدید ہے، میں تو جدیدیوں کا ذکر رہی ہوں۔'' میں لندن چلا آیا۔ تین چار ماہ بعد رضیہ آپا کا انتقال ہو گیا۔ دل کٹ کے رہ گیا۔ پھر Guilt کا احساس کچھ کم قاتل نہ تھا۔ اس کے بعد بیسیوں بار فیض صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہر بار اس مسودے کا ذکر کیا۔ انھیں اتنا تو یاد پڑتا تھا کہ افضل صاحب کے مکان میں انھوں نے کہیں رکھا تھا۔ اس کے بعد ان کا حافظہ درطۂ انکار میں چلا جاتا۔ ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ اداس ہو جاتے ''دیکھو سوچتے ہیں'' ضرور کہتے۔ پچھلے برس علی باقر ملنے آئے تو انھوں نے بتایا کہ رضیہ آپا کی کہانیوں کے مجموعے چھاپ رہے ہیں، ساری کہانیاں جمع کر لی ہیں۔ سو اب اس باب میں طبیعت کو کچھ سکون ہے۔ فیض صاحب کی یادوں کے چراغ کے پاس رضیہ آپا کے امام ضامن بھی دل کے طاق میں رکھے ہوئے ہیں کہ ان خیراتوں کا مستحق مجھ سے زیادہ اور کون ہوگا۔

فیض صاحب سے تنہائی میں جو باتیں ہوئیں وہ خاصی ذاتی قسم کی تھیں ان میں سے دو ایک باتوں سے پردہ اُٹھائے دیتا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ ان سے فیض صاحب کی

شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ایک بار ایک نئے شاعر نے (جو پرانی زبان اور کلاسیکی استعارے میں درک رکھتے ہیں اور جن کی صلیبیں میر انیس اور میرزا دبیر کے دریچے میں گڑی ہوئی ہیں) فرمائش کی کہ فیض صاحب کو ان کے ہاں لیتا آؤں۔ میں افضل صاحب کے گھر پہنچا تو ٹیلی ویژن پر فٹ بال کے ورلڈ کپ کا کوئی میچ دیکھ رہے تھے۔ تیار ملے۔ میں کار میں انھیں لے کر چلا۔ راستے میں Spaniard's Inn (ہمارا پرانا پب) پڑتا تھا۔ میں نے کہا، "چلیے پرانی صحبتوں کی یاد تازہ کی جائے۔" کہنے لگے، "کیوں نہیں۔" اصل میں میرا دل اپنی نظمیں سنانے کے لیے مضطرب تھا۔ وہ بیٹھ گئے میں جا کر شراب لے آیا اور اپنی دو نظمیں 'شیر امداد علی کا میڈک' اور 'رات کے راج ہنس اور بات' سنائیں۔ دھیمے سروں میں تعریف کی۔ اس طرح داد نہیں دی جیسی 'میڈک' والی نظم پر راشد صاحب نے دی تھی۔ شاید جوش آفرینی ان کے مزاج میں نہیں تھی۔ پھر کہنے لگے، "ان سب نظموں کی رسائی ہوگی، ہوگی کیوں نہیں، تمہاری بھی ہوگی، راشد کی بھی ہوگی، ذرا دیر لگے گی۔" میں نے کہا، "آپ مجھے راشد صاحب سے کیوں بھڑا رہے ہیں، ان کی تو رسائی بھی ہو چکی ان کا Impact بھی شدید ہے نئے لوگوں پر میرا جی کا بھی ہے۔" میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے ذرا ٹھہر کر پوچھا، "فیض صاحب! ویسے راشد کے بارے میں آپ کی اصلی رائے کیا ہے۔" انھوں نے سگریٹ سے سگریٹ سلگائی اور گویا ہوئے، "سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا دماغ مجھ سے بڑا تھا۔" اس فقرے کے بعد اس دریا دل شاعر نے اپنے ہم عصر دوست کے بارے میں وہ باتیں بھی کیں جو "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" والے انٹرویو میں ہیں۔ مگر اس فقرے میں جو ہشت پہلو اعتراف چھپا ہوا ہے اس سے میرے دل میں فیض صاحب کا وقار بڑھ گیا۔ راشد صاحب نے اس طرح انھیں کبھی داد نہیں دی تھی۔ وہ دوسرے قسم کے آدمی تھے۔

اسی طرح انھیں ایک بار کسی محفل سے گھر واپس لے جا رہا تھا۔ ہیمپسٹڈ کے ایک سنسان اور اندھیرے راستے میں گاڑی روک دی۔ رات کے دو بجے تھے اور سڑک کے دونوں طرف ہیبت ناک درختوں کی شاخیں اپنے پتوں کے دف بجا رہی تھیں۔ کہنے لگے،

''اتنی ڈراؤنی جگہ پر کار کیوں روک دی۔'' میں نے کہا'' تاکہ خوف سے گھبرا کر آپ جلدی جلدی ان تمام خواتین کا نام بتادیں جو آپ کے شعروں کے حجاب میں ہیں اور جن کا ذکر آپ کسی سے نہیں کرتے۔ آخر میری ہی نسل کے لوگ تو آپ کا نام آگے لے جائیں گے نا اور آنے والوں کو بتائیں گے کہ راشد ایسے تھے، آپ ایسے تھے۔'' بولے ''بتاتے، ہیں بھئی...ی....ی بتاتے ہیں مگر گاڑی تو چلاؤ۔'' میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور پوچھا: ''یہ رقیب والی نظم کے پیچھے کون تھا؟''

''وہ ہمارے کالج کے زمانے کا ایک فلیم (Flame) تھا۔ بھئی تم انھیں نہیں جانتے۔ یہ ہمارا پہلا عشق اور پہلی شکست تھی۔''

''اور رقیب کون صاحب تھے؟''

''انھیں بھی تم نہیں جانتے، ایک کاروباری آدمی ہیں۔''

''تو معاملہ کچھ آگے بڑھا کہ نہیں...؟''

''نہیں۔''

''اور د....ر....ج، سے؟''

''ہم ان سے بہت ڈرتے تھے۔ عشق کا سوال ہی نہ اُٹھا۔''

''اور ب....م....م، سے؟ سنا ہے کہ آپ دونوں کئی بار ایک ہی کمرے میں سوئے بھی؟''

''تو سونے سے کیا ہوتا ہے، بھئی بعض لوگوں پر نظر کا حق ہوتا ہے بعض پر دل کا، وہ حق تو ہم ادا کرتے رہے۔''

''بدن کے بھی تو کچھ حقوق ہوتے ہیں؟''

''تم یورپ میں آ کر بس گئے ہو اور بھول گئے ہو کہ ہر عشق کے لیے ضروری نہیں کہ آدمی بستر بھی ساتھ لے کر چلے، دوستیاں رہیں کئی خواتین سے اور خوب رہیں اور بس۔''

''یہ جو بھری محفلوں میں آپ خوب صورت لڑکیوں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھے رہتے ہیں یا ان کے شانوں اور گردنوں کو سہلاتے رہتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میری روح پر خلجان طاری ہوتا رہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان میں سے دو چار میرے حوالے کر دیجیے۔ دوسرے یہ کہ کیا آپ کا دل نہیں دھڑکتا؟''

''بھئی دھڑکتا ہے جبھی تو دل کا اور نظر کا حق ادا کرتے رہتے ہیں نا؟''

غرض کہ میں فلانے کا اور فلانے کا ذکر کرتا گیا مگر موصوف فقط 'دل کا حق' اور 'نظر کا حق' کی رٹ لگاتے رہے۔ ایسے شرمیلے تھے کہ یہ باتیں کرتے وقت بھی چہرے پر طرح طرح کے رنگ آتے جاتے رہے۔ یہ سوچ کر رشک آتا ہے کہ میں تو اپنے جہنم زار میں جل رہا ہوں اور وہ کم سن حوروں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے، نظر اور دل کا حق ادا کر رہے ہوں گے۔

ایک محفل میں ایک چھوٹا موٹا ہنگامہ ہو گیا۔ اس کا سرسری ذکر میں اپنے مقالے ''نظم کا سفر'' میں کر چکا ہوں۔ پورا واقعہ یوں تھا: مغنی تبسم کی بہن اور بہنوئی نے اپنے فلیٹ میں ایک محفل برپا کی۔ تقریباً ۵ا مہمان تھے۔ ہم سب چھٹ بھیّے (میں احمد فراز، شہرت بخاری وغیرہ) اپنا اپنا کلام سنا چکے تو فیض صاحب کی باری آئی۔ انھوں نے اپنی کچھ نئی چیزیں سنائیں۔ ابھی داد کے ڈونگرے برس ہی رہے تھے کہ میں نے فرمائش کی۔ ''فیض صاحب آج پھر اپنی وہ معرکہ آرا نظم 'رقیب سے' سنایئے۔'' انھوں نے اپنے سبج سبج انداز میں نظم شروع کی۔ ایک ایک مصرعے پر تحسین کا طوفان اُٹھتا رہا۔ سب سے زیادہ زور شور سے میں داد دے رہا تھا کہ نظم کا بیسواں مصرع ''جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں'' آن پہنچا میں نے کہا، ''بس، نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے، آگے مت سنایئے۔'' ایسے دل دار آدمی تھے کہ مان گئے۔ پھر احمد فراز نے کہا، محمد علی صدیقی نے کہا، شہرت بخاری نے کہا، ہندوستان کے مشہور مصور حسین صاحب نے کہا مگر فیض صاحب بولے، ''نہیں بھئی جب ساقی نہیں سننا چاہتا تو ہم کچھ اور سنائیں گے'' اور انھوں نے پبلک کے بے حد اصرار کے باوجود نظم نہیں سنائی۔ شہرت جیسے بھل مانس کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے میرے کان میں کہا، ''اب تم کہو۔''

میں نے تو من کی موج (Impulse) میں آ کر ایک بات کہہ دی تھی۔ شاید ذہن کے کسی گوشے میں یہ بھی ہو کہ آس پاس بیٹھے ہوئے بڑے بڑے شاعروں کو بتایا جائے کہ نظم کیسے شروع کرنی چاہیے اور کہاں ختم کرنی چاہیے۔ پھر اس سے زیادہ مہلک بات فیض صاحب سے اور راشد صاحب سے اور سجاد ظہیر صاحب سے اور سردار جعفری صاحب سے کر چکا ہوں۔ کہنے کے بغیر اور نیت کی صفائی کے ساتھ۔ یہ کشادہ قلب بزرگ تھے اور ہیں۔ ان کے دلوں میں میری طرف سے کبھی رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ فیض صاحب جب بھی آتے زہرا نگار سے فون کروا کے مجھے ضرور بلواتے۔ میں ان سے ضرور چھیڑ چھاڑ کرتا۔ وغیرہ وغیرہ، خیر۔

اب مجھے اپنے الفاظ تو یاد نہیں مگر شہرت کے کہنے پر میں نے فوراً کہا تھا: ''غریبوں کی حمایت اور مزدور کے گوشت کا تقاضا تھا کہ آپ ایک الگ نظم کہتے، اور آپ نے کئی عمدہ عمدہ نظمیں ان مسائل پر کہی ہیں، اس نظم میں آخری ۱۲ مصرعے پیوند لگتے ہیں۔ اس لیے میں نے گستاخی کی تھی۔ اب یہ ہے کہ آپ پوری نظم سنایئے۔ میری بات کا برا نہ مانیے۔'' مگر وہ بہانہ کر کے ٹال گئے۔ دوسرے دن محمد علی صدیقی نے مجھے بتایا تھا کہ اردو کے ایک ادارے میں سارے عندلیب بیٹھے آہ زاریاں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے طور پر اس بات سے طمانیت حاصل کی کہ تمام عندلیبوں کو کام پر لگا رکھا ہے۔

زہرا نگار کے یہاں آئے دن نشستیں ہوتی رہتی ہیں، اور کمال کی۔ مگر جب جب فیض صاحب ان کے یہاں ٹھہرنے آتے، گھر کی بہار اور محفلوں کی رونق بڑھ جاتی، اور میرے پھیرے بھی۔ ان پھیروں میں ان سے سیکڑوں باتیں ہوئیں اور ساری باتیں زہرا نگار اور ماجد علی کے سامنے ہوئیں۔ یہاں صرف ان چیزوں کا ذکر کروں گا جن سے فیض صاحب کی شاعری یا شخصیت کو سمجھنے میں کسی قسم کی مدد مل سکے۔

ایک اتوار کی صبح کو پہنچا تو دیکھا ایک جوڑا فیض صاحب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو رہا ہے۔ میں زہرا نگار کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہفتے بھر سے طرح طرح کے لوگ فیض صاحب سے ملنے چلے آ رہے ہیں اور یہ کہ ''آج والے لوگ، بسکٹ بناتے ہیں اور فیض صاحب کے لیے بسکٹوں کے کئی ٹن لائے ہیں اور فیض صاحب کے

ساتھ گھنٹے بھر بیٹھ کے گئے ہیں۔ اتنے میں فیض صاحب، "تو ہاں بھئی... یہ کہاں غائب رہے" کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے کہا، "ابھی بتاتا ہوں مگر پہلے آپ یہ بتایئے کہ ایرے غیرے چیز قناتیوں کے ساتھ آپ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں؟"

"بھئی اتنی محبت سے یہ لوگ فون کرتے ہیں اور آتے ہیں۔ ہم ان کا دل کیسے دُکھائیں۔"

"لیجیے فیض صاحب، آپ بھی کمال کرتے ہیں، دل ہوتا کس لیے ہے، دکھانے ہی کے لیے تو ہوتا ہے...." میں نے ذرا دل لگی کی، پھر یہ کہ آپ فرصت کا رونا روتے ہیں۔ اصل میں آپ نے اپنے آپ کو بہت پھیلا رکھا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا وقت آپ کے پاس رہا نہیں۔ پچھلے دس پندرہ سال میں جو غزلیں نظمیں آپ نے لکھی ہیں وہ آپ کے معیار کی نہیں۔ آپ سے توقعات کچھ اور ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آپ نے جو "طرز سخن" ایجاد کی تھی وہی گلشن میں "طرز فغاں" ٹھہری ہے۔ مگر آپ وقت کی کمی کے باعث اپنی سطح سے بہت نیچے اُتر گئے ہیں۔ پھر آپ کی گفتگو اور آپ کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ کم از کم ۲۰ سال سے آپ نے کوئی نئی کتاب نہیں پڑھی۔ یہ اردو ادب کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔"

یہ مضمون لکھتے وقت سوچ رہا ہوں کہ شاید یہ باتیں سخت تھیں۔ اور لہجے میں بھی ڈپلومیسی نہیں تھی۔ مگر جس آدمی سے دل کی دھڑکن کی طرح قربت محسوس ہوا اس کے ساتھ ڈپلومیسی کا سوانگ رچانا صرف غیر مہذب لوگوں کا کام ہے اور دوغلاپن میرے احاطہ اختیار میں نہیں۔ ادھر کے لوگوں میں میر تقی میر، حسرت موہانی اور یاس یگانہ چنگیزی ایسوں اور ادھر کے لوگوں میں بیت بوفن، ازرا پونڈ اور ڈی ایچ لارنس جیسوں سے اپنے مزاج کو ہم آہنگ پاتا ہوں۔ دل دُکھانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ خود اپنا دل بھی دُکھتا ہے، اور حساس آدمی کا شاید کچھ زیادہ ہی۔ سو یہ درد تو سائے کی طرح زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔

ماجد علی اور زہرا نگار نے میرے جملوں کا کھردرا پن "چین جبیں" سے کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر فیض صاحب کی "نازنینی" عجیب تھی۔ اپنے گرم تبسم سے اور اپنے نرم لہجے

میں کہا تو صرف یہ کہا، ''بھئی ...ی...ی فرصت، ہی نہیں ملتی نا۔ اب پڑھیں تو کیسے پڑھیں۔ پھر ہم نے اپنا بہتر کام تو ختم کر دیا نا۔ اسی سے ہمیں جانچو، یہ نئی چیزیں اگر معیار سے ذرا گر گئی ہیں تو ہم کیا کریں۔ شاعر کو اس کے بہتر کلام ہی سے پرکھا جاتا ہے۔''

ایک شام ماجد علی کے ہاں گیا تو دیکھا کہ احمد فراز پہلے ہی سے پہنچے ہوئے ہیں۔ بہترین وسکی اور بہترین انواع و اقسام کے کھانے کے لیے زہرا نگار کا گھر چار دانگ میں مشہور ہے مگر مجھے یہ امید نہیں تھی کہ فقرے بازی کے لیے اللہ ٹارگٹ... (Target) بھی مہیا کر دے گا۔ فراز کو دیکھ کر آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ مالک حقیقی کے تحائف کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے، اس لیے ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد جب احمد فراز نے فیض صاحب سے پوچھا، ''آپ نے میری نظموں کے ترجمے دیکھ ڈالے؟'' فیض صاحب نے جواب دیا، ''ادھر اُدھر سے نظر ڈالی ہے، روحانی نظمیں بہتر ہو گئی ہیں مگر....'' میں نے بات پکڑ لی اور کہا، ''یونان کے ایک گم نام شاعر تھے۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں نوبل پرائز مل گیا۔ اب اتنے گم نام نہیں رہے۔ ان کا نام ہے Alepoudhells (Elytis) جب ترجمہ باز پہنچے تو انھوں نے بڑی عمدہ بات کی اور بیان دیا کہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ترجموں سے نہ لگایا جائے کہ ترجمے میں اچھے شاعروں کی ہتک ہوتی ہے اور برے شاعر بہتر ہو جاتے ہیں۔ اب اس بے چارے فراز کو لیجیے۔ ادھر آپ نے لاہور میں ایک بار 'مقتل' لکھا۔ ادھر اس نے پشاور سے ۳۰ مقتل بھیجے۔ ادھر آپ نے ایک 'جاناں' لکھا۔ ادھر اس نے 'جاناں جاناں' کا ورد شروع کر دیا۔ ادھر آپ نے ایک 'صلیب' اٹھائی۔ یہ برادر پورا درخت کاٹ کر چل نکلا۔ نہ صرف یہ بلکہ اب آپ ہی کی طرح اٹک اٹک کر مشاعروں میں شعر بھی پڑھنے لگا ہے۔ آپ ہی کی طرح سگریٹ پیتا ہے بلکہ راکھ بھی آپ ہی کے انداز میں جھاڑتا ہے....'' فیض صاحب کہنے لگے، ''بھائی تم اپنا کام کیے جاؤ۔ انھیں اپنا کام کرنے دو۔'' میں نے کہا، ''آپ کو تو لطف آتا ہے کہ لوگ آپ کی نقل کر رہے ہیں۔ بلکہ آپ ان لوگوں کی پرورش بھی کرتے ہیں۔ حالاں کہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی زندہ اور بزرگ ہم عصر کی نقل کرنا اپنی موت کو دستک دینے کے مترادف ہے۔'' ان کا وہی نرم جواب، ''بھئی سب آدمی تو زندہ نہیں رہتے نا۔

سب کو اپنا اپنا کام کرنے دو۔'' میں نے زچ ہو کر کہا، ''جس طرح میر کا نام غالب سے غالب کا نام اقبال سے اقبال کا نام آپ سے اور راشد سے اور میراجی سے چلا کہ آپ لوگ مختلف تھے۔ (آپ اقبال کی طرح لکھتے تو آپ کا نام کون لیتا)۔ اسی طرح آپ کا نام ناصر کاظمی، منیر نیازی جیسے لوگوں سے تو آگے بڑھے گا کہ یہ آپ سے مختلف انداز میں چلے، ان سے نہیں جنھوں نے آپ کے لفظ پر لفظ لکھا اور مکھی پر مکھی ماری۔'' مگر واہ رے فیض صاحب۔ اپنے مسلک سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ واقعی دل آزاری ان کے مزاج میں نہیں تھی۔ آخر آخر میں بھی صرف یہی کہا، ''ہاں ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بھی غلط نہیں۔'' یہ ادا ان کے مزاج کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے لیکن میں اپنے آپ کو ان کی شخصیت کے اس پہلو سے کبھی متفق نہ کر سکا۔

اس پورے عرصے میں احمد فراز ہوں، ہاں کے علاوہ کچھ نہیں بولے اس لیے کہ دوسرے دن انھیں میرے غیاب میں زہر اُگلنا تھا۔ کھانا وانا کھا کے میں چلنے لگا تو وہسکی بہت چڑھ چکی تھی اس لیے جب زہرا نگار نے کہا کہ میں فراز کو چھوڑتا جاؤں تو میں نے نشے کا حوالہ دیے بغیر بہانہ کیا، ''بہن، میں انھیں اپنی گاڑی میں نہیں بٹھا سکتا کہ جوں ہی کوئی خراب شاعر بیٹھتا ہے گاڑی کا ایک پہیا ہلنے لگتا ہے۔'' یہ کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے دن ملنے پہنچا تو فیض صاحب نے کہا، ''تمہارے بیٹھنے سے تمہاری گاڑی کے دو پہیے تو مستقل ہلتے ہوں گے۔'' میں ان سے لپٹ گیا۔

ایک چٹکلا یاد آیا۔ اپنی زبان اور دوسروں کی طبیعت صاف کرنے کے لیے کراچی کے زمانے میں دو چار شریر شعر کہہ کر سینہ بہ سینہ چلوا دیے تھے مثلاً:

دونوں 'مفاعلاتن' اک دوسرے کے والد

سید رفیق خاور، عبدالعزیز خالد

(لطیفہ یہ کہ یہ شعر پچھلے سال حبیب جالب نے میری اور شہریار اور زہرا نگار کی موجودگی میں، اپنا کہہ کر سنایا۔ میری یاددہانی پر انھوں نے اپنی تصحیح کر لی۔ خیر حافظے کی لڑکھڑاہٹ ہم سب سے ہو جاتی ہے۔ پھر شعر ایسا ہے کہ ہر آدمی کو اپنا معلوم ہوتا ہے) اور

دوسرا شعر (جو فیض صاحب کے شعر میں صرف تین الفاظ بدل کر ترتیب دیا تھا) تو خوب چلا بلکہ حق تو یہ ہے کہ قیوم نظر کی شاعری سے زیادہ چلا۔ یوں ہے:

وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی 'نفرت' مجھ سے
اک نظر تم مرا 'قیوم نظر' تو دیکھو

(سید ابوالخیر کشفی نے 'افکار' کے فیض نمبر میں اسے لاہوری شعر کہہ کر پیش کیا تھا۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ خالص کراچوی ہے اور اس بندۂ عاجز کا ہے۔)

خالد صاحب سے کراچی میں اور قیوم صاحب سے لندن میں یہ کہہ کر معافی مانگ لی تھی کہ یہ اشعار برائے بیت ہیں اور تفنن طبع کے لیے کہے گئے تھے اور ان سے دل آزاری مقصود نہیں تھی اور ان دونوں نے میرے خیال میں مجھے معاف بھی کر دیا مگر ایک دن بیٹھے بٹھائے فیض صاحب نے کہا کہ ''تمہارا قیوم نظر والا شعر بڑھیا ہے مگر لوگوں کے دل دکھانے سے آدمی کو پرہیز کرنا چاہیے۔ مذاق میں بھی نہیں۔'' میں کیا کہتا۔

میں پلٹ کر دو عشروں کی طرف دیکھتا ہوں تو فیض صاحب کی غیر معمولی فرشتہ صفتی پر صرف ایک داغ نظر آتا ہے۔ وہی تعلقات عامہ والا۔ اس کے کئی مناظر میری گنہ گار آنکھوں نے دیکھے۔ ان کا انداز اتنا دقیقہ سنج یعنی subtle تھا کہ دل عش عش کہہ اٹھتا تھا۔ کلیدی صحافیوں سے بنائے رکھنا، بعض احمقوں کو بار بار خط لکھنا، ایک ہی طرح کی دیباچہ بازی کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سیاسی رویے کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اب سوچتا ہوں کہ ایسے تیجلے شاعر پر تو سات خون معاف تھے۔ وہ شاعر تھے اور شاعر رہیں گے۔ نہ انھوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا نہ وہ پیغمبر تھے۔

۱۲ر ستمبر ۱۹۸۳ء کی تاریخ دل پر نقش ہے۔ وہ میرے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ حکم دیا کہ میں انھیں اپنے گھر کا ایک ایک کمرہ دکھاؤں۔ میں نے یہ کام اپنی بیوی (گن بلڈ جنھیں میں خباثت اور میرے تمام احباب پیار سے گنڈی کہتے ہیں) کے حوالے کر دیا۔ نیچے اوپر ہر جگہ گئے۔ گنڈی کے سلیقے کی کھل کر تعریف کرتے گئے۔ گنڈی پر بوسے نچھاور کرتے رہے اور ''دل کا حق'' اور ''نظر کا حق'' ادا کرتے رہے۔ شاید گنڈی اس سارے عرصے،

میرے مزاج کے برے پہلو ''جلالیت'' کی شکایت کرتی رہیں۔ آکر صوفے پر بیٹھے تو مجھے بہت ڈانٹا پھٹکارا اور بڑی لعن طعن کی۔ میری عمر پوچھی۔ بتایا تو کہنے لگے اب وقت آ گیا ہے کہ تمام اول فول چیزوں سے پرہیز کروں اور بس جم کر صرف شاعری کروں اور گالی گلوج تو قطعی طور پر بند کروں اور بخشش عام کروں، اور بیوی کی فرمائش پر ''فیض اکیڈمی'' کا کاغذ لیا اور ''یا دوستاں تلطفِ با دشمناں مدار'' لکھ کر چلے گئے۔

فیض صاحب، اگر جوش گفتگو میں گاہے گاہے مجھ سے زیادتیاں ہو گئی ہوں تو مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نے آپ سے اتنی ہی محبت کی جتنی دوسروں نے کی۔ مگر میں ''اپنا آدمی'' بھی ہوں اور آج آپ سے آخری فرمائش کرنے آیا ہوں۔ ذرا ''نسیم صبح چمن'' سے کہہ دیجیے کہ میرے گھر میں، جہاں آپ کے سانسوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے وہاں ''یادوں سے معطر'' تو آئے مگر ''اشکوں سے منور'' نہ جائے۔

(لندن۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

ooo

نورالحسن نقوی
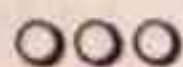
مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی کی شخصیت میں کوئی ایسی دل فریبی نہیں تھی کہ جو پہلی بار ملے گرویدہ ہو جائے لیکن جن خوش نصیبوں کو نزدیک سے انھیں دیکھنے کا موقع ملا وہ ان کی عظمت کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مولانا ان لوگوں میں سے تھے جو آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لیے وقت کے ریگ زار پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی زندگی فقر و استغنا اور ایثار و خلوص کا بے نظیر مجموعہ تھی۔

حسرت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے کہ تحریک آزادی سے وابستہ ہو گئے۔ اس جرم میں تین بار کالج سے نکالے گئے، کئی بار قید با مشقت کی سزا بھگتی اور ایک ایک دن میں من من بھر آٹا پیسا۔ تحریک کی حمایت میں ایک رسالہ اردوئے معلیٰ جاری کیا تھا۔ بے باکی اور صاف گوئی کی پاداش میں اسے بند کرنا پڑا، پریس اور کتاب خانہ ضبط ہوا، مضامین کے مسودات ان کی آنکھوں کے آگے نذر آتش کیے گئے۔ کالج کے حدود میں داخلہ ممنوع ہو گیا تو شہر میں کرایے کا مکان اور سودیشی تحریک کو فروغ دینے کے لیے سودیشی اسٹور کھول لیا جس کا کالج کے اسٹاف اور طلبا کی طرف سے بائیکاٹ کیا گیا۔ جیل گئے تو گزر اوقات کے لیے پردہ نشین بیوی نے دکان پر بیٹھ کر کپڑا بیچا اور کسی ہمدرد نے مالی مدد کرنی چاہی تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ حسرت صاحب نے کسی کا سہارا گوارا نہیں کیا تو میں یہ مدد کیسے قبول کر لوں۔ جیل ہی میں تھے کہ بیٹا بیمار پڑا، حالت بگڑی اور دنیا سے رخصت بھی ہو گیا مگر حکام نے باپ کو مطلع کرنا

بھی ضروری نہ سمجھا۔ بہت دن بعد جب اس جانکاہ حادثے کی اطلاع ملی تو حسرت صرف آہ بھر کے رہ گئے، حرف شکایت تک زبان پر نہ لائے۔

تحریک آزادی کا درخت برگ و بار لایا تو اس کی فصل کا لوگوں میں بٹوارا ہوا، کسی کے حصے میں دھن دولت آئی کسی نے شہرت پائی، کسی کو صرف عزت ملی۔ مگر حسرت کو کچھ بھی نہ ملا، وہ کسی صلہ و ستایش کے طلب گار بھی نہ تھے۔ انھیں انعام ملا تو یہ کہ ان کے اپنوں نے کہا بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں، فہم و فراست سے محروم ہیں، سیاسی شعور سے بے بہرہ ہیں، انھوں نے کچھ بھی تو نہ پایا، نہ یگانوں سے نہ بے گانوں سے، مگر یہ حسرت ہی تو تھے جو ہمیں سرافرازی کی ایک لازوال دولت عطا کر گئے۔ ہم ہمیشہ سر اُٹھا کے کہہ سکیں گے کہ جب ملک کے بڑے بڑے سورما آزادیٔ کامل کا نام لیتے گھبراتے تھے تو ایک مرد مسلماں، اردو کا ایک شاعر و ادیب، اس درس گاہ کا ایک فرزند ایسا تھا جس نے ہزار مخالفت کے باوجود ہزاروں کے مجمع میں فوری اور مکمل آزادی کی تجویز پیش کی۔ یہ اور بات کہ کوئی جواں مرد اس کی آواز میں آواز نہ ملا سکا۔

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ احمد آباد میں کانگریس کا ایک تاریخی جلسہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام نظر بند تھے۔ باقی حضرات شریک تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں میں بھی تھا۔ اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا۔ حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے۔ گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے، بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا کہ جلدی چلیے کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کر دیا ہے اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں کوئی غیبی گولہ آکر پڑا ہے۔ گاندھی جی گھبرائے ہوئے جلسے سے اُٹھ کر سبجیکٹ کمیٹی کی طرف روانہ ہو گئے مگر حسرت:

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

حسرت بدستور اپنی بات پر جمے رہے اور نوٹس دیا کہ وہ اسے کھلے اجلاس میں پیش کریں گے۔ چنانچہ وہ وقت آیا جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی اور آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی ان کی تائید میں نہ اٹھی۔

حسرت کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے پہلے نظر جاتی ہے اور جم کے رہ جاتی ہے وہ ان کا فقر و استغنا ہے۔ ساری زندگی ان کا ہاتھ تنگ رہا۔ ایسوں کے دل میں دولت کی حرص کچھ زیادہ گھر کرلیتی ہے مگر حسرت کا معاملہ برعکس تھا۔ کبھی دولت کی دیوی ان پر مہربان ہوئی بھی تو مولانا فوراً گھبرا کے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مہاتما گاندھی نے ایک بار پنڈت نہرو سے سوال کیا تھا کہ:

> ''جواہر لال یہ بتاؤ کہ دیش آزاد ہوا اور تم پردھان منتری بنائے گئے تو کیا تنخواہ لو گے؟''

> ''سو روپے ماہوار'' انھوں نے زرہِ انکسار جواب دیا۔

اس پر مہاتما چیخ پڑے: جواہر لال، تم اس ننگے بھوکے دیش سے سو روپے تنخواہ لو گے، سو روپے! جب دیش آزاد ہوا تو حسرت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ پارلیمنٹ کے ممبر خود اپنی سرکار سے اتنی بڑی بڑی رقمیں سفر خرچ کے طور پر کیوں وصول کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک مشاعرے کے منتظمین سے یہ کہہ کر سفر خرچ تک لینے سے انکار کردیا تھا کہ میں گرفتاری کے ڈر سے بلا ٹکٹ انجن میں بیٹھ کر آیا ہوں، کرایہ کیسے لے لوں۔ ایک بار پی ایچ. ڈی کا زبانی امتحان لینے علی گڑھ آئے۔ رشید صاحب نے دستخط کے لیے ٹی اے بل پیش کیا۔ میزان پر نظر پڑی تو دیر تک کہتے رہے کہ اتنے بہت سے روپیوں کا ہم کریں گے کیا؟ پھر تفصیل پر نظر پڑی تو چونکے۔ بولے ہم تو تھرڈ کلاس میں آئے ہیں فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسے لے لیں، پھر ارشاد ہوا ہم تو آپ کے گھر ٹھہرے ہیں یہ قیام و طعام کا خرچ کیا معنی؟ پھر کچھ اور خیال آیا، بولے ہم تو دہلی جا رہے تھے، راستے میں ذرا دیر کو یہاں اتر گئے، ہم تو کچھ لے ہی نہیں سکتے۔

جو شخص درویشانہ زندگی بسر کرتا ہو اسے روپے پیسے کی ضرورت بھی کیا۔ ایک دوست کو
کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کا وقت آیا تو مہمان عزیز کے لیے ڈیوڑھی میں چٹائی بچھا دی۔
پھر اندر سے ایک رکابی میں چنے کی دال کا سالن اور طباق میں روٹیاں لے آئے۔ اسے
محبت سے بٹھایا اور میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ لباس کی طرف سے وہ ہمیشہ لاپروا رہے۔ بیگم
نے جو کپڑے دے دیے انھوں نے بلا تامل پہن لیے۔ وہ ان کے کپڑے خود ہی سیتی تھیں
خود ہی دھوتی تھیں۔ مولانا کو افسوس تھا کہ شیروانی درزی سے سلوانی پڑتی ہے۔ بیگم سے ذکر
کیا تو انھوں نے کسی درزی سے شیروانی کی تراش سیکھ لی اور درزی کا قصہ ہی پاک ہو گیا۔
جب کالج کے اساتذہ اور طلبا نے حسرت کے سودیشی اسٹور کا بائیکاٹ کر دیا تو وہ ذرا بھی
ہراساں نہ ہوئے۔ بولے ہمارا خرچ ہی کتنا ہے جو فکر مند ہوں۔ ملازم رکھنے کی تو حالات
نے کبھی اجازت ہی نہ دی۔ کرایے کے جس مکان میں رہتے تھے اس میں نل نہیں تھا۔ مکان
کے سامنے سڑک کے اس پار پانی کا نلکا تھا۔ حسرت پائنچے چڑھا کر بالٹیاں بھر بھر کے لاتے
اور دن بھر کی ضرورت کے لیے گھڑوں میں پانی بھر لیتے۔ کوئی اس کام میں مدد کرنا چاہتا تو
سختی سے انکار کر دیتے۔ آزادی کے بعد پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے تو اجلاس میں شرکت کے
لیے دہلی کے اسٹیشن پر تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ سے اس شان سے اترتے کہ ایک میلا سا تکیہ
پھٹی ہوئی دری میں لپٹا، رسّی سے بندھا داہنی بغل میں ہے اور بائیں ہاتھ میں لوٹا۔ اسٹیشن
سے نکل کے پاپیادہ نئی دہلی کی مسجد میں جا پہنچتے کہ یہی ان کی قیام گاہ تھی۔ جس غریب ممبر
پارلیمنٹ کو بھتے کے نام پر ایک پیسہ وصول نہ کرنا ہو وہ یہ نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

حسرت شاعر تھے، حسن پرست تھے اور سرتاپا پیکر اخلاص۔ جس سے ایک بار
ملاقات ہو گئی اسے ہمیشہ محبت سے یاد کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ایک رفیق سید محمد ہاشم رُسوا
سے تعلق خاطر ہو گیا تھا جو ہاشم کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد برابر انھیں تڑپاتا رہا۔
کئی شعروں میں اس عزیز کا بڑی محبت سے ذکر کیا ہے:

تھا علی گڑھ کو جو یہ فخر کہ حسرت ہے یہاں
حیدرآباد کو ہے ناز کہ واں تو آیا

اس جانِ آرزو نے کیا ہے جو واں مقام
گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

ایک ہمدردیٔ رسوا تھی انیسِ حسرت
سو وہ رسوا بھی اسے جا کے دکن بھول گئے

حسرت ایک زندہ دل عاشق مزاج انسان تھے اور ان کا لڑکپن خاصی رنگینی میں گزرا تھا۔ قبرص کی حسینہ اور اٹلی کی ژوپا کے قصوں اور عہد ہوس کے فسانوں کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے مگر یہ سب عہدِ شباب کی باتیں ہیں۔ انھوں نے جسے ٹوٹ کر چاہا، جس سے دائمی عشق کیا وہ تھیں ان کی بیگم نشاط النسا۔ کہا کرتے کرتے تھے کہ زلیخا، کملا اور نشاط نہ ہوتیں تو ابوالکلام، جواہر لال اور حسرت بھی نہ ہوتے۔ بیگم نشاط کی موت کا ماتم حسرت نے یہ کہہ کر کیا:

غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس	دل کسی اور سے لگانے کی
مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے تجھے	سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ وہ دل نہ وہ ذخیرۂ شوق	توڑ دوں کنجیاں خزانے کی

ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرت
دل فریبی ترے فسانے کی؟

حسرت کو اپنے وطن سے جو عشق تھا اور اس کی آزادی کے لیے ان کے دل میں جو بے پناہ تڑپ تھی اس کی طرف کچھ اشارے اوپر کیے جا چکے ہیں، تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ملک کی خاطر جیل تو ہزاروں لوگ گئے لیکن وہاں لوگوں نے جس طرح کی زندگی گزاری اس سے ہم ناواقف نہیں۔ مثلاً جیل میں مولانا آزاد اور ان کے رفقا کے شب و روز کیا تھے، غبار خاطر کے خطوط سے اس کا ہمیں علم ہو چکا ہے۔ اب سنیے حسرت کا حال خود ان کی زبانی: جیل پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا، کرتا، ایک ٹوپی پہننے کے لیے، ٹاٹ کا ٹکڑا بچھانے کے لیے، ایک کمبل اوڑھنے کے لیے ملا۔ ایک قدح آہنی بڑا ایک چھوٹا ضروریات کو رفع کرنے کے

واسطے مرحمت ہوا۔ پھر مجھے الہ آباد جیل منتقل کیا گیا، جہاں قید کی ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنا پڑا۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے:

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کا تعلق گرم دل سے تھا۔ احباب کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ حکومت سے شدید عداوت کا رویہ ترک نہ کر سکے اور ساری زندگی اس کا خمیازہ بھگتا۔ سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی اور جیل جانے کا وقت آیا تو گاندھی جی اور دوسرے رہنما چپ چاپ پولیس کے ساتھ ہو لیے۔ حسرت نے سنا تو حیران ہوئے کہ یہ کیا نافرمانی ہوئی۔ جب پولیس انھیں گرفتار کرنے پہنچی تو دل میں جیل جانے کی خواہش تھی مگر اظہارِ نافرمانی کے لیے زمین پر اوندھے لیٹ گئے کہ میں تو نہیں جاتا۔ مار پڑ رہی ہے کہ مگر نہیں اٹھتے۔ سپاہیوں نے گھسیٹا تو گھاس پکڑ لی۔ آخر بہ ہزار وقت زبردستی لاری پر لاد کر لے جائے گئے۔ گاندھی جی اور ان کے فلسفۂ عدم تشدد کے وہ قائل نہ تھے۔ جب انھوں نے فوری اور مکمل آزادی کی تجویز پیش کی تو گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں نے سمجھایا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا مگر وہ نہ مانے۔ افسوس انھیں اس ریزولیوشن کی تائید کرنے والا ابھی کوئی میسر نہ آیا۔ حسرت کی تجویز کے خلاف تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا ''حسرت صاحب ہمیں اس پانی میں لے جانا چاہتے ہیں جس کی گہرائی کا بھی ہمیں اندازہ نہیں۔''

حسرت بڑے بے باک اور بلا کے صاف گو تھے، دل کی بات زبان پر لانے میں انھیں کبھی تامل نہ ہوتا تھا۔ اس میں کبھی کبھی ناگفتنی بات بھی زبان سے نکل جاتی تھی جس کا تاوان بہرحال انھیں ادا کرنا پڑتا تھا۔ کان پور میں مسلمانوں کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر حکومت آپ کے ساتھ انصاف نہ کر سکی تو میں آپ کو گوریلا جنگ شروع کرنے کا مشورہ دوں گا۔ آزادی کے بعد ملک کے استحکام کے لیے سردار پٹیل نے بعض ریاستوں کو حسنِ تدبیر سے رام کیا، بعض کو زور زبردستی قابو میں لائے۔ یہ بات مولانا کو ناگوار گزری۔ پارلیمنٹ میں ہندوستان کے

مردِ آہن سردار پٹیل کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا "تم نے وہی کام کیا ہے جو ہسٹنگز، ولزلی اور کلائیو نے کیا تھا۔ تم نے اپنی طاقت ور فوجوں کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادیاں چھینی ہیں۔ تمہارے محکمے پر خدا کی لعنت ہو۔"

اس طرح کی تقاریر اور ایسے بیانات سے مولانا کے بارے میں اکثر غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی جذباتیت اور شدت پسندی سے خود ان کی ذات کو بھی نقصان پہنچا اور ملکی سیاست خصوصاً مسلم سیاست کو بھی، لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ غور و فکر کے عادی نہ تھے یا ان میں تدبر کی کمی تھی۔ ان کے مزاج میں ایک طرح کی جلد بازی ضرور تھی۔ وہ ہر کام جلدی کرتے تھے۔ ان کا دماغ بھی اسی طرح تیز رفتاری سے سوچتا تھا اور جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے تھے تو چوں کہ مصلحت کا ان کے مزاج میں گزر نہ تھا، موقع محل دیکھے بغیر دل کی بات زبان پر لے آتے تھے ورنہ ان کی دور اندیشی اور فہم و فراست کے ثبوت میں بہت سی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم بہت دنوں مکمل غیر جانب داری کی پالیسی پر عمل نہیں کر سکتے۔ لامحالہ کسی ایک بلاک سے ہمیں اپنا رشتہ استوار کرنا ہوگا اور وہ بلاک امریکی نہیں روسی بلاک ہونا چاہیے۔ دولتِ مشترکہ کے زیر سایہ رہنے کو وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ مرکز کے بجائے ریاستوں کو زیادہ اختیارات دینے کے حق میں تھے، ان کا خیال تھا کہ مرکز کے پاس صرف دفاع، رسل و رسائل اور مالیات جیسے چند محکمے ہی رہنے چاہئیں۔ مضبوط مرکز کے خلاف اب آوازیں اُٹھنے لگی ہیں۔ چند برس بعد اس معاملے میں عوام کا اندازِ فکر کیا ہوگا اس پر بھی صرف قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے۔ اردو رسم خط کو وہ مشکل بتاتے تھے اور آزادی سے پہلے انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ ہمیں رومن (انگریزی) رسم خط اپنا لینا چاہیے۔ اس کے کئی فائدے ہیں۔ انگریزی اعداد اور نام بالکل اسی طرح باقی رہیں گے، ٹائپ اور چھاپے کی آسانی ہو جائے گی، بولنے کی حد تک اردو زبان سارے ملک میں سمجھی جاتی ہے، معاملہ صرف رسم خط کا ہے۔ رومن رسم خط سے اس کے حدود بہت وسیع ہو جائیں گے اور یہ زبان بہ آسانی انتہائے جنوب تک پہنچ جائے گی اور پھر ملک کی کوئی زبان اردو کی ہم سری کا دعویٰ نہ کر سکے گی۔ اس وقت

لوگ مولانا کے مشورے کو ایک دیوانے کی بات سمجھ کر ہنس دیے اور خود مولانا بھی چپ ہو رہے لیکن آج یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اس وقت اس مشورے پر عمل کیا گیا ہوتا تو شاید اردو کی صورت حال کچھ مختلف ہوتی۔ یہ ہے مولانا حسرت موہانی کی شخصیت اور ان کے افکار کی ایک دُھندلی سی جھلک:

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اور

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

جیسے شعروں کے خالق، اردوے معلیٰ کے ایڈیٹر، پارلیمنٹ کے ممبر مولانا حسرت موہانی کو پہلی بار نئی دہلی کی ایک مسجد کے پاس الجھی ہوئی بے ہنگم داڑھی، پچکی ہوئی ترکی ٹوپی، ٹوٹی ہوئی کمانی کی عینک، ملی دلی شیروانی کے ساتھ ایک ہاتھ میں لوٹا اُٹھائے دوسرے میں رسّی سے بندھا دری تکیہ سنبھالے پھٹی پھٹی باریک آواز میں بولتے دیکھا تو ایک عظیم الشان دیوار ڈھیتی ہوئی نظر آئی مگر جب ان کے حالات زندگی اور کارناموں سے شناسائی حاصل ہوئی تو اسی شکستہ دیوار کے ملبے سے ایک منارۂ نور بلند ہوتا دکھائی دیا۔ ایسا بلند کہ آج تک تو اس کا ہم سر کوئی دوسرا مینار نظر آیا نہیں۔

○○○

نورالحسن نقوی
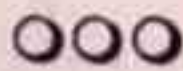
مولانا ابوالکلام آزاد

دہلی کے رام لیلا میدان میں مولانا حسین احمد مدنی کی وفات پر تعزیتی جلسہ ہو رہا تھا، پنڈت جواہر لال نہرو تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کا ان کا اپنا رنگ تھا۔ ٹوٹے پھوٹے جملے، رُک رُک کر بولنے کا انداز۔ مگر اس انداز میں بلا کی کشش تھی۔ شاید یہ ان کی شخصیت کا جادو تھا جو سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ جلسہ گاہ میں ہزاروں کا مجمع تھا مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف پنڈت جی کی آواز گونج رہی تھی۔ اتنے میں صدر دروازے کی طرف کچھ شور سا سنائی دیا۔ اسٹیج کافی اونچا تھا۔ پنڈت جی نے مڑ کر بائیں طرف دیکھا اور تقریباً دوڑتے ہوئے اسٹیج کی سیڑھیاں اُتر گئے۔ معلوم ہوا مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لے آئے ہیں۔ ذرا دیر میں مولانا کو لے کر پنڈت جی دوبارہ اسٹیج پر آئے اور پھر سے تقریر شروع کی۔ ان کے نزدیک ہی مولانا اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھ اور ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ مشکل سے دو چار منٹ گزرے ہوں گے کہ مولانا نے کچھ کہا۔ پنڈت جی نے جھک کر سنا اور مائک پر اعلان کیا کہ مولانا جلدی میں ہیں، انھیں کچھ ضروری کام ہے، پہلے وہ تقریر کریں گے۔ میں اپنی بات بعد کو مکمل کروں گا۔

اب مولانا کی تقریر شروع ہوئی۔ ایک ایک لفظ نپا تلا، ایک ایک فقرہ ترشا ہوا، لہجے میں انتہا درجے کی متانت اور وقار۔ مولانا کی خطابت کے چرچے بہت سنے تھے مگر جو کچھ سنا تھا اس سے کچھ سوا پایا۔ تقریر کے بعد وہ بیٹھے نہیں جلسہ گاہ سے رخصت ہو گئے۔ پنڈت جی جس احترام کے ساتھ انھیں لے کر آئے تھے اسی احترام کے ساتھ رخصت کرنے گئے۔ واپس آ کر انھوں نے تیسری بار اپنی تقریر شروع کی مگر اب مجمع اُکھڑ چکا تھا۔

مولانا کے ساتھ پنڈت جی کی نیاز مندی کے قصے سنے بھی تھے، پڑھے بھی تھے، غبارِ خاطر میں بھی اس کا اشارہ پایا تھا۔ اس دن جلسہ گاہ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا مگر چند برس پہلے محمد علی جناح نے انھیں کانگریس کا "شو بوائے" کہا تھا اور الزام لگایا تھا کہ کانگریس انھیں محض نمائش کے لیے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ یقین نہ ہونے کے باوجود مسٹر جناح کا بیان دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا اور یہ اندیشہ سر اُٹھاتا رہا کہ یہ سارا ادب واحترام کہیں سیاست کی شعبدہ گری تو نہیں۔ آخر کار یہ شبہ بے بنیاد ثابت ہوا۔

آزادی سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت مولانا سے بے زار رہی کیوں کہ ان کے پاس سستے جذباتی نعرے نہیں تھے۔ جس رہنما کو خود اپنی قوم کی مکمل حمایت حاصل نہ ہو وہ دوسروں سے اپنی بات کیسے منوا سکتا ہے۔ مولانا کی اس کمزوری سے ہندوستانی مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ مہاتما گاندھی تقسیم ملک کے اتنی ہی شدت سے مخالف تھے جتنے مولانا اور کہا کرتے تھے کہ پاکستان میری لاش پر ہی بن سکتا ہے، لیکن بند کمرے میں مہاتما کی سردار پٹیل سے ایک ہی ملاقات نے ان کا ذہن اس طرح تبدیل کر دیا کہ پھر مولانا کی کوئی دلیل انھیں قائل نہ کر سکی۔ ملک تقسیم ہو گیا اور ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب فرماتے تھے کہ رات بھر مسلح گروہ مسلمانوں کے گھر لوٹتے تھے، بے گناہوں کو شہید کرتے تھے اور صبح سویرے مہاجروں کو سرحد پار پہنچانے کے لیے ٹرک قطار میں کھڑے نظر آتے تھے۔ کیسی منظم کارروائی تھی! شاید یہ اس لیے ضروری تھا کہ شرنارتھیوں کو خالی مکانوں میں آباد کیا جا سکے۔ فرقہ پرست لیڈروں کی بن آئی تھی۔ بدنصیبی یہ کہ ان کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت بھی تھی، ایسے میں مولانا تو کیا خود مولانا کے الفاظ میں ہندوستان کے وزیر اعظم بھی آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس کی تفصیل مولانا آزاد کی کتاب "انڈیا ونز فریڈم" میں موجود ہے۔

اس وقت ہندوستان کے ہر مسلمان کو شکایت تھی کہ مولانا مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے کوئی قدم کیوں نہیں اُٹھاتے اور اگر بے بس ہیں تو کانگریس اور حکومت دونوں سے مستعفی کیوں نہیں ہو جاتے۔ اہنسا کے پجاریوں کے اس دیس میں جو کچھ ہو رہا ہے

کم سے کم دنیا اس سے باخبر تو ہو جائے گی۔ بہ ظاہر اس دلیل میں وزن نظر آتا تھا مگر یہ خام خیالی تھی۔ یہ بے حسوں کی دنیا ہے، یہاں ظالم کا ہاتھ کوئی نہیں پکڑتا۔ اسرائیل اور بوسنیا جیسی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ مولانا کے مستعفی ہونے کا یہ نتیجہ ضرور نکلتا کہ ایوان حکومت میں ہمارا اپنا کوئی نہ بیٹھا ہوتا تو فرقہ پرستوں کو اور بھی کھیل کھیلنے کا موقع مل جاتا۔ مولانا آزاد نے "انڈیا ونز فریڈم" میں فسادات کے زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ سردار پٹیل نے کئی میزوں پر پرانے چاقو، چھریاں، لوہے کی چھڑیں، ٹوٹے ہوئے پائپ سجا کر گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دکھائے کہ دہلی کے مسلمانوں نے یہ اسلحہ جمع کر رکھا تھا جسے حکومت نے بروقت برآمد کرلیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایک پرانا زنگ آلود چاقو اُٹھایا، اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں فرمایا کہ اچھا ہی ہوا جو مسلمانوں سے یہ ہتھیار چھین لیے گئے ورنہ ان سے وہ دہلی کے سارے ہندوؤں کا خاتمہ ہی کر دیتے۔ سردار کی یہ ہمت تو اُس وقت ہوئی جب ایک مسلمان بھی وہاں موجود تھا۔ وہ نہ ہوتا تو خدا جانے موصوف کتنی زہرافشانی فرماتے۔

مولانا آزاد ایک کشادہ دل اور وسیع القلب انسان تھے، ترجمان القرآن اور مولانا کے دیگر مضامین سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ وحدت ادیان کے قائل تھے۔ دنیا کے مختلف مذاہب ان کے نزدیک مختلف راستے ہیں جن کی منزل بہرحال ایک ہے۔ مولانا عبدالحمید رحمانی نے التوعیہ (مئی ۹۴ء) میں بہ دلائل اس رائے کی تردید کی ہے۔ مولانا کے مذہبی افکار کے بارے میں اظہار خیال کا ہمیں استحقاق نہیں تاہم اتنی بات تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام عالم انسانیت کو خوشی اور خوش حالی سے معمور دیکھنے کے آرزومند تھے۔ ہندوستان ان کا اپنا وطن تھا، اسے وہ اقوام عالم میں سر بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مسلمان تھے اس لیے مسلمانوں کے مسائل سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ ملت کے اداروں ہی کی نہیں بلکہ معمولی افراد کی فکر بھی ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی اور ان کی مدد کو ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔ زبردست مقرر ہونے کے باوجود کم گو تھے اور کم آمیز تو وہ حد سے زیادہ تھے۔ احسان جتانا، بڑھ چڑھ کے دعوے کرنا اپنی خدمات کا اعلان کرنا، یہ ساری باتیں ان کے مزاج کے

خلاف تھیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انھوں نے کیا کیا۔ اس مختصر مضمون میں اسی کا اعتراف مقصود ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں سب سے زیادہ نقصان دہلی کے مسلمانوں کو پہنچا۔ ان کے تمام تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ اسی دوران پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک تقریر کی۔ تقریر کرتے ہوئے وہ اکثر اتنے جوش میں آجاتے تھے کہ سرکاری مصلحتیں بھی نظر انداز ہو جاتی تھیں۔ انھوں نے کہا مسلمانوں کے جو ادارے بند ہو گئے ہیں وہ پھر سے کھلیں گے خواہ ایک ہی طالب علم کیوں نہ ہو۔ مولانا آزاد نے اسی وقت مولانا حفظ الرحمٰن کو ٹیلی فون کیا کہ اساتذہ اور طلبا کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو فتح پوری مسلم اسکول اینگلو عربک اسکول اور دوسرے مسلم اسکول فوراً کھلوا دیے جائیں۔ آج جواہر لال نہرو نے جو تقریر کی ہے وہ کل کے اخباروں میں چھپے گی۔ اس کے تراشے کے ساتھ سرکاری امداد کے لیے محکمۂ تعلیم کو درخواستیں بھیجی جائیں۔ تعمیل کی گئی اور کامیابی ہوئی۔ مولانا آزاد کی توجہ سے دہلی کے مسلم اسکول نے نئی زندگی پائی۔ یہ واقعہ ہم نے خود مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی زبان سے سنا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا ذکر آیا تو ایک اور بات یاد آئی۔ وہ بڑے بے باک اور صاف گو انسان تھے۔ دل کے نرم مگر زبان کے بہت سخت تھے۔ مرضی کے خلاف ذرا سی بات ہو جائے تو برس پڑتے تھے اور رُکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ فتح پوری مسلم ہائی اسکول کی مجلس منتظمہ کے صدر تھے۔ ایک سال محکمے نے کچھ گرانٹ روک دی۔ مولانا نے اس سلسلے میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ بنرجی ڈائرکٹر تھے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کے ہم زلف تھے۔ قابل ہونے کے ساتھ ساتھ سخت بھی بہت تھے۔ ان کے سامنے اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہوتا تھا، مگر اس ملاقات میں مولانا نے انھیں جیسی کھری کھری سنائیں ویسی شاید انھوں نے ساری زندگی نہ سنی ہوں گی۔ گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ یہ اسکول مسلمانوں کا ہے اور آپ کا سارا عملہ بے حد متعصب ہے۔ مسلمانوں کے یہ چھوٹے چھوٹے اسکول بھی آپ کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں اور آپ لوگ انھیں بند کرا دینے کے درپے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب بار بار تعاون اور تحقیق کی یقین دہانی کرتے رہے مگر مولانا کی تقریر کا ما، فل اسٹاپ کے بغیر جاری رہی۔

ڈائرکٹر صاحب اگر اسکول کی گرانٹ بند کر دیتے تو یہ ان کے مزاج کے عین مطابق ہوتا مگر انھوں نے اسی دن چھان بین کی اور حکم دیا کہ روکی ہوئی گرانٹ فوراً ادا کی جائے۔ سارے محکمے پر نئی پوری اسکول کی دھاک جم گئی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ڈائرکٹر صاحب مولانا کی صاف گوئی کے قائل ہو گئے۔

محکمہ تعلیم میں چھوٹے سے اسکول کے ایک معمولی سے کلرک کو کوئی منھ نہ لگاتا تھا۔ مگر ایک دن طلب کیا گیا اور ڈیلنگ آفیسر اپنے افسر اور وہ اپنے افسر کے پاس لے گئے۔ آخر ڈائرکٹر صاحب کے پی۔ اے نے بتایا کہ وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ڈائرکٹر صاحب سے ناخوش ہیں، ان کا تبادلہ کر دینا چاہتے ہیں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کی وجہ سے ڈائرکٹر صاحب کی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تک رسائی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ڈائرکٹر صاحب کا تبادلہ ہو مگر وزارت تعلیم کے معاملے میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے۔ اس دن جو مولانا صاحب تمہارے ساتھ آئے تھے، سنا ہے مولانا آزاد ان کی بات بہت مانتے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب کی خدمت کرنے کا یہ نادر موقع تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے سامنے لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔ ہمیں ان سے کچھ کہنا ہوتا تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو وسیلہ بناتے تھے۔ اس دن بھی یہی کیا، مگر ان کا جواب تھا کہ دیکھو، جس طرح تم مولانا حفظ الرحمٰن کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے، اسی طرح مولانا حفظ الرحمٰن مولانا آزاد کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ چپ ہو رہو۔ بہت دن تک ملال رہا کہ ہمیں ڈائرکٹر صاحب کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع نہ مل سکا مگر اس خیال سے خوشی بھی ہوئی کہ اگر ہم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ڈرتے ہیں تو کوئی ایسا مولوی بھی ہے، جس سے ہمارے مولانا ڈرتے ہیں۔

یہ بات بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی زبانی سنی تھی کہ ہمدرد دواخانے کو مولانا آزاد کے مشورے پر ہی ایک وقف کی شکل دی گئی ورنہ اسے حکومت لے لیتی۔ یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ملک میں ہزاروں لاکھوں نجی کمپنیاں ہیں، حکومت ان پر قبضہ نہیں کرتی تو ہمدرد دواخانے پر کس طرح قابض ہو جاتی۔ ایک تو یہ بات ممکن ہے کہ حکیم صاحب

کے ایک بھائی پاکستان چلے گئے تھے اس لیے کسٹوڈین اس پر قابض ہو جاتی۔ دوسری بات یہ ممکن ہے کہ منافع کا بڑا حصہ انکم ٹیکس کی شکل میں حکومت کے پاس چلا جاتا۔ وقف ہونے کے سبب یہ رقم توسیعی کاموں میں لگائی جا رہی ہے۔

علی گڑھ نے آزادی سے پہلے مولانا آزاد کے ساتھ نہایت نازیبا سلوک کیا تھا مگر وزارت تعلیم کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد مولانا نے ایسی تدبیریں کیں کہ یہ ادارہ گزند سے محفوظ رہا اور اسے استحکام حاصل ہوا مسلم یونیورسٹی لاکھوں فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی مگر وہ اس کا بال بیکا نہ کر سکے۔ علی گڑھ نے ایک بار پھر انھیں شکایت کا موقع دیا مگر مولانا نے صرف اپنے رنج کا اظہار کیا۔

ایک بار ندوۃ العلما کو مالی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تو مولانا نے بحیثیت وزیر تعلیم ایک معقول رقم سے مدد کی۔ مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن تو زہر میں بجھے ہوئے تھے ہی، انھوں نے پارلیمنٹ میں اس پر اعتراض کیا۔ جواب دیتے ہوئے مولانا کو ایسا جلال آیا کہ انھوں نے اپنا فونٹن پین غصے میں اٹھا کر دور پھینک دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنا قلم پیش کیا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا۔

رام پور کا کتب خانہ رضا لائبریری مشرقی علوم کی بیش بہا کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ ہے۔ مولانا اس کے معاملات میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے رہے۔ مدرسہ عالیہ رام پور کو ہمیشہ ان کی سرپرستی حاصل رہی۔ حیدر آباد کے سہ ماہی میگزین ''اسلامک کلچر'' کی امداد صوبائی حکومت نے کم کر دی تو چیف منسٹر کو لکھا کہ آپ محض چند ہزار کے لیے لاکھوں کا نقصان کر رہے ہیں۔ اس رسالے کے بند ہو جانے سے ہندوستان کے وقار کو ٹھیس پہنچے گی۔ مولوی مسعود علی نے اکیڈمی کے لیے ساٹھ ہزار کی مدد مانگی، وزارت تعلیم کے افسروں نے دس ہزار کی سفارش کی۔ اس پر نوٹ لکھا کہ دس ہزار کی امداد بالکل بے معنی ہے جتنی رقم مانگی گئی ہے اتنی ہی دی جائے۔ شیخ احمد سرہندی کی درگاہ کو کس مپرسی کی حالت میں پایا تو اسے سدھارنے کے ہزار جتن کیے۔ مسلم اوقاف کی بدنظمی نے انھیں ہمیشہ مضطرب رکھا۔

مولانا آزاد دفتر کی فائلوں پر اردو میں نوٹ دیا کرتے تھے اور کسی کو انگریزی میں خط بھیجنا ہوتا تو اکثر اس کا مضمون بھی اردو میں لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ ساری تحریریں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر راجیس کمار پرتی نے انھیں ترتیب دے کر مارچ ۱۹۹۰ء میں شائع کر دیا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی تحریریں مولانا کے ذہن کو سمجھنے میں بہت مدد کرتی ہیں۔

ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں مساجد کی بے حرمتی مولانا کے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ متعلقہ اصحاب کو وہ بار بار اس طرف توجہ دلاتے تھے اور ان کی بے توجہی پر رنجیدہ ہوتے تھے۔ جے نرائن ویاس کو لکھتے ہیں کہ بھرت پور کی جامع مسجد کا ایک حصہ اور اس کی جائداد ابھی تک مسجد کمیٹی کو نہیں سونپی گئی۔ دوسرا معاملہ الور کی مسجدوں کا ہے جن کا ابھی تک مسلمانوں کو واپس نہ کیا جانا افسوس ناک ہے۔ اس سے دنیا میں ہماری بدنامی ہوتی ہے۔

بھیم سین سچر کو مولانا نے بار بار پنجاب کی مسجدوں کی افسوس ناک حالت کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ باہر ملکوں میں مسجدوں کی اس حالت کے سبب ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد دلایا کہ بہت جلد ہند پاک مذاکرات ہونے والے ہیں۔ بات چیت کے دوران یہ معاملہ پاکستان کے لیے ہتھیار کا کام کرے گا مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ مولانا سے ملنے سے بھی گریز کرنے لگے۔ مولانا نے انھیں طنزیہ لہجے میں لکھا کہ آپ ملنے سے ہچکچایئے مت۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری گفتگو تو کرنی ہے مگر وہ مساجد کے بارے میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ دہلی آئے بھی مگر مولانا سے نہیں ملے تو انھوں نے پھر لکھا کہ گھبرایئے مت۔ میں لدھیانہ کی مسجدوں کے بارے میں بات نہیں کروں گا۔

آزادی کے بعد کسٹوڈین کی زیادتی ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اَن گنت مسلمان اپنے دیس میں رہتے ہوئے بے گھر ہو گئے تھے۔ کوئی جان بچانے کو اپنے شہر سے دوسرے شہر یا اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں چلا گیا تو اسے اپنے گھر سے بے دخل

کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنی زندگی کے باقی سال ان مظلوموں کو انصاف دلانے کی کوشش میں صرف کر دیے۔ یہ کام انھوں نے مولانا آزاد کے مشورے پر ہی کیا۔ خود مولانا آزاد برابر اس طرف متوجہ رہے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ کسی خاندان کا ایک فرد بھی پاکستان چلا گیا تو اس کی کل جائداد نکاسی قرار دے دی جاتی تھی۔ مولانا نے حکومت کو بار بار توجہ دلائی کہ جتنے حصے کا مالک پاکستان گیا ہے صرف اتنے حصے کو نکاسی جائداد قرار دینا چاہیے۔ مولانا نے اس سلسلے میں اجیت پرشاد جین کو کئی خط لکھے۔ اس معاملے میں زیادتی کا کوئی انفرادی معاملہ بھی مولانا کے علم میں آتا تھا تو فوراً حکومت سے کارروائی کا مطالبہ کرتے تھے۔

۲۲ راپریل ۱۹۵۳ء کو شاستری جی کو لکھتے ہیں: عبدالرحیم کی درخواست آپ کو ملی ہوگی۔ اس کی کاپی بھیجتا ہوں۔ یہ ریلوے میں خلاصی تھا۔ اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ چھ مہینے کے اندر اگر چاہے گا تو واپس آ جائے گا۔ چنانچہ واپس آ گیا۔ جب سے بھوکا مر رہا ہے۔ نوکری پر نہیں لیا جاتا۔ یہ کوئی ریلوے افسر نہیں ہے۔ محض انجن کا خلاصی ہے۔ کیا ایک غریب خلاصی کے لیے ریلوے میں کوئی جگہ نہیں نکل سکتی۔

کسی شخص کے ساتھ اگر چھوٹی سی زیادتی بھی ہوتی تھی تو مولانا اسے انصاف دلانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس میں نہ یہ شرط تھی کہ مولانا اس سے واقف ہوں اور نہ یہ کہ وہ مسلمان ہی ہو۔ وہ ہر ایک کی مدد کو تیار رہتے تھے۔ چھپرا کے ایک نوجوان زین العابدین کے لیے بار بار کوشش کی کہ اسے کوئی ملازمت مل جائے۔ سید سلیمان احمد آئی اے ایس کے مقابلے میں ۳۲ ویں نمبر پر کامیاب ہوئے۔ انتخاب ۳۰ نمبر تک ہوا۔ مولانا مسٹر کاٹجو کو لکھتے ہیں کہ حسبِ ضابطہ اسے پولیس، ریلوے، اکاؤنٹس وغیرہ میں جگہ دی جا سکتی تھی۔ نہیں دی گئی۔ جب کہ اس کے بعد کے نمبر والوں کو ملازمت دی جا چکی ہے۔ یہ ناانصافی کیوں؟

برطانوی حکومت نے ۱۹۳۰ء میں گڑھوال رجمنٹ کو برخاست کر دیا تھا کیوں کہ اس کے فوجیوں نے نان کوآپریشن کی تحریک چلانے والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔

ایک ہندو فوجی کا بیٹا سرکاری وظیفے کا امیدوار ہوا تو مولانا نے مسٹر تیاگی کو زوردار سفارشی خط لکھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کشمیر کو ہندوستان کا ایک لازمی حصہ مانتے تھے اور کسی بھی صورت میں ہندوستان سے اس کے علاحدہ ہو جانے کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق شیخ عبداللہ کی خواہش پر ہوا تھا۔ ایک بار انھیں موقف سے ہٹتا ہوا دیکھا تو وزیراعظم کو مشورہ دیا کہ کشمیر کے معاملات درست کرنے کی ذمہ داری رفیع احمد قدوائی کو سونپی جائے، لیکن وہ ضروری خیال کرتے تھے کہ کشمیری مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور وہ ہر طرح سے مطمئن رہیں تاکہ ہندوستان سے ان کا رشتۂ دوستی استوار تر ہوتا جائے مگر یہ دیکھ کر انھیں ملال ہوتا تھا کہ جو تین محکمے مرکز کے اختیار میں ہیں ان میں کشمیری مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بار مسٹر جگ جیون رام کو بہت سخت خط لکھا۔ فرماتے ہیں:

"آپ جانتے ہیں ہمارے انٹرسٹ کے لیے یہ بات کتنی ضروری ہے کہ ہم کشمیر کے باشندوں کے اندر گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے اچھے خیالات پیدا کرائیں اور ان کے اندیشے جو ہمارے طرزِ عمل کی نسبت ہیں وہ یک قلم دور ہوں لیکن افسوس ہے کہ اس کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے اور ایسی باتیں ہو جاتی ہیں جو کشمیر میں ہمارے خلاف ایک پرابلم بن جاتی ہیں اور پھر اس کے اثرات ہمارے تعلقات کو خراب کرتے ہیں۔ اسٹیٹ گورنمنٹ ایک عرصے سے شکایت کر رہی ہے کہ ڈاک تار محکمے کی سروس میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ جتنے آدمی رکھے جاتے ہیں نان مسلم۔ نارورن سرکل کی کلرکی کے لیے امتحان لیا گیا تو ساٹھ نان مسلم رکھے گئے اور صرف تین مسلم۔ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد بے روزگار ہے۔ اگر ایک محکمہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ہاتھ میں جانے کا یہ نتیجہ نکلا ہے تو کیوں کر کشمیر یہ بھروسا کر سکتا ہے کہ اس کا مستقبل محفوظ رہے گا۔ (اندراج ۱۶۲، ص: ۱۳۱۔۱۳۲)

زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ایسا ہی واقعہ پھر پیش آیا۔ مولانا نے پھر جگ جیون رام جی کو لکھا کہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے لیے تینتالیس (۴۳) کلرکوں کی بھرتی ہوئی ہے اس میں

صرف ایک کشمیری ہے۔ پھر لکھتے ہیں ابھی صرف تین سبجیکٹ (محکمے) گورنمنٹ آف انڈیا
کے حوالے کیے گئے ہیں۔ کشمیری مسلمانوں کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں نکل سکتی تو پھر
دوسرے محکموں میں ہم کیا امید کر سکتے ہیں۔

مولانا کی دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ کشمیر میں یہ روش جاری رہی تو حالات
قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ انھوں نے بروقت حکومت ہند کو متنبہ بھی کیا مگر فہم و فراست کی
شکست اور تعصب و تنگ نظری کی فتح ہوئی۔

مولانا آزاد کم گو تھے، کم آمیز تھے، میل ملاقات اور جلسے جلوس سیاست داں ہونے
کے باوجود انھیں ناپسند تھے۔ وہ انتہا درجے کے تنہائی پسند تھے اور تنہائی میں ان کا بیش تر
وقت مطالعے اور غور و فکر میں بسر ہوتا تھا۔ دماغ بھی انھوں نے غیر معمولی پایا تھا۔ اس لیے
مستقبل میں پیش آنے والے اکثر وہ واقعات جو پردۂ خفا میں ہوتے تھے انھیں بے نقاب
نظر آجاتے تھے۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے سے برسوں پہلے لکھ دیا تھا کہ جغرافیائی
صورت حال پاکستان کے خلاف ہے اور دور مشرق میں واقع اس کا دوسرا حصہ ایک دن آزاد
ہو جائے گا۔ دو قومی نظریہ انھیں کھوکھلی بنیاد پر کھڑا نظر آتا تھا۔ ان کا ارشاد تھا کہ جس دن یہ
خواب چکنا چور ہوا اس دن بہت کچھ بکھر جائے اور ایسا ہی ہوا۔ انھیں اپنے ملک میں بھی
صوبائیت اور علاقائیت کا عفریت مستقبل قریب میں سر اٹھاتا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے
ایک جگہ لکھا ہے کہ روز بروز ایک نئی تفریق پراونشلزم کی بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ یقین کیجیے
یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلزم کے لیے سخت مضر ثابت ہوگی۔ وقت نے بتا دیا کہ ان کا یہ
اندیشہ بے بنیاد نہیں تھا۔

ملک کی تقسیم کو وہ ہندوستان کے لیے اور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے۔
ہندوستان متحد رہتا تو کشمیر اور پنجاب جیسے پیدا ہی نہ ہوتے، لیکن پاکستان وجود میں آ ہی گیا
تو وہ چاہتے تھے کہ دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ انھوں نے پاکستان کے
سربراہوں محمد علی اور غلام محمد کو خط لکھ کر پنڈت نہرو سے ملاقات کا مشورہ دیا اور اس عزم کا
اظہار کیا کہ پاکستان اور انڈیا کا پرابلم ہمیں حل کرنا ہے اور ہم حل کر کے رہیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے مفکر اور مدبر تھے کہ سخت سے سخت حالات میں ملک وقوم کی رہنمائی کا حق ادا کر سکتے تھے اور ان کی صلاحیتوں سے بہت فائدہ اُٹھایا جاسکتا تھا مگر انھوں نے درست ہی فرمایا ہے کہ ''دنیا میرے دماغ سے کوئی کام نہ لے سکی۔'' مسلمانوں کی اکثریت نے انھیں اپنا لیڈر تسلیم نہیں کیا۔ کانگریس اور کانگریسی حکومت نے ان کے وزن کو اس لیے پوری طرح محسوس نہیں کیا کہ خود مسلمانوں کی مکمل حمایت انھیں حاصل نہیں تھی۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا کی رہنمایانہ صلاحیت کے قائل تھے۔ مشکل کے وقت ان سے مشورہ کرتے تھے اور اکثر نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات مان لیتے تھے۔ ایک بار ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انھوں نے ٹی ٹی کرشنم چاری کا استعفیٰ طلب کر لیا لیکن انھیں رخصت کرنے ہوائی اڈے تک گئے۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ یہ کام انھوں نے اپنی منشا کے خلاف کیا ہے۔ مولانا کی وفات پر پنڈت جی نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ ہم مصیبت کے وقت ان سے صلاح لیتے تھے اور ان کی ہدایت پر عمل کرتے تھے۔ ہم نے اپنی مرضی کے خلاف ان کے جس حکم پر آخری بار عمل کیا وہ ٹی ٹی کرشنم چاری کے سلسلے میں تھا۔

مولانا کے جنازے کے ساتھ دنیا نے ایک سوگوار نہرو کو دیکھا۔ ایسے نہرو کو جس کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ''آج ہماری کمر کے نیچے سے وہ دیوار سرک گئی، مصیبت کے وقت ہم جس کا سہارا لیا کرتے تھے۔'' سچ تو یہ ہے کہ صرف پنڈت نہرو کی کمر کے پیچھے سے ایک دیوار نہیں سرکی بلکہ مولانا کی وفات سے ہندوستانی مسلمانوں کے پیروں تلے کی وہ زمین سرک گئی جس پر تقسیم ملک کے بعد ان کے قدم جم چلے تھے۔ آج مسلمان لیڈر رقطار اندر رقطار نظر آتے ہیں مگر ان میں کوئی ہے جس میں قوم کی قیادت کی ادنیٰ صلاحیت بھی موجود ہو؟۔

ooo

نورالحسن نقوی
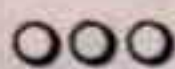
پروفیسر علی محمد خسرو

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ زیدی لاج کے خوب صورت لان پر بیس پچیس کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کسی میٹنگ کا اہتمام تھا۔ دس پندرہ لوگ آ بھی چکے تھے جو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بیٹھے ہوئے محوِ گفتگو تھے۔ نشست کے میزبان کرنل بشیر حسین زیدی ایسے ہی ایک حلقے میں مسلم یونیورسٹی کے مسائل پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے کہ پروفیسر علی محمد خسرو دو ایک روز میں وائس چانسلر کا منصب سنبھال لیں گے اور ان کے جو خواب ادھورے رہ گئے تھے وہ اب پورے ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی پریس کے لیے جو جدید مشینیں ان کے زمانے میں خریدی گئی تھیں وہ کام کرنے لگیں گی۔ انجینئرنگ کالج میں توسیع ہوگی اور یونیورسٹی کے نزدیک ایک صنعتی شہر وجود میں آجائے گا۔

اتنے میں ایک صاحب نے لان میں قدم رکھا اور یک بارگی سب کی نظریں ادھر اُٹھ گئیں۔ کشیدہ قامت، دوہرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی بے حد پُرکشش مسکراتی ہوئی آنکھیں، چال میں متانت اور خود اعتمادی، کیسی سحر آفریں شخصیت ہے! کون ہو سکتے ہیں کہ ان کے آتے محفل میں جان سی پڑ گئی۔ سب کرسیوں کا رُخ ان کی طرف کو پھر گیا۔ آنکھوں کا سوال پروفیسر مسعود حسین خاں نے پڑھ لیا ''ارے تم انھیں نہیں جانتے! یہ پروفیسر علی محمد خسرو ہیں، تمہارے نئے وائس چانسلر۔''

تعارف کے بعد خسرو صاحب اپنا پروگرام بتانے لگے۔ منہ سے پھول جھڑنے کا محاورہ بارہا سنا تھا، یہ نہ سنا تھا کہ محاورے کبھی کبھی سچ بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ بات کرتے تو لگتا تھا سچے موتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔

اب مہمان خصوصی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ان کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ حاضرین کی نظریں بار بار سڑک کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ اتر پردیش کے گورنر اکبر علی خاں صاحب تشریف لانے والے تھے۔ زیدی لاج میں اکابر کے جمع ہونے کا مقصد تھا لکھنؤ کے سنّی شیعہ قضیے کا تصفیہ۔ ذرا دیر میں ان کی کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ کرنل صاحب اور بعض عمائد پذیرائی کو بڑھے۔ کرنل صاحب کا اشارہ پا کر ہم لوگ نزدیک پہنچ گئے۔ انھوں نے تعارف کرایا: ''یہ ہیں ڈاکٹر عالم حسین اور نورالحسن۔ علی گڑھ سے آئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ سے ذاکر حسین اسکول کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوانے کے خواہش مند ہیں۔ سنّی شیعہ جھگڑا تو آسانی سے نمٹنے والا نہیں۔ پہلے آپ ان کی درخواست پر غور فرمالیجیے۔

انھوں نے توجہ سے درخواست سنی اور منظور فرمالی لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں محمڈن کالج کا طالب علم رہا ہوں۔ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ میں علی گڑھ جاؤں اور مسلم یونیورسٹی میں حاضری نہ دوں۔ اس پر خسرو صاحب کو زحمت دی گئی۔ وہ نزدیک آئے تو زیدی صاحب نے تجویز پیش کی کہ خسرو صاحب گورنر صاحب کو مسلم یونیورسٹی کی طرف سے مدعو کریں۔ لمحے بھر تامل کے بعد خسرو صاحب نے فرمایا: ''یہ ابھی قبل از وقت ہوگا۔ میں کچھ قربانیاں دے کر اور کچھ ارمان لے کر علی گڑھ جارہا ہوں میرے ذہن میں کچھ انقلاب آفریں منصوبے ہیں۔ خدا جانے وہ پسند کیے جائیں گے یا ناپسند۔ بڑی تبدیلیوں کو لوگ آسانی سے گوارا نہیں کرتے۔ ممکن ہے وہاں میری اور میرے خوابوں کی پذیرائی نہ ہو۔ ممکن ہے وہاں میرا سامان کھل بھی نہ سکے اور میں دن کے دن لوٹ آنے پر مجبور ہو جاؤں۔ اور اس عالم میں کہ میرے سر سے خون بہہ رہا ہو۔ میں اپنے خوابوں کا سودا کسی بھی قیمت پر کرنے کو تیار نہیں۔ پہلے مجھے حالات کا جائزہ لینے دیجیے پھر پہلی فرصت میں آپ کو دعوت دینے لکھنؤ حاضر ہو جاؤں گا اور یونیورسٹی میں آپ کے شایانِ شان آپ کا خیر مقدم کروں گا۔''

سامعین مسحور ہو گئے۔ الفاظ حریر و پرنیاں، عزائم صورتِ فولاد!

وہ رات عجب سرخوشی کے عالم میں گزری۔ کھلی آنکھوں سے بھی اور بند آنکھوں سے بھی صرف ایک ہی سپنا دیکھا، بڑا سہانا سپنا کہ دنیا کے نقشے پر بس ایک شہر جگمگا رہا ہے۔ اپنا علی گڑھ۔ اُجالوں کا نگر!

چند روز بعد خسرو صاحب کا علی گڑھ میں ایسا پُر جوش استقبال ہوا کہ برسوں اس کی یاد ذہنوں میں تازہ رہی۔ یونین ہال میں مہمان پر پھولوں کی لگاتار بارش کا سماں جس نے نہیں دیکھا اس نے دنیا کے حسین ترین منظروں میں سے ایک منظر کم دیکھا۔ ہال کی چھت میں ایک شگاف بنایا گیا ہے۔ چھت پر گلاب اور گیندے کی سرخ، سفید، زرد منوں پنکھڑیاں ڈھیر کر لی جاتی ہیں۔ شگاف سے یہ پتیاں تسلسل کے ساتھ مہمانوں پر برسائی جاتی ہیں۔ تار سا بندھ جاتا ہے۔ پھولوں کی بارش نظر آتی ہے۔ پھول برسانے والا ہاتھ دکھائی نہیں دیتا۔ محسوس ہوتا ہے آسمان سے نور برس رہا ہے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ اس منظر کو اور بھی اثر انگیز بنا دیتی ہے۔ جس پر یہاں ایک بار پھول نچھاور ہو گئے وہ زندگی بھر علی گڑھ پر نچھاور ہونے کے لیے کمربستہ رہا۔

تو صاحب، خسرو صاحب کا اس شان کا استقبال ہوا۔ پروفیسر ہربنس لال شرما قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ شرما جی سادھو سنتوں کے قدر دان تھے۔ خود کو بھی صوفی کہتے تھے۔ انھوں نے خیر مقدمی تقریر میں فرمایا: ”جناب والا! آپ کا اسم گرامی علی محمد خسرو ہے۔ اے. ایم خسرو ہے۔ آپ درویشانہ صفات اور صوفیانہ اوصاف کا مجموعہ ہیں۔ اس لیے جی چاہتا ہے اے. ایم پر آئی آر کا اضافہ کر کے آپ کو امیر خسرو کہوں۔ یوں بھی اب آپ ہمارے امیر کارواں ہیں۔“

خسرو صاحب جواب دینے کو اُٹھے۔ پھولوں کی بارش تیز ہو گئی اور تیز، اور تیز! پھولوں کی بارش اور تالیوں کا شور تھما تو خسرو صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اب لفظوں کے پھول برسنے لگے۔ اصلی پھولوں کی بارش مات کھا گئی۔ انھوں نے فرمایا: ”پروفیسر شرما! آپ نے مجھے امیر خسرو کہا۔ میں امیر خسرو نہیں، غریب خسرو ہوں۔ اور غریب کا لفظ میں خاص طور پر غریب الوطن کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ اس موقع پر مجھے خسرو کا ایک شعر

یاد آرہا ہے، جس میں وہ کہتا ہے کہ خسرو گدا ہے، غریب الوطن ہے، تمہارے شہر میں آپڑا ہے۔ اب جو چاہو اس کے ساتھ سلوک کرو۔ وہ شعر ہے:

خسرو غریب است و گدا، افتادہ در شہرِ شما

باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

امیر غریب کی اس بحث نے مجھے امیر مینائی کا ایک شعر یاد دلا دیا، کہتے ہیں:

امیرؔ جمع ہیں احباب، حالِ دل کہہ لو

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اس وقت یہ شعر میرے حسبِ حال ہے۔ آج مجھ پر آپ کی کیسی بے پایاں عنایتیں ہیں۔ کل خدا جانے یہ نگہِ التفات ادھر ہو کہ نہ ہو۔ سنا ہے، جتنی گرم جوشی سے آپ خوش آمدید کہتے ہیں اتنی ہی سرد مہری سے خدا حافظ بھی کہہ دیتے ہیں۔''

اور ایک دن ایسا بھی آیا جب ایک طالب علم نے اپنی تقریر میں کہا: ''کوئی کہتا ہے آپ امیر خسرو ہیں، آپ کہتے ہیں میں غریب خسرو ہوں، میں کہتا ہوں آپ نہ امیر خسرو ہیں، نہ غریب خسرو، آپ تو عجیب خسرو ہیں۔''

علیم صاحب کے دور میں یونیورسٹی کے ضبط و نظم کو دیمک لگنے لگی تھی۔ ان کے نرم رویے نے طلبا کو خودسری کے راستے پر ڈال دیا تھا اور ماحول تعلیم کے لیے سازگار نہیں رہا تھا۔ خسرو صاحب کے انتخاب کا ہر طبقے میں خیر مقدم کیا گیا۔ ان کی جادو بھری شخصیت اور سحر بیانی نے پہلے ہی دن سب کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ ان کی سربراہی میں یونیورسٹی کا وقار بہت جلد بحال ہو جائے گا۔ لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کی فراست پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلوں کو پل بھر میں سلجھا سکتی ہے۔ ان کی ذہانت کے بے شمار قصے لوگوں کو آج تک یاد ہیں۔ کوئی انھیں جمع کرے تو پوری کتاب تیار ہو جائے۔ ایک دلچسپ واقعہ اس وقت یاد آتا ہے۔

ایک بار پر کسی دکان دار کا قرض بہت بڑھ گیا۔ اس نے پرووسٹ کو قانونی کارروائی کی دھمکی دی۔ پرووسٹ صاحب کو شاید پہلی بار ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ بہت گھبرائے۔ وائس چانسلر صاحب سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا آپ

پریشان نہ ہوں۔ کسی بہانے لالہ جی کو حساب کتاب سمیت میرے پاس لے آئیں۔

پردوسٹ صاحب ایک دن لالہ جی کو لانے میں کامیاب ہو گئے۔ وائس چانسلر صاحب میٹنگ میں مصروف تھے۔ اطلاع کرائی گئی۔ فوراً باہر تشریف لے آئے۔ پردوسٹ صاحب سے مصافحہ کیا۔ پھر لالہ جی کو غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ آخر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ لالہ شیام بہاری لال تو نہیں؟''

''جی سرکار! شیام بہاری لال ہی ہوں۔''

''لالہ بھگوان داس جی کے بیٹے، جنھوں نے اب سے کوئی پچاس برس پہلے علی گڑھ میں پہلی بار آڑھت کا اتنا بڑا کاروبار شروع کیا تھا۔''

''جی جی ٹھیک فرمایا، مگر یہ سب آپ کو کیسے معلوم؟''

''بھائی، آپ کو کچھ تو آپ کی شان دار شخصیت سے پہچانا، کچھ اپنی سمجھ بوجھ سے۔''

لالہ جی خوش ہو گئے۔ انھوں نے جیب سے پڑیا نکال کے وائس چانسلر کو الائچی پیش کی جو کہنے کو چھوٹی الائچی تھی مگر اس کا سائز کوڑی کے برابر تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے یہ نایاب تحفہ بڑی حیرت اور مسرت کے ساتھ قبول کیا اور کہا۔

''کچھ ہی دنوں میں ہم زنجبار جانے والے ہیں۔ وہاں کی لونگیں اتنی بڑی بڑی ہوتی ہیں جیسے ماچس کی تیلیاں۔ وہ ہم آپ کے لیے ضرور لائیں گے۔ اور ہاں اب سنیے ہم آپ کے پریوار کو کس طرح جانتے ہیں۔ دراصل ہمارا میدان ہے اکنومکس۔ مطلب ہے ارتھ شاستر۔ علی گڑھ میں غلے کے ویاپار پر ہم ایک پستک لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ جان کاری حاصل کرنی پڑی۔ اسی وقت یہ سب کچھ معلوم ہوا۔ مگر آپ یہ بتائیے کہ آپ حساب کس طرح رکھتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر یہ کس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ اتنی رقم کا مال سپلائی کیا گیا؟''

لالہ جی نے خوش ہو کر سارا حساب کتاب سامنے پھیلا دیا۔ وائس چانسلر صاحب لالہ جی کی ذہانت اور حساب رکھنے کے ڈھنگ کو سراہتے رہے۔ پھر فرمایا ہم اسے اپنی کتاب

کے لیے ذرا توجہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کتاب میں دو ایک فوٹو بھی دے دیں گے۔ آپ دو ایک دن کے لیے یہ سب ہمارے پاس چھوڑ جایئے۔

میٹنگ کے بعد وائس چانسلر صاحب نے پرووسٹ کو فون کیا کہ اب آپ بے فکر ہو جایئے۔ اب لالہ جی روپیہ نہیں کا غذات مانگیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ آخر دس پندرہ دن میں روپے کا بندوبست ہو گیا اور ان کا حساب چکا دیا گیا۔

یہ خسرو صاحب کے حسن تدبیر کا معمولی سا نمونہ تھا۔ وہ بڑے سے بڑے مسائل بھی اسی طرح حل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مگر علی گڑھ کے ماحول نے ان صلاحیتوں کو روبہ کار آنے کا موقع ہی نہ دیا۔ سستی سیاست اور باہمی رقابت نے فضا کو ایسا مکدر کر دیا تھا کہ اس میں کوئی تعمیری کام آسان نہ تھا۔ خسرو صاحب نے علی گڑھ پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا۔ لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ تقریباً ہر شعبے، ہر دفتر، ہر ہاسٹل میں جا کر وہاں کے معاملات کو سمجھا۔ غور کیا اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ سانپ کی بانبی میں ہاتھ ڈالنے سے خود کو گزند پہنچنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنی پالیسی بدل دی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے عہد کی تاریخ کسی اور ہی انداز سے لکھی جاتی۔

خسرو صاحب نے اصلاح و ترقی کا خیال چھوڑ دیا اور وقت گزاری کا راستہ اختیار کر لیا۔ ایک گروہ اپنی ذاتی منفعت کا کوئی منصوبہ لے کر آتا وہ اس کی تائید کر دیتے۔ دوسرا گروہ اس کے خلاف کوئی تجویز پیش کرتا تو انھیں اس پر صاد کرنے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا۔ اب ان کی حکمت عملی یہ ہو گئی تھی کہ دو فریقوں میں نزاع کی صورت پیدا ہو اور کرسی عدالت پر آپ جلوہ فرما ہوں تو داہنے ہاتھ کی اوٹ سے بائیں آنکھ مدعی کو اور بائیں ہاتھ کی اوٹ سے داہنی آنکھ مدعا علیہ کو مار دیجیے۔ مقدمے کی فائل پر فیصلے کی کوئی تاریخ ڈال دیجیے۔ پھر کوئی اور تاریخ، پھر کوئی اور...... یہاں تک کہ پانی پنسال میں آ کے آپ سے آپ چورس ہو رہے۔ سب سے بڑا منصف وقت ہے۔ غرض یہ کہ مسئلے سلجھائے نہیں گئے۔ فیصلے وقت پر کیے نہیں گئے۔ کشتی کو بہاؤ کے رُخ پر چھوڑ دیا گیا۔ جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ جی کو خواہ مخواہ روگ لگانے سے حاصل۔"

سنجیدہ حلقہ چپ ہو گیا، اہلِ علم گوشہ گیر ہو گئے اور جلسے بازی کے دور کا آغاز ہو گیا۔
اس میدان میں خسرو صاحب کو کون مات دے سکتا تھا؟ کسی بے تکلف محفل میں گفتگو ہو، علمی مباحثہ ہو، بڑے سے بڑے مجمعے کو خطاب کرنا ہو، ان کا ثانی مشکل سے ملے گا۔ جس جلسے اور جس مشاعرے میں وہ موجود ہوتے حاضرین کی توجہ کا مرکز بنے رہتے۔ موقع کی مناسبت سے دلچسپ قصوں اور چٹکلوں کا استعمال، برمحل اشعار سے گفتگو کو سجانے کا جیسا کمال انھیں آتا ہے کم لوگوں کو آتا ہوگا۔ گھنٹوں گفتگو کرتے رہیں تو بھی کیا مجال کہ سننے والے اُکتا جائیں، یا ان کی توجہ میں کمی ہو جائے۔ تقریر کے فن میں بھی انھیں لاجواب مہارت حاصل ہے۔ انگریزی اور اردو دونوں میں ایسی تقریر کرتے ہیں کہ سنے جایئے اور لطف لیے جایئے۔ پھر اس کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ جب تقریر کے لیے اٹھنے لگیں تو بتا دیجیے کہ کس زبان میں اظہارِ خیال کرنا ہے اور کس موضوع پر۔ پھر دیکھیے گل افشانیِ گفتار کا کمال!

ان کے حافظے میں اشعار کا بے پناہ ذخیرہ محفوظ ہے۔ غزل کے اشعار اور چھوٹی چھوٹی نظموں کی بات تو جانے دیجیے۔ نظیرؔ کی طویل نظمیں۔ انیسؔ و دبیرؔ کے پورے پورے مرثیے انھیں ازبر ہیں۔ مشاعروں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے اور اساتذہ کا بہترین کلام کبھی تحت اور کبھی ترنم سے سنا کے داد پاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں کسی کی غزل سنا رہے تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے کہ:

جو بات کہی وہ لاثانی، جو شعر پڑھا وہ ذو معنی
ہر بات کے دو معنی یعنی انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

تو سامعین نے یہ کہہ کر داد دی کہ یہ شعر تو یقیناً آپ ہی کا ہے۔ ایک نشست میں ایسے اشعار سنانے لگے جن میں بول چال کی برجستہ زبان استعمال ہوئی ہے۔ بیسیوں شعر سنا کے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ آج سوچتا ہوں تو ان میں سے صرف ایک مصرع یاد آتا ہے:

ہاتھ لا استاد! کیوں کیسی کہی؟

خسرو صاحب کی گفتگو میں جو شے خاص طور پر دل آویزی پیدا کر دیتی ہے وہ بے ساختہ اور لطیف ظرافت ہے۔ ایسی ظرافت جس سے کچھ ذہن لطف لے پاتے ہیں، کچھ محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک دن صبح ہی صبح ایک بزرگ نے جگا کر عجیب سا سوال کیا۔

''آپ کو معلوم ہے آپ کے وائس چانسلر صاحب یہاں آنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟''

''جی معلوم ہے، پلاننگ کمیشن کے کسی شعبے کے ڈائرکٹر تھے۔''

''نہیں، اس سے پہلے۔''

''اس سے پہلے بھی کسی اونچے عہدے پر ہی ہوں گے۔''

''نہیں، سرکس میں کرتب دکھاتے تھے۔''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ کرتب دکھاتے تھے اور کیا۔ سرکس میں ملازم تھے۔ ابھی خود مجھے بتایا۔''

''مذاق کیا ہوگا۔''

''مذاق، اور مجھ سے، میرا بڑا احترام کرتے ہیں۔ وہ روز سویرے ہی سویرے کوٹھی کے سامنے ٹہلتے ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی ٹہلتا ہوا ادھر جا نکلتا ہوں۔ یونیورسٹی کے مسائل پر تبادلۂ خیال ہو جاتا ہے۔ آج تھوڑی دیر ساتھ ٹہلتے رہے۔ اسی دوران ایک سائیکل سوار ادھر سے گزرا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ پھر اس کی سائیکل پر سوار ہو کے چکر لگانے لگے۔ رفتار بڑھائی پھر ایک دم سائیکل کو پچھلے پہیے پر اُٹھا لیا اور اسی طرح کئی چکر لگا ڈالے۔ مجھے حیران دیکھ کر فرمایا، میں پہلے سرکس میں نوکری کرتا تھا، یہ سارے کرتب وہیں سیکھے۔''

ایک صاحب نے پوچھا ''یہ آپ ہر موقع پر اتنی اچھی تقریر کیسے کر لیتے ہیں؟'' فرمایا: ''تقریر سے میرا کیا تعلق؟ میں اس فن میں بالکل کورا ہوں۔ آپ جیسے ایک عالم سے

میں نے اردو انگریزی میں مختلف موقعوں کے لیے آٹھ تقریریں لکھوا کر رٹ لیں۔ میرا کمال بس اتنا ہے کہ کوئی نواں موقع پیش آجائے تو ان آٹھوں تقریروں کے ٹکڑے جوڑ کے ایک نئی تقریر تیار کر لیتا ہوں۔"

اس دن کے بعد کئی لوگوں نے تقریریں لکھوا کے رٹ ڈالیں، مگر سن کی داڑھی لگا کے کوئی مولوی مدن بن سکا ہے؟

خسرو صاحب کے زمانے میں کچھ لوگوں نے ڈائریوں میں شعر لکھنے شروع کر دیے تھے۔ وی۔سی لاج میں ایک دن افطار پارٹی تھی۔ ایک صاحب نے جن کا منصب وائس چانسلر سے کچھ ہی کم تھا، اشارے سے ایک طرف بلایا اور جیب سے ڈائری نکالی۔ اس میں سے ہجے کر کے شعر سنائے۔ ہر شعر میں یہ صفت تھی کہ کم سے کم ایک مصرع ضرور ساقط الوزن تھا۔ ڈائری کے شعروں کی کل تعداد تین تھی۔

خسرو صاحب کے زمانے میں دو اصطلاحوں نے علی گڑھ میں بہت رواج پایا۔ ایک ڈائیلاگ اور دوسرا کنونس کرنا۔ کہا کرتے تھے ڈائیلاگ سے ہر معاملہ طے ہو سکتا ہے۔ جسے کوئی شکایت ہوتی اسے اجازت تھی کہ بلا تکلف وائس چانسلر سے مکالمے کا آغاز کرے۔ یہ مکالمہ جاری رہتا... جاری رہتا۔ یہاں تک کہ وہ بے چارا ہانپ جاتا اور شکایت آپ سے آپ رفع ہو جاتی۔ "دیکھیے میں آپ کو کنونس کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" خسرو صاحب کا تکیہ کلام تھا۔ اوّل تو ان کی شیریں بیانی انسان کے کنونس کرنے کو کافی تھی۔ کوئی اس کے قابو میں نہ آتا تو ساری رات کے ڈائیلاگ کے بعد جب صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگتی تو کنونس ہونے کے سوا اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہتا۔ خسرو صاحب رات رات بھر گفتگو کر سکتے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ تھکن کے آثار دور دور نظر نہ آئیں۔

اطہر پرویز صاحب شعبۂ اردو سے پہلے جنرل ایجوکیشن میں لکچرر تھے۔ یہ شعبہ توڑ دیا گیا تو ان کی سروس شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئی۔ وائس چانسلر کی طرف سے انھیں خط ملا کہ اب آپ شعبۂ اردو سے منسلک کیے جاتے ہیں مگر سینیارٹی میں آپ کی پچھلی ملازمت

شمار نہ ہوگی۔ یہ فیصلہ یقیناً غیر منصفانہ تھا۔ وہ اپنا مقدمہ لے کر وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس عزم کے ساتھ کہ آج کسی طرح کنونس نہیں ہوں گے۔ ذرا دیر بعد لوٹے تو باہر ہی سے آواز دے کر کہا "بھائی ہم پھر کنونس ہو کر آ گئے۔"

خسرو صاحب نے ان کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھا اور بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ فرمایا: "بے شک یہ خط میرے دفتر سے جاری ہوا ہے اور دستخط میرے ہیں مگر مضمون انتہائی نامعقول۔ میں آپ کو کیسے قائل کروں خود کنونس نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں انکوائری کروں گا۔ اطمینان رکھیے کہ آپ کے ساتھ انصاف ہوگا۔"

○○○

نورالحسن نقوی

پروفیسر آل احمد سرور

طالب علمی کے زمانے میں اردو پڑھی تو سرور صاحب کے تنقیدی مضامین کا بھی مطالعہ کیا اور دل بے اختیار ادھر کھنچتا ہوا محسوس ہوا۔ دوستوں میں چند ہونہار طالب علم ایسے بھی تھے جنھیں غالب و اقبال کے سیکڑوں شعر، آب حیات اور غبار خاطر کی لمبی لمبی عبارتیں اور سرور صاحب کے دسیوں پیراگراف زبانی یاد تھے۔ ان دوستوں پر زیادہ رشک نہ آیا۔ یوں کہ اتنی نہیں تو کچھ کم عبارتیں اپنے حافظے میں بھی محفوظ پائیں۔ بالکل بے ارادہ آگے چل کر جب پڑھنے کے بعد پڑھانے کا زمانہ آیا تب بھی انھیں ذہن میں اسی طرح تر و تازہ پایا، مگر اس خیال سے ندامت ہوئی کہ طالب علم کیا سوچتے ہوں گے۔ یہی نا کہ انھوں نے جی لگا کے بس ایک ہی مصنف کو پڑھا ہے۔ اس لیے اوروں کے اقتباسات بھی یاد کیے۔ اس وقت پتا چلا کہ روکھی پھیکی عبارت کا حفظ کرنا کیسا مشکل کام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نقاد کی بات قاری تک پہنچانے کے بعد اگر لفظ فنا نہ ہو جائیں تو اسے تنقید کی زبان کا نقص سمجھنا چاہیے۔ ممکن ہے یہ کسوٹی یورپ اور امریکہ کے لیے درست ہو، ہمارے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ اندازِ بیان شگفتہ نہ ہو تو یہاں قارئین کا حلقہ سکڑ جاتا ہے اور مصنف کی ساری محنت رایگاں جاتی ہے۔ سرور صاحب کے مضامین بہت مقبول ہوئے کیوں کہ مواد قابلِ فہم اور انداز بیان پُرکشش۔ بلاشبہ موجودہ نسل کے ادبی ذوق کی تربیت میں ان مضامین کا بڑا ہاتھ ہے۔

بچپن میں افسر میرٹھی کی نظمیں دل پر جادو سا کر دیتی تھیں۔ انھیں دیکھنے کو جی چاہتا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ "کرنوں کی اک سیڑھی لے کر چھم چھم اترا آئے چاند" والے افسر

کہیں چاند کی دنیا میں بستے ہوں گے۔ ایک بار انھیں سامنے پایا تو بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ مصافحے کے لیے بڑھا تو محسوس ہوا قدم زمین پر نہیں چاند پر پڑ رہے ہیں۔ کچھ ایسی ہی خواہش سرور صاحب کو دیکھنے کی تھی مگر اس خواہش کے پورے ہونے میں ابھی کئی برس باقی تھے۔

جولائی ۱۹۵۵ء میں بی۔ایڈ کرنے کے لیے میں نے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ کچھ دنوں بعد غالباً کونووکیشن کی تقریب میں یونیورسٹی کے اکابر کو گاؤن پہنے ایک جلوس کی شکل میں گزرتے ہوئے دیکھا۔ ایک چہرے پر نظر پڑی تو منھ سے نکلا:

''اچھا! یہ لوگ ابھی تک یہاں موجود ہیں؟''

''یہ لوگ... کیا مطلب؟'' میرے ساتھی نے سوال کیا۔

''مطلب انگریز، اور کیا؟''

''نہیں بھائی، یہ کوئی انگریز نہیں۔ ہادی حسن صاحب ہیں۔''

''تو یہ ہیں ہادی حسن صاحب۔ کتنی داستانوں کے ہیرو!'' میں نے دل میں سوچا۔

اس کے بعد ایک اور دمکتے ہوئے چہرے پر نظر ٹھہری۔

''اور یہ؟''

''یہ سرور صاحب ہیں۔ آل احمد سرور۔''

دل پر خوشی کی ایک عجیب سی کیفیت گزر گئی۔ اس عالم میں منھ سے ایک جملہ نکلا۔ میں نے کہا کچھ تھا، میرے دوست نے سنا کچھ۔ کئی مہینے بعد انھوں نے پوچھا۔

''یہ سرور صاحب کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟''

''شیخ صدیقی ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے اجداد سرزمین عرب سے یہاں پہنچے ہوں گے۔ مگر اس وقت یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟''

''دراصل اس دن تم نے کہا تھا کہ...''

بات زیادہ پرانی نہ تھی۔ دماغ پر زور ڈالا تو اپنا جملہ یاد آیا۔ انھیں دیکھ کر بے اختیار منھ سے نکلا تھا۔ ''ارے، یہ تو اتنے ہی خوب صورت ہیں جتنی ان کی نثر۔'' اس عزیز نے ''نثر'' کو ''نسل'' سنا۔

اس دن سرور صاحب کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ دو ایک مہینے بعد قریب سے دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا۔ جلیل صاحب کا مکان جو آرٹس فیکلٹی کے پیچھے ہے، آج بھی جلیل ہاؤس کہلاتا ہے۔ اس وقت اس کے دو بڑے بڑے حصے تھے۔ ایک زنانہ اور دوسرا مردانہ۔ ایک شام جلیل صاحب سے ملنے گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ ایک صاحب باہر نکلے۔ میں نے جلیل صاحب کو پوچھا۔ انھوں نے بتایا ''جلیل صاحب تو دوسرے حصے میں رہتے ہیں۔ یہاں تو آل احمد سرور رہتا ہے۔'' یہ سرور صاحب تھے۔ مدتوں تک یہ خیال دل کو خوش کرتا رہا کہ سرور صاحب کو اتنے نزدیک سے دیکھا اور ان سے بات کی۔ ۱۹۶۷ء میں جب شعبۂ اردو میں تقرر ہوا تو تقریباً ہر روز یہ موقع میسر آیا۔ اب انھیں بہت پاس سے دیکھا اور سمجھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سرور صاحب کی مصروفیتوں کا طوفانی دور ختم ہو چکا تھا۔ مدت پوری ہونے پر وہ سر سید ہال، آفتاب ہال کے پرووسٹ، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اسٹاف ایسوسی ایشن اور کلچرل کمیٹی کی صدارت کے مناصب سے سبک دوش ہو چکے تھے۔ پھر بھی ان کے ہاتھ بہت سے کاموں میں الجھے ہوئے تھے۔ شعبۂ اردو کے صدر، انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری، اردو ادب اور ہماری زبان کے مدیر، مختلف کمیٹیوں کے رکن یا عہدے دار۔ تصنیف و تالیف کا شغل ان سب کے سوا اور اس سے بھی زیادہ مطالعے کا شوق۔ اس پر ان کی یہ عادت کہ ہر کام خود کیا جائے۔ خود کام کرنا سہل ہے اور دوسروں سے کام لینا دشوار۔ سرور صاحب نے کہیں اس کا اعتراف بھی کیا ہے، منصب جتنا بلند ہو دوسروں سے کام لینا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے، ورنہ آپ اپنے منصب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ چھوٹی سے چھوٹی کلاس کی کاپیاں جانچنی ہوں، کسی امتحان کا پرچہ بنانا ہو، کسی خط کا جواب دینا ہو۔ سارے کام وہ خود کریں گے۔ اس کے بغیر انھیں اطمینان نہیں ہوتا۔

ان دنوں سرور صاحب کا معمول یہ تھا کہ تقریباً ساڑھے نو بجے شعبۂ تاریخ کی طرف سے شعبۂ اردو میں داخل ہوتے، راہ داری سے گزرتے ہوئے کنکھیوں سے اپنے رفقا کو دیکھتے جاتے۔ سب اپنے اپنے کام میں مشغول ہوتے۔ یہ کسی خوف کے سبب نہ تھ بلکہ ماحول ہی ایسا بن گیا تھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی علمی کام میں لگا رہتا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد شعبے کے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ ایسے میں کوئی بے تکلف ملاقاتی آجائے تو بھی قلم کی رفتار مدھم نہ ہوتی تھی۔ لکھتے بھی جا رہے ہیں، سوالوں کے جواب بھی دیتے جا رہے ہیں۔ اس میں کلاس کا وقت ہو گیا تو بلا تکلف حاضرین سے معذرت کر لی۔ کوئی ریسرچ اسکالر کام لے آیا تو سن لیا یا دیکھ لیا۔ ان کے لیے باقاعدہ وقت مقرر تھا۔ شعبے کے کسی استاد کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ بلا جھجک چلا جاتا اور یہ کام چھوڑ کے ادھر متوجہ ہو جاتے۔ اس میں علمی کام کی تخصیص نہ تھی۔ کیسی بھی دشواری ہو وہ رد سے گریز نہ کرتے تھے۔ عام طور پر ڈیڑھ بجے کے بعد وہ اُٹھ جاتے۔ کھانا کھانے کے بعد ذرا دیر آرام کرتے۔ آرام کی صورت یہ ہوتی کہ کوئی کتاب، کوئی رسالہ لے کر لیٹ جاتے۔ تین سے پانچ تک کا وقت انجمن کے لیے مخصوص تھا۔ شام کو بلا ناغہ ٹہلنا بھی معمول میں داخل تھا۔ پہلے اسٹاف کلب جا کر ٹینس کھیلا کرتے تھے مگر اب یہ شغل چھوٹ گیا تھا۔ رات اور صبح کا وقت سنجیدہ علمی کاموں کے لیے وقف تھا اور اس میں مداخلت سے وہ جھنجھلا جاتے تھے۔

معروفیات کا یہ حال ہو تو بزم آرائیوں کے لیے وقت کہاں سے نکالا جائے اور وقت ناوقت آنے والے ملاقاتیوں کی پذیرائی کیسے کی جائے۔ اور ملاقاتی بھی وہ جن کی تشریف آوری کا مقصد محض سلام کرنا، خیریت پوچھنا، کار لائقہ کے لیے مستعدی کا اظہار کرنا یا حالات حاضرہ پر روشنی ڈالنا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس زیادہ تر آنے والوں کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی ملازمت کے لیے راستہ ہموار کرنا۔ یہ نہیں جانتے کہ یہاں راستہ اس طرح ہموار نہیں ہوتا۔

ایسے لوگوں کے لیے دو آزمودہ نسخے ہیں۔ ''معروف ہیں، کل ڈپارٹمنٹ میں ملاقات کر لیجیے۔'' جنھیں یہ جواب نہیں دیا جا سکتا ان سے کہلوا دیا جاتا ہے: ''ہیں نہیں۔

کہیں گئے ہوئے ہیں۔'' مگر اس میں طرح طرح کے خطرات بھی ہیں۔ سرور صاحب لکھنؤ میں تھے اور بیرڈ روڈ کے ایک چھوٹے سے مکان میں قیام تھا۔ صبح سویرے ایک بزرگ ملاقات کو تشریف لائے۔ یہ کسی ضروری کام میں مصروف تھے، کہلوا دیا کہیں گئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہم انتظار کرلیں گے، مونڈھا بھجوا دیجیے۔ ذرا دیر میں پانی، پھر پان کی فرمائش ہوئی۔ تعمیل کی گئی۔ چھوٹا سا مکان۔ بات کرنا دشوار۔ اندر چھینکیں تو باہر آواز آئے۔ اس میں صبح سے دوپہر ہوگئی۔ عجب نہیں ذرا دیر اور گزرتی تو پوچھا جاتا کہ دسترخوان بچھ گیا یا نہیں۔ اسی مکان کے ایک حصے میں ایک عیسائی خاتون رہتی تھیں۔ انھوں نے کہا یہ بزرگوار ملاقات کیے بغیر ٹلنے والے نہیں۔ ان ہی خاتون کی تجویز پر سرور صاحب کسی طرح صحن کی دیوار پھاند کر باہر گئے اور سامنے سے آکر ان صاحب سے ملاقات کی۔ تب نجات ملی۔ یہ واقعہ خود بیگم سرور نے سنایا تھا۔

چند اصحاب ایک دن یونیورسٹی روڈ پر سرور صاحب کے مکان کا پتا پوچھ رہے تھے۔ یہ لوگ بدایوں میں کوئی ادبی جلسہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی سرور صاحب اس جلسے کی صدارت کریں۔ شعبے کے ایک استاد سے ان لوگوں کی ملاقات ہوگئی اور وہ انھیں سرور صاحب کے مکان پر لے گئے۔ سرور صاحب نے بدایوں جانے، جلسے کی صدارت کرنے اور ان لوگوں سے ملنے سے صاف انکار کردیا۔ یہ لوگ جملہ ساکنان بدایوں کی جانب سے سرور صاحب کو بداخلاقی کا تمغہ دے کر بدایوں واپس چلے گئے۔ سرور صاحب کو شاید علم بھی نہ ہو کہ ایک صاحب نے ان کے خلاف ایک بہت سخت مضمون اس لیے لکھا تھا کہ ملاقات کے انتظار میں انھیں کئی گھنٹے سامنے کی سڑک پر ٹہلنا پڑا تھا۔

سرور صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات نے بہت لوگوں کو خفا کیا اس کا زیادہ غم نہیں۔ زیادہ غم یہ ہے کہ اس کے سبب کئی اہم کام سلیقے کے ساتھ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے۔ اس میں سے ایک کام علی گڑھ تاریخ ادب اردو کا ہے جس کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے گراں قدر مالی امداد دی تھی۔ مستند علما و محققین سے اس کے لیے مضامین لکھوائے گئے تھے۔ ناممکن نہیں کہ ان میں بھی بعض غلطیاں راہ پاگئی ہوں مگر اس کی زیادہ

ذمہ داری مضمون نگاروں پر ہوتی ہے، لیکن ستم یہ ہوا کہ طباعت کی بے شمار غلطیاں رہ گئیں۔ کئی جگہ اشعار کو نثر کی طرح لکھ دیا گیا۔ تاریخ ادب کی تیاری میں سرور صاحب کی مدد کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد کا انتخاب ہوا تھا۔ وہ اس کام کو بڑی ذمہ داری سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر ان کا تقرر شعبۂ فارسی میں ہو گیا اور مجنوں گورکھ پوری اس کام پر مامور ہوئے۔ انھوں نے پروف ریڈنگ کا کام اپنے شاگردوں کو سونپ دیا۔ وہ بھی زحمت کیوں اٹھاتے۔ جیسے صفحات ملے ویسے ہی لوٹا دیے۔ مجنوں صاحب ان صفحات کو انگلی لگانے کے گنہ گار نہیں۔ کاش ایک صرف ایک صفحہ مجنوں صاحب یا سرور صاحب کی نظر سے گزر جاتا تاکہ طباعت سے پہلے اصل صورت حال واضح ہو جاتی۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکا ہے۔ شعبۂ اردو کے دامن پر ایک داغ لگنا تھا لگ گیا۔ آخری ذمہ داری تو سربراہ کی ہی ہوتی ہے مگر معقول تنخواہیں وصول کرنے والوں سے بھی تو کوئی پوچھتا کہ تم نے کیا کیا۔ حیرت اس پر ہے کہ مجنوں صاحب کو کبھی اس غفلت پر پشیمان نہ دیکھا۔ ہمارے دیس کے بارے میں کسی نے خوب بات کہی ہے: یہ عجب ملک ہے، یہاں چار آدمی کام کریں تو پانچویں آدمی کو ان چاروں سے زیادہ تنخواہ صرف اس بات کی دی جاتی ہے کہ وہ انھیں کام کرتے ہوئے دیکھے۔ کڑی نگرانی کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہوتا۔

اسی زمانے میں یہ بھی سننے میں آیا کہ درّانی صاحب نے ذاکر صاحب کے توسط سے دیوانِ غالب کے انگریزی ترجمے اور نول کشور پر انگریزی میں ایک کتاب کی تیاری کا کام سرور صاحب کو سونپا تھا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اس سے ذاکر صاحب کو شرمندگی ہوئی اور درّانی صاحب نے یہ کام ہارورڈ یونیورسٹی کے حوالے کر دیا۔ سرور صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے دونوں کام مکمل کر دیے تھے۔

یہاں ہر صاحب اختیار کے بارے میں کبھی نہ کبھی یہ ضرور سننے کو ملا کہ کچے کانوں کا ہے۔ سرور صاحب بھی اس الزام سے نہیں بچے۔ دیکھا اور سوچا تو پتا چلا کہ یقین کر لینے والے کا گناہ کم ہے۔ داد و تحسین کے سزاوار وہ کلاکار ہیں جنھیں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کا ہنر آتا ہے۔ بادشاہوں اور نوابوں کے دربار باقی نہ رہے تو وہاں سے سازشوں

اور ریشہ دوانیوں کے کارخانے یونیورسٹیوں میں اُٹھ آئے۔ اہلِ علم کی توجہ سے یہ خوب پروان چڑھے۔ صدر شعبہ کی نظر سے کسی کو گرانا ہے تو عموماً کئی دوست مل کر یہ معرکہ سر کریں گے۔ پہلا کہے گا جناب والا کیا فلاں صاحب آج کل آپ سے کچھ خفا ہیں، خیر چھوڑیے، جانے دیجیے ناخوش گوار باتوں کے ذکر سے کیوں آپ کا موڈ خراب کیا جائے۔ دوسرا کہے گا، ہاں مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی۔ اپنے محسن کے بارے میں ایسی گفتگو! کردار کشی کا یہ کام کئی قسطوں میں جاکے مکمل ہوتا ہے مگر بڑے سلیقے سے۔

ایک ایسی ذاتِ شریف کی سرور صاحب تک رسائی ہوگئی تھی جو اس فن میں بڑی دست گاہ رکھتے تھے۔ روز ایک بے گناہ کا قتل کرتے اور ایسی صفائی سے کہ خنجر بے داغ رہتا۔ آخر کب تک؟ ایک دن چور پکڑا گیا۔ آخر کار معتبر قاصد کی زبانی ان کی خدمت میں وہ پیغام بھیجا گیا جو سرسید نے مولوی سمیع اللہ خاں کو بھیجا تھا۔ تب جاکے امن ہوا۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ انسان ایک ہی بار دھوکا کھاتا ہے، مگر ہم نے تو ایک ہی سوراخ سے ایک ہی مومن کو سو بار ڈسے جاتے دیکھا ہے۔ ذہین آدمی عموماً بھولا بھی ہوتا ہے۔ سرور صاحب کے مزاج میں خاصا بھولا پن ہے۔ لوگوں پر جلد بھروسا کر لیتے ہیں، ہر طرح کی بات پر جلد یقین کر لیتے ہیں لیکن صفائی پیش کر دی جائے تو دل میں کوئی بات رہتی نہیں۔ ایک بار کہا تھا اپنوں سے ملتے رہو تو غیروں کو بدگمانیاں پیدا کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

سرور صاحب بہت اصول پرست ہیں۔ بے دردی کی حد تک اصول پرست! رو رعایت کا ان کے مزاج میں سرے سے کوئی خانہ ہے ہی نہیں۔ کسی داخلے، کسی وظیفے میں نرمی، کسی امتحان کے نمبروں میں کمی بیشی، کسی تقرر میں ذرا سی ہیرا پھیری ان کے بس کی بات نہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے وہ بہت قدر دان رہے ہیں۔ ان پر تبصرے بھی کیے مگر جب وہ پہلی بار ان سے ملنے آئے تو اس درخواست کے ساتھ کہ ایک طالب علم کو کچھ زیادہ نمبر دے دیجیے۔ انھوں نے بلا تامل معذرت کر لی۔ تقرر کے معاملے میں یہ سختی اور بھی زیادہ ہے۔ یہاں صرف ایک چیز ان کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ امیدوار کی صلاحیت۔ سعی سفارش کا ان پر ذرّہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ امیدوار کے نجی مسائل اور مالی دشواریاں بھی ان کے

دل کو نہیں پگھلا سکتیں۔ سجاد ظہیر قید خانے سے لاکھ خط لکھا کریں کہ رضیہ سجاد ظہیر کے تقرر سے ان کے کچھ مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن وہ ڈاکٹر محمد حسن کو زیادہ باصلاحیت سمجھتے ہیں تو انہی کے نام کی سفارش کریں گے۔ امیدوار کے مذہبی معتقدات، سیاسی نظریات اور ادبی نقطۂ نظر نہ اس کے انتخاب میں معاون ہوتے ہیں نہ سدِ راہ۔ امید تو نہیں کہ یہ سن کر ہمارے کچھ دوست اور بزرگ اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔

انتخاب کمیٹی کے کسی رکن نے بتایا کہ ایک بار انھوں نے ایک امیدوار کی سفارش بھی کی۔ شعبے کی ایک خاص مصلحت کے پیش نظر۔ شاید بعد کو انھیں اپنے اس فیصلے پر تاسف بھی ہوا ہو۔

یہ بھی اصول پسندی ہی ہے کہ جہاں لب کشائی ضروری ہوئی وہاں انھوں نے کبھی چپ رہنا گوارا نہ کیا۔ سر ضیاء الدین کو یونیورسٹی کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی دھن سوار تھی۔ چاہتے تھے اساتذہ بھی اس کام میں ان کی مدد کریں۔ توقع پوری نہ ہوئی تو خفا ہو کے کچھ سخت سست کہہ دیا۔ اساتذہ نے احتجاج کا موقع تو ڈھونڈ نکالا مگر وقت پر سرور صاحب کے سوا کسی کی زبان نہ کھلی۔ اسی طرح ایک بار لکھنؤ میں سی. بی گپتا کی ناراضگی مول لی۔ رام پور میں رضا انٹر کالج کے پرنسپل تھے۔ وہاں نواب صاحب کے اے. ڈی. سی میجر فاروق نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی۔ یہ کام خطرے سے خالی نہ تھا۔

اندرا گاندھی کی رائے سے اختلاف کرنے میں سو طرح کے خطرے تھے۔ ان کے آگے اچھے اچھوں کی زبان نہ کھلتی تھی۔ میرے ایک محترم دوست فرمانے لگے، میں اکثر سوچتا تھا کہ مرنے کے بعد اگر مُردوں کو زندہ کر کے قبروں سے اٹھایا گیا، اگر حشر کے میدان میں واقعی سب انسان جمع ہوئے، اگر سچ مچ وہاں مالک کون و مکاں موجود ہوا اور بندہ و آقا میں سوال و جواب کی نوبت آئی تو خدا کس طرح اپنے بندے سے مخاطب ہوگا اور بندہ کس طرح جواب دے گا۔ ایک میٹنگ میں فخر الدین علی احمد اور اندرا گاندھی کو گفتگو کرتے دیکھا تو مسئلہ حل ہو گیا۔ اندرا جی نے جب فاروق عبداللہ کو کشمیر کی وزارت اعلا کے منصب

سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تو ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی جو اس فیصلے کو غلط سمجھتے تھے لیکن اندراجی سے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ہمت کم لوگوں نے کی اور ان میں ایک سرور صاحب بھی تھے۔

جواہر لال نہرو نے ایک بار رانا پرتاپ کے کارنامے کا ذکر کیا کہ اکبر جیسی زبردست طاقت سے ٹکرا گیا اور غلامی پر راضی نہ ہوا۔ اس پر سرور صاحب نے کہا، کیا اکبر کا رتبہ رانا پرتاپ کے رتبے سے بلند نہیں جو سارے ہندوستان کو متحد کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ پنڈت نہرو کا ظرف بھی ملاحظہ ہو۔ انھوں نے ایک لمحے کو غور کیا اور بولے، ہاں یہ سچ ہے۔ صاف گوئی کبھی کبھی بہت مہنگی پڑتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا پرانا ایکٹ بحال کرانے کی پاداش میں سرور صاحب ملازمت میں توسیع سے محروم رہے۔

سرور صاحب کی شخصیت میں یہ عجب طرح کا تضاد ہے کہ نہ انھیں اپنے اصولوں سے انحراف گوارا ہے نہ کسی کی دل شکنی۔ کوئی اپنا مسئلہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو تو خواہ وہ اس کی مدد نہ کر سکیں مگر اسے تسلی ضرور دے دیں گے اور وہ اس امید کے ساتھ واپس جائے گا کہ اس کا کام تو ہوا ہی سمجھئے۔ قوی امید کے بعد مایوسی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور اس مایوسی کا سامنا بہتوں کو کرنا پڑا۔

دراصل جو لوگ کوئی سوال لے کر آتے ہیں، وہ دیر تک بیٹھتے اور لمبی روداد بیان کرتے ہیں۔ سرور صاحب ذرا دیر توجہ سے بات سن لیتے ہیں۔ پھر خیالوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور ہاں ہاں کرتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا تھا سرور صاحب واقعی زبان سے گفتگو کرتے ہیں۔

سرور صاحب کے شوق ہیں: مطالعہ، سیر و سفر اور اہلِ علم سے ملاقات اور شاید ترتیب بھی یہی ہے۔ ان کا مطالعہ صرف اردو ادب تک محدود نہیں۔ انگریزی ادب میں تو انھوں نے اردو سے پہلے ایم۔اے کیا اور تقریباً دو برس انگریزی ادب کی درس و تدریس کا فرض بھی انجام دیا۔ ادبیات کے علاوہ دیگر علوم بھی ان کی دلچسپی کا موضوع رہے ہیں۔ ہڈسن کا یہ قول انھیں پسند ہے کہ وہ انگریزی ادب کو کیا جانتا ہے جو صرف انگریزی ادب کو

جانتا ہے۔ اس لیے زمانۂ طالب علمی سے انھوں نے اپنے مطالعے کا دائرہ وسیع رکھا۔ وہ بہت تیز پڑھتے ہیں۔ کسی کتاب کا صبح سے شام تک ختم کر لینا ان کے لیے آسان کام ہے۔ جن دنوں آنکھ میں تکلیف تھی، مطالعے کا شغل اس وقت بھی جاری تھا۔ رفتار البتہ کم تھی۔

سیر و سفر کا انھیں نوعمری سے بہت شوق رہا ہے۔ علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے کہ پیدل چلنے کا ایک موقع میسر آیا۔ انھوں نے ستائیس میل پیدل چلنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ ملک کے اندر اور باہر جب بھی سفر کا موقع ملا، انھوں نے بہت خوشی سے قبول کیا۔ انھوں نے تقریباً تمام اہم ممالک کا سفر کیا اور وہاں اکثر قابل ذکر ہستیوں سے ملاقات کی۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر جو کچھ ہوتا رہا ہے، سرور صاحب نے اسے بہت توجہ سے دیکھا ہے اور اس پر غور کیا ہے۔ اس لیے وہ تمام اہم معاملات پر بہت واضح رائے رکھتے ہیں۔ یہ آرا ان کی خودنوشت "خواب باقی ہیں" میں محفوظ ہوگئی ہیں۔ ہندوستان کے سیاسی معاملات، تعلیمی مسائل، اردو کی صورت حال، مسلمانوں کے حال و مستقبل پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد سرور صاحب نے سر سید نگر میں جہاں انھوں نے پہلے سے کئی ہزار گز زمین خرید رکھی تھی، ایک بڑا سا مکان تعمیر کیا، مگر اس کی آرائش پر زیادہ توجہ نہیں کر سکے۔ سادہ سی زندگی گزارنا ہی انھیں زیادہ پسند ہے۔ خالی زمین میں بیگم صاحبہ کا ارادہ باغیچہ لگوانے کا تھا جو پورا نہیں ہو سکا۔ ان کے ایک بیٹے نے جرمنی میں رہائش اختیار کر لی تھی (افسوس کہ ان کا انتقال ہوگیا)۔ دوسرے بیٹے دہلی میں ہیں۔ بیٹی بھی اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں رہتی ہیں۔ علی گڑھ میں سرور صاحب اور بیگم سرور تنہا ہیں اور انھیں اپنے سارے کام ملازموں کی مدد سے خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے بہت سے کام ابھی تک ادھورے ہیں۔

رنگ گورا، بدن چھریرا، قد نہ لمبا نہ پست۔ اس لیے ہر لباس اور ہر رنگ سرور صاحب کے بدن پر بجتا ہے لیکن سفید سے زیادہ ہلکے ہلکے رنگ انھیں پسند ہیں۔ موسم کی مناسبت سے شیروانی اور سوٹ بھی پہنتے ہیں لیکن عام طور پر ان کا لباس پتلون اور بش شرٹ ہے۔ گھر میں

سفید ململ کا کرتا اور لٹھے کا پاجامہ پہنے رہتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں گرم شال اوڑھ لیتے ہیں۔ گاؤن پہنے ہوئے انھیں کم دیکھا۔

چائے اور چائے سے زیادہ کافی انھیں مرغوب ہے۔ بہت کم خوراک ہیں مگر لذیذ اور نفیس کھانے انھیں پسند ہیں۔ پائے، کباب، کریلے شوق سے کھاتے ہیں۔ رساول اور فیرنی بھی پسند کرتے ہیں بشرطیکہ مٹھاس کم ہو۔ ویسے کھانے کو وہ بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اگر پسند کی کوئی کتاب مل گئی ہے تو دن رات اس میں کھوئے رہیں گے۔ کھانا پینا سب بھول جائیں گے۔ جب اور جو کچھ سامنے آ گیا، کھالیا۔ نمک کم ہے یا زیادہ، کھانا ٹھنڈا ہے یا گرم، اس کا بھی پتا نہیں چلے گا۔ بلکہ یہ بھی بھول جائیں گے کہ کھانا کھالیا کہ نہیں۔ علامہ اقبال کا بھی یہی حال تھا۔ اکثر کھانا بھول جاتے تھے اور اپنے خادم سے پوچھا کرتے تھے کیوں بھئی ہم نے کھانا کھالیا یا نہیں۔

پڑھنے میں زیادہ اور لکھنے میں کم وقت بسر ہوتا ہے۔ لکھنے کا کام عموماً رات کو کرتے ہیں اور قلم برداشتہ لکھتے جاتے ہیں۔ نظر ثانی کا کام بعد کو کرتے ہیں اور اس میں مسودے کی شکل بالکل بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد مسودے کو صاف کرنے کا مسئلہ پیش آتا ہے اور یہ خاصا دشوار کام ہے کیوں کہ ان کی تحریر پڑھ لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اگر سرور صاحب نے تصنیفی کام میں مدد کے لیے شروع سے کوئی لٹریری اسسٹنٹ رکھ لیا ہوتا تو اور زیادہ کام ہو گیا ہوتا۔ سرسید کے علمی کاموں کی رفتار اس لیے بھی زیادہ رہی کہ انھیں لائق مددگار میسر آتے رہے۔ ایک بار مولوی وحیدالدین سلیم نے بھی سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ کے فرائض انجام دیے۔ دراصل سرور صاحب کو املا کرانے کی عادت نہیں رہی۔

سرور صاحب نے ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزاری ہے اور اس کامیابی میں بیگم سرور کی رفاقت کا بڑا دخل ہے۔ انھوں نے خانہ داری سے متعلق تمام ذمہ داریاں سنبھال کر سرور صاحب کو اس طرف سے بے فکر کر دیا۔ علمی اور ادبی کام میں ہمہ وقت مشغول رہنے والوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ گھر کا ماحول خوش گوار ہو۔ بیگم سرور خود بہت خوش مزاج ہیں

اور بچوں کی پرورش بھی انھوں نے اس نہج سے کی کہ یہ دولت ان سب کے حصے میں بھی آئی۔ شوہر کے ملنے والوں سے خلوص کا برتاؤ کرتی ہیں اور چھوٹوں سے بہت شفقت سے پیش آتی ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ سرور صاحب اور بیگم سرور کی عادتوں میں نمایاں فرق ہے۔ سرور صاحب میں بڑا تحمل ہے، بڑی سے بڑی پریشانی سے وہ ہراساں نہیں ہوتے۔ بیگم صاحبہ کو بھی کوئی چھوٹی سی بات بے مزہ اور پریشان کر دیتی ہے۔ شہریار کی شادی کے بعد ہمارا قافلہ جب ملیح آباد سے لوٹ رہا تھا تو ان کی سسرال نے بہترین کھانے تو ساتھ کر دیے تھے مگر پلیٹیں اور چمچ شاید اس خیال سے نہ دیے تھے کہ جہیز کے برتنوں میں سے نکال لیے جائیں گے اور وہ برتن خدا جانے کہاں تھے۔ بیگم صاحبہ بار بار کہتیں کہ کھانا کیسے کھایا جائے گا۔ سرور صاحب ہر بار اطمینان دلاتے آپ پریشان نہ ہوں۔ سارا انتظام ہے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو سرور صاحب نے ذرا اہتمام سے ہاتھ دھوئے اور ہر ساتھی کے ہاتھ پر ایک ایک تنوری روٹی رکھ دی۔ دیگچے میں بھنا ہوا مرغ تھا۔ پھر ہاتھ سے اسے نکال نکال کے ہر ایک کی روٹی پر رکھ دیا۔ واقعی خدا ساز برتنوں کا معقول انتظام تھا۔

زندگی نے سرور صاحب کو بہت کچھ دیا مگر ان کا یہ خیال غلط نہیں کہ وہ اس سے زیادہ کے مستحق تھے۔ ان کی زبان سے کئی بار سنا کہ جوہر قابل اپنی قدر آپ کرا لیتا ہے مگر دیکھا یہ کہ اہلِ تدبیر تقدیر کا بھی سرنگوں کرا لیتے ہیں۔ تدبیروں کی اس دنیا میں سرور صاحب کا طریقہ یہ رہا کہ:

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

ان کا اپنا شعر ہے:

دامن پہ ان کے ہاتھ حریفانہ پڑ گیا
عجز و نیاز اپنا مقدر نہ بن سکے

کج کلاہوں کو اتنا کچھ مل جائے جتنا سرور صاحب کو ملا تو وہ لایق شکر ہے۔ اس مضمون کو میں سرور صاحب کے ایک اقتباس پر ختم کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ سرور صاحب کو خود ان کی اپنی نظر سے بھی دیکھ سکیں اور ان کی نثر کا بھی لطف لے لیں۔ لکھتے ہیں:

''شکر ہے کہ عمر کی اس منزل میں بھی ابھی مجھ میں جینے کا ولولہ، کچھ کام کر جانے کا ارمان، کوئی اچھی نئی کتاب پڑھنے کا شوق، دنیا کی نیرنگیوں سے زندگی سے، حسن سے دلچسپی باقی ہے۔ برسات میں شام کی شفق اب بھی نظر میں رنگ بھر دیتی ہے۔ ہرے ہرے کھیتوں کی ہریالی اب بھی آنکھوں کو تازگی بخشتی ہے، صبح کو چمن میں چڑیوں کا چہچہانا بہت اچھا لگتا ہے۔ اچھی صورت پر نظر ٹھہر ہی جاتی ہے۔ کوئی پرانا دوست مل جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ جوانی لوٹ آئی۔ ٹھنڈے پانی، اچھی چائے، مزے دار پان، پایے، کریلے، کباب، رساول کا لطف اب بھی یاد رہتا ہے۔ کوئی مزے کا فقرہ، کوئی اچھا شعر اب بھی وجد کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایک زمانے میں میرا حافظہ بہت اچھا تھا۔ اب وہ بات نہیں رہی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی بات بھول جاتا ہوں۔ شکر ہے کہ تھوڑی دیر بعد یاد آ جاتی ہے۔ ایک زمانے میں محفلوں، صحبتوں، جلسوں، کمیٹیوں میں بہت وقت گزرتا تھا۔ تنہائی کم ہی میسر آتی تھی۔ جب سے کشمیر سے آیا ہوں زیادہ وقت گھر میں گزرتا ہے مگر تنہائی سے مجھے وحشت نہیں ہوتی۔ بڑھاپے میں آدمی کچھ عادتوں کا غلام ہو جاتا ہے۔ وقت پر چائے مل جائے، وقت پر کچھ کام ہو جائے، کھانا بھی وقت پر ہو، تندرستی کے لیے جو دوائیں ضروری ہیں وہ بھی چلتی رہیں۔ اس لیے اپنے اجاڑ گھر میں ہی دل لگتا ہے۔ علی گڑھ میں گپ کا بڑا مرض ہے۔ زیادہ تر لوگ گھنٹوں بیٹھے ادھر ادھر کی ہانکتے رہتے ہیں۔ جس سے کام ہوتا ہے اس کی

خوشامد اور جس سے کام نہ نکلا اس کی مذمت۔ وقت کی پابندی کا بھی احساس کم ہی ہے۔ اس لیے اب کچھ سوچنے، اپنا جائزہ لینے، اپنے سے ملاقات، اپنے کو پہچاننے کا موقع ملا ہے تو میں اسے غنیمت سمجھتا ہوں۔ ہاں یہ جی ضرور چاہتا ہے کہ بچے اور زیادہ عرصے تک ساتھ رہا کرتے اور ان کے ساتھ اور زیادہ وقت گزرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں ہوں، اپنے بچوں کا بھی نہیں۔ ٹھاٹ باٹ کی زندگی مجھے پسند نہیں۔ صاف ستھری، سیدھی سادی زندگی گزارنا ہی میرا شعار ہے۔ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اب جتنا بھی وقت باقی ہے اس میں میرے سارے پارہ ہائے لخت لخت یک جا ہو کر شائع ہو جائیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب کشمیر میں میرا آخری سال تھا، اپنی پچھترویں سال گرہ پر میں نے ایک نظم لکھی تھی وہ یہاں درج کرنا شاید بے محل نہ ہو ویسے میں اپنی سال گرہ مناتا نہیں، صرف یاد رکھتا ہوں:

پچھتر سال گزرے آج دنیا میں مجھے آئے
نظر کا شعلہ مدھم ہے، لہو کا رقص دھیما ہے
قدم بھی سست ہیں سائے بھی لمبے ہوتے جاتے ہیں
صدا کوئی کسی کوہِ ندا سے جانے کب آئے
نفس کا، آرزو کا کھیل کب خاموش ہو جائے
نظر شاداب ہے، آباد ہے دل، فکر روشن ہے
سہارا کتنے خوابوں کا، دلاسا کتنی یادوں کا
مرے پھولوں کی خوشبو، میری کلیوں کی جگرداری
مری سعیِ وفا سعیِ جنوں، سعیِ حنابندی
ہزاروں خواب ہیں پامال، لیکن خواب باقی ہیں

○○○

پروفیسر اسلوب احمد انصاری
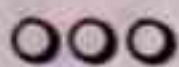
ڈاکٹر ذاکر حسین: پیکر ستودہ صفات

یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے، جب ڈاکٹر ذاکر حسین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر نام زد کیے جانے پر یہاں تشریف لائے۔ یاد نہیں پڑتا کہ مجھے ان سے باقاعدہ متعارف کرایا گیا ہو، لیکن وہ غائبانہ طور پر مجھ سے واقف تھے۔ مجھے اس وقت شعبۂ انگریزی سے بحیثیت جونیر لکچرر وابستہ ہوئے ایک ہی سال گزرا تھا۔ میں نے جب انھیں دور سے پہلی بار دیکھا تو وہ حد درجے جاذبِ نظر معلوم ہوئے۔ سرخ و سپید رنگت، چوڑے چکلے اعضا، مختصر سی خشخشی داڑھی، متوسط قد و قامت، مضبوط کاٹھی، فربہ جسم، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی، وہ مردانہ حسن کا نمونہ تھے اور ان کی جسمانی ساخت کے تاثر کی ادائیگی کے لیے انگریزی کا ایک لفظ Hefty کفایت کرے گا۔ ذاکر صاحب سے غائبانہ تعارف کی دو وجوہات تھیں: پہلی اور اہم تو یہ کہ ان کے میرے خاندان کے بعض بزرگوں سے قریبی اور دوستانہ تعلقات تھے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں یونیورسٹی کی آبادی آج کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ طلبا کی تعداد تقریباً چار ہزار تھی اور اساتذہ کی بھی اسی نسبت سے بہت کم۔ مزید یہ کہ ذاکر صاحب ہر شخص سے باخبر رہنے کا گر جانتے اور اس کے بارے میں معلومات فراہم کر لیتے تھے۔ میرے بارے میں انھیں غالباً یہ بتایا گیا ہوگا کہ میری لیاقت ناقابلِ التفات نہیں اور یہ کہ میں اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں ذمے داری کا ثبوت دیتا ہوں۔ چنانچہ جب پہلی بار ملنا ہوا تو فرمایا کہ مجھے پہلے سے Appointment لینے کی ضرورت نہیں، میں جب چاہوں ان سے مل سکتا ہوں۔ پہلی ملاقات میں منجملہ اور دوسرے امور کے یہ

شکایت کی کہ یہاں طالب علموں کی انگریزی کی استعداد اچھی نہیں ہے۔ درخواستوں کے آخر میں Yours Faithfully کی بجائے Your's Faithfully لکھتے ہیں، اور یہ بڑی معیوب بات ہے۔ میں نے اپنی خلقی کم گوئی کے سبب اس پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا، یہ بات انھیں کچھ ناگوار گزری، قدرے جھلاہٹ کے ساتھ کہنے لگے: آپ تو پروفیسر ہیں آپ کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تب میں نے اپنے اوسان مجتمع کر کے جواب دیا کہ میں فی الحال تو لکچرر ہوں، لیکن آئندہ پندرہ بیس برس میں میں نے اپنے مضمون میں کوئی کارنامہ انجام دیا تو شاید پروفیسر بنا دیا جاؤں، آپ اس امکان کو مسترد نہیں کر سکتے۔ (چنانچہ ایسا ہی ہوا، یعنی جب ۱۹۶۵ء میں انگریزی شاعر ولیم بلیک پر اپنی کتاب Arrows of Intellect جسے عظیم نقاد نارتھوپ فرائی نے رومانی ادب کی تنقید کی تاریخ میں ایک کارنامہ قرار دیا، کی اشاعت کی بنا پر مجھے پروفیسر مقرر کر دیا گیا اور اس وقت شعبے میں تنہا ہی پروفیسر تھا)۔ مزید یہ کہ جب لڑکے یونیورسٹی میں داخل ہوں، اس وقت تک انگریزی میں ان کی لیاقت اس درجے ہو جانی چاہیے کہ وہ صحیح عبارت لکھ سکیں اور بول بھی سکیں۔ ان کی استعداد کی دیکھ بھال کی ذمے داری اسکولوں کے استادوں کی ہے، یونیورسٹی اساتذہ کی نہیں۔ جن کا کام انگریزی زبان سکھانا نہیں، انگریزی ادب پڑھانا ہے۔ میرا جواب سن کر چپ ہی تو ہو گئے۔ قدرے مطمئن، قدرے غیر مطمئن۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت گوناگوں صفات کی جامع تھی۔ وہ غیر معمولی ذہانت، فہم و فراست، خوش سلیقگی، نفاست و نظافت اور مرتعش حسیت کے مالک تھے۔ ان میں ایک طرح کی سوفسطائیت تھی، جو اُن کے طور طریقوں سے بخوبی عیاں تھی۔ حاضر جوابی، خندہ پیشانی اور بذلہ سنجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ گفتگو میں جان بوجھ کر مخاطب کے برعکس نقطۂ نظر اپناتے تھے تاکہ متضاد آرا کے ٹکراؤ سے کوئی مثبت نتیجہ اُبھر کر سامنے آ سکے۔ اسے آپ ایک طرح کا جدلیاتی رویہ کہہ لیجیے، اور چاہے کوئی قطعی نتیجہ نہ بھی نکلے تب بھی بحث و تکرار میں گرما گرمی تو پیدا ہو ہی جاتی تھی جس سے وہ بغایت لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان میں وہی سیر چشمی، کشادگیِ قلب و نظر، تواضع، دل دہی اور دل سوزی اور

حلم وانکسار تھا جو اُن کے جگری دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم اور اس نسل کے شرفا کا طرۂ امتیاز تھا اور جو آج کل کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً آل احمد سرور مرحوم میں یہ سب خوبیاں ناپید تھیں۔ ذاکر صاحب کو بچوں، پھولوں، پرندوں، پالتو جانوروں، نقاشی اور خطاطی کے نمونوں، صاف ستھری چیزوں، اچھے کھانوں اور طہارت و پاکیزگی سے عشق تھا۔ اپنے قیامِ جرمنی کے دوران انھوں نے دیوانِ غالب کا ایک دیدہ زیب ایڈیشن کاویانی پریس جرمنی سے شائع کرایا تھا۔ جو اُن کے نفیس ذوق کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ذہانت و ذکاوت کی پر مستزاد ان کی قوت آخذہ بھی بہت غیر معمولی تھی۔ وہ یونیورسٹی اساتذہ اور دوسرے لوگوں سے ان کی دلچسپیوں اور اختصاص کے بارے میں کرید کرید کر بات چیت کرتے اور اس طرح کی گفتگو سے بہت سے کارآمد نکتے اخذ کر کے انھیں اپنے ذہن کے گودام میں جمع کر لیتے اور حسب ضرورت ان سے کام لیتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع نہیں تھا، لیکن بہت متنوع تھا۔ تحریر و تقریر پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ زبان پر آئی ہوئی بات کو وہ روک نہیں سکتے تھے۔ جس زمانے میں وہ نائب صدر جمہوریۂ ہند تھے، میں دلّی میں ایک بار ان سے ملنے کے لیے گیا۔ اطلاع ملنے پر بلا تاخیر ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے۔ گفتگو کا آغاز ہوا مشہور فن کار فدا حسین کی تجریدی تصویروں کے بارے میں اظہار رائے سے جو وہاں آویزاں تھیں۔ چوں کہ وہ جرمن زبان سے بخوبی واقف تھے اور راقم الحروف کو بھی ترجمے کے ذریعے جرمن ادب کے کارناموں سے دلچسپی تھی، اس لیے عظیم جرمن ناول نگار طامس مان کے ناولوں اور کہانیوں کا ذکر ناگزیر تھا۔ اس دوران یہ استفسار بھی فرمایا کہ جدید انگریزی شاعری، خصوصاً ایس. ایلیٹ کی شاعری اتنی دقیق اور ناقابلِ فہم کیوں ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں؟ اور ادب میں ترسیل و ابلاغ اور عقیدے یعنی belief کے ضمن میں پیچیدگیاں کب اور کیسے پیدا ہوتی ہیں؟ پھر ایک دم پلٹا کھایا۔ اسی دوران بدرالدین طیب جی مرحوم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر آئے تھے۔ ان کے بارے میں میری رائے دریافت کی۔ میں اوّل تو مرحوم سے اس وقت تک سابقہ نہ پڑنے کی وجہ سے زیادہ واقف نہیں تھا اور دوسرے اپنی یونیورسٹی کے وائس چانسلر

کے سلسلے میں کوئی منفی بات کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے عرض کیا کہ ان میں کچھ خوبیاں ضرور ہوں گی، لیکن ان کے محاسن ابھی مجھ پر منکشف نہیں ہوئے ہیں۔ بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے زیادہ موزوں آدمی نہیں ہیں۔ میرے اس جواب سے کچھ بدحظ سے ہوئے اور بے ساختگی کے ساتھ فرمایا: ''لٹھ ہے لٹھ۔'' پیرایۂ بیان کو بدل کر راقم الحروف یہ کہہ سکتا ہے کہ مرحوم طیب جی بہ منزلے ایک Freak of Nature یعنی عجوبۂ فطرت کے تھے۔ بعد میں رفتہ رفتہ تجربے سے یہ ثابت بھی ہوگیا کہ وہ کسی علمی ادارے کے سربراہ ہونے سے زیادہ شہر کے کوتوال کے عہدے کے لیے زیادہ صحیح اور مناسب ہیں۔ اسی طرح ایک بار ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم کی کتاب ''روحِ اقبال'' کا ذکر آ گیا۔ میری رائے طلب فرمائی، میں نے کہا کہ اس کتاب میں اطلاع تو ضرور ہے لیکن بصیرت کا فقدان ہے اور غیر ضروری طور پر ٹھونس ٹھانس (Padding)، کسی قدر متبسم ہوئے اور پھر بڑی برجستگی کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کو نذرانہ بھی پیش کر دیا: ''ہمارے یوسف میاں بڑے غبی ہیں۔''

ذاکر صاحب میں بڑی شائستگی اور سوفسطائیت تھی، لیکن وہ کبھی کبھی اس معیار سے نیچے بھی اُتر آتے تھے۔ ایک واقعہ سنیے: غالباً ۱۹۵۶ء کے اوائل میں ودیا بھون (بمبئی) سے کے. ایم. منشی کی نگرانی میں Religious Leaders کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں نبی کریمؐ کی ذاتِ اقدس کے سلسلے میں ہرزہ سرائی کی گئی تھی۔ فطری طور پر عام مسلمانوں اور طلبائے مسلم یونیورسٹی میں اس کے خلاف شدید ردِعمل ہوا، اور بڑا اشتعال اور ہیجان رونما ہوا۔ شاید ذاکر صاحب نے دبے دبے لفظوں میں مسلمانوں کے ردِعمل کے دفاع میں کچھ کہا ہوگا۔ اس پر اخبارات میں ان پر بڑی لے دی کی گئی اور شاید ان پر فرقہ پرستی کا الزام بھی لگایا گیا کہ ذاکر حسین جیسے نیشنلسٹ اور سیکولر مزاج رکھنے والے شخص سے اس کی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی دوران آچاریہ ونود بھاوے (مہاتما گاندھی کے خاص چیلے) علی گڑھ آئے ہوئے تھے، اور یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں جو سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، خیر مقدمی جلسہ تھا۔ دورانِ تقریر ذاکر صاحب کو یہ واقعہ یاد آ گیا۔ بس بپھر گئے۔

پٹھانی رگ (ذاکر صاحب قائم گنجی پٹھان تھے) پھڑک گئی، جلالِ ذاکری ابل پڑا۔ چنانچہ علی الاعلان کہا کہ کون بھڑوا مجھے فرقہ پرست کہتا ہے؟ یہ تصویر کا ایک رُخ تھا۔ پھر جلسے کے اختتام پر جب پلٹے تو دور دیہ اساتذہ اور طلبا ہال سے نکل رہے تھے۔ چلتے چلتے مجھ پر نظر پڑی ایک لمحہ کے لیے رک گئے اور فرمایا کہ کل مجاز کو گھر پر چائے پر بلایا ہے اور مختصر سی شعری نشست بھی رکھی ہے۔ دعوت نامہ بھیج دیا گیا ہے۔ اگر نہ بھی ملا ہو تو اس زبانی یاد دہانی کے مطابق ضرور آجانا۔ حافظ کے الفاظ میں انھیں 'تلطف' اور 'مدارا' کے برتنے کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ یہ تصویر کا دوسرا رُخ تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے مہاتما گاندھی کی منشا کے عین مطابق ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، جس کا واحد مقصد علی گڑھ کی مرکزیت پر ضرب کاری لگانا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس اور انضباط کار میں وہ مولانا محمد علی جیسے ناپختہ اور غیر معتبر سیاسی لیڈر کے دستِ راست تھے جو حد درجے جوشیلے، جذباتی اور ناعاقبت اندیش انسان تھے۔ وہ ایک برق آسا شخصیت تھے۔ ذاکر صاحب نے اپنی زیرکی کی وجہ سے اوّل دن سے تاڑ لیا تھا کہ انھیں آئندہ کہاں سے کیا فراہم ہو سکے گا۔ وہ ایم۔اے۔او کالج کے ساختہ پرداختہ تھے، تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد جب وہ حکومت ہند کی طرف سے یہاں کے وائس چانسلر بنا کر بھیجے گئے تو یہ گویا ان کے لیے ایک طور سے مراجعت وطن یعنی Homecoming تھی۔ وہ ایک وقفے کے بعد ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم کے جانشیں ہوئے تھے۔ انھوں نے نہایت ہمدردی، انہماک، دل بستگی اور دل سوزی کے ساتھ آٹھ سال کی مدت اس ادارے کی خدمت اور حیاتِ نو کی بازیابی میں صَرف کی۔ انھوں نے علی گڑھ کے اس ویرانے کو جہاں خاک اڑا کرتی تھی، گل وگلزار میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے یونیورسٹی میں جگہ جگہ لان بنوائے، پھولوں کے تختے آراستہ کرائے، صفائی ستھرائی کے انتظام کو مقدم جانا، نئی عمارتوں کی تعمیر کے منصوبے تیار کرائے جنھیں بعد میں وائس چانسلر بشیر حسین زیدی مرحوم نے عملی شکل دی اور جگہ جگہ بلند وبالا عمارتوں نے سر اُٹھایا۔ مختلف شعبوں کے علمی معیار کو بلند کرنے کی سعی کی اور ملک گیر کانفرنسوں اور سمیناروں کے انعقاد کے اہتمام کا ڈول ڈالا۔ وہ اعلیٰ درجے

کے منتظم نہیں تھے، لیکن وہ یونیورسٹی کے کاموں کو مصلحانہ اور مشنری اسپرٹ میں انجام دیتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے زمانے میں بہت سے لائق لوگوں کے تقررات بھی کیے۔ جیسے شعبۂ معاشیات میں وہ نامور عالم اور ماہرِ معاشیات ڈی. پی مکرجی کو شعبہ میں لائے، شعبۂ انگریزی میں انھوں نے ڈاکٹر اے. بوس کا تقرر کیا۔ اسی ضمن میں شعبۂ عربی میں ڈاکٹر عبدالعلیم اور شعبۂ تاریخ میں ڈاکٹر نورالحسن کا نام بھی لیا جاسکتا ہے، لیکن انھوں نے بعض بے حد لائق لوگوں مثلاً علی محمد خسرو اور ڈاکٹر مظفر علی کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی۔ یہ دونوں اپنے اپنے مضمون میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اوّل الذکر یہاں سے ناکام لوٹنے پر دہلی اسکول آف اکانومکس میں پروفیسر بنادیے گئے جو ایک بڑا اعزاز تھا، اور موخرالذکر ساگر یونیورسٹی میں جغرافیہ کے پروفیسر بنادیے گئے۔ جن لوگوں کو ان دونوں پر ترجیح دی گئی تھی وہ ان سے یقیناً فروتر تھے۔ اسی طرح اربابِ جاہ و اقتدار کے دباؤ کی وجہ سے کئی ایک ایسے لوگوں کا تقرر بھی کیا جو خاصے نااہل تھے اور ان تقررات کے ہرگز مستحق نہ تھے۔ ویسے تو اس طرح کی فروگزاشتیں اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں، لیکن ذاکر صاحب پر انگشت نمائی اس لیے جائز ٹھہری کہ وہ عینیت پسندی کے علم بردار سمجھے جاتے تھے، لیکن تجربے نے یہ ثابت کردیا کہ ان کی Idealism بھی ایک طرح کا پوز تھا۔ دو اور حد درجے کام انھوں نے کیے: اوّل تو یہ کہ یونیورسٹی کے نوجوان اساتذہ کو دو سال کی پوری تنخواہ پر رخصت کی اسکیم کو نافذ کیا تاکہ وہ بیرون ہند یونیورسٹیوں میں داخلہ لے کر اپنی تعلیمی استعداد میں ترقی کے لیے کوشاں ہوں۔ راقم الحروف بھی اسی اسکیم کے ماتحت دو سال کے لیے انگریزی زبان و ادب میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آکسفورڈ گیا۔ عین اسی زمانے میں جب وہ انگلستان کے لیے پابہ رکاب تھا، ذاکر صاحب علی گڑھ کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ پھر جب وہ واپس آیا اس وقت وہ بہار کے گورنر تھے۔ انھیں جب میری واپسی کی اطلاع ملی تو انھوں نے پٹنہ سے مجھے کامیابی کے ساتھ اپنی تعلیمی سرگرمیاں کو ختم کرکے واپس ہندوستان آنے پر مبارک باد کا خط لکھا۔ یہ منجملہ دوسرے امور کے ان کے حسنِ اخلاق اور اعلیٰ ظرفی کی ایک روشن دلیل تھی۔ (ذاکر صاحب ہر خط کا جواب اپنے قلم سے لکھتے تھے اور اردو میں لکھتے تھے)

دوسرے یہ کہ یوم سرسید کی تقریب منانے کے اہتمام کی بنیاد ڈالی۔ اس موقع پر جو جلسہ
اسٹریچی ہال میں منعقد کیا جاتا تھا، اس میں یونیورسٹی کے کسی ایک استاد اور ذاکر صاحب کی
تقریر کے علاوہ علی گڑھ کے ایسے معمر ترین شخص کو بھی اظہار خیال یا یہ کہیے کہ اپنی یادوں کی
بازیافت اور اس میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ جو سرسید کی شخصیت،
ان کے کارناموں اور علی گڑھ تحریک سے ہمدردی اور دلچسپی رکھتا ہو۔ یہ ایک دلچسپ اور
پُر لطف تجربہ تھا، لیکن یوم سرسید کی تقریب جیسا Ritual پہلے تھا، ایسا ہی اب بھی ہے۔
اس میں روشنیوں اور وسیع پیمانے پر اجتماعی ڈنر کا انتظام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ درآں حالیکہ
ہونا تو یہ چاہیے کہ اس موقع پر سرسید کے متعلق مستند اور ذی علم لوگوں سے تحریریں لکھوا کر اور
انھیں کثیر تعداد میں چھپوا کر اساتذہ، طلبا اور عام پڑھے لکھے مسلمانوں میں ملک بھر میں تقسیم
کرایا جائے تاکہ لوگ نہ صرف سرسید کے مشن کا ادراک حاصل کریں، بلکہ یہ بھی سوچیں کہ
موجودہ حالات میں ہم سرسید کی دور بینی اور عاقبت اندیشی کو اپنے لیے کس طرح مشعلِ راہ
بنا سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب کا تقرر بہ حیثیت وائس چانسلر اوّلاً چھ سال کی مدت کے لیے
کیا گیا تھا، لیکن چوں کہ پنڈت نہرو اور مولوی ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم، ان کی کارکردگی سے
بہت خوش اور اس کے مداح تھے، اس لیے انھیں چھ سال کا دوسرا ٹرم بھی تفویض کیا گیا،
لیکن وہ دوسرے ٹرم کے دو برس پورے کرنے پر اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔
اس قبل از وقت اور غیر متوقع سبک دوشی کے بادی النظر میں تین اسباب تھے: اوّل تو یہ کہ وہ
علی گڑھ کو اپنے نیشلسٹ رنگ میں جس طرح رنگنا چاہتے تھے اس میں انھیں بہ وجوہ
خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ وہ یونیورسٹی کی مقامی سیاست کے زیر و بم اور
تموج و تلاطم کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتے تھے اور تیسرے یہ کہ وہ یہ پسند نہیں
کرتے تھے کہ پُر شکستہ بن کر ایک طویل مدت تک بس علی گڑھ ہی کے ہو رہیں۔ شاید وہ
اپنے محبوب شاعر اقبال کے یہ اشعار عالم تنہائی میں زیر لب گنگناتے رہے ہوں:

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ان کی علو ہمتی انھیں وسیع تر فضاؤں میں پرواز اور کار آشیاں سازی پر اُکسا رہی تھی۔ چنانچہ علی گڑھ سے سبک دوش ہونے کے بعد چھ ماہ کے اندر اندر وہ پانچ سال کے لیے بہار کے گورنر مقرر کر دیے گئے، پھر یہ عرصہ گزرنے پر پانچ سال کے لیے نائب صدر جمہوریہ ہند اور پھر پانچ سال کے بعد صدر جمہوریہ ہند بنا دیے گئے۔ مناصب اور اعزازات ان کی جھولی میں پکے پھل کی طرح گرتے رہے۔ اس دوران انھوں نے یہ احتیاط ضرور برتی کہ مسلمانوں کے دکھ درد کا مداوا تو کیا ہی کرتے (کہ ایسا کرنے سے ان کے اپنے سیکولرزم کے امیج کے داغ دار ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اس کی پیش بندی کرنا لازمی امر تھا) انھوں نے پھر بھی اردو کی حمایت میں بھی لب کشائی نہیں کی۔ جب کہ انھی ذاکر صاحب نے گورنر بنائے جانے سے قبل بیس لاکھ لوگوں کے دستخط اردو کی بقا کے سلسلے میں کرائے تھے، لیکن یہ مختر یا یہ پوتھیاں جن پر یہ دستخط مرتسم تھے، بابو راجندر پرشاد کے زمانے میں بھی اور ذاکر صاحب کے عہدِ حکومت میں بھی بقول غالب: ''نقش و نگار طاقِ نسیاں'' ہی بن کر رہ گئیں اور ان پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری 'یادوں کی دنیا' میں یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب کبھی ڈاکٹر ذاکر حسین کا اپنے دو بھائیوں سے جو اُن سے عمر میں بھی بڑے تھے اور زیادہ طاقت ور بھی تھے کوئی معرکہ ہو جاتا تھا تو وہ اپنی حکمت عملی سے اس پر غالب آجاتے اور انھیں زیر کر لیتے تھے۔ دراصل حکمت عملی ان کی شخصیت کا جزوِ اعظم تھی اور موقع شناسی اور مصلحت اندیشی بھی۔ اسی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ وہ بہ یک وقت دو اہم اور متحارب سیاسی جماعتوں، یعنی کانگریس اور مسلم لیگ سے بہ یک وقت ربط ضبط رکھتے تھے۔ گو جاننے والے بخوبی جانتے تھے کہ ان کی وفاداری موخر الذکر کی نسبت اوّل الذکر سے زیادہ پکی ہے۔ اسی طرح فرانسیسی ماہر ریاضی، آندرے وائل نے جو یہاں

صدر شعبہ تھے، اپنی خودنوشت سوانح عمری میں یہ لکھا ہے کہ ۳۲-۱۹۳۳ء کے لگ بھگ ذاکر صاحب اس تگ ودو میں لگے رہے کہ کسی طرح قائداعظم محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو کو آپس میں گلے ملوا دیں۔ کیسی معصومانہ خواہش تھی ذاکر صاحب کی اور اپنی اس جرأت رندانہ کی لاحاصلی پر انھیں برابر قلق ہوتا رہا:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ناروانہ ہوگا اگر اس سیاق وسباق میں یہ جتا دینے سے احتراز نہ کیا جائے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک Janus-Faced شخصیت تھے۔ یہ تضادات کی یکجائی اور ہمہ وقت موجودگی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور دوغلے پن اور دورُخے پن کی طرف بھی۔ غالب کے الفاظ میں ذاکر صاحب 'رنگ تماشہ باختن' کے زیادہ قائل تھے۔ شہید جستجوے حق نہیں تھے۔ ان کی مصلحت اندیشی، حق شناسی اور حق گوئی کے راستے میں ان کے لیے عمر بھر زنجیر پا بنی رہی۔

اپنے خاص مضمون معاشیات کے علاوہ ذاکر صاحب کی دلچسپی تعلیمی نظریات اور تجربات سے بہت گہری تھی۔ چنانچہ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی سطح پر بہت سے خوش گوار اور مفید تجربات کیے اور جو لوگ اس معاملے میں ان کے شریک کار رہتے تھے، ان کی کارکردگی، جذبۂ ایثار اور تعلیم وتربیت کے مسائل میں دلچسپی لینے پر انھیں برابر اُکساتے بھی رہے اور ان کی رہنمائی اور ہمت افزائی بھی کرتے رہے۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے مہاتما گاندھی کے اشارے پر مشہور یا بدنام واردھا تعلیمی اسکیم کا، جو کانگریسی وزارتوں کے زمانے میں کئی صوبوں میں نافذ کی گئی، خاکہ تیار کیا اور اس میں اپنی کاوشِ ذہنی کا عکس اُتارا۔ اس اسکیم کی خوبیوں (جن میں تعلیم کے عمل کو کام سے منسلک کرنا تھا) اور خامیوں سے قطع نظر یہ امر بہر حال محل نظر ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں چرخے پر سوت کات کر تعلیم کو عملی کام سے وابستہ کر کے اور دیہی صنعتوں کو فروغ دینے پر زور صرف کرنے سے ہم کیسے پنپ سکتے اور معاشی اعتبار سے خودکفیل بن سکتے ہیں؟ ذاکر صاحب متحدہ قومیت اور مخلوط کلچر جیسے لغو اور لایعنی تصورات اور اصطلاحات میں یقین واثق رکھتے تھے، اور انھیں انھوں نے تمام عمر حرزِ جاں بنائے رکھا۔ اس معاملے

میں انھیں مولوی ابوالکلام آزاد کی رمز آشنایانہ ہم نوائی حاصل تھی۔ دونوں ہی دل وجان سے مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو پر فریفتہ اور ان کے حلقہ بہ گوش تھے۔ ذاکر صاحب کے علمی اور ادبی کارنامے معدودے چند لیکن دلچسپ اور قابلِ ذکر ہیں (انھیں اپنے عملی مشاغل کے انجام دینے کے سبب علمی کاموں کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے برعکس بنیادی طور پر علمی یا ادبی نہیں مجلسی اور سیاسی آدمی تھے)۔ ابھی ایم.اے. او کالج میں تعلیم کے ابتدائی مراحل ہی طے کر رہے تھے کہ انھوں نے افلاطون کی معرکۃ الآرا تصنیف 'ریاست' کا اردو میں ترجمہ کیا جو پختہ عمر اور استعداد کے لوگوں کے لیے بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ تعلیمی افکار اور تجربات کے ضمن میں ذاکر صاحب کے 'تعلیمی خطبات' اور یونیورسٹی کے تصور پر ان کی کتاب The Dynamic University کے عنوان سے عرصہ ہوا شائع ہوئی تھی۔ ان کے 'تعلیمی خطبات' کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک مختصر سا مجموعہ 'ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں' کے عنوان سے ہے جو جرمن زبان میں لکھی ہوئی کہانیوں پر انحصار رکھتا ہے، لیکن انھیں ذاکر صاحب نے ہندوستانی ماحول اور فضا کے تناظر میں ڈھال کر کمال خوبی اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ راقم الحروف نے اس پر ایک تنقیدی مضمون بھی لکھا تھا جو 'اردو ادب' میں جسے آل احمد سرور مرحوم ایک عرصے تک نکالتے رہے شائع ہوا تھا اور ان پر مستزاد سرمایہ داری پر انگریزی زبان میں ان کے وہ لیکچرز ہیں جو انھوں نے دہلی یونیورسٹی کی فرمائش پر دیے تھے اور جو خود ان کے اپنے قول کے مطابق ان کے معاشیات کے جرمن پروفیسر کے لیکچروں پر انحصار رکھتے ہیں۔

ذاکر صاحب بہت ہی پُرکشش، دل نواز اور من موہنی شخصیت تھے۔ ان کی ذہانت، ورّاکی، حاضر جوابی اور جمالیاتی حسیت اعلیٰ درجے کی تھیں اور حسنِ اخلاق میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ راقم الحروف کو یہ خوش فہمی ہے کہ اسے ان سے برابر خاصی قربت اور تعلق خاطر رہا۔ بالکل شروع زمانے میں غالباً ۱۹۴۹ء میں شعبۂ انگریزی میں سینئر لیکچرر شپ پر تقرر کے سلسلے میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ میری حق تلفی کی گئی ہے کہ مجھے مستقل جگہ پر رکھنے کے بجائے عارضی جگہ پر میرا تقرر کیا گیا۔ ایسی باتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں، لیکن کم عمری

اور نا تجربہ کاری کے دور میں آدمی زیادہ حساس اور زود رنج ہوتا ہے۔ پھر شعور کی بالیدگی، پختگی اور ثمر رسیدگی کی وجہ سے اس میں وہ لاتعلقی پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب وہ غالب کے اس شعر میں اپنے لیے عافیت تلاش کر لیتا ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

چند روز بعد ایک جگہ کھانے پر ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھیں غالباً میری حق تلفی اور زود رنجی کا احساس تھا۔ چنانچہ کھانے کے دوران اور اس کے ختم ہونے کے بہت دیر بعد تک اور دوسرے مہمانوں سے منھ موڑ کر پوری توجہ میری دل دہی پر صَرف کرتے رہے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ بہت دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے جس سے ذاکر صاحب کی اعلیٰ ظرفی بہ طور خاص نمایاں ہوئی اور اس کا نقش ذہن پر اب تک مرتسم ہے۔ مئی ۱۹۶۸ء میں دو کتابیں بہ طور Festschrift ایک انگریزی میں اور ایک اردو میں، جنھیں مالک رام صاحب مرحوم نے مرتب کیا تھا، انھیں پیش کی گئیں۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے جو ایوانِ صدر (President's House) میں منعقد کی گئی تھی، علی گڑھ سے نواب صاحب چھتاری مرحوم، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم، مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم، پروفیسر شبیر خاں مرحوم، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد اور راقم الحروف ہم سب ایک ہی گاڑی سے علی گڑھ سے روانہ ہوئے۔ علی گڑھ سے دلی تک کا دو ڈھائی گھنٹے کا سفر ہی کیا، فواکہات اور لطفِ سخن کے سہارے یہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ اس تقریب کے لیے ذاکر صاحب نے غالباً تیس چالیس منٹ کا وقت دیا تھا۔ شرکائے محفل میں اہلِ علم و فن، سیاسی لیڈر، پارلیامنٹ ہند کے اراکین اور وزیر اور مسز اندرا گاندھی موجود تھیں۔ راقم الحروف نے انگریزی جلد کے لیے ٹی. ایس. ایلیٹ کی شاعری پر ایک مضمون لکھا تھا جو اس میں شامل کیا گیا۔ تقاریر کے بعد جب چائے کا دور چلا تو راقم الحروف چائے کی پیالی لیے چند احباب کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیسے ہی ذاکر صاحب کی نظر مجھ پر پڑی فوراً پیش قدمی کرکے میری طرف بڑھے۔ پہلے تو میرے پروفیسر منتخب کیے جانے پر مبارک باد دی۔ پھر فرمایا کہ اس معمولی سی تقریب میں

شرکت کے لیے آپ نے علی گڑھ سے دہلی آنے کے لیے بڑی زحمت کی۔ ان کی اس بات کا جو ردعمل مجھ پر مرتب ہوا، اس کا اظہار اقبال کی غزل کے اس مصرعے کو دُہرا کر ہی کر سکتا ہوں:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

ذاکر صاحب اس یونیورسٹی کے چار بڑے وائس چانسلروں میں سے ایک تھے۔ یہ چاروں بڑی قد آور شخصیتیں تھیں اور یہ چاروں اپنے اپنے امتیازات رکھتے تھے۔ سر راس مسعود میرے علی گڑھ آنے سے پہلے ہی مستعفی ہو کر جا چکے تھے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ سائنس فیکلٹی میں Laboratories کا قائم کرنا تھا اور دوسرا چند نہایت ذی علم اور دانش ور اساتذہ کا تقرر جیسے رشید احمد صدیقی (اردو)، پروفیسر خواجہ منظور حسین (انگریزی)، ڈاکٹر بابر مرزا (حیوانات) اور مشہور فرانسیسی ریاضی داں آندرے ویل (Andre Weil) جو علی گڑھ سے جانے کے بعد تاحیات پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں ریاضی کے پروفیسر رہے اور جن کا کام نوبل پرائز پانے والوں کے کام کی طرح استحقاق کے برابر تھا اور جنھوں نے ایک عرصے بعد اپنی خودنوشت سوانح عمری بہ عنوان The Apprenticeship of a Mathemetician لکھی جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ایک باب علی گڑھ کے بارے میں بھی ہے۔ سر شاہ سلیمان اعلیٰ درجے کے ریاضی داں، ماہر طبیعات اور متقنن تھے اور ان چند سائنس دانوں میں تھے جنھوں نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت ۱۹۱۵ء پر سوالیہ نشانات قائم کرنے میں پہل کی۔ انھوں نے ذوق کا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد درجۂ اوّل کے ریاضی داں تھے، یہ کیمبرج یونیورسٹی کے رینگلر (Wrangler) رہ چکے تھے۔ یہ اصطلاح کیمبرج میں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئی تھی، جو ریاضی میں انتہائی اور بے اندازہ امتیاز اور قدر و منزلت کے مستحق قرار دیے گئے ہوں۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھیں Newton اسکالرشپ تفویض کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے جرمنی کی Gottingin یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، وہاں کے Archives میں ان کا مقالہ، جو علمِ فلکیات پر ہے، واقف کاروں کے بقول اب تک محفوظ ہے اور بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اپنے زمانۂ وائس چانسلری میں انھوں نے البیرونی کی

مشہور کتاب ''قانونِ مسعودی'' کا انگریزی میں ترجمہ کرانے کے بھی ڈول ڈالا تھا لیکن یہ اتمام کو نہیں پہنچ سکا۔ جتنے حصے کا ترجمہ ہوا اس کا مسودہ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے، لیکن پھر انھوں نے اپنی تمام تر مساعی کا مرکز و محور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور فروغ اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے استحقاق اور تناسب آبادی کے مطابق ان کے حصے کی مانگ کو بنا لیا تھا۔ انھیں اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے بس ایک ہی دھن سوار رہتی تھی کہ بالعموم مسلمانوں کی اور اس درس گاہ کی فوز و فلاح کے لیے کیا راہ نکالی جائے۔ اس معاملے میں وہ سرسید کا اتباع کرنے والوں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کے لیے ایک عدیم المثال نمونہ تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا اپنے مضمون معاشیات میں تو کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہیں ہے، لیکن انھوں نے بھی تعلیم کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر اپنی تمام تر کوششیں صَرف کر دیں۔ انھوں نے Basic Education کا خاکہ بھی تیار کیا اور اس میں رنگ آمیزی کے بھی وہ تنہا ذمہ دار تھے، اسے وہ ایک عرصے تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماحول میں آزماتے رہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین بڑے بیدار مغز، دور اندیش اور موقع شناس انسان تھے۔ وہ مسلم کلچر کی Urbanity یعنی شائستگی کا پیکرِ جمیل تھے، قوت و اقتدار اور مناصب کے حصول نے انھیں بگاڑا نہیں۔ ان میں جو مصلحت اندیشی اور سیانا پن یعنی Shrewdness تھی۔ اس میں ایک نوع کی شرافت اور کشادگی پنہاں تھی۔ اس میں انانیت، سفلگی اور کمینے پن کا دور دور گزر نہیں تھا۔ تصوف سے بھی انھیں بڑی دلچسپی تھی اور قلندری کا لبادہ بھی وہ کبھی کبھی زیب تن کر لیا کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں وہ مولوی الیاس صاحب مرحوم سے، جو تبلیغی جماعت کے امیر تھے، بغایت ارادت قلبی رکھتے تھے، لیکن اپنی Idealism کے ساتھ ہی وہ Pragmatist بھی تھے۔ ان کی چھٹی حس نے انھیں یہ باور کرا دیا تھا کہ اس راہ پر چل کر وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ پائیں گے اور گوہرِ مقصود کو اپنے کفِ دست میں اسیر نہیں کر سکیں گے کہ اس وادی میں

''خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا''

(اقبال: جبریل و ابلیس)

والا معاملہ تھا۔ چنانچہ وہ جلد ہی مولوی الیاس صاحب سے دامن کشاں ہو گئے اور انھوں نے اپنے قبلے کا رُخ دوسری سمت موڑ دیا، اور پھر وہ تا مین حیات تن دہی اور ثابت قدمی کے ساتھ اسی راستے پر چلتے رہے اور اس سے تمتع حاصل کرتے رہے اور پھر کبھی انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ چنانچہ غالباً ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۲ء میں جب مرکزی لائبریری کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے پنڈت نہرو آں جہانی علی گڑھ تشریف لائے تو ذاکر صاحب نے اپنی خیر مقدمی خطبے میں ان کی مدح سرائی جس طور سے کی اس نے غالب کی قصیدہ گوئی کی یاد تازہ کر دی۔ ان کے اس خطبے کو خوب خوب سراہا گیا یعنی زبان و بیان کی ترصیع، رنگ آمیزی اور بلند آہنگی کے سبب۔ راقم الحروف کا اس پر تبصرہ صرف دو الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے:

Flowery And Pretentious

۳ر مئی ۱۹۶۹ء میں ذاکر صاحب کے انتقال پر کئی لوگوں کو آل انڈیا ریڈیو دہلی پر ان کے بارے میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا، جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ اس کی یہ تقریر انجمن ترقی اردو کے اخبار ''ہماری زبان'' میں شائع ہوئی۔ پھر ۱۹۷۴ء میں ذاکر حسین تعلیمی اور ثقافتی فاؤنڈیشن کی جانب سے ان پر مضامین کا ایک مجموعہ بہ عنوان "Dr. Zakir Husain As I Saw Him" اشاعت پذیر ہوا جسے رادھے موہن صاحب نے مرتب کیا تھا، اس میں خاص طور سے ان لوگوں سے مضامین لکھوائے گئے جو ذاکر صاحب کو قریب سے جاننے کا شرف رکھتے تھے۔ ان میں من جملہ اور لوگوں کے پروفیسر محمد مجیب، خواجہ غلام السیدین، ہمایوں کبیر، کرن سنگھ اور مسز اندرا گاندھی کے مضامین شامل تھے۔ علی گڑھ سے صرف راقم الحروف کا مضمون شامل کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا: "A Man Among Men" ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم فی الحقیقت ایک بڑی اور پر تجمل شخصیت تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دانش وروں اور رفقائے کار کے درمیان ان کا قد یقیناً نکلتا ہوا تھا۔ اس داستان طرازی کے اختتام پر اقبال کا یہ شعر جس کا ذاکر صاحب کی شخصیت پر کسی قدر اطلاق ہوتا ہے۔ نقل کرنے کو دل چاہتا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

○○○

اسلوب احمد انصاری

رشید احمد صدیقی: ہمارے رشید احمد

جب سے سن شعور کو پہنچا تھا، گھر میں رشید صاحب کا نام کانوں میں پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ خاندان کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ کی رشید صاحب سے دانت کاٹی روٹی تھی اور یہ دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ ابھی اسکول ہی میں پڑھتا تھا کہ ''مضامین رشید'' کا اوّلین ایڈیشن جو مکتبہ جامعہ سے چھپا تھا، ہاتھ لگ گیا۔ چوں کہ بچپن سے کتابیں چاٹنے کی چیٹک لگی تھی، اور گھر میں ہر قسم کی کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا اس لیے حسب معمول اس کتاب کی ورق گردانی کے بھی درپے ہوا، لیکن غالباً کچھ زیادہ پلے نہیں پڑا۔ زبان ثقیل اور غرابت زدہ معلوم ہوئی، جملوں کی ترتیب پیچیدہ اور گنجلک، عبارت میں بے ربطی اور پراگندگی نمایاں اور تاثرات واحساسات کا تسلسل غیر منطقی نظر آیا۔ باتیں بہکی بہکی سی لگیں۔ یعنی خیالات کے آزاد تلازمے کا ایک الجھا ہوا تانا بانا۔ ہاں، البتہ کہیں کوئی مزاحیہ جملہ اگر اتفاق سے سمجھ میں آجاتا، تو مزہ دے جاتا تھا لیکن اس کے باوجود رشید صاحب کے نام کی جو تسبیح اوّل دن پڑھی جاتی رہی تھی شاید اس کا یہ اثر تھا کہ ان کی شخصیت کے تصور میں ڈوبا رہا۔ ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول کا امتحان دلّی سے پاس کر کے جب میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دہلیز پر قدم رکھا تو رشید صاحب کو ایک نظر دیکھنے کے لیے شوق نے دل میں انگڑائی لی، لیکن اس امید کے برآنے کی کوئی سبیل بہ ظاہر نظر نہ آئی۔ کئی مہینے بعد ایک بار دور سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اپنی تخیل کی عمارت کے یکلخت منہدم ہو جانے پر کچھ ایسا ہی افسوس ہوا جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے کوئی رنگین کھلونا گر کر ٹوٹ جائے۔ رشید صاحب بہ یک جنبش نظر دیکھ لینے میں

جاذبِ توجہ ہرگز نہ تھے۔ متوسط قد و قامت، گندمی رنگ، چہرے پر انتہائی سنجیدگی بلکہ کبیدگی کے آثار، رفتار مدھم اور مجموعی طور پر ڈھیلے ڈھالے، آنکھیں دبیز چشمے سے ڈھکی ہوئیں، لباس اور چال ڈھال سے کسی دفتر میں کام کرنے والے منشی جی سے مشابہ۔ یہ راز تو کچھ مدت بعد ہی کھلا کہ اس بہ ظاہر غیر مرعوب کن انسان میں کس بلا کی ذہانت و فطانت، کچھ درجے کی شوخی اور حاضر جوابی اور کس معیار کی دیدہ وری، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی چھپی ہوئی تھی۔ ظواہر بڑی حد تک فریب کن ہوتے ہیں، لیکن جو نقش ذہن اور تخیل پر برسوں سے جما ہوا تھا، وہ پھر بھی یکسر محو نہیں ہوا۔ ملاقات کی صورت میں غیر متوقع طور پر پیدا ہوئی۔ اسی سال نومبر کے مہینے میں، جب راقم الحروف کو اس سرزمین پر وارد ہوئے چند ہی مہینے گزرے تھے۔ مضمون نویسی کے ایک مقابلے میں حصہ لینے کا اتفاق ہوا۔ مضمون کا عنوان تھا ''اقبال کا ذہنی ارتقا۔'' رشید صاحب حکم مقرر کیے گئے تھے اور انھوں نے مجھے اوّل انعام کا مستحق قرار دیا (یہ مضمون بعینہٖ بعد میں جنوری اور فروری ۱۹۴۱ء میں رسالہ ''جامعہ'' کی دو اشاعتوں میں قسط وار شائع کیا گیا) مضمون کے سرِ ورق پر جو جملہ انھوں نے لکھا تھا، وہ اتنی طویل مدت گزر جانے کے باوجود ابھی تک لوحِ ذہن پر مرتسم ہے۔ رشید صاحب نے لکھا تھا:

> ''مجھے اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ مسٹر اسلوب احمد انصاری باوجود خورد سال ہونے کے اپنے ان بہت سے دوستوں اور بزرگوں سے جو اس وادی میں کہنہ مشق ہیں، آنکھ ملا سکتے ہیں۔''

یہ جملہ پڑھ کر کچھ دیر کے لیے دل فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا۔ اس طرح کا خوش گوار اور حیرت زا، تجربہ زندگی میں اس کے بعد بھی ایک سے زائد بار ہوا، لیکن اتنی کم عمری میں نہیں۔ چند روز بعد رشید صاحب کا پیغام ملا کہ مجھ سے آ کر مل جائیے۔ میں اپنے لاغر اور منحنی جثے کے ساتھ ایک بھیگی ہوئی فاختہ کی طرح ڈرا سہما سمٹا ہوا ان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ فرسٹ ایر کے طالب علم کی بساط ہی کیا۔ بڑی شفقت اور بہ غایت مہر و محبت کے ساتھ پیش آئے گویا کہہ رہے ہوں:

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود

دو چار پُر لطف جملے کہے اور پھر ایک معنی خیز انداز سے دوبارہ پھر ملنے کی ایک طور پر تاکید کی۔ یوں جنوری ۱۹۴۰ء کے اولین دنوں میں رشید صاحب سے میرا تعارف ہوا۔

رشید صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ بڑی شفقت، انتہائی تلطف اور دل دہی کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے اور اگر ان میں ادبی استعداد کی کوئی ہلکی سی رمق بھی انھیں نظر آتی تو ہمت افزائی میں کوئی کور کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ دل بڑھانے کا یہ ملکہ میں نے ان بہت سے مشاہیر علم وادب میں پایا، جن سے ہندوستان اور بیرونِ ہند سے مجھے سابقہ پڑا۔ ان میں ایک میرے علی گڑھ کے محبوب اور مشفق استاد اور برصغیر میں اردو اور انگریزی کے متبحر عالم اور نقاد خواجہ منظور حسین تھے اور دوسرے آکسفورڈ میں کڑی نظر رکھنے والے سخت گیر میرے اتالیق اور انگریزی زبان وادب کے جید عالم اور محقق، تاریخ داں اور نقاد مسٹر ایف ڈبلو بیٹس۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے پہلی ٹرم کے اختتام پر کالج کے ڈین کو میرے کام کے بارے میں جو رپورٹ بھیجی تھی اس کا آغاز اس طرح کیا تھا:

"Mr. Ansari started his work in the full blaze of glory with a brilliant essay on T.S.Eliot's Four Quarters."

مارچ ۱۹۴۴ء کے علی گڑھ اردو میگزین میں رشید صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ایک مضمون ''اپنی یادیں'' سپردِ قلم کیا تھا۔ اس مضمون اور ان کی انتہائی اہم اور دلچسپ سوانح ''آشفتہ بیانی میری'' کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں طرح طرح کے نشیب وفراز سے گزرے تھے، اور زمانے کی تندی اور تلخی اور اپنی حرماں نصیبی کو انھوں نے اپنے کام و دہن کی آزمائش کا ذریعہ بنایا تھا، لیکن چوں کہ ظرف اور حوصلہ بڑا پایا تھا اس لیے ان گوناگوں اور متنوع تجربات نے ان کے اندر خود پرستی، بخل، ایذا رسانی اور خود غرضی جیسے سفلی جذبات کو نہیں اُبھرنے دیا۔ بلکہ ان کی شخصیت زندگی اور زمانے کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوگئی اور ان کے رویوں میں کشادگی، ہمواری اور گہری

انسانی ہمدردی کی دمک اور تب وتاب نمایاں ہوگئی۔ رشید صاحب ایک گردے کے آدمی تھے۔ سنا ہے کہ گردے کے آپریشن سے قبل اپنی طالب علمی کے زمانے میں وہ ٹینس کے چمپئن رہ چکے تھے۔ بعد کے دور میں انھیں دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے کھلاڑی رہے ہوں گے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ زندگی کی طرف ان کا عام رویہ ایک اچھے کھلاڑی کا تھا جسے ہار جیت کی کوئی فکر نہیں ہوتی، بلکہ جس کی تمام تر توجہ کھیل کے معیار اور سطح پر مرکوز رہتی ہے اور کھیل کو کھیل کی طرح برتنا اس کا شیوۂ زندگی ہوتا ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی، جب میں شعبۂ انگریزی سے بحیثیت استاد منسلک ہو گیا تھا رشید صاحب سے کبھی کبھی ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ وہ میرے بارے میں غالباً اچھی رائے رکھتے تھے، لیکن خود میری طبیعت میں جھجک، کم آمیزی اور عزلت (عُزلت) گزینی کی طرف ایک واضح میلان تھا۔ کچھ اس بنا پر اور کچھ رشید صاحب کے مزاحیہ اور طنزیہ جملوں کا ہدف بننے کے خوف سے میرا ان کے پاس بہت زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ اپنے گھر سے شعبۂ اردو تک اپنی سائیکل پر سوار ہو کر جایا کرتے تھے اور یہ سائیکل کچھ اس وضع قطع کی تھی اور خود ان سے اس درجے متاثر یا مرعوب رہتی تھی کہ چار فٹ آگے جاتی تھی تو کم از کم دو فٹ ضرور پیچھے ہٹ جاتی تھی اور اس طرح وہ بہت اطمینان کے ساتھ گھر سے شعبے تک کا فاصلہ طے کیا کرتے تھے۔ رشید صاحب شعبۂ اردو اور یونیورسٹی کی علمی وادبی مجالس اور نشستوں میں اکثر شریک ہوتے تھے اور ان کی روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں مجھے تقریر کرنے کا کافی چسکا تھا اور اس فن میں کافی مشق ومہارت بہم پہنچائی تھی۔ یہ کیفیت اب بھی باقی ہے کہ "چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی۔" اکثر ایسا ہوتا کہ طلبا کی یونین کی طرف سے منعقدہ تقریری مقابلے میں شرکت ہوتی اور رشید صاحب حکم بنائے جاتے تھے۔ اس زمانے میں طلبا کا تقریر وتحریر کا معیار خاصا بلند تھا اور ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا فطری اور صحت مند جذبہ پایا جاتا تھا۔ شائستگی اور مہذب قسم کی حاضر جوابی اور جملے بازی یونیورسٹی کے طلبا کا امتیازی وصف سمجھی جاتی تھی۔ جب مباحثہ ختم ہوتا اور یونین کے صدر کی طرف سے انعامات کا اعلان

کر دیا جاتا تو پھر رشید صاحب سے تقریر کرنے کی درخواست کی جاتی تھی اور وہ اپنی لطیف حسِ مزاح کو بر سر کار لا کر انتہائی غیر خود آگاہ طریقے سے پہلے تو مقررین پر کچھ چھینٹے اڑاتے اور پھر اپنے برجستہ، بے محابا اور شوخ و شنگ انداز میں اپنی پُر بہار شخصیت کے پھول اس طرح بکھیرتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ رشید صاحب اپنے زمانے میں یونیورسٹی یونین کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔

رشید صاحب نے اپنے منفرد، اچھوتے اور البیلے اندازِ نگارش کی وجہ سے، بہت جلد اپنا لوہا منوا لیا۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور ان کی ذات مرجع خواص تھی۔ شعور پختہ ہونے پر جب ان کی تحریروں کو سمجھنے اور ان پر رائے قائم کرنے کی کسی حد تک استعداد پیدا ہوئی تو راقم الحروف نے رشید صاحب پر تابڑ توڑ کئی مضامین لکھے اور عجلت اور کم فہمی کے باعث ان کی تحریروں کے بعض پہلوؤں پر سخت تنقید کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے دل پر میل آنا تو کجا، انھوں نے ان مضامین کو بہت پسند فرمایا اور وہ مجھے بہت عزیز رکھنے لگے۔ اس سے ان کی وسعتِ قلب و نظر اور اپنے امتیازات کے بارے میں ان کی غیر معمولی کسر نفسی پر روشنی پڑتی ہے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا رشید صاحب علمی و ادبی حلقوں میں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ کوئی شخص باہر سے علی گڑھ آئے اور رشید صاحب سے نیاز حاصل کیے بغیر ہی لوٹ جائے تو سمجھ لیجیے کہ اس کی آمد کا نصف سے زائد مقصد ہی فوت ہو گیا۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اور یہ کچھ ماضی بعید کی بات نہیں ہے، اس وقت علی گڑھ صحیح معنوں میں ایک علمی دانش گاہ، ثقافت و تہذیب کا مرکز و محور اور ہندوستانی مسلمانوں کی آرزوؤں، تمناؤں، خوابوں اور آدرشوں کی آئینہ داری کرتا تھا اور اس میں رشید صاحب کی ذات کو ایک فوقیت اور بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ رشید صاحب غالب اور اقبال کے بڑے پرستار اور شیدائی تھے۔ غالب ہی کی طرح ان میں ایک بڑی کمزوری یہ ضرور تھی کہ حکام اور نوابین سے مل کر ان کا دل اس طرح پسیج جاتا تھا جیسا غالب کا، اور اپنے گھر پر ان کے ورودِ مسعود سے انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مقام علیین پر پہنچ کر ملائکہ سے بالمشافہ گفتگو کر رہے ہوں اور ان کے نزول اجلال کو اپنے لیے موجب برکت و رحمت تصور کرتے ہوں۔

یہ ایک عینی مشاہدہ ہے، جس میں کسی شک وشبہ کی مطلق گنجایش نہیں، لیکن قطع نظر اس ایک بشری کمزوری کے، رشید صاحب مروّت، تلطف اور وضع داری کا ایک جیتا جاگتا پیکر تھے۔ وہ سادہ لوح ہر گز نہیں تھے ہر طرح کی اونچ نیچ اور حسن وقبح پر گہری نظر رکھتے تھے اور خوب جانتے تھے کہ کس شخص سے کس وقت کس طرح کا کام کس انداز سے لیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان میں ایک نوع کی اعلیٰ ظرفی، فراخ دلی اور بلند نگہی بھی پائی جاتی تھی اور جس تخلیقی فن کار میں یہ خوبیاں نہ پائی جائیں، اس کا کھرا پن یعنی اس کی authenticity مشتبہ ٹھہرتی ہے۔ رشید صاحب نے اپنی طویل مدت حیات میں طرح طرح کے لوگوں کو دیکھا اور برتا تھا اور خود اپنی زندگی کے نشیب وفراز سے گزرنے کے نتیجے کے طور پر ان کے ذہن میں بڑی کشادگی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ فطرت انسانی کے گہرے نبض شناس تھے اور انسانی رویوں اور محرکات کی باریکیوں اور پیچیدگیوں میں بڑا درک اور بڑی بصیرت رکھتے تھے۔

وہ انسانی تعلقات اور روابط کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ وہ ایک پروانہ وار شوہر، ایک جاں نثار باپ اور ایک مخلص اور بڑے ہی وفادار دوست تھے۔ اپنی اولاد کے سلسلے میں ان کے دل میں کبھی کبھی یہ عجیب وغریب خواہش ابھرتی تھی کہ کاش وہ اپنی اوج گاہوں سے اتر کر ایک بار پھر طفلی کے دور معصومیت میں داخل ہوجائیں، تاکہ اس طرح تجربے اور معصومیت کے اختلاط اور امتزاج کا روح پرور منظر نگاہوں کے سامنے پھر جائے۔ دوستی ان کے لیے ایک قدر اعلیٰ تھی "مضامین رشید" میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یونین الیکشن کے معاملے میں ان کا رویہ یہ رہتا تھا کہ چاہے فریق مخالف کے مقابلے میں ان کا امیدوار نراگدھا ہی کیوں نہ ہو، ووٹ وہ ہمیشہ اپنے دوست ہی کو دیں گے۔ ای.ایم. فاسٹر نے بھی اپنے مشہور مضمون "What I Believe" میں لکھا ہے کہ اگر انتخاب ان کے دوست اور ملک کے مابین ہو اور انھیں حق انتخاب کی آزادی حاصل ہو تو وہ اپنے ملک کے ساتھ دغا کر سکتے ہیں۔ اپنے دوست کے ساتھ ہر گز نہیں، چاہے اس کے نتیجے کے طور پر پولیس ہی کو کیوں نہ طلب کرنا پڑ جائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا اقبال سہیل سے دوستی نبھانے میں رشید صاحب اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند تھے، رشید صاحب کو

ان کی سفارش پر حکومت کی طرف سے پدم شری کے خطاب سے نوازا گیا۔ راقم الحروف کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ ان کے رتبہ سے فروتر تھا۔ خطاب ملنے پر ہر طرف سے لوگوں نے انھیں مبارک باد کے تار اور خطوط روانہ کیے، اور گھر پر بھی دوستوں اور عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہا، لیکن راقم الحروف کی طرف سے اس قسم کی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ چند روز بعد جب یہ طوفان تھما اور یہ ہنگامہ ذرا کی ذرا اعتدال پر آیا۔ ایک بار ملنے کا اتفاق ہوا، کہنے لگے کیوں حضرت اخبار میں خبر تو دیکھی ہوگی مگر آپ چپ سادھے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی ادبی شہرت تو اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اردو پڑھنے والے اور اس سے محبت کرنے والے اس برصغیر میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ خطاب وغیرہ تو سطح آب کا خس وخاشاک ہیں۔ یہ سن کر بہت محظوظ ہوئے اور مسکرا کر کہنے لگے کہ مجھے آپ کی طبیعت کا کچھ اندازہ ہے۔ آپ سے اسی قسم کے جواب کی توقع تھی۔ اس ایک واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے احترام اور ان کی تالیف قلب کی خاطر رشید صاحب نے خطاب واپس تو نہیں کیا، لیکن اس کے تفویض کیے جانے کو اپنے لیے طرۂ امتیاز بھی نہیں سمجھا، اور یہ ایک تخلیقی فن کار کے شایانِ شان ہے بھی کب؟

رشید صاحب یونیورسٹی کی ملازمت سے بہ حیثیت پروفیسر و صدر شعبہ اردو مئی ۱۹۵۷ء میں سبک دوش ہوئے۔ میں اگلے سال ستمبر میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستان لوٹا۔ علی گڑھ واپسی پر چند روز کے بعد اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رشید صاحب کے پاس بھی گیا۔ بہت دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے استفسار حال کرتے رہے۔ میں نے کیمبرج میں مشہور ناول نگار ای. ایم. فاسٹر سے اپنی ملاقات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ فاسٹر جب دوسری بار ۱۹۴۵ء میں ہندوستان آئے تو علی گڑھ بھی آئے تھے اور انھوں نے یہاں کئی روز قیام کیا۔ وہ سر راس مسعود مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جگری دوست تھے اور ڈاکٹر بابر مرزا صاحب سے بھی جو اس زمانے میں یہاں شعبۂ حیوانات کے صدر تھے، ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ رشید صاحب انفرادیت سے فاسٹر کے لگاؤ اور لبرلزم میں ان کے

غیر متزلزل ایمان وایقان کو بہت سراہتے تھے۔ فاسٹر سے ان کی ملاقات پی ای این کانفرنس کے دوران ہو چکی تھی۔ میں جب رشید صاحب سے رخصت ہونے لگا، تو فرمانے لگے کہ امید ہے آپ برابر آتے رہیں گے۔ اس جملے کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس وقت سے لے کر جنوری ۱۹۷۷ء میں ان کی وفات تک میں برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ مجھے کبھی اس کی مطلق شکایت نہیں ہوئی اور اس کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوا کہ وہ ملنے جلنے میں تغافل برتتے یا کتراتے ہیں۔ میں جب بھی ان کے پاس جاتا، اور میری آمد کی انھیں اطلاع ملتی فوراً چند ساعتوں میں اندرونِ خانہ سے برآمد ہوتے اور اپنے وسیع وعریض، ہرے بھرے، ہموار اور گھاس سے گتھے ہوئے لان میں جو چاروں طرف انواع واقسام کے تر وتازہ اور شگفتہ گلاب کے تختوں سے ڈھکا رہتا تھا، بلا تکلف آن بیٹھتے اور ''پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار'' کا سلسلہ چل نکلتا۔ اس لان کی نگہ داشت اور ان مہ رخوں کی ناز برداری میں علاوہ رشید صاحب کے اپنے ذوق کے ان کے بھانجے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی ہنرمندی، سلیقہ شعاری اور جگر کاوی کو بھی بڑا دخل تھا۔ ایک بار کہنے لگے کہ آپ آجاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ نسیم صبح کا تازہ جھونکا آگیا ہے۔ رشید صاحب بڑے پتے کی باتیں بڑی برجستگی، خوش طبعی اور روشن ضمیری کے ساتھ کیا کرتے تھے اور ان کے ذہن میں نکتہ سنجی کے کوندے لپکتے رہتے تھے۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کی طبیعت کا غالب رجحان تھا، ہر شخص اور ہر صورت حال کے مضحک پہلوؤں کو چشم زدن میں اپنے ادراک کی گرفت میں لے آنے کا ان میں فطری ملکہ تھا اور بعض دوسرے طباع فن کاروں کی طرح وہ اپنی ذات کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کرتے تھے، لیکن ان کے طنزیہ واروں میں تلخی، جلن اور انقباض نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک نوع کی آسودگی، مرحمت اور انبساط وکشادگی پائی جاتی تھی۔ ان کی گفتگو زیادہ تر علمی اور ادبی موضوعات پر ہوتی، یا پھر علی گڑھ یونیورسٹی، اردو اور مسلمانوں کے مسائل پر۔ یہ تینوں ان کے نزدیک ایک ہی وحدت کے اجزا تھے، اور یہ وحدت غیر منقسم تھی کیوں کہ ان کی رائے میں علی گڑھ ہی وہ مرکز ومحور تھا جہاں سے علم وتہذیب وثقافت کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر ہندوستان کے ہر ہر گوشے کو دور دور تک منور کرتی رہی تھیں۔ رشید صاحب کو اشعار کم یاد رہتے تھے، لیکن

ان کی پرکھ اور تحسین شناسی کے معاملے میں ان کا ثانی سوائے مولوی ضیاء احمد بدایونی کے جو فارسی شعر و ادب کے بحرِ بیکراں کے شناور تھے، میں نے کسی دوسرے کو نہیں پایا۔ دونوں میں غیر معمولی نکتہ رسی اور شعر کی تہ تک اُتر جانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم نمایاں تھی۔ ایک بار رشید صاحب کی کسی بات پر طبیعت کچھ آزردہ سی رہی۔ ایک ڈیڑھ مہینے تک آنے جانے کا سلسلہ منقطع رہا پھر یکایک ایک دن ایک لفافہ موصول ہوا، کھول کر دیکھا تو اندر ایک بالکل سادہ ورق پر، جو القاب و آداب، نام پتے اور تاریخ سے عاری تھا، غالب کا صرف ایک مصرعہ نقش تھا:

''مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے''

مصرعے کا انتخاب اور خط یعنی Handwriting دونوں بھیجنے والے کی نشان دہی اور غمازی کر رہے تھے۔ اپنی نااہلی اور نالائقی پر تاسف اور ندامت کا احساس ہوا، فوراً حاضر خدمت ہوا اور انھیں اسی طرح مسرور و بشاش، خنداں و شاداں و فرحاں پایا جیسا کہ ہمیشہ پایا کرتا تھا:

شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

رشید صاحب کا یہ معمول تھا کہ وہ راقم الحروف کو اردو یا انگریزی کی کوئی چیز لکھنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ اس طرح کے کاموں کی طرف جسے بعض لوگ بیگار کہتے ہیں، ایک خاص رویہ رکھتا تھا۔ اوّل تو اس طرح گاہے گاہے لکھنے سے چاہے وہ فرمائش ہی پر کیوں نہ ہو اپنی مشق کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور قلم میں روانی برقرار رہتی تھی۔ دوسرے اس طرح کی کوئی تحریر کو مکمل کر کے جب رشید صاحب کو واپس کرتا تو اس پر ان کا تبصرہ ذہن کے بہت سے دریچوں کے کھلنے کا سبب بنتا، اور وہ اس میں کوئی نہ کوئی مزید نکتہ پیدا کرتے اور تیسرے یہ کہ اپنے بزرگوں کے چھوٹے موٹے کام سرانجام کرنے میں ہمیشہ اطمینان اور سعادت کی ملی جلی کیفیت کا انبساط آگیں احساس ہوتا تھا۔ میں لکھنے کے کام کو بالعموم اس وقت تک ٹالتا رہتا ہوں جب تک کہ اس کا ٹالا جانا ممکن ہو سکے یعنی جب تک پانی سر سے نہ گزر جائے اور مفر کی کوئی صورت باقی نہ رہے، کیوں کہ ظاہر ہے کہ ڈھنگ کی کوئی تحریر لکھنے کے لیے ایسی ابتلا اور ایسے جان لیوا کرب سے گزرنا پڑتا ہے گویا صلیب پر آویزاں کیا

جار ہا ہو۔ اگر دماغ میں کھچڑی پوری طرح پک بھی چکی ہو تب بھی الفاظ عین وقت پر دھوکا دے جاتے ہیں۔ خیال اور لفظ کی چول بٹھانے اور مافی الضمیر کو موثر اور اطمینان بخش طریقے پر الفاظ کی خارجی ہیئت میں پیوست کر کے اس کی ترسیل اور ابلاغ کے لیے جس ہفت خواں کو طے کرنا پڑتا ہے، اسے لکھنے والے کا دل ہی بخوبی جان سکتا ہے اور نتیجہ پھر بھی بسا اوقات ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ رشید صاحب راقم السطور پر کچھ اس درجہ اعتماد کرتے تھے کہ اشاعت سے قبل اپنی تحریر بھیج دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جب تک آپ اسے پڑھ کر اس پر صاد نہ کر دیں گے اس وقت تک اسے چھپنے کے لیے نہیں دوں گا۔ یہ ان کے تعلق خاطر کا بین ثبوت تھا ورنہ ''من آنم کہ من دانم'' اس امر کا تذکرہ یہاں اس لیے کیا گیا کہ ان کے مسودات کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بہت سے اہم اور چوٹی کے انشا پردازوں کی طرح رشید صاحب بھی اپنی تحریر پر بار بار نظر ثانی کرتے، اس کی نوک پلک درست کرتے، اس کی آرائگی بلکہ مشاطگی اور جملوں کی مناسب تراش خراش کے بعد انھیں سبک بجل اور سڈول بنانے پر توجہ اور وقت صَرف کرتے تھے۔ تب کہیں جا کر وہ نفیس، آب دار اور کانٹے پر تلی ہوئی نثر وجود میں آتی، جس پر ان کے تحسین شناس اس درجے سر دُھنتے تھے۔ اس سے یہ بھی بخوبی عیاں ہوتا ہے کہ شعر کا جادو جگانے کے لیے خون جگر کی جو کشید درکار ہوتی ہے کم و بیش ایسی ہی جاں کاہی اور ریاض کا مطالبہ اچھی اور ستھری نثر کی تخلیق بھی کرتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کے سرکار ماہنامہ 'آج کل' میں مدیر کی فرمائش پر میں نے ایک مضمون ''غبار کارواں'' کے عمومی عنوان کے ذیل میں جس پر اردو کے تقریباً ایک درجن ادیبوں اور شاعروں کو طبع آزمائی کی دعوت دی گئی تھی اپنے بارے میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں میں نے اپنے خاندانی پس منظر، اپنی ابتدائی زندگی کے رجحانات اور دلچسپیوں، دورانِ قیام انگلستان اپنی سرگرمیوں اور مصروفیات، اپنے والدین اور اساتذہ اور ان کتابوں اور شخصیتوں کا ذکر کیا تھا جن سے میں بہ طور خاص متاثر ہوا تھا۔ شاید یہ بھی لکھا تھا کہ میری بیوی کا ننھیالی رشتہ براہ راست شاہ عبدالقدوس گنگوہی سے ملتا ہے۔ میرے جد امجد حاجی امداد اللہ مکی تھے اور حکیم آزاد انصاری جنھیں مولانا حالی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور جنھیں سہل ممتنع کے استعمال پر

کامل دست گاہ تھی، میرے پھوپھا تھے۔ رشید صاحب کا اس مضمون میں کوئی ذکر نہیں تھا کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے شاگردِ رشید ہونے کی سعادت اس لیے نصیب نہیں ہوئی کہ انگریزی سے میری رغبت اور میرا ذوق ابتدائی تعلیم و تربیت کی وجہ سے تھا، اور فارسی کی تحصیل پر ایم اے کے مرحلے پر پہنچنے تک میں نے مسلسل اور خصوصی توجہ صَرف کی لیکن یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد باضابطہ طور پر اردو کبھی نہیں پڑھی۔ بجز ابتدائی لازمی اردو کے جو نصاب کا ایک حصہ تھی، اردو سے میرا شغف وہبی زیادہ اور اکتسابی کم تھا۔ ہاں خاندان کی فضا اور ماحول کا اثر ضرور تھا جیسے کہ مسلمانوں کے ہر مہذب گھرانے پر اردو کلچر کی چھاپ ہوا کرتی تھی۔ رشید صاحب نے یہ مضمون پڑھتے ہی مجھے خط لکھا اور حسبِ عادت مضمون کی بہت تعریف و توصیف کی۔ ان کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا کہ جب کبھی میری کوئی بھی بھلی بری تحریر کسی اردو یا انگریزی اخبار یا رسالے میں ان کی نظر سے گزرتی، وہ فوراً فرداً ان شفقت کے ساتھ مجھے خط لکھتے اور میری تحریر کے حسن و قبح پر بڑی فراخ دلی، دیدہ وری اور برجستگی کے ساتھ روشنی ڈالتے، اپنے خوردوں کی دل جوئی کرنے، ان کی ہمت بڑھانے اور ان کی پیٹھ ٹھونکنے میں وہ کبھی تامل نہیں کرتے تھے۔

بعض لوگوں نے رشید صاحب کی خامیوں کی جانب انگشت نمائی کو اپنا وظیفۂ خاص قرار دے رکھا ہے۔ خامیاں ان میں ضرور تھیں اور کس میں نہیں ہوتیں، لیکن ان کی خوبیاں ان کی خامیوں پر حاوی تھیں۔ ایک خوبی میں نے ان میں ایسی پائی جس پر ان کی تمام کوتاہیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ اس طویل مدت میں اور اس درجے ربط ضبط کے باوجود میں نے ان کی زبان سے کبھی کسی کی برائی یا تضحیک کا ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ اس خاص معاملے میں میں نے ان کا مثل صرف اپنے استاد خواجہ منظور حسین مرحوم کو پایا۔ ان سے بھی ربط و تعلق مدتِ مدید تک رہا، لیکن یہ صوفیوں اور ولیوں جیسی خو بو میں نے ان دو اشخاص کے سوا کسی اور میں نہیں دیکھی۔ کسی شخص کو disapprove کرنے کے لیے رشید صاحب صرف ایک لفظ نامعقول استعمال کیا کرتے تھے، خواجہ صاحب کو کبھی یہ بھی کہتے نہیں سنا۔ رشد صاحب نے متعدد جگہ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کوئی نامعقول شخص اچھا شاعر نہیں

ہو سکتا۔ شعر وادب کی تنقید کے سلسلے میں ان کا یہ رویہ چاہے پورے طور پر درخورِ اعتنا اور قابلِ قبول نہ سمجھا جائے مگر اس سے امر کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ انسان کی خلقی اچھائی اور بھلائی کو ایک قدرِ اعلیٰ مانتے تھے۔

رشید صاحب کی غیر معمولی منکسر المزاجی اور فروتنی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اپنا اور اپنی تصانیف کا ذکر کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ یہی بات میں نے ای.ایم. فاسٹر میں بھی پائی۔ دسمبر ۱۹۵۶ء کی ایک یخ بستہ شام کو جب کیمبرج یونیورسٹی کے کالجوں کی backs کو محیط تاریکی نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور کہرے میں لپٹی ہوئی عمارتوں کی outlines جدید فنِ مصوری کے آڑے ترچھے اور مبہم خطوط کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں King's College میں فاسٹر کے اس وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوا، جو ہر طرف ہزاروں کتابوں سے پٹا ہوا تھا اور جس کی تصویر کشی انھوں نے اپنے معروف مضمون "In my library" میں کی ہے۔ بیٹھتے کے ساتھ ہی فاسٹر نے مجھ سے انتباہ کے طور پر کہا کہ وہ اپنے ناولوں کے بارے میں کوئی گفتگو پسند نہیں کریں گے۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹے کی طویل ملاقات کے دوران جدید انگریزی ادب، تصوف، اسلام، چین کا فلسفہ، تخفیف اسلحہ کا مسئلہ، برٹرینڈ رسل، ایف. آر لیوس، اقبال اور ٹیگور سب ہی موضوعات زیر بحث آئے۔ سوائے ان کی اپنی تصانیف کے، کہا تو صرف اتنا کہا کہ Lionel Trilling نے ان پر جو کتاب لکھی ہے وہ بری نہیں۔ فاسٹر کی یہ ادا دیکھ کر مجھے اپنی زبان کے بعض ادیبوں اور شاعروں کا معاً خیال گزرا، جن کے دماغ پر اپنی انانیت کا آسیب اس حد تک سوار رہتا ہے کہ وہ اپنے مفروضہ کمالات اور اکتسابات کی مدح سرائی بہ زبانِ خود کرنے اور دوسروں سے کرانے کی ادھیڑبن میں ایسے لگے رہتے ہیں کہ انھیں کسی دوسری چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ ظرف و ضمیر اور فہم و فراست کی تنگی اور کمی کے علاوہ اسے اور کیا کہیے گا۔ فاسٹر نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ انھوں نے اقبال اور ٹیگور دونوں کو ترجمہ میں پڑھا ہے لیکن وہ اقبال کو زیادہ بڑا شاعر مانتے ہیں۔ رشید صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے معاصرین کے بارے میں چاہے وہ ان کے مخالف ہی کیوں نہ رہے ہوں، نہایت فراخ دلی کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

مولوی عبدالحق بابائے اردو نے رشید صاحب کے بارے میں ایک سے زائد بار بڑی سخت سست باتیں کہیں۔ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد مرحوم سے بھی ان کے تعلقات برابر کشیدہ ہی رہے اور وہ اس لیے کہ رشید صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی پارٹی سے وابستہ تھے اور ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم دو متحارب گروپوں کے سربراہ تھے، اور ان کے درمیان خاصی چشمک ہی نہیں بلکہ مخاصمت رہتی تھی۔ لیکن رشید صاحب کا دل گردہ دیکھیے کہ انھوں نے مولوی صاحب کا ذکر ہمیشہ شائستہ الفاظ میں کیا اور ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم کے بارے میں جو مضمون انھوں نے موصوف کی وفات کے بعد لکھا اس نے بہت سے کوتاہ اندیش مبصروں یعنی ڈاکٹر ذاکر کی ٹولی کے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم اپنے زمانے میں ایک متنازعہ فیہ شخصیت تھے۔ راقم الحروف بھی عنفوانِ شباب کی سرمستی اور ناسمجھی اور صبر و احتیاط کے فقدان کی وجہ سے ان پر سخت سے سخت تنقید سے باز نہیں آتا تھا، لیکن وقت گزرنے کے بعد متوازن اور منصفانہ احتساب کے آئینے میں دیکھیے (اور رشید صاحب نے اس کا اقرار و اعتراف بغیر کسی ذہنی پس و پیش کے کیا ہے) تو ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنے بعد آنے والے تمام وائس چانسلروں پر بہ شمول ڈاکٹر ذاکر حسین، بدرجۂ اتم فوقیت رکھتے ہیں۔ موصوف کو اس ادارے سے جنون کی حد تک جو وابستگی اور شیفتگی تھی اور جس طرح اس کی ہر ممکن فلاح و بہبود کے لیے وہ ہمہ وقت منہمک .... اور پابہ رکاب رہتے تھے، اور جس طرح اس کی آن پر کسی آنچ کا آنا انھیں گوارا نہیں تھا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کے جذبے کی صداقت، ان کے ایثار کی ہمہ گیری اور ان کی دیوزادوں جیسی فہم و فراست اور حیرت انگیز کارکردگی پر بڑے سے بڑے کافر کو بھی بالآخر ایمان لانا پڑا۔ یہ ایک جملۂ معترضہ تھا، جو طویل ہو گیا کہ ایسا ہونا اس سیاق و سباق میں ناگزیر تھا۔ رشید صاحب نے اپنے معاصرین کے بارے میں جس بے پایاں محبت یگانگت اور روشن ضمیری کے ساتھ جو کچھ لکھا ہے اس کی مثال کہیں اور تلاش کرنا فعلِ عبث ہوگا۔ ڈاکٹر اقبال سے تو انھیں والہانہ محبت اور عقیدت تھی ہی لیکن جس سطح پر بھی ان کا تعلق جس کسی سے رہا، حسبِ موقع انھوں نے ہمیشہ اس کے محاسن اور خوبیوں کا چن چن کر اعتراف کھلے دل سے بلکہ غلو کی حد تک کیا۔ اپنا معاملہ

اس سے مختلف تھا۔ انتقال سے چند سال قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مجلس عاملہ نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے وائس چانسلر علی محمد خسرو نے راقم الحروف کو خط لکھا اور فرمایش کی کہ میں اس موقع پر پڑھے جانے کے لیے رشید صاحب کے لیے Citation لکھ دوں۔ میں تعمیل ارشاد کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رشید صاحب نے کہلوایا کہ میں آکر ان سے مل لوں۔ میں جب حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کسی جانب داری اور غلو کی مطلق ضرورت نہیں۔ حقیقت جتنی ہے اسی قدر ضبطِ تحریر میں آنی چاہیے۔ یعنی Citation معروضیت کے ساتھ لکھا جائے اور مبنی بر حقیقت یعنی Factual ہو۔ غالباً اس سے پہلے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملنے کے سلسلے میں جو Citation چند سال قبل ان کے لیے میں نے لکھا تھا وہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم ہی کی طرح علی گڑھ کی محبت رشید صاحب کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ خود انھوں نے ایک جگہ (بہ حوالہ اپنی یادیں) لکھا ہے کہ کسی معقول باصلاحیت اور اپنے فن میں صاحب کمال آدمی سے ملاقات ہو اور یہ پتہ چلے کہ اسے علی گڑھ سے اکتساب فیض کا موقع نہیں ملا تو بے اختیار اس پر ترس آتا، اور اس سے ہمدردی کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ اس نعمت سے کیوں اور کیسے مرحوم رہا۔ نجی طور پر رشید صاحب ہر ضرورت مند کی مدد کرنے پر سخنے، درمے، قدمے ہر وقت آمادہ اور مستعد نظر آتے تھے۔ کتنی بیواؤں اور یتیموں کی انھوں نے نگہ داشت کی، کتنے ضرورت مند طالب علموں کی تعلیم کا بار برداشت کیا، کتنی یتیم و مسکین لڑکیوں کی شادیاں کرائیں اور کتنے نادار اور بے سہارا لوگوں کے ان کی مصیبت کے وقت ان کے آڑے آئے۔ اور یہ سب اس اسلامی اصول کے مطابق کہ دائیں ہاتھ سے اس طرح دو کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ اس ادارے پر جسے بوڑھے سرسید نے اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا تھا جسے رشید صاحب ہندوستان کا قرطبہ اور غرناطہ کہتے تھے اور جسے ان کی ذہنی اور روحانی تربیت و پرداخت میں اس حد تک دخل تھا۔ وہ ہمیشہ جان چھڑکنے پر آمادہ رہتے تھے اور اسے مسلمانانِ ہند کی ملی آبرو کا ایک لازوال اشاریہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ سابق وائس چانسلر

ڈاکٹر عبدالعلیم کے دورِ حکومت میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خلاف پولیس ایکشن کی نوبت آئی، اس وقت رشید صاحب کا اضطراب، ان کی سراسیمگی اور شکستہ خاطری دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا ان کی متاعِ آبرو پر براہِ راست یلغار کی جارہی ہو۔ رشید صاحب جن اقدارِ زندگی کے حامل اور ان کی تجسیم تھے، وہ اب یکسر بھلا دی گئی ہیں۔ رواداری، سیر چشمی، خوش ذوقی اور گہری انسانی ہمدردی، یہی وہ اقدار تھیں جو انھیں اس درجے عزیز تھیں اور ان ہی اقدار سے اس ادارے کو قوتِ نمو اور حوصلۂ بال و پر ملا تھا۔ آج کے علی گڑھ میں ان کے متضاد اقدار کا چرچا اور ان کے برتنے پر اصرار ملتا ہے۔ ورنہ عزت و ناموس و حیا کے تحفظ کی ضمانت نہیں کی جاسکتی۔ رشید صاحب ظاہری طور پر مذہبی آدمی نہیں تھے، لیکن ان کے تحت الشعور میں مذہبی اقدارِ حیات گہرے طور پر جاگزیں تھیں۔ وہ مذہب کی قوتِ شفا کے بہت قائل تھے اور اقبال ہی کی طرح نبی کریم ﷺ سے انھیں بے پناہ عشق اور شیفتگی تھی اور جس شخص میں یہ عشق اور شیفتگی نہ پائی جائے وہ اسے معتبر انسان نہیں سمجھتے تھے۔ رشید صاحب نے اپنی زندگی کے تقریباً ساٹھ سال علی گڑھ کی سرزمین پر گزارے۔ انھوں نے تاریخ کے بہت سے مدوجزر دیکھے۔ وہ بہت سی معرکۃ الآرا تحریکوں سے وابستہ رہے۔ انھوں نے بہت سے انقلابات کی دھوپ چھاؤں کو آزمایا۔ شخصیتوں کا ٹکراؤ بھی دیکھا اور معینہ اور مسلّمہ اقدار کے پامال ہونے اور بکھرنے کا الم ناک منظر بھی، لیکن وہ ہر غم اور ہر حادثۂ جانکاہ، ہر جھلکے اور ہر رستاخیز کے ردِعمل اور اثرات کو اپنے اندرون کی گہرائیوں میں جذب کرتے اور سموتے رہے۔ انھوں نے کبھی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ اشتعال کے باوجود آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ حالات کی ہر بوقلمونی اور نیرنگی، زندگی کے ہر گرم و سرد، ہر تخت و ست اور ہر اُتار چڑھاؤ کو بہ چشمِ عبرت دیکھتے رہے اور شاید زبانِ حال سے کہتے رہے ہوں:

آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے!

○○○

اسلوب احمد انصاری
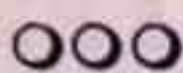
سید حامد: حلم وانکسار کی روشن علامت

سید حامد، جدید دور کے ہندوستانی مسلمانوں میں قدر ومنزلت، احترام واعتماد کی حامل اور مستحق ایک سربرآوردہ شخصیت ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں اپنی تمام تر سنجیدگی، بردباری اور شریف النفسی، تعلیمی وظائف میں اپنے ہمہ تن انہماک وامتیاز اور ہاکی کے کھیل میں اپنی مہارت اور ہنرمندی کے طفیل وہ اساتذہ اور ساتھیوں میں یکساں طور پر مقبول اور ہردل عزیز تھے اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ وہ یونیورسٹی ہاکی ٹیم کے، جو اس زمانے میں پورے ہندوستان میں اعلا درجے کی ٹیم شمار کی جاتی تھی ایک اہم رکن تھے اور سینٹر فارورڈ کھیلتے تھے۔ وہ کپتان عبدالشکور (مرحوم بڑے خوب رو، تیکھے ناک نقشے اور دبلے پتلے جثے کے تھے) کی سرکردگی میں جن کے Stick work کی جائز طور پر تعریف وتوصیف کی جاتی تھی کہ اس میں صحت وصلابت اور بانکپن کا امتزاج پایا جاتا تھا، کھیلتے تھے اور ان کے دست راست تھے۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ اس دور میں ہاکی ٹیم میں زیادہ تر طلبا بھوپال کے ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ نواب صاحب بھوپال اس کھیل پر خصوصی توجہ کرتے اور اس کی سرپرستی فرماتے تھے۔ سید حامد راقم الحروف سے یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران پانچ چھ سال سینئر تھے۔ (سید صاحب اس وقت ایم.اے (انگریزی) کے آخری سال میں تھے اور میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا) چوں کہ اس زمانے کے علی گڑھ میں سینئر اور جونیئر طلبا کے مابین بڑا فرق اور امتیاز روا رکھا جاتا تھا اس لیے ان سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس سید حامد کے ہم جماعت انعام الحق انصاری

سے راقم الحروف کا خاصا ربط و تعلق اس وجہ سے تھا کہ وہ اس کے قریبی عزیز تھے۔ وہ غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے اور متصوفانہ مزاج رکھتے تھے۔ خواجہ منظور حسین صاحب اور پروفیسر فیلڈن دونوں ان کی لیاقت کے بڑے معترف تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔
سید حامد صاحب سے میرا ایک طرح کا Tangential رابطہ تھا۔ بالواسطہ تعلق کی یہ صورت نکلی تھی کہ وہ خواجہ صاحب کے چہیتے شاگرد تھے اور خواجہ صاحب راقم الحروف سے بھی نہایت شفقت، تلطف اور التفات خاص برتتے تھے۔ ہم دونوں خواجہ صاحب کی خدمت میں گاہے گاہے حاضر ہوا کرتے تھے، اور یوں سید صاحب سے دزدیدہ نگاہی کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ یہاں یہ اضافہ کرنے کو دل چاہتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں انگریزی زبان و ادب کے سیاق وسباق میں خواجہ صاحب دو جید عالموں میں سے ایک تھے۔ دوسرے الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ایس. بی دیب تھے۔ یہ دونوں حیرت انگیز حد تک وسیع المطالعہ تھے اور دونوں کا حافظہ بھی غیر معمولی طور پر مستحضر تھا۔ دونوں کی آپس میں گہری دوستی بھی تھی۔ دیب صاحب بنگالی ہونے کے باوصف اردو اور فارسی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ راقم الحروف کو انھوں نے اردو میں کئی خط لکھے تھے۔ وہ طلاقت لسانی کے بھی ماہر تھے۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب طبعاً بہت زیادہ شرمیلے، کم گو اور کم آمیز تھے البتہ محدود اور نجی صحبتوں میں ان کی گل افشانیِ گفتار نمایاں ہوتی اور اپنا نقش جمائے بغیر نہیں رہتی تھی۔ خواجہ صاحب اور دیب صاحب کی علمیت قابل صد رشک بھی تھی اور موجب افتخار بھی۔

تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سید حامد صوبائی اور مرکزی دونوں سطحوں پر بہت سے اعلا سرکاری اور ذمہ داری کے عہدوں پر فائز رہے، اور اس دوران انھوں نے اپنی ذہانت، کارکردگی، مذہبی واجبات کی ادائیگی، انصاف پسندی، غیر جانب داری اور خلوص و جاں فشانی کا اَن مٹ نقش دلوں پر مرتسم کر دیا۔ ۱۹۸۰ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نام زد کیے جانے پر یہاں تشریف لائے اور اس خلفشار سے دوچار اور نبرد آزما ہوئے جوان کے کئی پیش روؤں نے اپنے اپنے مصالح اور اپنی اپنی بساط کے مطابق پوری لگن اور دلچسپی کے ساتھ یہاں کے حالات میں پیدا کر دیا تھا اور اس پر فرحاں اور نازاں تھے

اور اپنے لیے طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ یونیورسٹی کے حالات اور معاملات میں کجی، بدنظمی اور زراج کی داغ بیل تو بیج پوچھیے وائس چانسلر بدرالدین طیب جی ڈال گئے تھے، اور اس کا اتمام ہوا علی محمد خسرو مرحوم کے ہاتھوں۔ ۶ رنومبر ۲۰۰۱ء کو دہلی میں ایک تقریب کے دوران جو سید حامد صاحب کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی اور جس میں راقم الحروف بھی موجود تھا انھوں نے اپنی پالیسیوں اور کارناموں کا جو وہ بہ حیثیت وائس چانسلر انجام دے چکے تھے، دفاع یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ یونیورسٹی میں جمہوری اقدار کو تازہ دم کرنا چاہتے تھے درآں حالیکہ ان کی کرتب بازیوں کا واحد مقصد اپنی Image making یعنی شبیہ سازی تھا اور اپنی سستی اور سوقیانہ حرکتوں کے ذریعے جنھیں آپ شعبدہ بازی کے سوا کچھ اور نہ کہیے، اپنے آپ کو جانِ محفل بنانا اور یونیورسٹی حلقوں میں قبول عام کی سند حاصل کرنا۔ اس کا یونیورسٹی کے وقار اور انصرام اور انضباط کار سے دور دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔ جمہوری اقدار کی بے جا سرپرستی کرنے سے اگر انتظامیہ متزلزل ہو جائے اور تعلیمی معیاروں میں گراوٹ پیدا ہو جائے تو ایسی جمہوریت کے مقابلے میں آمریت اور مطلقیت قابلِ ترجیح ہے۔ اسی لیے اقبال نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا:

گریز از طرزِ جمہوری، غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اسلام کے ضابطۂ حیات میں بھی بے لگام جمہوریت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا آئیڈیل ایک طرح کی Controlled Democracy ہے۔ جو صورت حال ان کے پیش رو نے بڑے طمطراق کے ساتھ پیدا کی تھی، اس کا خمیازہ سید حامد کو بھگتنا پڑا، لیکن انھوں نے بڑی جرأت، دوراندیشی، معاملہ فہمی اور ہمت و حوصلے کے ساتھ ناساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ان کے پایۂ استقامت میں مطلق لغزش نہیں آئی۔ انھوں نے طلبا سے ان کے ناادا کردہ واجبات کی ادائیگی (جو برسوں سے نہیں ہوئی تھی) کے سلسلے میں تقریباً پانچ لاکھ کی خطیر رقم واپس کرا کر یونیورسٹی کے خزانے میں جمع کرائی اور داخلوں میں کسی بے ضابطگی کو دخل انداز نہیں ہونے دیا اور ایسے تمام طلبا کا اخراج کیا جو یونیورسٹی کی اقامت گاہوں میں

غیر قانونی طور پر مدت سے فروکش تھے۔ یہ بھڑوں کے چھتے پر ہاتھ ڈالنے کے مرادف تھا اور ایسے میں ان کا برہم اور مشتعل ہو کر بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہو جانا فطری امر تھا۔ ۱۹۸۰ء کے آخر آخر میں سید حامد کے خلاف شورش اور ہنگامہ آرائی اپنے شباب کو پہنچ گئی۔ طلبا نے پولیس پر پتھراؤ کیا۔ اس کے ردِ عمل اور نتیجے کے طور پر ایک لڑکا مارا گیا۔ اس ناگہانی موت کی ذمہ داری ان پر کس طور سے عائد نہیں ہوتی تھی کہ وہ برابر پولیس کو تاکید کرتے رہے تھے کہ ان طلبا کو جو مستقل طور پر وائس چانسلر لاج کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور یونیورسٹی میں علی العموم بدامنی اور شورش پیدا کرنے پر کمربستہ تھے، کسی حال میں اور کسی قیمت پر ہرگز ہرگز گزند نہ پہنچے۔ مگر ہونی کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ سید حامد بغایت حساس ہونے کے سبب اس حادثے سے بہت زیادہ آزردہ خاطر اور متاسف ہوئے اور اپنی پوزیشن سے استعفیٰ دینے پر تیار بیٹھے تھے، لیکن وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے جو اس وقت ہندوستان سے باہر تھیں، صورتِ حال کی اطلاع ملنے پر انھیں ان کے اس ارادے سے باز رکھا۔ دو سینئر اساتذہ جو اس وقت مرحومین ہیں، بہ ظاہر سید حامد سے ہمدردی، رفاقت اور اشتراکِ کلی کا اظہار کر رہے تھے، لیکن پس پردہ طلبا کو بغاوت اور ہنگامہ آرائی کے لیے برابر شہ دیتے رہتے تھے اور یہ آس لگائے ہوئے تھے کہ اگر وہ مستعفی ہو جائیں تو شاید جانشینی کا قرعہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے نام نکل آئے۔ یہ تھا ظاہر و باطن کا وہ بین فرق جو ان کے رویے سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آیا اور جس نے تمام حجابات کو چاک کر دیا۔ خیر اور شر کے درمیان کشمکش ہر دور میں ہوتی رہی ہے اور انسانی صورتِ حال کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اسی کے بارے میں اقبال نے بڑے بلیغ انداز میں کہا ہے:

وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

سید حامد مخالفین کے سامنے کسی قیمت پر سرنگوں نہیں ہوئے اور اپنے ظرف اور اولوالعزمی کا برابر ثبوت فراہم کرتے رہے۔ علی گڑھ والوں نے ان کے ساتھ اہلِ کوفہ کا سا برتاؤ رکھا۔ مگر ان کی صاف ستھری روشن جبیں پر کسی کے خلاف برہمی، تکدر اور تضحیک و حقارت کی ہلکی سی تحریر بھی نمایاں نہیں ہوئی۔ راقم الحروف اس کا شاہد ہے کہ انھوں نے نہ تو ان طلبا کے

خلاف جو وقتاً وقتاً طوفان وتلاطم برپا کرتے اور آمادۂ پیکار رہتے تھے اور نہ ان معدودے چند اساتذہ کو جو اس معاملے میں طلبا کی سرپرستی کرتے اور انھیں شر پر اکساتے رہتے تھے۔ کبھی مطعون کیا بلکہ یہی کہتے رہے کہ یہ ناسمجھ ہیں، دیر سویر راہِ راست پر آجائیں گے۔ سید حامد کی شریفانہ طبیعت میں جو صبر وضبط اور تحمل ہے وہ قابلِ صد ستائش ہے۔ یہاں ایک چشم دید واقعے کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ان کے دورِ وائس چانسلری میں ایک بار یونیورسٹی کورٹ کا جلسہ ہوا جس میں راقم الحروف بھی بہ حیثیت صدر شعبۂ انگریزی موجود تھا۔ ایک نہایت ہی غیر اہم اور معمولی سی بات کا بہانہ بنا کر ایک ناہنجار شخص نے جو خیر سے ہندوستانی پارلیمنٹ کے رکن تھے (اور بعد میں منسٹر بھی بنا دیے گئے) سید حامد کے سامنے، جو صدرِ جلسہ تھے اور انھیں نشانہ بنا کر ایسی دریدہ دہنی اور بازاری پن کا مظاہرہ کیا کہ سب لوگ جو وہاں کسی نہ کسی حیثیت سے موجود تھے انگشت بدنداں رہ گئے، لیکن انھوں نے جواباً اپنے دفاع میں اور اس شخص کو مخاطب کر کے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ خود ضبطی کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال راقم الحروف کو کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملی۔ اسی روز شام کو وائس چانسلر کے گھر پر پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق چند اراکین شعبۂ انگریزی کے ساتھ ایک گروپ فوٹوگراف کھنچوانا تھا۔ راقم الحروف نے سید حامد صاحب سے بہ اصرار کہا کہ اس ناگوار واقعے کے بعد گروپ فوٹوگراف کھنچوانے کے لیے طبیعت کسی طرح آمادہ نہیں ہے۔ اسے کسی اور دن کے لیے ملتوی کر دیں، لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور پروگرام حسبِ معمول پورا کیا گیا۔ بعد میں جن لوگوں نے بھی مجھ سے اس واقعے کی تفصیلات جاننا چاہا اس نے ان سے یہی کہا کہ اس کی حمیت اس ناہنجار شخص کے الفاظ کو دہرانے کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ نقلِ کفر بھی کفر ہی کے برابر ہوگا۔

راقم الحروف بلا وسوسے اور بغیر خوفِ تردید یہ کہنا چاہے گا کہ سید حامد میں جو فہم وفراست، جو صبر وتحمل، جو انکسار اور فروتنی اور جو حلم اور تواضع ہے یا بہ الفاظِ دیگر کردار کی جو صلابت ہے وہ شاذ ہی کہیں اور دیکھنے کو ملے گی۔ علی گڑھ اور عام مسلمانوں کی فلاح بہبود سے جو سروکار اور دل بستگی انھیں تواتر اور تسلسل کے ساتھ رہی ہے اس کی نظیر

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم کے علاوہ جو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اور سفر حضر کے درمیان اسی غم میں گھلتے رہتے تھے اور ان امور کے لیے منصوبہ بندی کرتے رہتے تھے کہیں اور تلاش کرنا محض فعل عبث ہوگا۔ سید حامد تا حال تندہی اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اپنے تعلیمی اور اصلاحی مشن کی انجام دہی میں منہمک اور پابجولاں رہتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کی انتظامی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے سر سید علیہ الرحمہ کے مشن اور ان کے اتباع میں ان کے تعلیمی اور اصلاحی مشن کو جاری رکھنے کا عزم صمیم کے ساتھ بیڑا اُٹھایا اور حکیم عبد الحمید مرحوم نے اس نیک کام میں ان کی بڑی معاونت اور ہمت افزائی فرمائی اور وہ حکیم صاحب کے دست راست بن گئے۔ ان ہی کی پُر خلوص اور اَنتھک مساعی اور تعلقات کی بدولت جامعہ ہمدرد (دہلی) کو ایک طور سے یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا۔ وہ حکیم صاحب کے دور حیات سے لے کر اب تک اس ادارے سے وابستہ رہے ہیں۔ فی الوقت وہ جامعہ ہمدرد کے عالی وقار چانسلر بھی ہیں اور اس سے منسلک ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے مہتمم اور معتمد یعنی سکریٹری بھی، وہ اپنا پورا وقت قوم اور ملت کی بے لوث خدمت میں صَرف کرنے پر قانع اور مطمئن ہیں۔

چوں کہ سید حامد انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں ایم۔اے کے سند یافتہ اور اپنی مادری زبان اردو میں بھی طبعی ادبی ذوق رکھتے ہیں اس لیے وہ برابر ادبی قسم کی چیزیں لکھتے رہتے ہیں لیکن اپنے اس ذوق وشوق کو نبھانے کا انھیں کوئی سلیقہ نہیں ہے۔ وہ اپنی اس قسم کی تحریروں میں فارسی کے غیر ضروری الفاظ وتراکیب غیر مناسب جگہوں پر استعمال کرنے کے عادی رہے ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر بے حد بوجھل، پُر تصنع اور بغایت ناہموار نظر آتا ہے۔ اسے انگریزی محاورے کے مطابق اگر Laboured Style کہا جائے تو کچھ ناروا نہ ہوگا۔ ان کے ادبی مضامین کا ایک مجموعہ بہ عنوان "نگار خانہ رقصاں" (کتاب کا عنوان ہی ایک طرح کے بے جا تکلف کی چغلی کھا رہا ہے) جو غالباً ۱۹۸۴ء میں جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہوئے تھے۔ منظر عام پر آیا تھا، اس کے بارے میں راقم الحروف نے جس رائے کا اظہار اس وقت کیا تھا وہ اب بھی محفوظ ہے اور اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں اور امتدادِ وقت نے اسے اثر انداز نہیں کیا ہے:

''سید حامد کے ادبی ذوق کے اخلاص اور پاکیزگی اور شعروادب سے ان کی وابستگی یعنی (Involvement) اور شغف میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں اور یہ باوصف ہمہ وقت انتظامی ذمہ داریوں میں ملوث رہنے کے، لیکن یہ مضامین محض تحسین شناسی کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان میں تحقیق و تجزیے یا ادب وتنقید کے فہم وادراک سے سروکار نظر نہیں آتا۔ محض تعمیمات کی جلوہ گری ہے۔ فارسی اور اردو ادب کا ذوق ان کے مزاج میں بہت رچا ہوا ہے۔ سید صاحب الفاظ کا استعمال بے دریغ اور بے غل وغش کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں تعقید لفظی کی اسیر نظر آتی ہیں۔ مرادفات کا استعمال بے اندازہ اور فراوانی کے ساتھ الفاظ و تراکیب بے موقع، مرکبات لفظی کی افراط اور تزئین وآرائش کی شعوری کوشش۔ ان سب کی موجودگی سے گراں باری کا احساس پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ادبی مضامین کے اس مجموعے کا خیر مقدم ایک حسین اور دل کش گلدستے کے طور پر کیا جانا چاہیے۔ اس میں سب سے اچھے مضامین راقم الحروف کی رائے میں اقبال کے کلام میں تراکیب، اقبال کی تضمینیں اور حسن نظامی کی نثر کے اجزائے ترکیبی کہے جاسکتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے اسلوب میں جو سادگی، رچاؤ، طرفگی اور پرکاری ہے وہ ان کے اپنے تخیل کی شادابی اور زرخیزی کے علاوہ سعدی شیرازی اور میر امن دہلوی سے ان کے اکتساب فیض کا ہی نتیجہ ہے۔''

کچھ مدت گزرنے پر انھوں نے برطانوی شاعر رابرٹ براؤننگ اور اس کی محبوبہ اور بیوی الزبیتھ بیرٹ براؤننگ کے منتخب خطوط کا اردو ترجمہ بہ عنوان 'مہر و ماہ' شائع کیا۔ یہ بہت وقیع اور قابلِ قدر کام ہے۔ اس کے بارے میں راقم الحروف نے جو کچھ کہا تھا، اس کا یہاں دہرانا نامناسب نہ ہوگا:

"ترجمے کا فن بہت مشکل فن ہے۔ شاعری کا ترجمہ تو خیر ایک زبان سے دوسری زبان میں کرنا ممکن ہی نہیں، نثر کا ترجمہ البتہ کیا جاسکتا ہے، لیکن پھر بھی یہ بغایت احتیاط اور کاوش کا مطالبہ کرتا ہے اور سید حامد نے یہ کام بہ طریق احسن انجام دیا ہے۔ انھوں نے خطوط کا انتخاب اور ان کی تلخیص بڑے سلیقے کے ساتھ کی ہے۔ بیچ بیچ میں انھوں نے ان خطوط کے موضوعات، محرکات اور جذبات کے اتار چڑھاؤ پر بھی بڑے دل کش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ نثر کی زبان دو رُخی نہیں ہوتی اور اس کے لیے ترجمے میں متبادلات کا تلاش کرنا اتنا دشوار نہیں ہوتا، جتنا شاعری کے ترجمے ہیں، لیکن پھر بھی انگریزی اور اردو زبانوں کے مزاج اور ان کے تاریخی ارتقا کے مدارج میں جو فرق ہے اس پر تفصیلی اظہار رائے کا یہ موقع نہیں۔ سید صاحب کے مزاج میں جو توازن، احتیاط، سلامت روی اور سنجیدگی ہے اور جو انھیں افراط و تفریط کا شکار ہونے سے بچاتی ہے۔ وہ اس ترجمے میں قدم قدم پر نمایاں ہے انھوں نے اپنے اندازِ بیان کی حلاوت اور شگفتگی کو بھی برقرار رکھا ہے۔"

برسبیل تذکرہ یہ خاطر نشیں رہے کہ عمومی طور سے بھی اور تنقیدی اور فلسفیانہ نثر کی اوّلین خوبی، اس کا نشانِ امتیاز، جزالت اور قطعیت ہے۔ جس کا کوئی بدل ممکن نہیں۔ دانستہ اور شعوری طور پر عبارت آرائی کا التزام اور الفاظ و تراکیب کی بھرمار سے مفہوم کی ترسیل اور اس کے ابلاغ میں رخنہ پڑ جاتا ہے اور تحریر کے حسن و خوبی اور وزن و وقار میں ضعف آجاتا ہے جس سے اجتناب برتنا لازمی ہے۔ بے شمار ادبی اور صحافتی تحریروں کے ماسوا سید صاحب شعرگوئی کے بھی بڑے رسیا ہیں اور ان کے کئی شعری مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ مگر شعر انھوں نے صرف ایک ہی کہا ہے:

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اُٹھے

نہ جانے کس عالم جذب میں سید صاحب نے یہ شعر کہا تھا کہ یہ تا دیر یاد رکھا جائے گا۔

اوپر یہ کہا گیا تھا کہ سید صاحب اپنی ادبی تحریروں میں، بوجہ فارسی ادب سے اپنے لگاؤ کے فارسی الفاظ و تراکیب فراوانی اور غیر ضروری طور سے استعمال کرنے کے عادی رہے ہیں۔ اب ادھر چند برسوں سے یعنی جب سے انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح حال کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا آغاز کیا ہے وہ برابر اخبارات و رسائل میں مختلف تعلیمی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھتے رہے ہیں۔ جن کا خاص سقم ان میں ہندی الفاظ کی بے موقع بھرمار کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کے باریک اور نازک نقوش کا خیال رکھے بغیر اچھی عبارت لکھنا بہت دشوار ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ expressive تو ضرور ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ کسی نہ کسی ضرورت کو پورا کرتا ہے، لیکن یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس کے استعمال سے مفہوم کا ابلاغ کس حد تک ہوا ہے اور وہ مذاق سلیم پر بار تو نہیں گزرتا۔ ہندی کے غریب اور نامانوس الفاظ کے استعمال سے ایک طرح کے سوقیانہ پن کا پہلو نکلتا ہے اور اس سے عبارت کی بدہیئتی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اسے زبان کا حلیہ بگاڑنا کہیے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اردو جیسی نفیس مہذب اور شائستہ زبان کے دامن کو ایسے فضول اور ناگوار الفاظ جیسے مثلاً گمبھیر، گمبھیرتا، نراش، کھلواڑ، جانکاری، ایکتا، آپسی، کشٹ، سنگھرش، اٹوٹ، اکھنڈ، گٹھ جوڑ، اتھل پتھل، بڑھاوا، رچنا، سوچنا، نیتا، نیتا گیری، پراچین کال، گھمنڈی، کرودھی، اچھا، پرم پرا، گھٹنا، لاگو، چالو، اڑچن، سویکار، مدا، جگرمی، شبھ کامنائیں، رنگ منچ وغیرہ وغیرہ کے لیے وا کر دینا ایک طرح کی بدمذاقی بھی ہے اور ایک مجرمانہ فعل بھی۔ اسی طرح ہندی کے جو الفاظ اردو میں رچ بس گئے ہیں اور چھن کر خراد پر چڑھ کر سبک اور گوارا بن گئے ہیں انھیں زبان سے خارج کرنا بھی تعصب اور تنگ نظری کی دلیل ہے۔ سید صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے دور میں سرسید علیہ الرحمہ کے رسالے "تہذیب الاخلاق" کو دوبارہ جاری کرنے کا ایک بہت ہی مستحسن اقدام کیا، لیکن تہذیب الاخلاق کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کا دم چھلا بھی اس سے

وابستہ کردیا۔ اسی طرح کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنے تعلیمی اور اصلاحی مشن کے سلسلے میں انھوں نے ''کارواں'' کے نام سے جو مہم چلائی، اس میں کارواں کے ساتھ ''سد بھاونا'' کا رشتہ بھی پیوست کردیا۔ یہ دونوں دم چھلے سماعت پر بھی گراں گزرتے ہیں اور بدمذاقی پر بھی دلیل محکم ہیں اور ایسا کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ جواز بھی نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے ہرگز کسی فائدے یا کاربرآری کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ کیا سد بھاونا کی جگہ خیر سگالی کا لفظ نہیں رکھا جاسکتا تھا جو Good Will کی بہتر طور پر ترجمانی کرتا ہے؟ دراصل اردو اور ہندی مختلف چہرہ مہرہ رکھنے والی دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ ایک کا رُخ شہروں کی طرف ہے اور دوسری کا دیہاتوں کی طرف۔ ان کا اپنا اپنا وقیع ادبی سرمایہ ہے۔ انھیں آپس میں خلط ملط کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ہندوستانی دراصل کوئی زبان ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ ہر زبان کا اپنا ادب ہوتا ہے جس سے وہ پہچانی جاتی ہے اور ہندوستانی کا کوئی ادب نہیں ہے اور جیسا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اپنی نشر شدہ تقریر (فروری ۱۹۳۷ء) میں بصراحت فرمایا تھا۔ اردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ انگریزوں کا رواج دادہ ہے۔ اس کی کوئی حقیقت اور اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ خلط مبحث کی خاطر ہندوستانی کا جو شوشہ تقسیم ہند سے پہلے مہاتما گاندھی نے چھوڑا تھا وہ تقسیم کے بعد بے معنی اور بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک اردو کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اس نے متحدہ قومیت اور سیکولرزم کے دعاوی کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ متحدہ قومیت کا اگر کوئی سبیل ہوسکتا تھا تو وہ اردو ہی تھی جو اس ملک میں رہنے والوں کے باہمی ربط و تعلق کے نتیجے کے طور پر اُگی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ پھر اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوششوں کے بارے میں کیا لب کشائی کی جائے جو برابر چل رہی ہیں۔ اردو زبان کے بولنے والوں سے راقم الحروف بس یہی کہہ سکتا ہے کہ اس زبان میں غیر ضروری طور پر ہندی الفاظ کو داخل کرنے سے قطعی کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ انھیں اقبال کے اس مصرعے کو ذہن میں رکھ کر اردو بولنی چاہیے اور اس کی پرداخت اور بقا پر نظر رکھنی چاہیے:

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اس ضمن میں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بول چال کی زبان اور ادبی اور علمی زبان میں بڑا فرق ہے۔ بول چال کی زبان کو تو سریع الفہم ہونا ہی چاہیے تاکہ وہ تعامل اور ترسیل و ابلاغ کا وظیفہ ادا کرنے کا موثر وسیلہ بن سکے، لیکن تنقیدی اور علمی زبان میں تو اصطلاحات کے بغیر کام نہیں چل سکتا اور ان الفاظ اور اصطلاحات کے وضع کرنے میں جو خیالات اور تصورات کی ادائیگی کے لیے ضروری ہیں کلاسیکل زبانوں جیسے فارسی اور عربی کا لامحالہ سہارا لینا پڑے گا اور ضرورت پڑنے پر اس میں انگریزی زبان سے مشتق یا براہ راست الفاظ اور تراکیب کے استعمال کو بھی جائز اور روا سمجھنا چاہیے۔ اس میں نہ جانب داری اور تعصب کو دخل دینا چاہیے اور نہ کٹر پن اور رجعت پسندانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ زبان کی خوب صورتی، خوش آہنگی، ثروت اور توسیع کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا چاہیے، اسی طرح زبان کا دامن ہمہ گیر اور تہذیب و ثقافت کا حامل بن سکتا ہے۔

انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد سید حامد انتظامی سروسز کے امتحانات میں شریک اور کامیاب ہوئے۔ انھوں نے یوپی کی ریاست اور مرکزی سطحوں پر یکے بعد دیگرے بہت سی اہم ذمہ داریوں کو سنبھالا اور انھیں خوش اسلوبی اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیا اور ہر طرح سرخ رو رہے۔ جب ۱۹۸۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے جانے پر یہاں آئے تب بھی انھوں نے وہی شریفانہ اور مہذب رویہ اختیار کیا، جو اُن کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا تھا۔ انھوں نے انانیت اور پندار کا وہ مظاہرہ نہیں کیا جو سرکاری انتظامی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے وائس چانسلر بالعموم کرتے ہیں، جو ایک طرح سے اپنے آپ کو فطرت کی ایک نادر اور اچھوتی مخلوق بھی متصور کرتے ہیں اور خلاصۂ کائنات بھی اور جملہ علوم و فنون کا جامع اور منتہی بھی۔ سرکاری دفاتر کی فضا کو چھوڑ کر جب وہ یک بارگی یونیورسٹی کے علم و ادب کے ماحول میں قدم رنجا ہوتے ہیں تو پہلے تو کچھ دن تک اپنے آپ کو ماہی بے آب کی طرح محسوس کرتے ہیں پھر انھیں یہ ماحول کچھ پُرکشش معلوم ہونے لگتا ہے اور وہ اس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ اور مدت گزرنے پر غالباً اندرونی اور غیر شعوری احساس کم تری پر قابو پانے کے لیے انانیت اور

نخوت وتکبر یا بہ الفاظ دیگر اپنی افسری شان کا مظاہرہ کرنا بھی ضروری سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال وائس چانسلر بدرالدین طیب جی تھے۔ وہ آئی۔ای۔ایس کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد ایک Composite Course کرنے کے لیے چھ ماہ کی قلیل مدت کے لیے انگلستان میں بھی قیام کر چکے تھے جو تربیتی کورس کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے عہد حکومت میں انگریزی زبان پر اپنی قدرت جتانے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے افسرانہ حکم ناموں اور اپنے انگریزی مضامین میں اس کا مظاہرہ کرنا ضروری جانتے تھے، لیکن ان کے حاشیۂ خیال میں بھی شاید کبھی یہ بات نہیں گزری کہ ہر آئی۔ای۔ایس افسر شیخ محمد اکرام یا علامہ عبداللہ یوسف علی نہیں بن سکتا کہ:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان کے اندازِ تحریر کے بارے میں راقم الحروف اپنی رائے کے اظہار کے لیے صرف دو الفاظ استعمال کرنا چاہے گا یعنی Shoddy اور Uncouth۔ اس طرح کے وائس چانسلروں کے ضمن میں اس کا رویہ مولانا حالی کے الفاظ میں ہمیشہ یہ رہا:

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا

سید حامد اس طرح کے عیوب اور خامیوں سے یکسر پاک تھے۔ یونیورسٹی کی انتظامی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے ساتھ ہی وہ یہاں کی ادبی اور علمی سرگرمیوں میں بھی بہ طیب خاطر شریک ہوتے تھے اور اپنی صدارتی تقریر بہت توجہ اور محنت کے ساتھ تیار کر کے آتے تھے، اور وائس چانسلر حامد انصاری کی طرح کا رویہ اختیار نہیں کرتے تھے جو بڑی ہوشیاری کے ساتھ موضوع زیر بحث سے دامن بچا کر یا کترا کر گزر جانے کا فن بخوبی جانتے تھے۔ سید حامد نے ہر جگہ اور ہر موقع پر اپنے منصب کے وقار کو اور اپنی شائستگی اور خوش اطواری کو ملحوظ خاطر رکھا۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جسے ان کے منصب اور معیار اخلاق سے فروتر قرار دیا جائے اور نہ کبھی دیانت داری، عدل وانصاف اور کرم گستری کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا۔

سید حامد تین سال کی مدت تک انجمن ترقی اردو (ہند) کی صدارت اور نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے مگر ان کی مساعی جمیلہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ مستقبل میں اردو کی بقا اور ترویج و ترقی کے سلسلے میں سامنے نہیں آسکا۔ اردو زبان اب بھی اسی طرح نرغے میں ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے تو اردو کے سلسلے میں یہ الجھن تھی کہ ہندی کو بنیاد بنا کر اس پر ہندوستانی کا غلاف چڑھایا گیا اور اسے اردو کا متبادل قرار دیا گیا۔ اب نئی الجھن یہ ہے کہ اس سلسلے میں طوعاً و کرھاً جو بھی مراعات منظور کی جاتی ہیں انھیں عملاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بہ ظاہر تو ملک میں بے شمار اردو اکیڈمیاں بھی قائم کر دی گئی ہیں اور ان کے لیے خاطر خواہ فنڈ بھی مہیا کر دیے گئے ہیں لیکن اردو زبان کی درس و تدریس کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا۔ یہ فنڈ صرف کیے جاتے ہیں اردو مصنفین کو انعامات سے نوازنے اور آل انڈیا بلکہ بین الاقوامی قسم کے سمینار اور مشاعرے ترتیب دینے پر۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب تک اردو میں درس و تدریس کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا جائے گا تو مصنفین کس کے لیے لکھیں گے اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ کون کرے گا۔ اگر اردو کے حق میں کبھی کبھار کوئی تجویز منظور بھی کی جاتی ہے تو وہ صرف کاغذ کی زیب و زینت ہی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس پر عمل درآمد نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اردو اخبارات کی اشاعت کثیر کے لیے فنڈ مہیا کرنا، اردو کتابوں کی نمائش کے سلسلے میں سرکاری امداد دینا اور اردو کتابوں پر انعامات تقسیم کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا ان حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ نہ صرف اردو زبان کی تدریس اور ترویج کے ضمن میں ہم اپنی تجاویز حکومت کے سامنے برابر رکھتے رہیں بلکہ خود اپنے بچوں کو بھی نجی طور پر پوری توجہ اور کاوش کے ساتھ اردو کی تعلیم دینے کا مصمم ارادہ کریں اور اسے عملی جامہ پہنانے میں وقت کی کمی کا عذر کر کے کوئی کوتاہی نہ کریں۔ صرف حکومت کے رحم و کرم پر تکیہ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اردو کی بیخ کنی کے سلسلے میں دو خطرناک تجاویز وقتے وقتے سے پیش کی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اردو کا رسم الخط تبدیل کر کے اسے دیوناگری میں لکھنے کا رواج عام کیا جائے۔ اس تجویز کی تائید بعض ترقی پسند ادیبوں بہ شمول علی سردار جعفری اور عصمت چغتائی کی طرف سے کی گئی تھی۔ اب ان عقل مندوں سے کوئی

پوچھتا کہ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ ہر زبان کا تشخص تو اس کے رسم الخط اور ذخیرۂ الفاظ یعنی لغات ہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اگر اردو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی تو وہ اردو کہاں رہے گی۔ دوسری تجویز یہ کہ اردو کلاسیکی شعرا کا کلام دیوناگری رسم الخط میں منتقل کر کے شائع کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ دو ایک نسلیں گزرنے کے بعد یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا کہ یہ شاعر اردو کے تھے یا ہندی کے۔ اگر یہ کام آئندہ محققوں کے سپرد کیا گیا تو وہ شاید یہ نتیجہ نکالیں کہ یہ اردو شاعروں کا نہیں، ہندی شاعروں کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ سید حامد ایک مدت سے جیسا کہ کہا گیا مسلمانوں کو درپیش تعلیمی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھتے رہے ہیں لیکن انھوں نے کسی مثبت، غیر مبہم اور قطعی لائحۂ عمل کی طرف رہنمائی نہیں کی، صرف فریاد ہی کرتے رہے۔ ان کی پُرکشش شخصیت میں ایک عنصر سادہ لوحی کا بھی ہے جو یونیورسٹی کے معاملات پر جلد قابو نہ پانے اور ان سے پوری طرح نبرد آزما نہ ہونے پر ان کی آڑے آتی رہی۔ ان کی انتہائی سادہ لوحی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بابری مسجد کے انہدام کے سلسلے میں ان لوگوں سے گفت و شنید کرنے کے آرزومند تھے جو اس حادثے میں شریک غالب تھے اور جنھوں نے برملا اور دھڑلے کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا بھی ضروری جانا۔ (حوالہ: The Nation, January 2001) سید حامد کے نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق نہ کرنے پر بھی (اور کس کے نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق کرنا ممکن ہے) یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ان مسائل کو نہ صرف درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں بلکہ ان کے ممکنہ حل کے لیے اپنی تمام ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں سے برابر کام لیتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنا عقیدہ اور ایمان درست رکھنے کے ساتھ ہی جدید علوم و فنون خصوصاً طبیعاتی اور سائنسی علوم میں اختصاص اور برتری حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام کوششوں کو وقف کر دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے مستقبل کی اپنی آرزوؤں اور امیدوں کے مطابق جدید زندگی کے سیاق و سباق میں تعمیر و تشکیل کر سکیں اور باہمی اتحاد، تعاون اور یگانگت کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑیں۔

اپنی تمام ترسنجیدگی اور بردباری کے پہلو بہ پہلو سید حامد کے مزاج میں پوشیدہ حس ظرافت کی ایک رمق بھی کبھی کبھی اپنی نمود کرتی ہے جس کا اظہار وہ لطیف و دل پذیر انداز میں کرتے ہیں اور اردو والوں کی طرح کسی استاد کا شعر بھی ایسے موقعوں پر پڑھ دیتے ہیں۔ ان میں سادگی اور سادہ لوحی تو ہے لیکن اس سادہ لوحی میں وہ مکاری اور منافقت نہیں ہے جسے حکمت عملی اور مصلحت اندیشی کا نام دیا جاتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے انگلستان کی اخلاقی اسکیم میں جن سات مہلک اور جاں گسل گناہوں یعنی Seven Deadly Sins کا ذکر کیا گیا ہے ان میں حیرت انگیز طور پر منافقت شامل نہیں ہے، لیکن اسلام کے ضابطۂ اخلاق میں یہ گناہ کبیرہ کے برابر ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں 'المنافقون' کی جا بجا اور شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے۔ سید حامد کی شخصیت میں نمایاں خوبیاں ان کا صبر و تحمل، فروتنی اور انکسار، نیک طینتی اور عفو و درگزر کا جذبہ ہے۔ اسلام میں تقویٰ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ علی گڑھ کی سرزمین پر اب تک ان کی پذیرائی اور عام مسلمانوں میں ان کی قدرشناسی ان کے انہی محاسن کی وجہ سے ہے۔ بلاشبہ انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر تخیل کی آنکھ کے روبرو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی شبیہ پھر جاتی ہے۔ ان پر اقبال کا یہ شعر کس درجے صادق آتا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

○○○

کبیر احمد جائسی
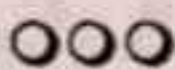
جذبی صاحب

جذبی صاحب کا شمار ان اساطین ادب میں ہوتا ہے جو اپنے عہد حیات ہی میں ایک پُرفسون افسانہ (legend) بن جاتے ہیں۔ لوگ ایسے ادیبوں کو چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہنستے بولتے دیکھنے کے باوجود ان کو اپنے سے ممتاز اور مختلف سمجھتے ہیں اور ان کی ہر ہر ادائے بے نیازی کو اپنی اپنی وسعت فکر و نظر کے مطابق مصور کرتے رہتے ہیں حالاں کہ ان کی صورت، شکل، چال، ڈھال غرا اور کوئی بھی چیز 'غیر معمولی' نہیں ہوتی۔ میں جب بھی جذبی صاحب کے بارے میں کچھ سوچنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے ان کا وہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے جو ان کی شناخت بن چکا ہے۔ ہماری نسل کے کم ہی افراد ایسے ہوں گے جنھوں نے جذبی صاحب کا درج ذیل شعر متعدد بار نہ پڑھا ہوگا اور اس کے تاثر سے مسرور و مست ہو کر از سر نو جینے اور زندگی کو جھیلنے کا جذبہ اپنے اندر نہ پایا ہوگا:

جب کشتی ثابت سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی

اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

اس شعر کی شرح کرنے بیٹھیے تو بات کچھ زیادہ بنتی نظر نہیں آتی اور شرح بالکل 'مکتبی' بن کر رہ جاتی ہے لیکن اگر محسوس کیجیے تو جو کچھ متشکل ہو کر ذہن و دماغ کے پردے پر نمودار ہوتا ہے وہ زندگی کی انتہائی اہم اور سچی مگر تلخ حقیقت ہونے کے باوجود الفاظ کی گرفت میں آنے سے کتراتا رہتا ہے۔ یہ تو ہے مگر اس شعر میں شاعر کا جو 'رویہ' ہے وہی اس کی شخصیت اور شاعری دونوں کے قفل ابجد کو وا کرنے کی کلید ہے۔

۱۹۶۰ء کے وسط میں جب میں علی گڑھ آیا تو یہاں کے معدودے چند افراد ہی سے واقف تھا۔ میرے بزرگ دوست اور مدتوں کے رفیق صدیق ڈاکٹر ابن فرید۔ نے جہاں اور بہت سے افراد سے ملایا ان میں ایک جذبی صاحب بھی تھے۔ عمروں میں کافی فرق کے باوجود دونوں نئے ملنے والے ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے۔ اس زمانے میں جذبی صاحب کی ''شب گشتی'' بہت مشہور تھی۔ مغرب کے فوراً بعد جذبی صاحب گھر سے نکلتے اور شمشاد مارکٹ میں احسن نشاط کی کتابوں کی دوکان پر پہنچ جاتے۔ ان کے آنے کے کچھ ہی دیر بعد ابن فرید صاحب، انور صدیقی، حسن مثنیٰ انور، امین اشرف، غلام سمنانی اور میں اسی دوکان پر پہنچ جاتے۔ کچھ دیر تک دوکان پر گپ شپ رہتی، پھر جذبی صاحب کی ''ٹہل'' شروع ہوتی۔ وہ میر کارواں کی طرح وقار الملک ہال کی طرف جانے والی سڑک پر چل نکلتے۔ راستے بھر مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی۔ انور صدیقی قدم قدم پر لطیفے سناتے چلتے جس پر دوسرے لوگ حاشیہ آرائی کرتے رہتے۔ جس طرح ارسطو اپنے شاگردوں کو ٹہل ٹہل کر درس دیا کرتا تھا اسی طرح اس ''شب گشتی'' میں جذبی صاحب جینے اور جینے کا حوصلہ پیدا کرنے کا درس دیا کرتے غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ ''شب گشتی'' میں ان کے ساتھ ہوتے، اس زمانے میں سب کے سب وقت کے مارے ہوئے اور اپنی زندگیوں سے اُکتائے ہوئے لوگ۔

ٹہلتے ٹہلتے یہ چھوٹا سا قافلہ وقار الملک ہال سے آگے نکل جاتا جب کسی کو دھیان آتا کہ خاصی مٹر گشتی ہو چکی ہے تو واپسی کا اعلان ہوتا۔ واپسی میں پورا قافلہ کیفے ڈی لیلیٰ آتا۔ جذبی صاحب کی طرف سے سب کو چائے پلائی جاتی اور کچھ دیر مزید گپ شپ کے بعد سب لوگ اپنے اپنے ''رین بسیرے'' کی طرف رُخ کرتے۔ جن لوگوں نے علی گڑھ نہیں دیکھا ان کی آگاہی کے لیے یہاں لکھ دینا ضروری ہے کہ ''علی گڑھ کے لوگ'' ہوٹلوں، کیفوں اور رہائشی مکانوں کے نام رکھنے کے بادشاہ ہیں۔ جگہ خواہ کتنی اُجڑی ہوئی کیوں نہ ہو اس کو ایسے حسین نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے کہ وہ جگہ بجائے خود ایک تاریخ بن جاتی ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں دو کیفے خاصے مشہور تھے ایک ''کیفے ڈی پھوس'' کے نام سے

مشہور تھا اور دوسرا ''کیفے ڈی لیلیٰ'' کے نام سے۔ کیفے ڈی پھوس کی وجہ تسمیہ تو سمجھ میں آتی ہے جس زمانے میں اس کا یہ نام پڑا تھا اس کی چھت پر پھوس کا بڑا چھپر تھا، اس مناسبت سے علی گڑھ کے ''کھلنڈروں'' نے پھوس کے چھپر کو فرانسیسی ''کیفے ڈی پھوس'' بنا دیا لیکن ''کیفے ڈی لیلیٰ'' کی وجہ تسمیہ آج تک سمجھ میں نہ آسکی۔ بہر حال ''شہزادگان شب'' نے برسوں پہلے اس کیفے کا جو نام رکھا تھا وہ آج بھی باقی ہے مگر اس کی ویرانی دو چند ہو چکی ہے۔

کیفے ڈی لیلیٰ کی نشست کا سلسلہ برسوں تک چلتا رہا۔ جب واجد خاں مرحوم (جاوید کمال) نے یونیورسٹی کی پکچر گیلری میں قائم کینٹین کا ٹھیکہ لے لیا تو روز کے معمول میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی کہ اب بجائے کیفے ڈی لیلیٰ کے واپسی میں یونیورسٹی کینٹین میں بیٹھا جاتا مگر اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ اتنی دیر سے کینٹین میں قدم رکھا جائے جب وہ تقریباً خالی ہو چکی ہو۔ ہم لوگوں کے پہنچتے ہی جاوید کمال اپنی نشست چھوڑ کر ہم لوگوں کے پاس آجاتے اور شریک گفتگو ہو جاتے، کچھ دیر بعد چائے آجاتی جس کو ٹھکانے کے بعد محفل برخاست ہوتی۔

نئی نسل کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ یہ واجد خاں (جاوید کمال) تھے کون۔ اس لیے چند سطروں میں ان کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ جاوید کمال مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے اور رام پور کے رہنے والے تھے۔ جسم تو ان کا پہلوانوں جیسا تھا مگر شاعر بہت اچھے تھے اتنے اچھے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم ان کے بعض اشعار ہم لوگوں کو سنایا کرتے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ رات بھر عابد شب زندہ دار کی طرح جاگتے رہتے اور جب دنیا جگی رہتی وہ سوتے رہتے، اسی عادت کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی لیکن وہ اپنے معمول پر قائم رہے۔ یکم رجون ۱۹۷۸ء کو جب خلیل صاحب کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کی یاد میں پُر درد اشعار کہے۔ یہ اشعار تعداد کے لحاظ سے صرف تین تھے مگر اپنی معنویت کے لحاظ سے بڑی سے بڑی رثائی نظم پر بھاری تھے جو ذیل کی سطروں میں نقل کیے جاتے ہیں:

ہم نے اک ساتھ ہی آداب جنوں سیکھے تھے
ہم نے اک ساتھ ہی زنجیر وفا پہنی تھی

کچھ اصولوں کے لیے وقف کیا تھا خود کو
کچھ عقیدوں کے لیے کوہ کنی سیکھی تھی
تم کہ اک سیل تھے طوفاں تھے ہنگامہ تھے
اتنی خاموشی سے مرجاؤ گے امید نہ تھی

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ہی ماہ میں وہ بھی اتنی خاموشی سے انتقال کر گئے جس کے وہ خلیل صاحب سے شاکی تھے۔ جاوید کمال نے اشعار تو کم ہی کہے ہیں مگر جو کچھ کہے ہیں وہ اچھے اشعار ہیں۔ جذبی صاحب اور جاوید کمال میں جو قدر مشترک تھی وہ شاعری اور صرف شاعری تھی مگر ان دونوں حضرات کو شاعری کے موضوع پر گفتگو کرتے نہیں سنا۔ کینٹین کی نشست میں دنیا جہاں کی باتیں ہوتیں سنجیدہ بھی اور تفریحی بھی، افراد تک معرضِ بحث میں آجاتے مگر صرف ایک شاعری ایسی تھی جس کو اس محفل میں اذن باریابی حاصل نہ تھا، اس موقع پر جاوید کمال کے چند اشعار نقل کیے جارہے ہیں تاکہ اسی بہانے وہ محفوظ ہوجائیں:

نیند آنکھوں میں ہے کم کم مجھے آواز نہ دو
جاگ جائے گا کوئی غم مجھے آواز نہ دو
یوں بھی رفتار دلِ زار ہے مدھم مدھم
اور ہوجائے گی مدھم مجھے آواز نہ دو

......

آئے تھے چند گام کسی بے وفا کے ساتھ
پھر عمر بھر کو بھول گئی زندگی ہمیں

......

دے جو فرصت غم دنیا تو بتائیں تجھ کو
زندگی ہم نے ترے باب میں سوچا کیا ہے
اپنے پیدا کیے سورج سے اجالے مانگو
بھیک مانگی ہوئی کرنوں کا بھروسہ کیا ہے

۶۲-۱۹۶۱ کے تعلیمی سال میں مجھے جذبی صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ اس سال وہ بی۔اے سال دوم میں نثر کا پرچہ پڑھاتے تھے اور ان کا کلاس لنچ کے وقفے کے بعد ڈھائی بجے سے ہوتا تھا، ابھی موجودہ آرٹس فیکلٹی کی عمارت نہیں بنی تھی اور سارے کلاس سرسید ہال میں ہوتے تھے۔ جذبی صاحب ٹھیک ڈھائی بجے شیروانی اور چوڑی مہری کا پاجامہ پہنے کلاس میں داخل ہوتے، آتے ہی فوراً حاضری لیتے اور پھر پڑھانے میں منہمک ہوجاتے۔ شیروانی اور پاجامے کا ذکر آگیا ہے تو یہاں ایک بات بتاتا چلوں کہ جذبی صاحب اپنی پوری مدت ملازمت میں یونیورسٹی کے اوقات کار میں صرف اسی لباس میں دیکھے گئے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد وہ گرمیوں میں پتلون اور بوشرٹ پہننے لگے تھے مگر یونیورسٹی کے اوقات کار میں انھوں نے نہ تو کبھی سوٹ پہنا اور نہ پتلون بوشرٹ۔ ان کے پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ پہلے بلند خوانی کرتے یا کسی طالب علم سے پڑھواتے، پھر مشکل الفاظ کے معنی بتلاتے، بعد ازاں نثر کا جو ٹکڑا پڑھا رہے ہوتے اس کی تشریح کرتے اور بیچ بیچ میں طالب علموں سے سوال بھی کرتے جاتے۔ ان کے پڑھانے کا انداز بہت ٹھہرا ہوا اور پُرسکون تھا، نہ تڑک بھڑک، نہ گرمی نہ غصہ، اگر کبھی کسی کی کوئی بات ناگوار ہوتی یا کسی کی سرزنش کرنا چاہتے تو "اجی حضت" کہہ کر مخاطب ہوتے اور بڑے ہی معنی خیز الفاظ میں اپنی خفگی یا کبیدگی کا اظہار کردیتے، یہ تو تھا مگر ان کا تحمل مثالی تھا جس کا انداز خود میرے ہی ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک دن دوران سبق فارسی کا یہ شعر سبق میں آگیا:

دیوانہ باش تا غم تو دیگران خورند

آنرا کہ عقل بیش غم روزگار بیش

جذبی صاحب نے پہلے تو شعر پڑھا پھر ہم لوگوں کو اس کے معنی بتلائے، میری جہالت میں بول اُٹھا "سر یہ بات یوں نہیں یوں ہے۔" آج کا زمانہ ہوتا تو کلاس میں طوفان آجاتا۔ جذبی صاحب ایک لمحے کے لیے رُکے پھر فرمایا "تو پھر حضت اس کے کیا معنی ہوئے۔" میں نے خاصی بے باکی سے اپنی بات کہہ دی، سارے کلاس پر سناٹا طاری تھا کہ میں نے کیا حماقت کی ہے مگر جذبی صاحب نے غور سے میری بات سنتے رہے،

دو جگہوں پر ٹوک کر مجھ سے الفاظ کی وضاحت کروائی اور جب پوری بات سن لی تو کلاس سے مخاطب ہوئے "انھوں نے جو وضاحت کی ہے درست ہے" عمر کی اس منزل پر پہنچ کر میں تو اب اپنی اس جسارت پر نادم رہتا ہوں مگر جذبی صاحب اس سے اب بھی خاصے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں، اگر میں کبھی ان کے ساتھ ہوتا ہوں اور وہ کسی ناواقف سے میرا تعارف کراتے ہیں تو اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں: "یہ میرے استاد ہیں" یہ سنتے ہی میں ندامت سے سر جھکا لیتا ہوں مگر اسی کے ساتھ ساتھ اب سے انتیس تیس سال پہلے کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے کہ اس زمانے کے اساتذہ کس طرح اپنے طلبا کی دل دہی کرتے اور کس طرح ان کی صحیح بات کو بلا تامل تسلیم کر کے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیتے۔

جس زمانے کا ذکر ہے اس زمانے کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب جمع تھے جن کی مجموعی روشنی سے شعبۂ اردو ہی نہیں پوری یونیورسٹی جگمگاتی رہتی۔ استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور صاحب شعبۂ صدر تھے اور ڈاکٹر محمد عزیز صاحب ریڈر۔ جذبی صاحب کے علاوہ دیگر اساتذہ میں خورشید الاسلام صاحب، خواجہ مسعود علی ذوقی صاحب، خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب اور نسیم قریشی صاحب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سارے کے سارے اساتذہ عالمانہ شان رکھنے کے باوجود مزاج اور افتادِ طبع میں ایک دوسرے سے الگ بلکہ متضاد تھے۔ اس تضاد کے باوجود سب حضرات میں ایک چیز مشترک تھی جس کو "درویشی" کہنا چاہیے، درویشی یہ نہیں کہ آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے، اس کی تنگ دستی کا عالم یہ ہو کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو، نہ گھر بار ہو نہ ہی دوسرے دنیاوی علایق۔ اصل درویشی تو قناعت اور عزت نفس سے عبارت ہے اور یہ اساتذہ اسی اصل درویشی کے نمونے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے ذریعے زندگی کی عظمت کو اجاگر کیا کرتے، ان کے لیے کوری صراحی کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی، توے سے اتری ہوئی گرم گرم روٹی، دعائے سحرگاہی میں ان کی سلامتی کے لیے رفیق زندگی کے آنسو، گرمی کی شدت کو کم کرنے کے لیے دستی پنکھے، شدید سردی سے بچنے کے لیے کچے کوئلے کی دہکتی ہوئی انگیٹھی، وہ اطمینان قلب اور نفس مطمئنہ فراہم کر دیتی کہ ان کو "ابنائے جہالت"

کی درگاہ پر جبیں سائی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ ان کو نہ تو بے جا دولت جمع کرنے کی ہوس تھی، نہ ہی ظاہر زیبائش و آرائش کا ہو کا تھا۔ یہ اساتذہ جب ایک دوسرے سے ملتے تو کسی نئی کتاب یا مضمون کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ کبھی کبھی شعرخوانی کی نشستیں منعقد کر کے مل بیٹھنے کا ذریعہ نکالتے۔ اس زمانے کی یونیورسٹی بھی آج کی "سیاست" سے عاری نہ تھی مگر اس زمانے کے سیاستی سیاسی نہیں "اختلافات" کے بھی کچھ اصول تھے جن کی سختی سے پابندی کی جاتی اور ان اختلافات کا ذاتی تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑنے دیا جاتا لیکن جب یہی اساتذہ کسی جاہل سرمایہ دار، حاکم زشت فطرت، متکبر رئیس کبیر اور کندۂ ناتراش ارباب ثروت کے مقابل ہوتے تو ان کی اصل درویشی اپنا جلوہ دکھائے بغیر نہ رہتی۔ یہ وہ اساتذہ تھے جو علم کے قدرداں تھے دولت کے نہیں اسی لیے یہ حضرات عالم کے لیے تو دیدہ و دل فرش راہ کر دیتے مگر جاہل اور متکبر سرمایہ دار کو اس کی "اوقات" بتلا دیا کرتے، جذبی صاحب بھی اسی اصلی درویشی کے نمائندے تھے۔ وہ کسی حاکم، جاہل اور متکبر سرمایہ دار اور بد دماغ رئیس کو نہ سیٹھتے تھے اور نہ ہی آج سیٹھتے ہیں۔ ہاں اپنے دوسرے رفقا کی طرح علم کا احترام کرتے اور اگر یہ علم ان کو کسی نو آموز طالب علم میں بھی نظر آتا تو اس کو بھی وہی درجہ دیتے جو معمر افراد کو دیتے تھے۔

جذبی صاحب کی شاعری کی غیر منقسم ہندوستان بھر میں دھوم رہی وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے ابتدائی دور ہی سے اس سے وابستہ ہو گئے اور ان کا شمار صف اوّل کے شعرا میں ہونے لگا۔ اس ادبی تحریک سے بہت سے "باغی شعرا" بھی وابستہ ہو گئے تھے جو شعر و ادب کی ہر روایت سے بغاوت کو ترقی پسندی سمجھتے، اس تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود جذبی صاحب کا انداز شروع ہی سے معتدل رہا غالباً یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۲ء تک یعنی ترقی پسند ادبی تحریک کے سُست رفتار ہونے کے زمانے تک کی ان کی جو غزلیں ہیں ان میں بہت سے اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو اس "ابدی صداقت" کے حامل ہیں جن کو زمانے کی تیز رفتار اور وقت کا بدلتا ہوا تقاضا بھی دھندلا نہیں پاتا۔ مثلاً:

اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمہاری نظروں کی
اک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

زندگی کو لاکھ بن جائے تبسم آفریں
زندگی لیکن تبسم کے فسانوں میں نہیں

سوز وہی تپش وہی زخم وہی خلش وہی
پوچھے دل سے آج کیوں نالہ دمبدم نہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

وہی دیوانگی شوق، وہی تیشہ غم
راہ چلیے تو وہی کوہ گراں ملتے ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ہجر کی رات تھی امکان سحر سے روشن
جانے اب اس میں وہ امکان سحر ہو کہ نہ ہو

مجھے جذبی صاحب کی شاعری پر کوئی محاکمہ نہیں کرنا ہے بلکہ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ''شورش وطوفاں'' کے اس دور میں جب بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اُکھڑ گئے جذبی صاحب اعتدال کی سرزمیں پر مضبوطی سے قدم جمائے کھڑے رہے۔

علی گڑھ آنے سے پہلے میں نے جذبی صاحب کو ریڈیو کے مشاعروں میں کئی بار سنا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جذبی صاحب ترنم سے غزلیں پڑھتے۔ اس زمانے کے شعرا کے ترنم پر جگر صاحب کے ترنم کی گہری چھاپ تھی۔ جذبی صاحب کا بھی ترنم جگر صاحب کے ترنم کی یاد دلاتا۔ ایک طرف تو ان کے سجے سجائے، موتیوں کی لڑی میں پروئے ہوئے اشعار اس پر ان کا دل نشین ترنم، ان کا کلام سن کر پورا مجمع مسحور ہو جاتا، غالباً ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ انھوں نے ترنم ترک کر کے تحت اللفظ غزلیں پڑھنی شروع کیں جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ وہ ہندوستان کے تقریباً سارے بڑے اور اہم مشاعروں میں شریک ہوتے، اس کے لیے دور دراز کا سفر بھی کرتے مگر ان کی یہ وضع احتیاط تھی کہ انھوں نے علی گڑھ میں

نہ تو کبھی یونین کے مشاعروں میں شرکت کی اور نہ ہی نمایش کے مشاعروں میں۔ وہ طلبا کو بے حد عزیز رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو کبھی اس بات کے لیے آمادہ نہ کر سکے کہ علی گڑھ کے طلبا کے سامنے غزل سرا ہوں۔ یہ شرف صرف ان طالب علموں کو حاصل ہو سکا جو چھوٹی موٹی نجی نشستوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔

جذبی صاحب سے جب بھی شاعری بالخصوص ترقی پسند ادبی تحریک کے دور عروج کی شاعری پر گفتگو ہوتی تو وہ اپنے معاصرین میں مجاز کا ذکر کرتے، ان کے لطیفے سناتے اور کبھی کبھی ان کے شعری تجربات کی بھی توجیہ و تاویل کرتے۔ میں نے گزشتہ انتیس تیس برسوں میں ان کی زبان سے جتنی بار مجاز کا ذکر سنا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے معاصر شاعر کے بارے میں نہیں سنا۔ ابھی سال سوا سال پہلے جذبی صاحب کی زبان سے دوران گفتگو یہ جملہ پھر سننے کو ملا "مجاز کی موت کے بعد سے میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں" مجاز کے انتقال کو تیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر جذبی صاحب کے نہاں خانۂ دل میں مجاز کی یاد کی شمع اب تک روشن ہے جس کی روشنی میں وہ اپنے عہد گزشتہ کا مشاہدہ کیا کرتے ہیں ان کی خاموشی طبعی ان کے احساس تنہائی کو چھپائے رہتی ہے مگر "پردہ در" الفاظ اور فقرے اس کو کبھی کبھی بے نقاب کر ہی دیتے ہیں۔ مجاز کے سانحۂ ارتحال پر جذبی صاحب جس کرب سے گزرے اس کی ایک جھلک ان کی اس نظم میں دیکھی جا سکتی ہے جو انھوں نے مجاز کی یاد میں لکھی تھی۔ مذکورہ نظم کا پہلا شعر یہ ہے:

آج اک جادہ پر پیچ کا راہی گم ہے
اک حریف الم لامتناہی گم ہے

جذبی صاحب ماضی پرست یا ماضی کی یادوں کے اسیر تو کبھی نہیں رہے مگر مجاز کی یاد ان کے ماضی کا ایک ایسا سرمایہ ہے جس کو وہ آج بھی دنیا کی نظروں سے چھپائے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

ایک طرف تو جذبی صاحب کا یہ انداز ہے دوسری طرف ان کی "شاعرانہ انا" بھی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یوں تو وہ انتہائی مرجاں مرنج اور خوش باش انسان ہیں مگر

کبھی کبھی ان کی شاعرانہ انا جوش پر آ ہی جاتی ہے اور جب اس کا اظہار شعری پیکر میں ہوتا ہے تو وہ ایک ایسی غزل کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے جس کو ناقدین ادب ''چیزے دگر'' کہا کرتے ہیں، جذبی صاحب کی اس طرح کی غزلوں میں وہ غزل سر فہرست ہے جس کا مطلع یہ ہے:

ہر جور ناروا کے مقابل رہے ہیں ہم
وجہ شکست شیوۂ قاتل رہے ہیں ہم

یہ غزل اس زمانے کی یادگار ہے جب شعبۂ اردو میں جذبی صاحب کا ریڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا تھا۔ غلط یا صحیح جذبی صاحب کا خیال یہ تھا کہ کچھ لوگ ان کے تقرر میں مزاحم ہو رہے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ جذبی صاحب ریڈر کے عہدے پر فائز ہوں۔ ریڈر مقرر ہو جانے کے بعد جذبی صاحب نے مڑ کر اس ''آگ کے دریا'' کو دیکھا جس کو تیر کر وہ اس مقام تک پہنچے تھے تو ان کی شاعرانہ انا بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے ''رجز'' کا اظہار اس غزل میں کیا جس کا مطلع اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس غزل کے بقیہ اشعار یہ ہیں:

ہر آئنہ رہا ہے حریف غرور سنگ
ہر تیر کے لیے صفت دل رہے ہیں ہم
ظلمت فگن رہا کوئی ہر آسمان پر
ہر آسمان پر مہ کامل رہے ہیں ہم
اے آسمان خاک نشینوں سے مت الجھ
اے آسمان تیرے مقابل رہے ہیں ہم
جب بڑھ گئے، تلاطم و طوفان بن گئے
یوں دیکھنے کو موجۂ ساحل رہے ہیں ہم
جب جل گئے تو بخش دیا اک جہاں کو نور
یوں تو چراغ کشتہ محفل رہے ہیں ہم
ہم گمرہان شوق کا عالم نہ پوچھیے
منزل سے دور بھی سر منزل رہے ہیں ہم

ہم کو سمجھ نہ پاؤ گے اے ناقدان فن
روز ازل سے عقدہ مشکل رہے ہیں ہم

رجز اور غزل کا جب امتزاج ہوتا ہے تو شاید ایسے ہی اشعار عالم وجود میں آتے ہیں۔ جذبی صاحب کا تعلق جس دور کے اساتذہ سے ہے اس دور کا کم وبیش ہر استاد اپنے شاگردوں کو ہی اپنا سرمایۂ حیات سمجھتا اور روپیہ، پیسہ، عزت وشہرت سے بڑھ کر ان کو عزیز رکھتا، یہ وہ اساتذہ تھے جو شاگردوں کو صرف نصابی کتاب نہ پڑھاتے بلکہ زندگی کے عملی میدان میں بھی ان کے رہبر ورہنما بنتے، شاگرد اگر کوئی اعزاز حاصل کرتا یا کسی اکرام و انعام سے نوازا جاتا تو شاگرد سے بڑھ کر استاد خوشی مناتا، اپنے دوست، احباب، ہم چشموں اور دوسرے شاگردوں سے اس اعزاز یا انعام کا اس طرح تذکرہ کرتا جس سے خود اس شاگرد کی توقیر اپنی نگاہوں میں بڑھ جاتی اور وہ تازہ دم ہو کر پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہو جاتا۔ طالب علموں کی زندگی کا سب سے نازک مرحلہ وہ ہوتا ہے جب وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تلاش معاش کے میدان میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ زندگی کے اس نازک مرحلے میں جذبی صاحب نے اپنے شاگردوں اور معتقدوں کے لیے جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہے اس کی مثالیں ذرا کم ہی ملتی ہیں۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں آج کی طرح ڈاکٹریٹ کی ڈگری کی گرم بازاری نہ تھی۔ تدریسی دنیا میں داخل ہونے کے لیے ایم۔اے، ایم۔ایس سی اور ایم۔کام کی ڈگری کافی تھی۔ ادھر جذبی صاحب کے جاننے والے کسی طالب علم نے ایم۔اے کا امتحان پاس کیا ادھر جذبی صاحب اس کو ملازمت دلانے کے لیے کوشاں ہوئے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ علی گڑھ کے اچھے طلبا علی گڑھ ہی میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیں اور اس روایت کو قائم رکھیں جو ان کے اساتذہ کو اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملی تھی، ان کو جیسے ہی معلوم ہوتا کہ فلاں شعبہ میں لکچرر کی جگہ خالی ہے ویسے ہی اپنے شناسا طالب علموں سے اس جگہ کے لیے درخواست دلواتے اور پھر بعد مغرب اس شعبہ کے صدر کے گھر پر اس وقت تک جاتے رہتے جب تک اپنے مشن میں کامیاب یا اس صدر شعبہ سے مایوس نہ ہو جاتے۔ ناکامی کے عالم میں کچھ دنوں مکدر رہتے مگر چند روز بعد ہی از سر نو اپنے ''مشن''

کی تکمیل کے راستے ڈھونڈنے میں مشغول ہو جاتے۔ یہ بات میں اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں میرے لیے بھی جذبی صاحب نے اسی طرح کی کوشش کی تھی اور جب ان کو کامیابی نہیں ہوئی تھی تو خلاف معمول بہت دنوں تک مکدر رہے تھے۔

ہماری نسل کے نہ جانے کتنے ریڈر اور پروفیسر ایسے ہیں جنھوں نے جذبی صاحب کے عملی تعاون سے اپنی تدریسی زندگی کی ابتدا کی ہے۔ جذبی صاحب اس طرح کا کام کرنے کے بعد بھول جایا کرتے اور اس کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہ لاتے۔ آج کی دنیا میں اب یہ وصف کم ہو چلا ہے اس لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ جذبی صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کر دیا جائے جس کو وہ شعوری طور پر چھپاتے رہے ہیں یوں تو یہ بات کچھ اچھی نہیں ہے کہ جس چیز کو جذبی صاحب چھپاتے رہے ہوں اس کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے لیکن چوں کہ یہ ایک ایسا وصف ہے جو ہر زمانے کے اساتذہ میں ہونا چاہیے اس لیے جذبی صاحب سے معذرت کے ساتھ اس کو قلم بند کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۰ء کے وسط سے ۱۹۷۴ء کے اواخر تک میرے بیش تر رات کے ابتدائی حصے جذبی صاحب کی صحبت میں گزرے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے کی ہماری ساری شامیں ''شام مصر'' تھیں اور شبیں ''شب شیراز''۔ ۱۹۷۴ء کے اواخر سے ۱۹۸۳ء کے اواخر تک میں علی گڑھ سے باہر رہا۔ جب دوبارہ علی گڑھ آیا تو محسوس ہوا کہ اب نہ تو ہماری شام، ''شام مصر'' ہے اور نہ شب ''شب شیراز''۔ جذبی صاحب اپنی ملازمت سے سبک دوش ہو کر اپنے بنوائے ہوئے مکان سرسید نگر میں منتقل ہو چکے ہیں اور پرانی محفلیں درہم برہم ہو چکی ہیں۔ اب نہ شاگردوں اور عقیدت مندوں کا وہ ہجوم ہے اور نہ ہی ''شب گشتی''۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹہلنا تقریباً موقوف ہو چکا ہے اور وہ بڑی حد تک خانہ نشین ہو کر اپنے ہی اٹھائے ہوئے اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں:

حسن و عشق دونوں تھے بیکراں و بے پایاں
دل وہاں بھی کچھ لمحے جانے کب گزار آیا

''جانے کب'' کی تلاش ہی اب ان کی زندگی ہے۔ ○○○

ڈاکٹر اسلم فرخی

ثناخوانِ حق

(مولوی ثنا الحق صدیقی)

انجمن کے بھی لوگ وہاں جمع تھے۔ ادیب سہیل، شہاب قدوائی، مختار اجمیری، نسیم احمد، معروف اتنے میں کسی نے کہا۔ آخری دیدار کر لیجیے۔ لوگ آہستہ آہستہ کمرے میں جانے لگے۔ نہ کفن خوں چکاں تھا نہ کروڑوں بناؤ تھے۔ مسہری پر چٹائی بچھی تھی جس پر ایک پوپلے منھ والا مردِ ضعیف و نحیف سفید چادروں میں لپٹا ابدی نیند سو رہا تھا۔ چہرے پر معصومیت اور تحیر کی ہلکی سی چھوٹ۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سونے والا آخر کار تھک کر سو گیا ہے۔ یہ سوچ کر آنکھیں موند لی ہیں کہ ناروا منظر سامنے نہ آئیں۔ یہ آنکھیں ساری زندگی کھلی رہی تھیں۔ انھیں سے نوشتے پڑھے گئے تھے اور مرتب بھی کیے گئے تھے مگر آج یہ آنکھیں بند تھیں۔ سب کے سب جس طرح خاموشی سے اندر آئے تھے اسی طرح باہر چلے گئے۔ ذرا سی دیر میں لوگوں نے گہوارے کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔ وہ جو زندگی میں کسی کا احسان اُٹھانے کو تیار نہیں ہوتا تھا دوشِ احباب پر سوار بہ مجبوری اللہ کے گھر پہنچ گیا۔ نماز ہو گئی تو ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک طرف مسجد کا نام لکھا نظر آیا۔ ''باب الجنت'' تو یہ مولوی ثنا الحق صدیقی کے لیے جنت میں جانے کا دروازہ تھا۔ معاً ذہن ارشادِ ربانی سے روشن ہو گیا۔ ''ان المتقین فی جنت و عیون. ادخلوھا بسلام آمنین. ''پرہیزگار اس دن؟ بہشت کے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے (اور باغوں میں آتے وقت ہمارے فرشتے ان سے کہیں گے کہ) سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان (تمام) ان (باغوں) میں تشریف لاؤ۔ احساس ہوا کہ وہ

سلامتی کے ساتھ بہشت کے باغوں میں چلے گئے۔ انھیں جانا بھی وہیں تھا۔ وہی ان کی منزل مقصود تھے۔

راقم الحروف نے گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ اس عہد میں کالج ہی کے احاطے میں ٹریننگ کالج اور گورنمنٹ اسکول کی عمارتیں بھی تھیں۔ اسکول کے بعض اساتذہ سے دعا سلام بھی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن ایک صاحب سے تعارف ہوا۔ دُبلے پتلے، نرم ونازک، ذرا نکلتا ہوا قد، چہرے پر علم و وقار، گھٹنوں سے اونچی شیروانی، علی گڑھ کٹ کا پیجامہ، سر پر مخمل کی کشتی دار ٹوپی، لکھنے پڑھنے والے آدمی نظر آئے اس لیے اسکول کے اساتذہ میں بڑے غنیمت معلوم ہوئے۔ ملاقات کرانے والے نے نام بتایا، ثناالحق صدیقی تو میں چونکا کہ اس نام سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ مولوی ثناالحق صدیقی ایم اے علیگ مسلم یونیورسٹی کے پرانے طالب علم، دارالعلوم دیوبند سے وطنی نسبت کے حامل۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن، اس کے رسالے 'العلم' کے مستقل مضمون اور مراسلہ نگار اور مولوی سید الطاف علی بریلوی کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ ان کے مضامین اور مراسلے دیکھتا رہتا تھا۔ مضامین اور مراسلوں سے ذہن نے جو نقشہ مرتب کیا تھا انھیں اسی کے مطابق پایا۔ شریف، مخلص، علم دوست، وضع دار، چھریرے جسم کے باوجود آواز میں کرارا پن، یہ غالباً اسکول میں تدریس کا اثر تھا۔ بڑی محبت سے ملے۔ اگلے دن اپنے کچھ کتابچے لا کر دیے۔ میں ان میں سے بیش تر کا مطالعہ کر چکا تھا اور صدیقی صاحب کے علم کا قائل بھی تھا۔ اب ان سب کو دوبارہ پڑھا تو صدیقی صاحب کی محنت، دیدہ وری اور علمی لگن کا کچھ اور زیادہ قائل ہو گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ اسکول کے اکثر اساتذہ علم کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ اس عاجز کو اسکول کی زندگی میں بعض ایسے اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا ہے جو ہر اعتبار سے علم میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن آہستہ آہستہ علمی لگن کم ہوتی گئی۔ علم سکھانے والوں نے مشرب علم سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو مالی منفعتوں کی جانب موڑ دیا۔ ورنہ اسی کراچی میں بشیر احمد صدیقی مرحوم، آصف حسین، مولوی محمد عمر خان، نصر اللہ خاں،

(اللہ انھیں سلامت رکھے) مرزا یعقوب بیگ، مولوی عبداللطیف کشتہ، مولوی مظہر جلیل شوق، صبا متھراوی، قدسیہ نسیم اور آمنہ ممتاز جیسی ہستیاں ہزاروں نہیں لاکھوں دلوں میں علم کی شمعیں فروزاں کرچکی ہیں۔ یہ صورت حال کچھ اسکولوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، کالجوں اور جامعات کا بھی یہی حال ہے۔ کالج کے اساتذہ کالج میں تعلیم دینے کے بجائے طلبا کو اپنے کوچنگ سینٹروں میں بلاتے ہیں اور امتحانات میں کامیابی کے ٹھیکے لیتے ہیں۔ یونیورسٹیاں سیاست، بدنظمی اور ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ معیارِ تعلیم روز بروز کم تر ہوتا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس صورت حال کا احساس عام ہے مگر خرابی کو دور کرنے کی کوئی منظم کوشش کسی سطح پر بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں کسی اسکول، کالج یا جامعہ میں علم کے کسی ستون کی موجودگی حیرت انگیز بھی ہوتی ہے اور خوش گوار بھی۔ مولوی ثناالحق صدیقی کراچی کے تعلیمی حلقے میں بڑے محترم سمجھے جاتے تھے۔ وہ خود عالم تھے اور دوسروں میں علمی لگن پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

صدیقی صاحب اپنی علمی جنت میں خوش، تدریسی فرائض سے مطمئن اور تحریری کاموں سے آسودہ خاطر تھے۔ علم، تحقیق، جستجو، حقیقت کی تلاش اور صداقت کا ابلاغ ان کا شیوہ تھا۔ علمی جستجو کے ذوق میں انھوں نے ساری زندگی تجربے میں گزاری۔ علم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رفیق حیات اور نگران کار تھا۔ دنیاوی منفعتوں سے بھی انھیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑے سینئر استاد تھے۔ ہیڈ ماسٹری کے لیے نمبر آیا۔ کچھ دن اس جھمیلے کو برداشت کیا اور پھر ہنسی خوشی اسی استادی پر لوٹ گئے۔ انتظامی ذمہ داریوں اور اداروں کی سربراہی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایسے بے لوث اور قانع انسان بھی کم ہوتے ہیں جو ہنسی خوشی اپنے جائز حق سے دست بردار ہوجائیں۔ صدیقی صاحب میں یہ عالی ظرفی اور قناعت تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ ساری زندگی اپنے علمی ذوق کی تسکین میں محور ہے۔

اسی زمانے میں ان کی کتاب ”میر وسودا کا دور“ شائع ہوئی۔ یہ ان کے ذوقِ تاریخ و ادب کا بھرپور اظہار تھا۔ میر وسودا کا دور ہماری سیاسی تاریخ کا بھی بڑا نازک اور اہم عہد ہے۔ ویسے یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تاریخ سارے عہد نازک اور اہم ہوتے ہیں۔ میر وسودا

کے عہد میں سیاسی انتشار، بدنظمی، اخلاقی انحطاط، دھونس دھاندلی اور چیرہ دستی تھی۔ یہی کیفیت ہمارے عہد میں بھی ہے۔ ہمارا عہد واقعات کی سنگینی اور استحصال کے اعتبار سے شاید زیادہ نازک اور اہم ہے۔ خیر، یہ تاریخ کا مسئلہ ہے اور تاریخ کے مسئلے ہر عہد میں تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ صدیقی صاحب کو چوں کہ تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ساری زندگی وہ تاریخ کے ان گوشوں کو ظاہر کرتے رہے جنھیں مورخوں نے بالعموم فراموش کر دیا ہے۔ چنانچہ میر و سودا کے عہد کو انھوں نے تاریخ کے تناظر اور میر و سودا اور ان کے معاصرین کے کلام کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے۔ اس جانچ پرکھ میں ہر جگہ وسیع مطالعے، مثبت اندازِ فکر، معروضی نقطۂ نظر اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا احساس ہوتا ہے۔

ہماری ادبی تاریخوں اور تنقیدوں میں سیاسی اور ثقافتی پس منظر کے بیان پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس حد تک کہ تنقیدی مطالعہ برائے نام رہ جاتا ہے، تاریخ پس منظر غالب آجاتا ہے۔ تاریخ پس منظر کا بیان بھی دلچسپ اور پرکشش ہو سکتا ہے بشرطیکہ تاریخ کو ایک زندہ حقیقت اور قوت کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ ہمارے یہاں محض سپاٹ بیان کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ شرر کا گزشتہ لکھنؤ بھی تاریخی بیان ہے۔ آزاد کا دربار اکبری بھی تاریخی بیان ہے اور ہاشمی فرید آبادی کی تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت بھی تاریخی بیان ہے۔ ان میں جو بنیادی فرق ہے وہ ہر ہوش مند قاری بڑی آسانی سے محسوس کر لیتا ہے۔ صدیقی صاحب نے 'میر و سودا کے دور' میں تاریخی پس منظر کو ادبی روایت پر کہیں بھی غالب نہیں آنے دیا کیوں کہ وہ میر و سودا کے حوالے سے ان کے عہد کی تعبیر و تشریح کر رہے تھے، عہد کے حوالے سے ان کا مطالعہ مقصود نہیں تھا۔ یہ بڑا متوازن اور فکر انگیز مطالعہ ہے مگر نہ جانے کیوں ہمارے نقادوں نے اسے نظر انداز کیا۔ صرف مرحوم عسکری صاحب ایک ایسے نقاد اور عالم تھے جو صدیقی صاحب کی اس کتاب کی معنویت اور افادیت کے قائل تھے اور اکثر اس کی تعریف کرتے تھے۔ سکہ بند تنقید نگاروں اور اشراف ادب نے اسکول ماسٹر کی ادبی کاوش کے جائزے کو اپنے مرتبے سے فروتر سمجھ کر اسے یکسر نظر انداز کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ میری فرمائش پر صدیقی صاحب نے عسکری صاحب کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھا تھا۔

یہ عاجز گورنمنٹ کالج سے رخصت ہو کر یونیورسٹی پہنچ گیا اور صدیقی صاحب سے ملاقاتوں کا ذریعہ صرف 'العلم' اور گاہے بہ گاہے شائع ہونے والے ان کے کتابچے رہ گئے۔

کراچی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد راقم الحروف مشیر علمی و ادبی کی حیثیت سے انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوا۔ انجمن پہنچا، کارکنوں سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ ثنا الحق صدیقی صاحب بھی موجود ہیں۔ خوشی ہوئی کہ انجمن ان کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہی ہے اور ان کا علمی فیض عام ہو رہا ہے۔ ایک بڑے کمرے میں ان کی نشست تھی۔ اسی کمرے میں ادیب سہیل اور شہاب قدوائی بھی بیٹھتے تھے۔ بعد میں شہزاد منظر بھی یہیں بیٹھنے لگے تھے۔ قومی زبان کے کاتب بھی ایک طرف اسی کمرے میں تھے۔ ادیب سہیل، شہاب قدوائی اور شہزاد منظر سب کے سب صدیقی صاحب کا اسی طرح احترام کرتے تھے جیسے ایک شاگرد اپنے بزرگ استاد کا احترام کرتا ہے۔ برابر والے چھوٹے سے کمرے میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کی نشست تھی۔ صدیقی صاحب کے احترام میں وہ بھی باقی سب لوگوں کے ساتھ شریک تھے۔

صدیقی صاحب خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ کچھ قومی زبان کے کاموں میں مدد دیتے۔ کبھی پروف پڑھ دیتے۔ کبھی کسی اشاعت پذیر کتاب کا کام دیکھ لیتے لیکن ان کا اصل کام "مشاہیر یونان و روما" کی نئی جلد کا ترجمہ اور ترتیب تھا۔ چوں کہ وہ بنیادی طور پر تاریخ کے عالم تھے۔ اس لیے یہ کام ان کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق تھا۔ وہ صبح سے دوپہر تک انجمن میں یہ کام کرتے پھر شام کو گھر پر بھی اکثر اسی کام میں منہمک رہتے تھے۔ اس سے پہلے وہ انجمن کی اردو انگریزی ڈکشنری کی ترتیب و تدوین کا کام بھی کر چکے تھے۔ یہ ڈکشنری متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

مجھے انجمن سے وابستہ ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ معلوم ہو کر بڑا دکھ ہوا کہ صدیقی صاحب انجمن کے جز وقتی ملازم ہیں اور انھیں صرف پان سو روپے ماہ وار مشاہرہ ملتا ہے۔ کام وہ کل وقتی ملازموں سے بھی زیادہ کرتے تھے مگر دوپہر کو چلے جاتے تھے۔ میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ان سے دریافت کیا کہ آپ دن بھر کیوں نہیں بیٹھتے۔ بولے،

صحت خراب ہے اتنی دیر بیٹھ نہیں سکتا۔ بیٹھوں گا تو بیمار ہو جاؤں گا۔ اس لیے دوپہر کو چلا جاتا ہوں۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ گھما پھرا کر تنخواہ کے موضوع پر لایا تو کہنے لگے جو مل جاتا ہے ٹھیک ہے۔ یہ تعلق تنخواہ کے لیے نہیں گزارے کے لیے ہے۔ یہاں کچھ کام ہو جاتا ہے۔ ادیبوں اور عالموں سے ملنا جلنا ہو جاتا ہے اور کیا چاہیے۔

صدیقی صاحب کی اس گفتگو سے میں دنگ رہ گیا۔ اتنی قناعت، ایسا ایثار، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا۔ عالم ہمہ افسانہ مادار دو ما ہیچ۔ مجھ کو ان کی باتوں سے خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی ہوا۔ اگلے دن میں نے انجمن کے ناظم اعزازی نورالحسن جعفری مرحوم سے اس بارے میں بات کی اور کہا یہ بڑے افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ صدیقی صاحب جیسے عالم کو چپراسی کی تنخواہ سے بھی کم مشاہرہ ملے۔ یہ تو اہلِ علم کی توہین ہے اور انجمن جیسے باوقار علمی ادارے کے شایانِ شان نہیں ہے۔ جعفری صاحب نے گھبرا کر کہا، مجھے تو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے اگر واقعی ایسا ہے تو بڑا افسوس ناک ہے۔ چنانچہ انھوں نے تنخواہ کا رجسٹر منگوا کر دیکھا۔ اس میں وہی پان سو کی رقم درج تھی۔ پھر میں نے اس صورت حال کے بارے میں ایک نوٹ لکھا اور یہ سفارش کی کہ صدیقی صاحب کا مشاہرہ کم از کم ایک ہزار روپے ماہ وار کر دیا جائے۔ جعفری صاحب نے یہ سفارش منظور کر لی اور صدیقی صاحب کا مشاہرہ ایک ہزار روپے ماہ وار ہو گیا۔ بعد میں اس میں کچھ اور اضافہ بھی ہوا۔ یہ کارروائی ہو گئی تو صدیقی صاحب کچھ شرماتے ہوئے میرے کمرے میں آ کے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔ پھر بولے میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ میں نے کہا، شکریہ کس بات کا۔ مجھے تو یہ حیرت ہے کہ آپ نے اتنے قلیل مشاہرے پر کام کرنا کیوں منظور کیا۔ کچھ سوچ کر بولے، کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ یہ کہہ کر پھر کچھ سوچنے لگے۔ یہ محسوس ہوا کہ جیسے اس موضوع پر گفتگو کرنا ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ بات کرنے میں تامل ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے چائے منگوائی۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور موضوع بدل گیا۔ اس موقعے پر یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ جعفری صاحب کو بھی پان سو روپے مشاہرے کی بات سن کر واقعی حیرت اور تکلیف ہوئی تھی اور انھوں نے نہایت خوش دلی کے ساتھ فوری طور پر اس کا ازالہ کر دیا۔

صدیقی صاحب خاموش کارکن تھے۔ شہرت اور نمود و نمائش سے دور بھاگتے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی کام کا چرچا نہیں کیا۔ بس لکھتے رہتے تھے۔ بس لکھتے رہتے تھے۔ تاریخ اسلام پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ یہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا لیکن ان کی تحقیق عام مورخوں سے مختلف تھی۔ وہ سکہ بند روایتوں کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کی تنقیح کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی تحقیق کے دو گوشے میرے سامنے آئے جن کے بارے میں انھوں نے خود بھی لکھا اور دوسروں سے بھی لکھوایا۔ میرا یہ موقف اور منصب نہیں کہ میں اس تحقیق کی تائید یا تردید کروں۔ یہ کام علمائے تاریخ کا ہے۔ وہی اس کے بارے میں رائے دے سکتے ہیں، میری حیثیت محض راوی کی ہے۔ پہلی تحقیق جس کے بارے میں ایک دن صدیقی صاحب نے تفصیل سے گفتگو کی یہ تھی کہ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد رفادہ اور سقایا کی ذمہ داری زبیر ابن عبدالمطلب کو منتقل ہوئی اور وہی بنو ہاشم کے سربراہ قرار پائے۔ حضرت زبیر ہی نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت بھی فرمائی۔ یتیم بھتیجے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شفیق چچا زبیر بن عبدالمطلب کے سایۂ عاطفت میں تربیت حاصل کی اور انھیں کی کفالت میں سن بلوغ کو پہنچے۔ حرب فجار میں بنو ہاشم کے سربراہ حضرت زبیر ہی تھے: اس حرب میں نوجوان محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے۔ صدیقی صاحب کا کہنا تھا کہ عام روایتوں میں اس طویل کفالت کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ اسے دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ میں حضرت زبیر کے بارے میں یہ تو لکھا ہے کہ عبدالمطلب کی وفات کے بعد وہی بنو ہاشم کے سربراہ مقرر ہوئے تھے لیکن بھتیجے کی کفالت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ صدیقی صاحب کی یہ تحقیق ان کے ایک دوست نے اپنی ایک کتاب میں قلم بند بھی کر دی تھی۔

دوسری تحقیق بھی ایک مقبول روایت کے حوالے سے تھی۔ عام روایت یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی شب ام ہانی کے مکان پر استراحت فرما تھے۔ وہیں سے معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ صدیقی صاحب بخاری کے حوالے سے یہ کہتے تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ام ہانی کے یہاں استراحت فرمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے شوہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن اور ایذا پہنچانے

والوں میں تھے۔ وہ فتح مکہ کے بعد مکے سے فرار ہو کر کہیں اور چلے گئے تھے اور ام ہانی کے اس کہنے کے باوجود کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں تمھیں ضرور معاف کر دیں گے، وہ خدمتِ والا میں حاضر نہیں ہوئے اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات اور روایتیں تھیں جو ساری زندگی صدیقی صاحب کی تحقیق کا موضوع رہیں۔ میں نے بارہا ان سے کہا کہ آپ تاریخِ اسلام کے حوالے سے ایک مفصل کتاب لکھ دیجیے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے، میری صحت خراب ہے۔ اکثر بیمار رہتا ہوں۔ اتنا بڑا کام کیسے کر سکتا ہوں۔ ایک دن میں نے کہا تو پھر یہ کیجیے کہ اس طرح کی تمام روایتیں جو آپ کی رائے میں غلط طور پر رواج پا گئی ہیں یک جا کر کے ان کے بارے میں ایک تحقیقی کتاب مرتب کر دیجیے۔ یہ بات انھیں کسی حد تک قابلِ قبول معلوم ہوئی۔ بہت سوچ کر وعدہ بھی کیا تھا مگر غالباً صحت نے اجازت نہیں دی۔ چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتے رہے، اس سلسلے میں کوئی بڑا کام نہ کر سکے جس کے وہ اہل تھے۔

صدیقی صاحب کا ایک کتابچہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے حوالے سے بھی ہے۔ اس کے مطالعے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وحدت الوجود کے قائل نہیں تھے اور اسی مناسبت سے تصوف کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ کتابچہ دراصل ان کے پرنانا کا ایک رسالہ ہے جسے انھوں نے مصنف کے حالات اور مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ مقدمے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی اندازِ فکر اور وجودی نقطۂ نظر کے حق میں نہیں تھے، لیکن ذاتی اور شخصی سطح پر وہ اولیاء اللہ کے منکر بھی نہیں تھے۔ راقم الحروف کو ہر سال حضرت سلطان جیؒ کے آستانے پر قدم بوسی کی سعادت حاصل ہوتی تھی۔ صدیقی صاحب کے مسلک میں اس کی کوئی گنجایش نہیں تھی مگر وہ میرے جانے سے پہلے اور واپسی کے بعد انتہائی خوش دلی سے میرے کمرے میں آتے۔ دو گھڑی بیٹھتے۔ صوفیاے کرام کی اصلاحی اور معاشرتی خدمات پر گفتگو ہوتی اور آخر میں وہ اس رائے کا اظہار کرتے کہ صوفیاے کرام کی وجہ سے برصغیر کے معاشرے کو غیر معمولی فائدہ پہنچا ہے۔ یہ ان کی رواداری اور اعلیٰ ظرفی کا اظہار تھا۔ انھوں نے کبھی اس مسئلے پر اختلافی انداز سے گفتگو نہیں کی۔ مناظروں اور بحث و

تکرار سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ کسی سے الجھنا ان کی خو تھی۔ اپنے کام سے کام، اپنی دنیا میں مگن، نہ کسی سے ناراض ہوتے تھے نہ کسی کی مذمت کرتے تھے۔ میں نے صرف ایک دفعہ ان کی زبان سے ایک شکایت سنی وہ بھی بر سبیل تذکرہ۔ اس کی روداد کچھ یوں ہے کہ صدیقی صاحب جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے تو ان کا ایک مضمون جغرافیہ بھی تھا جس سے انھیں دلچسپی تھی۔ اسی دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے ہجرت حضور اکرم ﷺ کے مقامات و منازل کا ایک نقشہ تیار کیا تھا جس میں صحت اور جغرافیائی اصولوں کو پوری طرح مدنظر رکھا گیا تھا۔ انھوں نے یہ نقشہ اپنے احباب اور جاننے والوں میں تقسیم بھی کیا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ سیرت کی ایک کتاب تبصرے کے لیے انجمن میں موصول ہوئی۔ میں نے یہ کتاب صدیقی صاحب کے حوالے کر دی۔ انھوں نے تبصرہ لکھا۔ شائع بھی ہو گیا۔ ایک دن اس کتاب کے بارے میں صدیقی صاحب سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے رنجیدہ لہجے میں کہا: ''صاحب! اس کے مؤلف نے میرا بنایا ہوا نقشہ کسی حوالے کے بغیر کتاب میں شامل کر لیا ہے۔'' میں نے کہا، تو پھر آپ یہ بات تبصرے میں لکھ دیتے۔ بولے نہیں صاحب! سیرت کی کتاب ہے۔ اس کے تبصرے میں ایسی بات نہیں لکھنا چاہیے مگر ہاں مجھے رنج ہوا۔ یہ تقاضائے بشری ہے مگر خیر وہ ملال بھی جاتا رہا بلکہ یہ خوشی ہوئی کہ میری محنت کسی کے کام آ گئی۔ ناخوشی اور خوشی کا بہ یک وقت یہ اظہار بڑا تعجب خیز تھا۔

صدیقی صاحب کو انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے میں بھی بڑی مہارت تھی۔ بڑا رواں دواں اور پاکیزہ ترجمہ کرتے تھے۔ مشاہیر یونان و روما کے عنوان سے پلوٹارک کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ انجمن ایک مدت سے شائع کر رہی ہے۔ ہاشمی فرید آبادی مرحوم نے بعض جلدوں کا ترجمہ کیا ہے۔ صدیقی صاحب نے بھی بعض منتخب سوانح پر مشتمل ایک جلد کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی پاکیزہ، رواں دواں اور موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہے: انھیں اس موضوع سے دلچسپی بھی تھی۔ اگرچہ انھیں کچہریوں، عدالتوں اور دفتروں سے کبھی واسطہ نہیں رہا مگر وہ انتہائی بدخط تحریر بھی آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ پرانے بزرگوں کی ایک شان اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اچھے سے اچھے خط شکستہ پڑھنے

میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہ شان اور خصوصیت صدیقی صاحب میں بھی تھی۔ راقم الحروف کے پاس میر محبوب علی خاں والی دکن کے انگریزی ٹیوٹر کا ایک خط ہے جو ڈپٹی نذیر احمد کے نام ہے۔ یہ خط انگریزی کی خوش خطی کا ایسا اعلیٰ نمونہ ہے کہ میں بار بار کی کوشش کے باوجود اسے پوری طرح نہیں پڑھ سکا۔ ایک دن صدیقی صاحب سے اس کا تذکرہ آیا۔ بولے، ذرا مجھے دکھائیے۔ میں نے دوسرے دن خط لے جا کر انھیں دے دیا۔ اگلے دن صدیقی صاحب بڑے خوش خوش میرے کمرے میں آئے۔ وہ خط واپس کیا ساتھ میں خوش خط لکھا ہوا متن اور اردو ترجمہ۔ میں نے پوچھا، کیسے پڑھ لیا آپ نے۔ کوئی دقت نہیں ہوئی؟ صدیقی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے پھر بڑے انکسار کے ساتھ کہنے لگے، نہیں دقت تو نہیں ہوئی۔ میں نے آسانی سے پڑھ لیا۔ ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں اس کام سے خوشی ہوئی ہے وہ دوسروں کا کام کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کے اکثر ملنے جلنے والے ان سے مضامین لکھواتے رہتے تھے اور وہ خوشی خوشی یہ کام کر دیتے تھے۔

صدیقی صاحب کو تاریخ کے ساتھ ساتھ سائنس سے بھی لگاؤ تھا چنانچہ انھوں نے مارٹن ڈیوڈسن کی کتاب Astronomy for Beginners کو اردو میں 'ماہ و انجم' کے نام سے منتقل کیا۔ انجمن ترقی اردو نے یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع کی تھی۔ ان دنوں کم یاب ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ انھیں سائنسی موضوعات میں فلکیات سے خاص دلچسپی تھی کیوں کہ ۱۹۹۳ء میں انھوں نے اسی موضوع پر ایک کتاب "زمین پر رہ کر آسمانوں کی سیر" کے عنوان سے مرتب کی تھی۔ دونوں کتابیں دل کش اور سبک انداز کی حامل ہیں۔ ان میں معلمانہ توضیح، سادگی اور تفہیمی نقطۂ نظر ہے۔ بہر حال تاریخ عام ہو، تاریخ اسلام ہو، ادب ہو، سائنس ہو، ان کی دلچسپی سب سے تھی اور یکساں تھی۔ میرا خیال ہے کہ ان کے بہت سے مضامین، کتابیں اور کتابچے دوسروں کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ عجب بے نیاز آدمی تھے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ بس کام ہونا چاہیے۔ اگر اگلا اس سے خوش ہوتا ہے کہ مضمون یا کتاب اس کے نام سے شائع ہو گئی ہے تو صدیقی صاحب بھی خوش ہیں۔ دوستوں کی دل داری اور نشاط خاطر کا

بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے دوستوں کا بھی ایک خاص حلقہ تھا، انھیں کی طرح علم دوست اور ادب نواز۔ مرحوم ڈاکٹر ایوب قادری ان کے بڑے عزیز دوست تھے۔ انھیں کام کرنے پر بھی اُکساتے رہتے تھے۔ 'وحدت الوجود' والا رسالہ صدیقی صاحب نے انھیں کی فرمائش پر مرتب کیا تھا اور 'میر و سودا کے دور' کے ناشر بھی وہی تھے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ میں نے صدیقی صاحب سے کہا، 'میر و سودا کے دور' پر نظر ثانی کر دیجیے تا کہ یہ دوبارہ شائع ہو جائے۔ اکثر طلبا کو اس کتاب کے مطالعے کا مشورہ دیا جاتا ہے مگر کہیں ملتی نہیں۔ صدیقی صاحب پہلے تو مسکرائے پھر حسب معمول کچھ سوچ کر بولے، شائع کون کرے گا۔ ایوب قادری صاحب مرحوم و مغفور ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کی ہمت اور حوصلے سے شائع ہو گئی تھی، اب یہ کام کون کرے گا۔ مجھ میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں تھا جو کہتا کہ آپ فکر نہ کریں، کوئی نہ کوئی ناشر تلاش کر لیں گے۔ چنانچہ نہ نظر ثانی ہوئی نہ دوسری اشاعت کی نوبت آئی۔ کاش کوئی علمی ادارہ اس کتاب اور صدیقی صاحب کے متفرق مضامین کو یک جا کر کے شائع کر دے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے سانحۂ ارتحال کے بعد صدیقی صاحب نے ایک یادگاری مجموعہ بھی شائع کیا تھا۔ مجھ سے بھی فرمائش کی تھی کہ ایک مضمون لکھ دیجیے چنانچہ میں نے بھی ایک مختصر مضمون لکھا تھا جو اس مجموعے میں شامل ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بھی انھیں بڑا شغف تھا۔ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ سید الطاف علی بریلوی مرحوم کانفرنس کے روحِ رواں تھے۔ صدیقی صاحب بھی ان کے بڑے مداح تھے۔ اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے مگر میں نے یہ دیکھا کہ صدیقی صاحب خود سے کوئی بات نہیں چھیڑتے تھے۔ کم سخن تھے، چپکے بیٹھے کام کرتے رہتے تھے مگر ادھر کسی نے ان سے کوئی بات پوچھی اور اُدھر اُنھوں نے تفصیلی جواب شروع کر دیا۔ ہر ہر پہلو سے مسئلے کو اجاگر کرتے، ہر گوشے کو واضح کرتے۔ ضمنی طور پر جو مسائل آ جاتے انھیں تسلی سے بیان کرتے۔ پوری شرح و بسط سے کام لیتے اور جب سوال کرنے والا پوری طرح مطمئن ہو جاتا تو یک لخت خاموش ہو جاتے اور اپنا کام کرنے لگتے۔ ان کے کمرے میں مختلف لوگ آتے جاتے

رہتے تھے۔ مختلف موضوعات چھڑتے، بحثیں بھی ہوتیں مگر وہ چپکے بیٹھے رہتے۔ جب ان سے کچھ دریافت کیا جاتا تو گفتگو میں حصہ لیتے ورنہ محض سننے پر اکتفا کرتے۔ میری رائے میں یہ ان کے بڑے پن کا ثبوت تھا۔ خواہ مخواہ کسی گفتگو میں دخل نہیں دیتے تھے نہ اظہارِ علم سے کسی کو مرعوب کرتے تھے۔

آخر عمر میں صدیقی صاحب کچھ اور زیادہ بیمار رہنے لگے تھے۔ ایک دن کچھ دل برداشتہ ہو کر مجھ سے کہنے لگے، اب میرے لیے انجمن آنا جانا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے لہٰذا مجھے چھٹی دے دیجیے۔ مجھے ان کی یہ بات سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ ایسے عالم علم دوست اور خاموش کام کرنے والے کہاں ملتے ہیں۔ یہ خیال آیا کہ کوئی صورت ایسی نکلنا چاہیے کہ انجمن سے صدیقی صاحب کی وابستگی برقرار رہے۔ چنانچہ میں نے مشفق خواجہ صاحب سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ صدیقی صاحب کو روز روز کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور وہ انجمن کا کام گھر ہی پر کرتے رہیں۔ جعفری صاحب نے بھی اس تجویز کو خوش دلی سے منظور کر لیا اور صدیقی صاحب حسبِ معمول انجمن کا کام کرتے رہے۔ مشفق خواجہ صاحب کے مشورے سے صدیقی صاحب کے ذوقِ تواریخ کے پیشِ نظر ایک کتاب Chronology of Modern India ان کے سپرد کی گئی تاکہ وہ اردو میں اس کا ترجمہ کر دیں اور اس پر مفید حواشی بھی لکھ دیں۔ ترجمہ تو کوئی بھی کر سکتا تھا کہ یہ ایک آسان کام تھا۔ اصل کام حواشی لکھنا تھا کیوں کہ حواشی میں متن کے فرنگیانہ نقطۂ نظر اور تاریخی مغالطوں کی نشان دہی ممکن تھی اور یہ کام تاریخ کا کوئی عالم ہی انجام دے سکتا تھا۔ صدیقی صاحب نے اس کام کو پسند کیا اور پوری توجہ کے ساتھ اس میں مشغول ہو گئے۔ ترجمے اور حواشی کے اجزا مجھے بھیجتے رہتے تھے ان اجزا کے مطالعے سے مجھے اندازہ ہوتا رہتا تھا کہ وہ پوری تندہی اور انہماک سے کام کر رہے ہیں۔ خرابیِ صحت کی وجہ سے مجھے بھی انجمن سے رخصت ہونا پڑا مگر شہاب قدوائی صاحب نے مجھے بتایا کہ صدیقی صاحب نے یہ کام مکمل کر لیا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اس کام کے اختتام کے بعد انھیں برصغیر کے مسلم عہد کی توقیت کے کام پر مامور کیا جائے۔ وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے مگر انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔

صدیقی صاحب کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دفعہ انھوں نے میری ایک نظم ''کراچی'' سنی۔ بہت پسند کی، مجھ سے کہا، ایک نقل مجھے دے دیجیے۔ انھوں نے نظم کے حوالے سے داد و تحسین کا جو انداز اختیار کیا تھا وہ سخن فہمی کے ساتھ ساتھ سخن گوئی کا غماز بھی تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ شعر کہتے تھے مگر کسی کو سناتے نہیں تھے۔ صرف ان کے حلقے کے مخصوص احباب ہی ان کے شعری سامع تھے۔ اپنے علم کی طرح وہ اپنی شاعری کا اظہار بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔

صدیقی صاحب صلح کل اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ ہر شخص کی مدد کو تیار رہتے تھے۔ انھیں اپنے اعزا، بہن، بھائی اور دوسرے عزیزوں سے بڑی الفت تھی۔ انجمن میں سب کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے مگر شہاب قدوائی اور ادیب سہیل سے بڑی اُنسیت تھی۔ شہاب قدوائی بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے بلکہ انجمن کی حد تک ان کے سکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ گھر جا رہے ہیں۔ اگر وہ بیمار ہیں تو بیمار پُرسی کر رہے ہیں۔ تقریباً سال ڈیڑھ سال پہلے محمد احمد سبزواری صاحب کی سربراہی میں بینکاری کی اصلاحات کے ترجمے کے ایک منصوبے پر کام شروع ہوا تھا۔ قدوائی صاحب نے صدیقی صاحب کو بہ اصرار تمام اس منصوبے میں شریک کیا اور صدیقی صاحب نے حسبِ معمول اصطلاحوں کے ترجمے کا کام بھی ذمہ داری اور حسن و خوبی سے انجام دیا۔ میں اکثر صدیقی صاحب کی خیریت قدوائی صاحب ہی سے دریافت کرتا تھا۔

صدیقی صاحب نے اپنی زندگی، تحصیل علم، توسیع علم، فروغ علم اور ترسیلِ علم کی نذر کر دی تھی۔ اسکول کی تدریس ہو، حلقۂ احباب ہو، لکھنے پڑھنے کا سلسلہ ہو سب کا مقصد ایک ہی تھا، علم حاصل کرو اور پھیلاؤ۔ ساری زندگی اسی مقصد کے لیے کوشاں رہے۔ نفس پر قابو رکھنے، نمود و نمائش سے دور بھاگنے، سادہ زندگی گزارنے، خلوص و محبت کا مظاہرہ کرنے اور دنیاوی بکھیڑوں سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن حقیقت کی جستجو میں مگن رہنے والے ایسے نفیس، پابندِ وضع اور مخلص انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ صدیقی صاحب اپنی ذات میں ایک ادارہ، ایک تحریک، ایک قوت تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے۔ آمین! ○○○

ڈاکٹر اسلم فرخی

مالک رام

میرے زمانۂ طالب علمی میں غالب کے حوالے سے تین کتابیں ''یادگارِ غالب''، ''غالب نامہ'' اور ''غالب'' از غلام رسول مہر مشہور تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان میں مالک رام صاحب کی کتاب ''ذکرِ غالب'' کا اضافہ ہوا اور ان کا نام غالب کا حوالہ بن گیا۔ 'ذکرِ غالب' کی اشاعت ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی مگر میں نے اسے ۴۵ء میں پہلی بار پڑھا۔ مؤلف کا اندازِ تحریر اتنا دل نشیں اور موثر تھا کہ پڑھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی اور یہ احساس ہوا کہ اگر تحقیق و سوانح کو اسی طرح لکھا جائے تو مردہ شوئی کا جو الزام ہمارے اہلِ تخلیق پر عائد ہوتی ہے اس کی گنجائش نہیں رہے گی۔ 'ذکرِ غالب' میں مؤلف کی ذاتی تحقیق اور دید و دریافت کا بڑا حصہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف سے پہلے مؤلف نے مرزا اور متعلقات مرزا کے بارے میں غور و فکر اور تحقیق میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ ہمہ وقت ممدوح کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو نظر میں رکھا ہے اور جانچ پرکھ کے نئے نئے زاویے تلاش کیے ہیں۔ 'غالب' کی عام سوانح عمریوں میں جو خلا ملتا ہے، اسے بڑی خوش اسلوبی سے پُر کیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے 'ذکرِ غالب' کو ایک یادگار حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

''ذکرِ غالب'' کے مطالعے کے بعد مالک رام صاحب سے دلچسپی پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ ان کی تحریروں کی تلاش شروع ہوئی اور ان کے بارے میں بزرگوں اور احباب سے پوچھ گچھ بھی کی گئی مگر نتائج تسلی بخش ثابت نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ہر جگہ سے

ایک ہی جواب ملا ''وہ ملک سے باہر ہیں۔'' اس کے بعد پاکستان وجود میں آ گیا۔ راقم الحروف کراچی آ گیا اور مالک رام صاحب سے ملنے کے امکانات بہ ظاہر معدوم ہو گئے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کرید جاری رہی۔ ایک دن محترم بزرگ محمود علی خاں جامعی سے ملاقات ہوئی تو موصوف نے مالک رام صاحب کے بارے میں بے شمار باتیں بتائیں۔ اپنی ملاقاتوں، مالک رام صاحب کی ادب دوستی، غالب سے محبت اور علم پروری کا تذکرہ کیا پھر اندر گئے۔ ایک کتاب لے کر ہنستے ہوئے آئے۔ یہ کتاب تھی ''عورت اور اسلامی تعلیم۔'' مالک رام صاحب کے دستخط تھے۔ خاں صاحب نے کتاب مجھے مرحمت فرمائی میں نے بڑے شوق اور غور سے کتاب کا مطالعہ کیا اور مالک رام صاحب کی علمی شخصیت کی ایک نئی جہت یعنی اسلام سے ان کی محرمانہ آگاہی کا احساس ہوا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۵۲ء میں مالک رام صاحب کراچی آئے۔ محض چند دن کے لیے۔ میں ان کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ قیام مختصر، ملنے جلنے والے بے شمار، دور سے دیکھا۔ اچھے اور بھلے معلوم ہوئے۔ بات چیت کی نوبت نہیں آئی مگر یہ دور کا جلوہ بھی بڑا مسرور کن تھا۔

اگرچہ مالک رام صاحب سے کوئی تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی کتابیں اور مضامین نظر سے گزرتے رہے۔ ''تلامذۂ غالب'' ایک نہایت اعلیٰ تحقیقی دستاویز ہے۔ یہ کتاب بھی مؤلف کی ذاتی تحقیق اور دید و دریافت پر مشتمل ہے۔ ''تلامذۂ غالب'' کی اشاعت سے مالک رام صاحب کو غالب شناسوں کی محفل میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔ یہ بلاشبہ غالب شناسی کے حوالے سے ایک بڑا اہم کارنامہ ہے۔

اس زمانے میں میری یہ کیفیت تھی کہ مالک رام صاحب کی جو تحریر بھی نظر آتی اسے بڑے شوق سے پڑھتا۔ بابلی تہذیب کے بارے میں ان کا ایک سلسلہ مضامین نظر سے گزرا۔ اب یہ کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ ان کا مرتب کردہ غالب کا بقیہ فارسی کلام ''سبد چین'' پڑھا۔ ''سبد چین'' کا ایک قدیم نسخہ خود میرے پاس موجود تھا اس لیے یہ ایڈیشن بہت دلچسپ معلوم ہوا، غالب کے حوالے سے بعض دوسرے مضامین مثلاً غالب اور دربار رام پور

کے تعلقات نواب شمس الدین خاں وغیرہ بھی پڑھے اور یہ اندازہ ہوا کہ مالک رام صاحب جی جان سے عرفانِ غالب کی منزلیں طے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

کم وبیش اسی دور میں مالک رام صاحب کی ادبی شخصیت کی ایک اور جہت بھی سامنے آئی، یہ تھی ان کی خاکہ نگاری۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی اور نواب صدر یار جنگ کے خاکے اردو خاکوں کے مرقعے میں بڑے زندہ، جان دار اور دل کش نظر آتے ہیں۔ گہری انسان شناسی، خلوص، محبت، وسعتِ معلومات اور اسلوب کی تازگی نے ان خاکوں کو خوب صورت بنا دیا ہے۔ جن لوگوں نے نواب سائل اور صدر یار جنگ کو نہیں دیکھا وہ بھی یہ خاکے پڑھ کر ان دونوں سے ذہنی قربت محسوس کرتے ہیں۔

اس پورے دور میں جس سے بھی گفتگو ہوئی اس نے یہی بتایا کہ مالک رام میاں آدمی ہیں۔ نہایت شریف، وضع دار، ملنسار ہر ایک کے کام آنے والے۔ ہر ایک کی مدد پر تیار مگر اسی زمانے میں کچھ نوجوانوں نے ان کے خلاف ایک کتاب مالک رام بہ حیثیت محقق یا مالک رام تحقیق کے میدان میں لکھ ماری۔ مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ مالک رام صاحب کو تحقیق وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ محض دوسروں کے خوشہ چیں ہیں اور پی آر کے بل بوتے پر بڑے غالب شناس سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ادبی گروہ بندی کا بھرپور اظہار تھی مگر میرا خیال ہے کہ اس کی اشاعت سے وہ سب نوجوان، جو اَب بوڑھوں کی صف میں آگئے ہیں، عرصۂ دراز تک اپنی حماقت پر پشیمان رہے۔ مالک رام صاحب کا کچھ بگڑا نہیں۔ یہ لوگ مفت میں رُسوا ہوئے۔ مالک رام صاحب کی زندگی کا رہنما اصول اپنی اصلاح اور درگزر تھا۔ یہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے سیکھا تھا اور ساری زندگی اس پر عمل کیا۔ ایک بار وہ مولانا آزاد کے کسی معترض کو جواب دینا چاہتے تھے۔ اس پر مولانا نے ان سے فرمایا "کیا آپ کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھیے، دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

یہ سب ہوا۔ کتابیں پڑھیں۔ مضمون پڑھے مگر ملاقات کی حسرت ہی رہی۔ کبھی کبھی دل چاہتا تھا کہ ملاقات ہو لیکن ایک دفعہ کے بعد مالک رام صاحب نے ادھر کا رُخ نہیں کیا

نہ کر دہات زندگی نے مجھے اتنی مہلت دی کہ جاتا اور ملاقات کرتا۔ بارے ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۷۸ء میں پہلی بار دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ پاکستانی زائرین کے قافلے کے ساتھ حضرت سلطان جیؒ کی آستاں بوسی کے لیے جانا ہوا۔ قیام ہمایوں کے مقبرے کے سامنے پنچ والی درگاہ کے مقابل ایک قدیم عمارت میں ہوا جو اسکاؤٹس کیمپ کے نام سے مشہور تھی۔ دن کے گیارہ بجے کا وقت۔ کیمپ میں سناٹا، سارے زائرین شہر کے گشت پر۔ میں چاشت کی نماز پڑھ رہا تھا۔ کوئی صاحب آئے۔ مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر بیٹھ گئے۔ سلام پھیرا، دیکھا تو پرانی وضع کے بزرگ، گول حلیم چہرا، دل کے اندر جھانکنے والی روشن آنکھیں، فراخ پیشانی، دہرا بدن، قدرے مائل بہ فربہی۔ چھوٹی سی توند۔ جسم پر شیروانی، اسی کپڑے کی ٹوپی، ڈھیلے پائچے کا پیجامہ، سرتاپا انکسار، میں نے غور سے دیکھا "ارے مالک رام صاحب... آپ۔" حیرت اور خوشی سے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے۔ اُٹھ کر بغل گیر ہوا۔ بڑے شفقت سے کہنے لگے، مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ ملنے کو جی چاہتا تھا۔ سوچا چلوں۔ آپ سے مل لوں۔ پھر کہنے لگے، کیا چاشت پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا، جی، پوچھا، اشراق اور اوّابین بھی پڑھتے ہو۔ میں نے کہا، جی۔ پھر پوچھا، تہجد بھی پڑھتے ہو گے۔ میں نے کہا، جی، پڑھتا ہوں۔ بولے، بہت اچھا کرتے ہو۔ یہاں یہ کیفیت کہ سرتاپا حیرت۔ بعض دفعہ چاشت پڑھتے دیکھ کر ایک آدھ دوست نے ٹوکا کہ یہ کون سا وقت ہے نماز پڑھنے کا، فجر قضا ہو گئی تو ظہر کے ساتھ پڑھو۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہ چاشت کی نماز ہے تو تعجب کرتے رہے۔ ادھر یہ کیفیت کہ اگلے کو ملفوظی نمازوں کا سارا سلسلہ نوکِ زباں۔ حیرت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔ ملاقات کے پہلے ہی لمحے میں مالک رام صاحب کی وسعتِ معلومات، تبحر اور اسلام سے آگاہی کا قائل ہونا پڑا۔ تعجب اس پر بھی ہوا کہ اتنا بڑا آدمی، ایسی سادگی کے ساتھ ایک غیر معروف طالب علم سے ملنے چلا آیا، نہ کوئی انا نہ تبختر، نہ شان و شوکت نہ کروفر۔ کہنے لگے خواجہ حسن ثانی نظامی نے بڑی صحیح رہنمائی کی آنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ پھر جو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو گھنٹوں جاری رہا۔ مالک رام صاحب کی گفتگو بھی ان کی تحریر کی طرح سادہ اور دل نشیں تھی۔ ان سے مل کر یہ احساس ہوا کہ ایک بہت اچھے انسان، ایک

بڑے عالم اور اپنی تہذیب کے ایک یادگار نمائندے سے ملاقات ہوئی ہے۔ تہذیب کے ایسے سچے اور پُر وقار نمائندے اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ تہذیبی اعتبار سے ہم اس وقت ایک خلا میں معلق ہیں کیوں کہ ہماری اکثریت تہذیب کے ان تمام مظاہر اور عناصر سے بے گانہ ہو گئی ہے جو تہذیبوں کو وزن و وقار بخشتے ہیں۔ مالک رام صاحب نے جس فضا میں آنکھ کھولی تھی، پرورش پائی تھی، جو کچھ دیکھا اور پڑھا تھا اس سے انھیں محبت تھی۔ اس کو انھوں نے اپنا جزوِ زندگی بنایا اور شاد کام ہوئے۔ عربی، فارسی، اردو سے محبت ان کے ایمان میں داخل تھی۔ اس محبت کا اثر ان کی اولاد میں بھی رہا۔ شاہ مسعود سرکاری دورے پر دلی گئے۔ ان کے اعزاز میں ایک تقریب ایک اسکول میں بھی منعقد ہوئی۔ دس گیارہ برس کی ایک بچی نے فصیح و بلیغ عربی میں سپاس نامہ پڑھا۔ جب شاہ مسعود کو یہ بتایا گیا کہ یہ لڑکی مسلمان نہیں ہے تو وہ بڑے متعجب ہوئے۔ یہ مالک رام صاحب کی بیٹی تھی۔ اس قسم کے بے لوث تہذیبی نمائندوں کی نسل تقریباً معدوم ہو گئی ہے۔

اگلے دن میں مالک رام صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ کمرہ کتابوں اور طغروں سے بھرا ہوا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اس طرح ملے جیسے وہ بزرگ نہیں ہیں میں بزرگ ہوں۔ میں نے اس موقعے پر ارتجالاً ایک شعر بطور سجع کہہ کر ان کی نذر کیا۔ بڑے خوش ہوئے۔ فوراً قبلہ میکش اکبرآبادی کا لکھا ہوا سجع دکھایا۔ شاہ صاحب نے بڑا خوب صورت سجع لکھا تھا۔ دیر تک ان کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ میرا خیال ہے کہ برصغیر کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر ادیب شاعر یا مصنف ایسا ہو گا جسے وہ اچھی طرح نہ جانتے ہوں۔ ادھر آپ نے کسی کا نام لیا اور اُدھر انھوں نے بڑی محبت اور خلوص سے اس کے خاندانی حالات اور کارنامے بیان کر دیے۔ لطف یہ کہ نکاتِ سخن کے اس بیان میں زور محاسن ہی پر ہوتا تھا۔ معائب کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ حالات بڑی تفصیل سے بیان کرتے تھے۔ یادداشت اور حافظہ غیر معمولی۔ معلومات کے دریا بہاتے۔ سب کچھ از بر تھا۔ ان سے گفتگو میں بعض اوقات یہ محسوس ہوتا کہ بات چیت نہیں ہو رہی ہے، انسائیکلو پیڈیا کھلی ہوئی ہے۔

اس سے اگلے دن انجمن ترقی اردو ہند نے ہم لوگوں کے اعزاز میں ایک بڑا جلسہ کیا۔ انجمن کی نئی عمارت ''اردو گھر'' کا افتتاح کچھ ہی دن پہلے ہوا تھا۔ یہ اس عمارت کی پہلی ادبی تقریب تھی۔ دلی کے تقریباً سبھی شاعر اور ادیب موجود تھے۔ ملا صاحب نے صدارت کی۔ اس تقریب میں، میں نے دو کنجاہیوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ ایک کنجاہی مالک رام صاحب دوسرے کنجاہی جماعت زائرین کے معزز رکن پروفیسر شریف کنجاہی۔ دونوں میں ایک عظیم الشان معانقہ ہوا۔ بڑی محویت سے گفتگو ہوئی۔ مالک رام صاحب نے دریافت کیا، اب میرے مکان میں کون رہتا ہے۔ شریف صاحب نے بڑی لجاجت سے بتایا میں مقیم ہوں۔ مالک رام صاحب بڑے خوش ہوئے کہنے لگے حق بہ حق دار رسید۔ مجھے اطمینان ہے کہ مکان کو بہت اچھے مکین مل گئے۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایک ادیب کے لیے اس سے زیادہ طمانیت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی چھوڑی ہوئی منزل کسی دوسرے نامور ادیب کے تصرف میں رہے۔

میں نے اس جلسے میں یہ بھی دیکھا کہ اہل قلم میں مالک رام صاحب کی کتنی عزت ہے۔ لوگ ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں: اسی محبت کے نتیجے میں ان کی پینسٹھویں سال گرہ پر ارمغانِ مالک کے عنوان سے دو جلدوں میں ایک یادگاری کتاب مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ یہ ان کی خدماتِ علم و ادب اور خلوص و محبت کا سچا اعتراف تھا۔ اس جلسے میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا حال سن کر وہ بہت مسرور ہوئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر روشنی کی ایک لہر اُبھرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ انھوں نے ہماری گفتگو کو بڑی توجہ اور دل جمعی سے سنا اور تقریب ختم ہونے کے بعد مجھ سے اس گفتگو کی بڑی تعریف کی۔ میں نے اس تقریب کے لیے ایک نظم بھی لکھی تھی جس کے دوسرے مصرعے میں ''قبلہ مالک رام ملے'' کا ٹکڑا تھا۔ یہ نظم ذہن سے بالکل محو ہو چکی ہے مالک رام صاحب نے بار بار کہا، بھائی یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے۔ کہاں کے قبلہ۔ کہاں کے قبلی۔ میں تو ایک ہیچ مداں انسان ہوں۔

دلی کی یہ ملاقاتیں بڑی محدود تھیں۔ مشکل سے تین چار دن چند گھنٹے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا مگر میں مالک رام صاحب کی سیر چشمی، بزرگانہ شفقت اور علمی تبحر کا بڑا گہرا تاثر لے کر واپس ہوا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ ملے تو اس طرح ملے جیسے برسوں سے مجھے جانتے ہوں۔ باوجود یہ کہ وہ بڑے آدمی تھے، بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ مطالعہ غالب میں ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ علومِ اسلامی کے ماہر تھے مگر ہم جیسے ادنیٰ طالب علموں سے اس طرح پیش آئے جیسے وہ کچھ بھی نہیں ہیں، علم و ادب کے معمولی خادم ہیں۔ سراپا انکسار اور سیر چشم۔ سیر چشمی پر مجھے یاد آیا کہ نیاز فتح پوری مرحوم نے مالک رام صاحب کی خوئے خلوص کا ایک واقعہ اپنے ذاتی حوالے سے یوں بیان کیا ہے کہ جب ایک بینک فیل ہو جانے کی وجہ سے ان کا سارا سرمایہ یک لخت برباد ہو گیا تھا اس وقت مالک رام صاحب نے یہ خبر سنتے ہی اپنے آپ ایک بڑی رقم نیاز صاحب کو کسی طلب اور درخواست کے بغیر بھجوا دی تھی۔ میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تھا تو بے اختیار حالی کا یہ مصرع "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" ذہن میں اُبھر آیا تھا۔

۷۸ء کی اس ملاقات کے بعد ہر سال پابندی سے ملاقات ہوتی رہی۔ میں جب بھی حضرت سلطان جیؒ کے عرس میں شرکت کے لیے گیا مالک رام صاحب کو چشم براہ پایا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے یہاں سمینار میں وہ پابندی سے شریک ہوتے اور پورے وقت شریک رہتے۔ مؤدب بیٹھتے، پہلو نہیں بدلتے تھے۔ ناسازیِ مزاج کے باوجود بھی اسی طرح مؤدب نشست رہتی۔ میرا مقالہ بڑی توجہ سے سنتے اور سمینار کے بعد اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ نظامؒ رنگ پڑھ کر وہ بہت مسرور ہوئے تھے۔ ان کے تحسینی کلمات سن کر میں نے کہا، یہ خاکہ لکھنے کا خیال مجھے آپ ہی کے ایک مضمون سے آیا۔ آپ نے غالب کا مہمان بن کر جو انداز پیدا کیا ہے میں بھی وہی کیفیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگے وہ کیفیت ہر جگہ موجود ہے۔ ملنسار تھے۔ ادبی تقریبوں میں بڑے شوق سے آتے جاتے تھے۔ ایک سال ایسا اتفاق ہوا کہ عرس پندرہ فروری کے لگ بھگ ہوا۔ پندرہ فروری کو مالک رام صاحب نے غالب اکیڈمی کی جانب سے مزار غالب پر ایک مشاعرہ بیادِ غالب

منعقد کیا۔ کہنے لگے مجھے معلوم ہے کہ تم حضرت سلطان جیؒ کے مہمان ہو۔ کسی ادبی تقریب میں شریک نہیں ہوتے مگر مشاعرے میں سامع ہی کی حیثیت سے آجاؤ۔ اس میں کیا حرج ہے۔ مخدومی خواجہ حسن ثانی نظامی نے بھی ارشاد فرمایا کہ شرکت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ میں مشاعرے میں جا پہنچا۔ صدارت مالک رام صاحب کی تھی۔ انھیں کے پاس ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اتفاق ہے کہ مشاعرے میں آخور کی بھرتی بہت تھی۔ جانے کہاں کہاں کے مبتدی اور نومشقے جمع ہو گئے تھے۔ ایک نوجوان نے مطلع پڑھا۔ خیر سے دونوں مصرعے ناموزوں اور مطلع دولخت، الفاظ کا تلفظ بھی عامیانہ۔ میں نے مالک رام صاحب کی طرف دیکھا۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ ''دلّی میں ادھر اُدھر سے لوگ آجاتے ہیں۔ ساری فضا کو خراب کر دیتے ہیں۔'' اس جملے پر میں نے پھر ان کی طرف دیکھا تھا اور بولے، ''ہم سب ادھر اُدھر سے آ کر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔'' مشاعرے کے بعد افسردہ ہو کر کہنے لگے۔

''اب دلّی وہ دلّی نہیں رہی... مگر کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

مالک رام صاحب بڑے وضع دار انسان تھے۔ منکسر المزاج تھے مگر رکھ رکھاؤ کے بھی قائل۔ نہایت متواضع تھے۔ میں جب بھی ان کے یہاں گیا بڑی خاطر کی۔ سال میں ایک دفعہ ضرور جانا ہوتا تھا۔ نام لکھی ہوئی کتابیں پیکٹ میں بند پہلے سے تیار ہوتی تھیں۔ چلتے وقت یہ پیکٹ اس طرح پیش کرتے جیسے ہم اسے قبول کر کے ان پر احسان کریں گے۔ ''ذکرِ غالب'' کا نیا ایڈیشن اور بعض دوسری کتابیں جو انھوں نے از راہِ محبت عنایت کیں۔ میرے ذخیرۂ کتب کا اثاثہ ہیں۔ ایک بات میں نے یہ دیکھی کے وہ گفتگو میں دوسرے کی بات کی تردید نہیں کرتے تھے، نہ کسی کی بات کاٹتے تھے۔ بڑے صبر و تحمل سے بات سنتے۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے کی قابلِ گرفت باتوں کو وہ عام طور پر نظر انداز کر دیتے تھے۔

اکتوبر ۱۹۹۲ء میں دلّی جانا ہوا تو ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ معلوم ہوا کہ بہت بیمار ہیں۔ چنانچہ سلام کہلوانے پر اکتفا کیا اور یہ سوچتا رہا کہ اردو ادب کو مالک رام جیسے ادیب کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ شمع سحر ہونے تک ہر رنگ میں جلی۔ مطالعۂ غالب ان کا محبوب موضوع تھا۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کے انھوں نے اس مطالعے کا حق ادا کر دیا اور

غالب شناسی میں ایک نئی راہ نکالی۔ خاکے لکھے۔ مولانا آزاد کی کتابوں پر عالمانہ حواشی لکھے
صرف یہی کام اس معرکے اور آن بان کا ہے کہ اسی سے ان کا نام زندہ رہ سکتا ہے۔
اسلوب تحریر ان کی شخصیت کی طرح نرم اور دل کش۔ جس طرح باتیں کرتے تھے اسی طرح
لکھتے تھے۔ معلومات کے خزانے لٹاتے رہے: صدر یار جنگ پر مضمون شروع کیا ہے۔ ان
کے یہاں پہنچنے کا بیان ہے کہ وہاں پہنچا تو عبدالوحید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اب پہلے
عبدالوحید صاحب کا حال سن لیجیے کہ مولانا عبدالغنی فرخ آبادی کے صاحب زادے تھے۔
مولانا عبدالغنی بڑے پایہ کے عالم اور نواب صاحب کے استاد تھے۔ ان کی ایک بیٹی بھی
نواب صاحب سے منسوب تھیں۔ اس تعلق سے وہ نواب صاحب کے برادر نسبتی بھی تھے۔
اتنی ساری معلومات فراہم کرنے کے بعد ہی مالک رام صاحب آگے بڑھتے ہیں۔ خاندانی
تفصیل اور شجرے ایسی دل جمعی سے بیان کر جاتے ہیں کہ جیسے ساری عمر اسماالرجال اور
علم انساب ہی کے مطالعے میں گزاری ہے۔

مالک رام صاحب کو اپنے کام سے عشق تھا۔ وہ اپنے کام میں سرتاپا ڈوبے ہوئے
تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے دانہ دانہ کے خرمن اکٹھا کیا تھا۔ سائل صاحب کے یہاں علم
کی لگن میں وہ ہر اتوار کو صبح سویرے ایک لمبی مسافت طے کر کے جاتے تھے اور موسم کی
شدت کو خندہ پیشانی سے گوارا کرتے تھے۔ مولانا آزاد کے یہاں بھی مدتوں تاروں کی
چھاؤں میں جاتے رہے اور علم کی دولت حاصل کرتے رہے کام اسی طرح ہوتا ہے۔ ساری
زندگی علم و ادب کی نذر کی۔ جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ ایسا لکھا کہ وہ ہمارے علمی اور تہذیبی
سرمائے کی بازیافت بن گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا لکھا ہوا ہر لفظ ایک عالی دماغ، پابندِ وضع،
پُر وقار تہذیبی نمائندے کی یاد تازہ کرتا رہے گا۔ جو پڑھے گا میرا ہم نوا ہو کر یہی کہے گا:

عشق سنوارے سچا کام
سچے کام سے مالک رام

ooo

ڈاکٹر اسلم فرخی

کس ادا کے ساتھ

(آدا بہن)

یہ ایک جھلک ہے اس بھولی بھالی معصوم لڑکی کی جو بدایوں کے شہر میں پیدا ہوئی۔ ٹونک والے پھاٹک میں بھونرے میں پلی بڑھی، مگر وہاں سے جو اٹھی تو لکھنؤ، الٰہ آباد، کراچی، لاہور، اسلام آباد، لندن، واشنگٹن اور نہ جانے کہاں کہاں اپنے نام کے جھنڈے گاڑ آئی۔ گھر والوں سے چھپ کر شعر لکھے۔ رسالوں میں بھیجے اور جب شائع ہو گئے تو سب کو اعتراف کرنا پڑا کہ ہاں "ایک انداز تو نکلتا ہے۔"

یہ بات غالباً ۳۶ء کی ہے کہ میں نے اور محب مکرم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی نے ایک نئی شاعرہ کا کلام پڑھا۔ کلام تو ہم دن رات پڑھتے ہی رہتے تھے لیکن اس کلام کا انداز کچھ ایسا بھایا کہ ہم نے ایک دن فرصت سے بیٹھ کر گھنٹوں اس کے بارے میں گفتگو کی۔ افسانے کی حد تک خواتین نے بڑی دھوم دھام سے اپنی ادبی حیثیت منوائی تھی لیکن شاعری میں ابھی تک نسائی حسیت کے بھرپور لہجے کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ مرحومہ ز۔خ۔ش کے یہاں اس کی ایک جھلک تھی مگر یہ جھلک پوری طرح ظاہر نہ ہو سکی تھی۔ جو خواتین شعر لکھ رہی تھیں ان میں بلقیس جمال تھیں، صفیہ شمیم ملیح آبادی تھیں، کنیز فاطمہ حیا تھیں۔ بڑی محترم، خوش فکر اور خوش گو، لیکن بنیادی طور پر ان کی شاعری اور کسی مرد کی شاعری میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جس طرح افسانہ نگار خواتین نے اپنی انفرادی حیثیت منوائی تھی اس طرح کا انداز اور اثر شاعری میں نمایاں نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور مغیث دونوں کو اس نئی شاعرہ کے یہاں ایک بالکل

نئے انداز کی جھلک نظر آئی۔ لہجہ بھی نیا، حسیت بھی نئی اور کیفیت بھی نئی۔ پھر یہ معمول ہو گیا کہ جب ادا بدایونی کی کوئی نظم کسی رسالے میں نظر سے گزرتی تو ہم دونوں اس سے لطف اندوز ہوتے اور اس کے بارے میں بڑے زور و شور سے اظہار خیال کرتے۔

قیام پاکستان کے بعد میرا تعلق خوش قسمتی سے ایک ایسے محکمے سے ہوا جہاں شعر و ادب ہی کا چرچا تھا۔ ملک کے بے شمار شاعروں اور ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ استفادے کا موقعہ ملا مگر ملاقات نہ ہوئی تو ادا بدایونی سے۔ سنا کہ وہ پنڈی میں ہیں۔ پھر سنا کہ لاہور میں ہیں لاہور- پنڈی برابر آنا جانا رہا لیکن ملاقات کی کوئی سبیل نہیں نکلی۔ مجھے عام طور پر نئے لوگوں سے ملنے میں ایک جھجک ہوتی ہے۔ میرے لیے خود کو کسی نئے آدمی سے ملنے کے لیے آمادہ کرنا ہمیشہ ایک صبر آزما کام رہا ہے مگر ادا بدایونی سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ اشتیاق کے باوجود چوں کہ اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی گئی لہٰذا ملاقات کی نوبت بھی نہیں آئی۔

۱۹۵۰ء میں ادا بدایونی کا، جو اُس وقت ادا جعفری ہو چکی تھیں، پہلا مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' شائع ہوا۔ میں نے اسے بڑے شوق اور اہتمام سے پڑھا۔ ایک بار نہیں بار بار۔ 'ان کی شکایتوں کا لکھا میں نے یہ جواب'، 'شکست ساز'، 'قافلے' اور 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' اس مجموعے کی ایسی نظمیں ہیں جو آج بھی میرے ذہن پر نقش ہیں۔ شاعرہ کا یہ اندیشہ کہ ''نظام نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں'' ایک زندہ سوال بن کر مدتوں میرے ذہن پر طاری رہا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ ادا جعفری کا کلام رسالوں میں شائع ہونا بند ہو گیا۔ کیوں بند ہو گیا، اس کا شافی جواب مجھے اس وقت نہیں ملا۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی یہ فرض کر لیا کہ ماحول، حالات اور گھریلو ذمہ داریوں نے اس آواز کو جو اردو شاعری میں بالکل نئی، انوکھی اور اپنی جنس کی بھرپور ترجمان تھی بڑی بے رحمی سے خاموش کر دیا ہے اور نظامِ نو نے ایک ذہین شاعرہ کے نغموں کے لیے کوئی ساز فراہم نہیں کیا۔ اس قسم کے سانحے اکثر پیش آ چکے ہیں۔ اپنے معاصرین میں میں نے مرحوم دوست ضمیر الدین احمد کو دیکھا کہ افسانے لکھتے لکھتے افسانے کے افق سے یک لخت غائب ہو گئے۔ خالدہ حسین کو دیکھا کہ

''سواری'' جیسا شاہ کار افسانے لکھنے کے بعد قلم ہاتھ سے رکھ دیا مگر عجیب بات یہ ہے کہ ضمیر نے پندرہ برس بعد پھر قلم سنبھالا اور بعض لاجواب افسانے لکھ کر قلم کی بندش کا کفارہ ادا کر دیا۔ یہی خالدہ حسین کے ساتھ بھی ہوا کہ انھوں نے از سرِ نو لکھنا شروع کر دیا اور اپنی خاموشی کی تلافی کر دی۔ یہی ادا جعفری کے ساتھ بھی ہوا۔ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کے سترہ برس بعد ان کا دوسرا مجموعہ 'شہر درد' شائع ہوا۔ سترہ سال کی یہ خاموشی بڑی طویل تھی مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ شاعرہ کا اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ نظام نو نے اس کے لیے ساز ہی فراہم نہیں کیا بلکہ اس کی آواز، لہجے، نغمگی اور انفرادیت کو وہ پختگی، رعنائی اور دل کشی بھی دی جسے ہر اعتبار سے اس طویل خاموشی کی جزا کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ شہر درد سے دستِ تہی لے کر نہیں نکلی۔ بے شمار پھول ہیں کہ اس کے دامن میں سمٹ آئے ہیں۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہر حساس انسان کی زندگی میں انقباض کا ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب یافت نایافت اور آگہی ناآگہی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ طبیعت پر تکدر چھا جاتا ہے اور شدید بے زاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت سلطان جیؒ پر انقباض کی کیفیت طاری تھی۔ حضرت نے غسل کیا۔ نیا جوڑا پہنا۔ ارادہ کیا کہ کسی باغ میں جا کر گل بوٹوں میں قدرت خداوندی کا مشاہدہ کریں۔ شاید انقباض خاطر کی کیفیت دور ہو جائے۔ پھر کچھ سوچ کر حضرت نے سید حسین کرمانیؒ کو طلب فرمایا۔ سید حسین حضرت کے منھ بولے بیٹے مشہور تھے۔ آزاد منش، پاک باز اور عالم فاضل تھے۔ جب وہ آ گئے تو حضرت سلطان جیؒ مسکرانے لگے۔ فرمایا، طبیعت میں کچھ انقباض تھا۔ باغ جانے کا ارادہ تھا۔ کسی نے میرے باطن میں آواز دی، سید حسین کو بلاؤ۔ تم آ گئے تو انقباض کی وہ ساری کیفیت یک لخت جاتی رہی۔ یہ بازیافت کا وہ موثر لمحہ ہوتا ہے جب انسان ایک بار پھر اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے۔ علامہ اقبال نے مضمحل ہو کر کیمبرج کے قیام میں سنجیدگی سے شعر گوئی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر سر عبدالقادر نے سمجھایا تو مطمئن ہو گئے۔ ادا جعفری کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ ۶۵ء کی جنگ ان کے لیے عرفانِ ذات اور فن کی بازیافت کا لمحہ ثابت ہوئی اور وہ ایک بار پھر پورے انہماک اور توجہ سے شعر کہنے لگیں۔ یہ سب باتیں درست ہوں یا نہ ہوں مگر یہ

بات ضرور درست ہے کہ 'شہر درد' کے مطالعے کے بعد محترمہ ادا جعفری سے ملاقات کا اشتیاق کچھ اور بڑھ گیا۔

پھر ۶۷ء میں وہ یادگار نظم 'مسجد اقصیٰ' شائع ہوئی جس نے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اردو ادب میں مسجدوں کے حوالے سے دو شہ کار وجود میں آئے ہیں۔ علامہ اقبال کی نظم 'مسجد قرطبہ' فلسفیانہ احساس میں ڈوبی ہوئی، زماں و مکاں کے اسرار ہویدا کرنے والی، سطوت ماضی کی بازیافت اور مستقبل کا ایک خواب ناک نظارہ ہے۔ 'مسجد اقصیٰ' جذبات و واردات سے لبریز وہ فریاد ہے جسے سن کر عرش سے خاک نشینوں کو سلام آتے ہیں اور ہوش والوں میں تلقین جنوں کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی پُر اثر اور سراپا آرزو نظمیں ہمارے ادب میں خال خال ہیں۔ بڑا چرچا رہا اس نظم کا نہ جانے کتنے دوستوں سے اس کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ جس نے بھی یہ نظم پڑھی بہت متاثر ہوا۔ ہماری متفقہ رائے یہ تھی کہ ایسی پُر اثر اور دل آویز نظم جس میں فریاد، آرزو، تقاضا سب ہی کچھ ہو اس لطافت اور نرمی کے ساتھ ایک خاتون ہی لکھ سکتی ہیں۔ ادا جعفری کے یہاں جس نسائی حسیت کی جھلک ابتدا سے ملتی ہے وہ اس نظم میں اپنے عروج پر آ گئی ہے۔ مجھ پر مدتوں اس نظم کا اثر رہا۔ آج بھی ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر ملاقات کا اشتیاق کچھ اور بڑھا لیکن پھر بھی نوبت نہیں آئی۔

'مسجد اقصیٰ' کی اشاعت کے بہت بعد کا ذکر ہے۔ ایک صبح یونیورسٹی گیا تو یہ اطلاع ملی کہ آج طلبا نے محترمہ ادا جعفری کو مدعو کیا ہے۔ ان کے اعزاز میں تقریب ہے۔ گیارہ بجے محترمہ تشریف لے آئیں۔ ملاقات ہوئی۔ اشعار کے مطالعے سے شخصیت کا جو تصور ذہن میں اُبھرا تھا اندازہ ہوا کہ بڑی حد تک صحیح تھا۔ درمیانہ قد، متوسط جسم، لباس میں سادگی کے ساتھ نفاست، ہلکے صوفیانہ رنگ، چہرے پر حیا اور عفت کی لہر، اجلے اجلے شعروں کی طرح اجلا رنگ، سبک ناک نقشہ، چال ڈھال انداز سب میں نرمی اور وقار، ہاتھ میں قدیم وضع کا ایک بٹوا جس میں غالباً بُن دھینے قسم کی کوئی چیز تھی۔ گفتگو میں دھیما پن، وہ جو ایک شاعرانہ ادّعا اور خود پسندی کی جھلک بالعموم شاعروں کے یہاں ملتی ہے اس کا کوئی نشان نہیں۔ نہ یہ کیفیت کہ حد سے زیادہ لیے دیے ہیں نہ وہ انداز کہ ''زمیں پر پاؤں

نخوت سے نہیں رکھتے..." لہجے میں انکسار اور معصومیت۔ بڑے دھیمے اور شائستہ انداز میں اپنی شاعری کے بارے میں بات کی لیکن پورے اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ۔ سادگی اور بھولپن یہ کہ اپنی شاعری کے ضمن میں اپنے بچوں کا تذکرہ بھی کیا۔ اسی محبت اور خلوص کے ساتھ جس سے ان کا یہ دعویٰ کہ میں تو اوّل اور آخر ایک ماں ہوں، بالکل سچا معلوم ہوا۔
بڑی پُر لطف نشست رہی جب رخصت ہوئیں تو بڑی دیر تک:

کانوں میں گونجتی ہے بڑی آشنا صدا
ویران بستیوں میں غزل خواں کوئی تو ہے

کا عالم رہا۔

اگرچہ یہ ملاقات مختصر تھی لیکن یادگار حیثیت کی حامل تھی کہ جس شاعرہ کا کلام ایک مدت سے پڑھتے آئے تھے۔ جسے اردو شاعری میں خاتون اوّل کی حیثیت حاصل ہے اس کی زبان سے شعر اور فن شعر کے بارے میں بھی کچھ سننے کا موقع ملا اور جعفری صاحب معاف فرمائیں، اداشناسی کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ان ملاقاتوں کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا ہے کہ بے تکلفانہ گفتگو ہوتی ہے۔ طلبا ادبی اور غیر ادبی بھی طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ فن کار کے لیے یہاں فن کارانہ ادّعا کے اظہار کی گنجایش نہیں ہوتی۔ سیدھے سادے طریقے سے خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور انسانی شخصیت کے بہت سے ایسے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں جو تکلف کی ملاقاتوں، ادبی محفلوں اور مشاعروں میں عام طور پر سامنے نہیں آتے۔

دوسری ملاقات ہوئی اسلام آباد ایرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں۔ غالباً اکادمی ادبیات کے سالانہ جلسہ شعرا و ادبا سے واپسی کا موقع تھا۔ مجھے یہ اندیشہ کہ بھلا محترمہ ادا جعفری مجھے کیا پہچانیں گی۔ بہر حال آگے بڑھ کر سلام کیا۔ خیریت دریافت کی۔ محترمہ نے نہ صرف پہچانا بلکہ بڑے پُر خلوص لہجے میں حال پوچھا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں۔ موجود جعفری صاحب بھی تھے مگر انھوں نے کوئی گھاس نہیں ڈالی۔ ایک دوسرے صاحب کو یہ بتاتے رہے کہ میں حکومت پاکستان سے NITS کے ڈیڑھ کروڑ روپے کے

قرض کی واپسی کا تقاضا کرنے آیا تھا۔ گفتگو میں ایک کتاب کا تذکرہ آیا۔ محترمہ کہنے لگیں، میں اس کتاب سے یوں واقف ہوں کہ پہلے اسے نور نے پڑھا۔ پھر میرے لیے اس کا خلاصہ تیار کیا۔ میں نے تعجب سے جعفری صاحب کو دیکھا اور ان کے لیے احترام کا ایک نیا جذبہ دل میں اُبھرا کیوں کہ ایک کم ترین شوہر ہونے کے باوجود بھی میں اس محنت شاقہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ جالبی صاحب کے یہاں، مشفق خواجہ صاحب کے یہاں، ادبی محفلوں میں، انجمن ترقی اردو سے وابستگی ہوئی تو محترمہ ادا جعفری، ایک بار میرے محترمہ کہنے پر چڑ گئی تھیں۔ کہنے لگیں۔ یہ محترمہ کیا ہوتا ہے.... آپ کی زبان سے یہ لفظ اچھا نہیں معلوم ہوتا... میں نے پوچھا۔ تو پھر۔ بولیں۔ سیدھے سیدھے ادا بہن کہیے... تو انجمن سے وابستگی کے بعد ادا بہن سے ملنے جلنے اور انھیں سمجھنے کے امکانات بہت زیادہ ہو گئے۔ گھر پر بھی دیکھا۔ محفلوں میں بھی دیکھا۔ دفتر میں بھی دیکھا۔ علمی مجلسوں میں بہ حیثیت منتظم اور مقرر بھی دیکھا مگر سب جگہ ان کو یکساں پایا۔ وہی پُر اعتماد، انکسار، وہی دھیما اور نرم لہجہ، وہی شائستگی اور انتہائی صایب رائے، صایب رائے پر مجھے یاد آیا کہ ادا بہن کی رائے بڑی نپی تلی اور صحیح ہوتی ہے۔ وہ مقتدرہ قومی زبان کی مقامی شاخ کے دفتر کی نگراں تھیں۔ اس دفتر کے ایک نائب قاصد نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ مقتدرہ کے ٹائپ کاری اسکول میں اردو ٹائپ بھی سیکھ لیا۔ جعفری صاحب اس کی محنت اور لگن سے ایسے متاثر ہوئے کہ اسے انجمن میں ٹائپ کار کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ ادا بہن نے بہت کہا کہ آپ اسے نہ رکھیں۔ یہ آپ کے لیے مفید ثابت نہ ہوگا مگر جعفری صاحب نے رائے نہیں مانی اور نیکی کر دریا میں ڈال کے بہ مصداق اسے رکھ لیا۔ یہ بھلا آدمی مارے باندھے کام کرتا تھا۔ چھٹیوں پر چھٹیاں لیتا رہتا تھا بے سوچے سمجھے جو منھ میں آتا برملا کہہ دیتا۔ بہت دن بعد خدا خدا کر کے انجمن سے رخصت ہوا۔ جعفری صاحب اکثر اس کے حوالے سے یہ اعتراف کرتے تھے کہ میں ہی اسے یہاں لایا تھا۔ میری غلطی تھی۔ اس وقت، مجھے ادا بہن کی رائے یاد آتی اور یہ احساس ہوتا کہ ان کی رائے کتنی صحیح تھی اور ان میں انسان شناسی کا

ملکہ کیسا زبردست ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ادا بہن نے اپنی رائے کا اظہار تو کیا لیکن اس پر اصرار نہیں کیا اور نہ کبھی جعفری صاحب کو اس تقرر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ بدمزگی اس وقت ہوتی ہے جب آپ خواہ مخواہ اپنی رائے پر اصرار کریں اور دوسروں کو اس کے ماننے پر مجبور کر دیں۔ ادا بہن کے یہاں اس قسم کا کوئی تصور نہیں۔ انھوں نے اردو زبان اور نفاذ اردو کے حوالے سے مقتدرہ قومی زبان کی کارکردگی کے بارے میں ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا۔ مقرروں کی فہرست خود انھوں نے مرتب کی۔ اس کے بعد مجھ سے بھی مشورہ کیا۔ میں نے ایک آدھ مقرر کے نام سے اختلاف کیا۔ ہر چند کہ فہرست انھوں نے بڑے غور و فکر سے مرتب کی تھی لیکن ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ میرا مشورہ قبول کر لیا۔ مجھے کسی قدر حیرت بھی ہوئی کیوں کہ کوئی بھی شخص آسانی سے اپنی رائے بدلنے پر تیار نہیں ہوتا۔ یہ انا اور پندار کا مسئلہ ہوتا ہے مگر ادا بہن کے یہاں اصابت رائے بھی ہے اور دوسروں کے مشوروں کو قبول کرنے کا جذبہ بھی۔ ان دونوں خصوصیتوں کا امتزاج کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ویسے میں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ رائے کے معاملے میں جعفری صاحب بھی شدت پسند نہیں۔ اگر وہ آپ کی گفتگو سے مطمئن ہو جائیں تو فوری طور پر اپنی رائے میں ترمیم کر لیں گے لیکن اس نائب قاصد کے سلسلے میں غالباً نیکی کا جذبہ غالب آیا اور انھوں نے اپنی رائے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اصابت رائے کے حوالے سے مجھے ایک اور واقعہ بھی یاد آتا ہے۔

ایک بار جعفری صاحب کچھ گھبرائے ہوئے دفتر سے گھر آئے۔ کہنے لگے۔ عزیز، بستر باندھ لو، وہ ادا بہن کو ان کے نام ہی سے پکارتے ہیں۔ ادا بہن انھیں نورم کہتی ہیں۔ کون کس کی روشنی ہے۔ یہ فیصلہ مشکل ہے۔ جعفری صاحب نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب یہاں وقت پورا ہو گیا۔ ان دنوں وہ اسٹیبلشمنٹ سکریٹری تھے۔ متعلقہ وزیر کوئی تھا نہیں۔ براہ راست صدر ضیاء الحق سے مکالمہ ہوتا تھا۔ ادا بہن نے پوچھا، بات کیا ہوئی۔ کچھ بتایئے تو سہی۔ جعفری صاحب کہنے لگے، آج بھری میٹنگ میں صدر صاحب نے کہا، میں تو یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ مگر جعفری صاحب کہتے ہیں آپ

ازروئے قاعدہ یہ کام کرنے کے مجاز نہیں۔ اب بتائیے میں کیا کروں... میٹنگ کے بعد لوگوں نے مجھ سے کہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر صاحب کو آپ کی دفتری اصول پسندی کچھ ناگوار گزری ہے۔ بہت ممکن ہے وہ آپ کو اس منصب سے ہٹادیں۔ ادا بہن نے پوری بات سن کر بڑی متانت اور سنجیدگی سے کہا ''یہ تو صدر صاحب نے آپ کی اصول پسندی کی انتہائی تعریف کی ہے۔ اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ صدر کو بھی خلاف قاعدہ چلنے سے روک دیتے ہیں۔ گھبرائیے نہیں، تبادلہ وبادلہ کچھ نہیں ہوگا۔'' ہوا بھی یہی ادا بہن کا خیال بالکل صحیح ثابت ہوا۔ جعفری صاحب منصب کی مدت پوری کر کے وہاں سے سبک دوش ہوئے۔ اس سے بڑھ کر اصابت رائے اور کیا ہوسکتی ہے۔ تسلی بھی دی۔ اطمینان بھی دلایا۔ اصول پرستی کی تعریف بھی کی اور سارے اندیشوں کو دل سے دور کردیا۔ بڑے تدبر اور دانش مندی کی بات ہے۔ مسئلے کی اس جہت کو ایک دور بین شاعر کی نظر ہی دیکھ سکتی تھی۔

تدبر اور دانش مندی پر یاد آیا کہ ادا بہن نے پہلے بچے کی شادی کی تو سونا تین سو روپے تولہ تھا۔ دوسرے کی باری آئی تو سونا پانچ سو روپے تولہ ہوگیا تھا۔ کسی جاننے والے نے مشورہ دیا قیمت بڑھتی ہی رہے گی۔ تیسرے بچے کی شادی کے لیے بھی ابھی سے سونا خرید لیجیے۔ ادا بہن نے مشورہ پسند کیا۔ ہر چند کہ ڈاکٹر عامر اس زمانے میں محض لڑکے ہی تھے مگر ان کی ہونے والی دلہن کے لیے زیور بنوا کر رکھ لیا۔ یہ احتیاط بھی مدنظر تھی کہ چھوٹی بہو کا زیور بڑی بہو کے زیور سے کم نہ ہو۔ ایک بار ادا بہن نے مجھ سے کہا۔ بس یہ کام ہو ہی گیا۔ اگر اس وقت زیور نہ بنتا تو رہ ہی جاتا۔ آج کے حالات میں سونا خریدنا اور چڑھاوے کے لیے زیور بنوانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ مجھے حیرت یہ ہے کہ لوگ تو ذرا سی بات پر اپنی دولت و امارت کی داستانیں سناتے رہتے ہیں۔ یوں ہے اور یوں ہے اور ایک یہ ادا بہن ہیں کہ سادگی اور بے تکلفی سے یہ کہہ رہی ہیں کہ اس زمانے میں سونا خریدنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ کمال ہے۔ اب ایسی سادگی بھی کیا مگر اس سادگی میں جو عظمت اور بڑا پن ہے وہ دولت و امارت کی ہزاروں داستانوں میں بھی نہیں۔

اسی تدبر اور دانش مندی کا نتیجہ تھا کہ ادا بہن نے انجمن کے کسی معاملے میں بھی کوئی دخل نہیں دیا۔ نہ میرے علم اور دانست میں جعفری صاحب کو انجمن کے معاملات و مسائل میں کوئی مشورہ دیا۔ میرے خیال میں یہ ذہنی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے۔ تم آزادی سے اپنا کام کرو ہم اپنا کام کریں۔ حالاں کہ معاملات و مسائل میں بیگمات کا عمل دخل زیادہ رہتا ہے۔ نور جہاں جہاں گیر کے پردے میں ہمیشہ شہنشاہ زمن رہی مگر یہاں عیسیٰ بہ دین خود اور موسیٰ بہ دین خود والا معاملہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ شخصیت کا لفظ بڑا خوف ناک ہے۔ کبھی کبھی اس خطرناک لفظ کی تہیں کھولنا بھی ضروری ہو جاتا ہے مگر شخصیت کی تہیں محفلوں میں نہیں کھلتیں۔ انسان کا اصل روپ اس کے گھر ہی میں نظر آتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا میں ایک دن ادا بہن کے گھر پہنچا۔ گھر پہنچا تو پھاٹک پر ادا جعفری کے نام کی تختی نظر آئی۔ تختی اردو میں تھی۔ اس لیے خوشی بھی ہوئی کیوں کہ اردو کے ادیب اور شاعر اپنے گھروں پر نام انگریزی میں لکھواتے ہیں۔ تقریبوں کے دعوت نامے بھی انگریزی ہی میں چھپواتے ہیں۔ پھر یہ کہ پہلی دفعہ اس قسم کی تختی پر نظر پڑی تھی۔ عام طور سے خواتین کو نظر انداز کیا جاتا ہے کم از کم میں نے کسی مکان پر شوہر کے نام کے بجائے بیوی کے نام کی تختی نہیں دیکھی۔ اسے جعفری صاحب کا ایثار بھی کہہ سکتے ہیں اور چٹکی لینا ہو تو Submissiveness بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال بھی آیا کہ بزرگوں کے قول کے مطابق گھر گھر والی سے ہوتا ہے اگر گھر پر گھر والی کا نام لکھا ہے تو تمہاری مردانگی کو صدمہ کیوں پہنچا۔ پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ وسیع اور سرسبز لان، تر و تازہ پودے، دروازے پر بیل چڑھی ہوئی، فرحت بخش پھول، ڈیوڑھی سے ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو بہت زیادہ حیرت ہوئی مگر اس حیرت کے اظہار میں میں اپنی رائے کے بجائے پروفیسر پریشان خٹک کے الفاظ آپ کو سناؤں گا۔ ایک بار ہم دونوں جعفری صاحب کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ خٹک صاحب کہنے لگے، ”یہ ڈرائنگ روم کسی گریڈ بائیس کے افسر کا ڈرائنگ روم ہی معلوم نہیں ہوتا۔ بہت سادہ ہے۔“ واقعی ادا بہن کا ڈرائنگ روم سادہ ہے صوفے، قالین، کرسیاں سب بڑے قاعدے قرینے کی ہیں۔

دیواروں پر صادقین اور دوسرے مصوروں کی تصاویر Over Stuffed نہیں ہے بلکہ کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نہایت خوش ذوق اور سلیقہ مند خاتون کے ڈرائنگ روم میں ہیں جہاں نفاست اور دقت نظر ہے۔ امارت کی نمائش اور بے جا شوکت کا اظہار نہیں۔ ادا بہن ملیں۔ سادگی اور بے تکلفی کا جو انداز باہر تھا وہی گھر میں بھی نظر آیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ، باتوں میں گھلاوٹ، نہ یہ تمکنت کہ اوہو، ہم تو اتنے بڑے شاعر ہیں۔ گفتگو میں ہمارا پلہ ہی بھاری رہنا چاہیے۔ ساری دنیا دیکھ چکی ہیں۔ امریکہ اور انگلستان گھر آنگن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امریکہ کی بڑی بڑی شاعرات سے مل چکی ہیں لیکن کیا مجال جو گفتگو میں اس بات کا اشارہ بھی ہو۔ آپ کریدیے تو سنائیں گی ورنہ خود سے کوئی تذکرہ نہیں کریں گی۔ ایک بار میں نے ایک امریکی شاعرہ کے بارے میں کچھ کہا تو بولیں، جی، اس سے مل چکی ہوں۔

ادا بہن اپنی گھریلو زندگی میں سادہ اور پُر وقار ہیں۔ وہ اچھی بیوی ہیں مگر خود کو ماں کے روپ میں دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ انھیں بچوں سے غیر معمولی محبت ہے۔ محبت جعفری صاحب کو بھی ہے۔ جب وہ کسی دوست سے کہتے ہیں۔ ہمارا ارادہ اس سال بچوں سے ملنے کے لیے امریکہ جانے کا ہے تو بچوں کا لفظ ادا کرنے میں ان کے چہرے پر بے پناہ محبت کی ایک لہر اُبھر آتی ہے اور بچوں کے لفظ کی ادائیگی میں بڑا جوش محسوس ہوتا ہے مگر ادا بہن کی محبت اس سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے بچوں کا تذکرہ ایسے فخر اور پیار سے کرتی ہیں کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بچوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں مگر تذکرے تذکرے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک تذکرہ ابوالکلام آزاد کا ہے اور ایک تذکرہ عنایت اللہ مشرقی کا بھی ہے۔ تذکرے میں غلو بڑی عام بات ہے مگر بے پناہ محبت کے باوجود ادا بہن اپنے بچوں کے تذکرے میں غلو سے پرہیز کرتی ہیں۔

ادا بہن ایک اچھی اور باخبر میزبان ہیں۔ جعفری صاحب کو دعوتوں اور تقریبوں کا شوق ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں بذاتِ خود بڑے محتاط ہیں۔ بہت کم کھاتے ہیں اور بڑی احتیاط برتتے ہیں لیکن کھلانے کے معاملے میں دریا دل ہیں۔ آئے دن تقریبیں ہوتی

رہتی ہیں۔ آج میلاد ہے۔ آج فلاں صاحب امریکہ سے آئے ہوئے ہیں، ان کے اعزاز میں نشست ہے۔ آج احباب کا اجتماع ہے۔ ادا بہن بڑی ہنر مندی سے دعوتوں کا انتظام سنبھالتی ہیں۔ مینو کے انتخاب میں دقت نظر سے کام لیتی ہیں۔ گھر کی چیزیں بھی ہوتی ہیں باہر کی بھی مگر ہر چیز خوش ذائقہ۔ مجمع زیادہ ہو یا کم، انتظام بڑا مناسب اور معقول ہوتا ہے۔ نہ ایسی افراط کہ چیزیں پھنک رہی ہیں نہ ایسی قلت کہ جو چیز ایک دفعہ لے لی دوبارہ میسر نہیں آئی۔ میرا خیال ہے کہ ادا بہن ہر تقریب سے پہلے اس کی مناسب منصوبہ بندی کرتی ہیں اور ہر گوشے پر نظر رکھتی ہیں۔ خود بھی بڑے مزے مزے کی چیزیں پکاتی ہیں۔ ملازموں سے کام لینے کا ہنر بھی بخوبی جانتی ہیں۔ ان کے یہاں ایک توازن اور اعتدال ہے۔ Over doing نہیں۔ نہ گھر میں نہ گھر کے باہر۔

ادا بہن میں صبر اور برداشت کا مادہ بھی بہت ہے۔ اب سے دو برس پچھلے دنوں ان کے گھٹنوں میں تکلیف ہوئی۔ ایسی شدید تکلیف کو پلنگ سے لگ گئیں۔ چلنا پھرنا بالکل موقوف اور درد اتنا شدید کہ ہر وقت چیخیں مارنے کو جی چاہے۔ بڑی بھیانک تکلیف تھی۔ جعفری صاحب اور ڈاکٹر عامر دونوں پریشان۔ بہترین ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ جو نسخہ جس نے تجویز کیا، آزمایا گیا مگر درد تھا کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس عالم میں بھی ادا بہن شکر ہی کرتی رہیں۔ شکایت کا کوئی لفظ ان کی زبان پر نہیں آیا۔ میں نے اس دوران بارہا بات کی۔ پریشان ضرور تھیں لیکن مایوس نہیں تھیں۔ ہر کس و ناکس سے خواہ مخواہ ہمدردی کی طالب بھی نہیں ہوتی تھیں۔ جو گزر رہی تھی بڑی ہمت اور استقلال مزاج سے برداشت کر رہی تھیں۔ بڑی کڑی آزمائش تھی مگر وہ اس آزمائش میں پوری اتریں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں شفا بھی عطا فرمائی۔ بیماری اور پریشانی میں انسان بالعموم چڑچڑا اور بدمزاج ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ اچھا بھلا آدمی تکلیف میں مبتلا ہو کر پلنگ پر پڑ جائے تو مزاج ضرور بگڑے گا مگر ادا بہن کے یہاں بیماری کے دوران چڑچڑے پن اور بدمزاجی کا کوئی مظاہرہ نہیں ہوا۔ اللہ سے لو لگی رہی۔ اللہ سے لو لگی رہے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں جب بھی فون پر بات ہوئی، پہلا جملہ یہی سننے میں آیا، ''اللہ کا شکر ہے۔'' نہ کوئی گھبراہٹ، نہ شکوہ، نہ مایوسی کا اظہار،

نہ بیماری کی طولانی داستان، جعفری صاحب زیادہ پریشان نظر آتے تھے۔ حوصلے کی بات یہ تھی کہ اسی زمانے میں جب تکلیف سے جان پر بنی ہوئی تھی اور کہیں آنا جانا بالکل موقوف تھا، ادا بہن نے اپنے ایک شاگرد کے جلسے میں بھی شرکت کی۔ طوعاً و کرہاً نہیں۔ تکلیف کے باوجود خوش دلی سے۔ ایک صاحب نیویارک سے آئے ہوئے تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ اپنا کلام ادا بہن کو دکھاتے تھے۔ ادا بہن کی شخصیت کا یہ رُخ کبھی کسی کے سامنے نہیں آیا۔ مجھے بھی اس کے علم سے خاصا تعجب ہوا۔ شعر و سخن میں اصلاح دینے کے کام کو آج کے دور میں میں بے کار کا دردِ سر سمجھتا ہوں۔ لوگ ہیں کہ اپنا کلام بلاغت نظام بغل میں داب اس طرح حملے کرتے ہیں جیسے محمود غزنوی نے برصغیر پر یلغار کی تھی۔ سیکھنا اور حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اصلاح کی معنویت پر کوئی غور نہیں کرتا۔ کسی سقم کی نشان دہی کی جائے تو دھونس سے کہتے ہیں۔ اس قافیے میں دوسرا شعر لکھ دیجیے۔ غزل کسی نہ کسی طرح مشاعرے میں کامیاب ہو جائے۔ بس یہ مقصد ہوتا ہے مگر ان صاحب کا مزاج اس قسم کا نہیں تھا۔ شاعری کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ سنجیدگی سے اصلاح لیتے تھے اور ادا بہن کی شاگردی کا برملا اعتراف کرتے تھے۔ اس علم کے بعد میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ادا بہن میں ایک اچھے استاد کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ زبان پر قدرت، بیان کی لطافتوں سے محرمانہ شناسائی۔ فنی نزاکتوں سے پوری پوری آگاہی۔ اصل میں ہر بڑا شاعر، بڑا استاد اور نقاد بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی کو اصلاح دے یا نہ دے مگر اس کی تنقیدی بصیرت اور استادی میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

تحسین و اعتراف کے اس جلسے میں ادا بہن خاصی تکلیف سے آئیں مگر ساری تکلیف کے باوجود بڑی خوش دلی سے پورے وقت بیٹھی رہیں۔ اس عالم میں ان کا آنا مجھے بڑا تعجب خیز معلوم ہوا پھر خیال آیا کہ وضع داری بھی تو ایک چیز ہے۔

صبر اور برداشت کا مظاہرہ میں نے ایک اور بھی دیکھا۔ ایک زمانے میں انجمن کے دفاتر اردو کالج کے احاطے میں تھے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو کالج انجمن کے احاطے میں قائم تھا۔ ان دنوں کالج میں اکثر ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ غل غپاڑا ہوتا۔

مار پیٹ ہوتی۔ بندوقیں نکل آتیں۔ حملہ آور اور شکار دونوں انجمن کے کمروں میں دندناتے اور چھپتے پھرتے۔ بعض اوقات صورت حال یہ ہو جاتی کہ ہمیں اپنے کمرے چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنا پڑتی تھی۔ ایک دن صدر صاحب کے کمرے میں میں ادا بہن سے 'غزل نما' کی اشاعت کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اتنے میں شور ہوا اور پناہ لینے والے طلبا کا ایک گروہ کمرے میں گھس آیا۔ ان لوگوں نے کرسیاں گھسیٹ لیں۔ بیٹھ گئے۔ زور زور سے مکالمہ شروع ہو گیا۔ ادا بہن جس اطمینان سے بیٹھی تھیں بیٹھی رہیں۔ ہم لوگوں نے کام بند کر دیا۔ حملے کا خطرہ تھا مگر ادا بہن پر اس صورت حال کا کوئی اثر نہیں ہوا جیسے یہ عام اور معمول کی بات ہو۔ اتفاق یہ کہ ذرا دیر میں حملے کا خطرہ ٹل گیا۔ ادا بہن نے ان لڑکوں سے جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے بڑی نرمی سے کہا، اب آپ جائیے۔ ہمیں کام کرنے دیجیے۔ طلبا یہ سن کر خاموشی سے چلے گئے۔ اگر یہ بات دفتر کا کوئی آدمی کہتا تو ہنگامہ ہو سکتا تھا کیوں کہ لڑکے اکثر دفتر والوں کی بات نہیں سنتے تھے مگر ادا بہن نہ تو صورت حال سے گھبرائیں، نہ انھوں نے طلبا سے بات کرنے میں کوئی جھجک محسوس کی۔ یہ بڑی ہمت اور حوصلے کی بات تھی۔

ادا بہن شفیق ماں اور متحمل مزاج بیوی ہیں۔ بچوں پر جان چھڑکتی ہیں۔ جعفری صاحب تعریف نہ کرنے کے بادشاہ ہیں۔ خود کہتے ہیں: "یہ میرا خاندانی مزاج ہے۔" یہ بھی کہتے ہیں، "میں ایک بیورو کریٹ ہوں اور مجھے اپنے بیورو کریٹ ہونے پر فخر ہے۔" مگر ادا بہن تعریف نہ سننے کے باوجود رفاقت کا حق خوش دلی سے ادا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی چٹکی بھی لیتی ہیں مگر چوں کہ ادا ہیں، اس لیے حسن ادا کے ساتھ۔ ایک دفعہ میرے سامنے کہنے لگیں: "جی ہاں، جعفری صاحب دنیا کی اصلاح کرنے کے دعوے سے اُٹھے تھے۔ دنیا کی اصلاح تو خیر کیا ہوتی، اپنی بھی اصلاح نہیں ہوئی۔" جعفری صاحب بھی موجود تھے۔ میں اس جملے کا لطف لیتا رہا۔ محظوظ جعفری صاحب بھی ہوئے مگر چوں کہ وہ تعریف نہیں کرتے اس لیے پی گئے۔ عافیت بھی اسی میں تھی۔

وہ گھر جس میں میاں بیوی اور بچوں میں مکمل ذہنی آہنگی ہو بڑا مبارک اور خیر و برکت کا مظہر ہوتا ہے۔ ایسے گھر بہت کم ہوتے ہیں۔ عام طور پر تھوڑی سی ہم آہنگی ہر جگہ ہوتی ہے

مگر غل غپاڑا بھی بہت ہوتا ہے۔ ادا بہن کا گھر اس غل غپاڑے سے بالکل پاک ہے۔ ان میں اور جعفری صاحب میں مکمل ذہنی ہم آہنگی ہے۔ جب بچے چھوٹے تھے اس وقت بھی، جب بچے بڑے ہو کر اپنے اپنے کاموں سے لگ گئے اس وقت بھی جعفری صاحب تعریف تو نہیں کرتے مگر تعریف نہ کرنے کے باوجود اردو شاعری پر بڑا احسان کر چکے ہیں۔ اردو شاعری پر ان کا احسان بڑا زبردست ہے۔ جب ادا بہن نے شعر کہنا بالکل ہی ترک کر دیا تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ میں نے شاعرہ سے شادی کی تھی ادا بہن کی خاموشی کو ختم کرایا اور انھیں شعر لکھنے پر آمادہ کیا۔ سخن گوئی کے احیا کی یہ کوشش ہزار تعریفوں پر بھاری اور مکمل ذہنی ہم آہنگی کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس مکمل ہم آہنگی میں گھپلا مجھے اس وقت نظر آتا ہے جب میں جعفری صاحب کو کسی جلسے یا محفل میں دیکھتا ہوں۔ جامہ زیب ہیں، خوش پوش ہیں، اعلیٰ لباس، خدا جھوٹ نہ بلائے تو ڈھیروں کپڑے بھرے ہوئے ہیں مگر تقریبوں اور جلسوں میں اوبدا کر انتہائی لاپروائی کے انداز میں انگھے اور بدرنگ کپڑے پہنے نظر آتے ہیں۔ ایک کڑھا ہوا کرتے شلوار کا کاسنی سوٹ ہے۔ اکثر اسی کو پہنے رہتے ہیں ادا بہن کبھی ٹوکتی بھی نہیں شاید ٹوک ٹوک کر تھک چکی ہیں۔ حد یہ ہے ڈاکٹر عامر کے ولیمے میں بھی ملگجا کرتا پیجامہ پہنے تھے۔ میری طرح میرے بعض دوست بھی جعفری صاحب کی اس لاپروائی کی تائید نہیں کرتے اور ادا بہن کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

خواتین میں سن گن لینے، ٹوہ لگانے، شوہروں پر دھونس گانٹھنے اور بدگمانی برتنے کی عادت بالعموم ہوتی ہے۔ پتا کھڑکا بندہ بھڑکا۔ ذرا سی بات ہوئی بتنگڑ بن گیا۔ میاں صاحب ہیں کہ جھینک رہے ہیں۔ بیگم صاحب ہیں کہ رو رو کر آنکھیں سجالی ہیں۔ میاں کچھ دبنے لچنے پر آمادہ بھی نظر آتے ہیں۔ عزت کو ڈرتے ہیں۔ فضیحت سے گھبراتے ہیں مگر بیگم صاحب شیرنی کی طرح غرا رہی ہیں۔ کسی صورت رام نہیں ہوتیں۔ یہ ڈرامہ اکثر گھروں میں ہوتا ہے کہیں کم کہیں زیادہ۔ بہرحال تھکا فضیحتی ہوتی رہتی ہے۔ ان گنہ گار آنکھوں نے انتہائی تعلیم یافتہ، معزز اور محترم خواتین میں بھی یہ انداز دیکھا ہے۔ بیوی اٹوانی کھٹوانی لے پڑی ہیں۔ میاں ہنڈیا چولھا کر رہے ہیں۔ ''چمچہ گیری'' بھی کرتے جاتے ہیں یا یہ کہ میاں

بچے کو گود میں لیے بیٹھے ہیں۔ بیوی منشی گیری کر رہی ہیں۔ میاں کبھی بیوی اور کبھی بچے کو دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ ادا بہن اس انداز کی قائل نہیں۔ جعفری صاحب ان سے خوش وہ جعفری صاحب سے مطمئن، ساس نندوں میں کیسی گزری، اس بارے میں مجھے علم نہیں مگر وہ خود ایک مثالی ساس ہیں۔ بہو کو بیٹی کی طرح رکھتی ہیں۔ محبت سے تذکرہ کرتی ہیں۔ پھول پان سمجھتی ہیں۔ سسرال والوں سے محبت سے ملتی ہیں اصل میں محبت، شائستگی اور نرمی ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر ہیں۔ وہ خشونت، درشتگی، لگائی بجھائی، دوسروں کو حقیر ذلیل سمجھنے اور اپنے آپ کو ہمیشہ ورر کھنے کے جذبے سے عاری ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی۔ وہ دوسروں کی کمزوریوں پر مسکراتی ہیں انھیں الم نشرح نہیں کرتیں، نہ کسی کی بھد اڑاتی ہیں۔ جس کا تذکرہ کرتی ہیں اچھے الفاظ میں کرتی ہیں۔ یہ کشادہ دلی کی بات ہے۔ اعلیٰ ظرفی اور ذہنی بلندی کی بات ہے۔ اختلاف رائے کو گوارا کرتی ہیں۔ یہ سمجھتی ہیں کہ ہر شخص کا انداز فکر مختلف ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سب لوگ ایک ہی طرح سوچنے لگیں۔ وہ خوش دلی سے ایسے لوگوں کو بھی گوارا کر لیتی ہیں جن سے انھیں یا جعفری صاحب کو تکلیف پہنچی ہے۔

بیرون خانہ ادا بہن بڑی پُر وقار اور متین خاتون ہیں۔ کہنے والے نے کہا، ایک کمرے میں بہت سی خواتین جمع تھیں اور سب چپ تھیں۔ اگلے نے ہنس کر کہا۔ ''یہ اس صدی کا سب سے بڑا سچ ہے۔'' ادا بہن کی گفتگو میں ٹھہراؤ ہے۔ کاما اور فل اسٹاپ موقعے موقعے سے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ بولنا شروع کیا تو پھر زبان تالو ہی سے نہیں لگی۔ عام ادبی تقریبوں اور مشاعروں میں وہ کم ہی شریک ہوتی ہیں۔ مشاعروں میں اوّل تو جاتی ہی نہیں اور بہ فرض محال گئیں بھی تو لاکھوں من کی بیٹھی نظر آتی ہیں۔ جعفری صاحب طویل عرصے تک برماشیل کے چیرمین رہے ہیں۔ اس ادارے کا سالانہ مشاعرہ بڑے اہتمام سے ہوتا تھا۔ اسے ایک اہم ادبی تقریب کی حیثیت حاصل تھی۔ برماشیل کے چیرمین ہونے کی وجہ سے جعفری صاحب صدارت کرتے تھے مگر میں جتنے مشاعروں میں شریک ہوا ان میں سے کسی ایک میں بھی ادا بہن نے شرکت نہیں کی۔ میں نے ایک بار شرکت نہ کرنے کا سبب پوچھا،

کہنے لگیں۔ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میاں صدارت کر رہے ہیں بیوی خصوصی شاعرہ ہیں، یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے ایسی شرکت پسند نہیں۔ لوگ برماشیل کے مشاعروں میں شرکت کے لیے کنوؤں میں بانس ڈالا کرتے تھے۔ مجھ سے کئی شاعروں نے کہا" آپ کے تعلقات ہیں۔ ذرا اقبال کاظمی صاحب سے کہہ دیجیے۔ ہمیں بھی بلالیں۔" اقبال کاظمی بے چارے بھلے آدمی۔ بات سن لیتے تھے۔ مگر ادا بہن شرکت پر تیار ہی نہیں۔ ایک طرح سے یہ ان کے گھر ہی کا مشاعرہ تھا لیکن اصول پسندی تو اصول پسندی ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ یارانِ طریقت کسی موقعے پر شخصیت سازی سے نہیں چوکتے اپنے منھ میاں مٹھو بھی بنتے ہیں۔ دوسروں سے تعریف کے متمنی بھی رہتے ہیں۔ بس ان کا نام آجائے۔ "بر سر الزام ہی سہی۔" ایک یہ ادا بہن ہیں کہ اپنی ذات اور اپنے فن کی تشہیر نہیں چاہتیں۔ نہ اپنے میاں کے منصب سے کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ چاہتیں تو ذرا سے اشارے پر رسالوں کے خاص نمبر شائع ہو جاتے۔ اخباروں میں آئے دن گوشے شائع ہوتے۔ تنقیدی کتابیں مرتب ہوتیں۔ مجلّے پیش ہوتے۔ تحقیقی مقالے لکھے جاتے (میری اطلاع کے مطابق ایم اے کا ایک مقالہ لکھا گیا ہے)۔ پی آر کے بل بوتے پر نہ جانے کتنے کاغذ کی ناؤ کھینے والے ناخدا بنے بیٹھے ہیں، مگر "رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے۔" کوئی پی آر نہ ہونے کے باوجود ادا بہن ماشاءاللہ اردو شاعری کی خاتونِ اوّل ہیں۔ اس پر مجھے آقا و مولا حضرت سلطان جیؒ بے اختیار یاد آئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی یاد کی شمع کو ہمیشہ فروزاں رکھے۔ میری رسائی انھیں تک ہے اور یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ادا بہن کو حضرت والا سے وطنی نسبت کی سعادت بھی حاصل ہے۔ حضرت نے ایک بار شیخ حمیدالدین سوائیؒ کے حوالے سے فرمایا کہ ان سے کسی نے یہ دریافت کیا کہ بعض مشائخ کے انتقال کے بعد کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا اور بعض کے وصال کے بعد ان کا نام اور شہرت دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جاتی ہے۔ احوال کا یہ فرق کیسے ہوتا ہے۔ شیخ نے جواب دیا جو زندگی میں اپنے اشتہار کی کوشش کرتے ہیں۔ وفات کے بعد ان کا نام بھی مٹ جاتا ہے۔ شہرت بھی مٹ جاتی ہے۔ جو زندگی میں خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں وفات کے بعد ان کا نام اور شہرت ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ ادا بہن

بھی خود کو اور اپنے فن کو چھپائے رکھتی ہیں۔ ان کی جانب سے کسی سطح پر اشتہار کی کوئی کوشش نہیں ہوتی۔

انجمن میں آئے دن ادبی تقریبیں ہوتی رہتی ہیں۔ باہر سے مہمان آتے ہیں۔ خواتین بھی، مرد بھی، ادا بہن اکثر تقریبوں میں شریک ہوتی ہیں۔ گفتگو میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ بڑے بچے تلے الفاظ میں خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کی شرکت سے تقریبوں کا وقار بڑھ جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ آدمی کی پہچان اس کے ساتھ سفر کرنے سے بھی ہوتی ہے۔ ہوتی ہوگی۔ بار ہا لاہور اور اسلام آباد جاتے ہوئے برابر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہم سفر سے بات چیت کی نوبت بھی نہیں آئی مگر ادا شناسی کے سلسلے میں ایک سفر کا حوالہ بھی آتا ہے۔ انجمن نے مرشدی و استاذی قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی خدمات ادب کے اعتراف میں ایک جلسہ کیا۔ جعفری صاحب ڈاکٹر صاحب قبلہ کی شخصیت سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کی خدمت میں حیدر آباد حاضر ہونے کا پروگرام بنایا۔ غالباً اس پروگرام کی تجویز ادا بہن کی طرف سے تھی۔

ایک صبح ہم لوگ حیدر آباد روانہ ہوئے۔ ادا بہن، جعفری صاحب اور ادا بہن کی بھاوج بیگم طیب۔ سفر اچھا گزرا۔ گیارہ بجے کے قریب ہم حیدر آباد پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ سے نیاز حاصل ہوا۔ حسبِ معمول سراپا لطف و کرم تھے۔ بڑی مفید اور معنی خیز گفتگو ہوئی۔ ادا بہن نے دریافت کیا کسی بزرگ کا مرید ہونا ضروری ہے۔ غالباً ان کے ذہن میں یہ سوال بہت عرصے سے تھا کہ سلسلہ سلوک طے کرنے یا اپنی اصلاح کے لیے کسی بزرگ سے بیعت کرنا ضروری ہے یا کسی کے دامن سے وابستہ ہوئے بغیر بھی یہ راہ طے ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے روایتی جواب نہیں دیا۔ فرمایا نہیں، ضروری نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیجیے۔ سنت اور قرآن پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی کے دامن سے وابستہ ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وابستگی سے فائدہ ہوتا ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف موقعوں پر بیعت کی ہے۔ بیعت کا تصور وہیں سے

نکلا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس جواب میں دونوں پہلوؤں کا احاطہ ہے۔ جواب کی معنویت یہ ہے کہ کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ جو مناسب حال ہو وہی کرنا چاہیے۔

اس کے بعد ادا بہن نے کہا، "ہمیں کچھ نصیحت فرمائیے۔" یہاں بھی ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ ارشاد ہوا، "میں خود گنہ گار ہوں۔ نصیحت کیا۔" پھر اتباع سنت نبوی پر زور دیا۔ بار بار سمجھاتے رہے کہ جو کچھ ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی پیروی سے ہے۔ انسان کو ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ کوشش جاری رکھنا چاہیے۔ اس گفتگو کے دوران میں ادا بہن کو دیکھتا رہا ان کے چہرے پر طمانیت اور روحانی مسرت کی ایسی روشنی جھلک رہی تھی جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ہم لوگ بہت دیر تک ڈاکٹر صاحب کے یہاں رہے اور دوپہر کا کھانا کھا کر رخصت ہوئے۔ واپسی کا سفر بھی جانے کے سفر کی طرح خوش گوار تھا۔ جاتے وقت ذہنوں میں بہت سے سوال تھے۔ کش مکش تھی، امید وبیم کی ایک کیفیت تھی۔ واپسی میں سکون تھا۔ ذہنی اور روحانی آسودگی تھی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ ادا بہن نے روحانی معاملات و مسائل پر بھی خاصا غور کیا ہے۔ انسانی ذہن میں وقتاً فوقتاً شک کے جو کانٹے چبھتے رہتے ہیں۔ تذبذب کی جس کیفیت سے گزر کر انسان تیقن کی منزل پر پہنچتا ہے انھیں سب کا تجربہ ہو چکا ہے۔ واپسی کے سفر میں ان کی گفتگو سے میرے اس خیال کی مکمل تائید ہو گئی۔

آدمی کی پرکھ معاملات سے بھی ہوتی ہے۔ ادا بہن سے میرا رشتہ مصنف اور ناشر کا بھی رہا ہے۔ ہر مصنف کی خواہش ہوتی ہے کہ ادھر اس نے مسودہ ناشر کے حوالے کیا اور اُدھر دوسری طرف سے چھپی چھپائی کتاب مشین سے باہر نکل آئے۔ بڑی مشکل ہوتی ہے۔ لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔ منائے نہیں منتے۔ قدم قدم پر نزاکتوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں معاملہ دوآتشہ تھا۔ مؤلفہ، شاعرہ، فن کار کا نازک مزاج ہونا لازمی، پھر شوہر اشاعتی ادارے کے صدر، جو کچھ نہ ہوتا کم تھا مگر ادا بہن تو جیسے شبنم ہی شبنم ہیں۔ ایک دفعہ بھی یہ نہیں پوچھا، "دیر کیوں ہو رہی ہے۔" میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ جس کاتب سے کتابت کرائی جا رہی ہے وہ صحیح معنوں میں خوش نویس بھی ہے اور دیر نویس بھی ہے۔ اپنی مرضی سے

کام کرے گا۔ ہمارے تقاضوں سے متاثر نہیں ہوگا۔ ادا بہن اس بات سے مطمئن ہو گئیں۔
کاتب صاحب نے جی بھر کر دیر لگائی جتنی دیر لگا سکتے تھے اس میں کوئی کمی نہیں کی مگر لکھا ایسا کہ دل خوش ہو گیا۔ اس سارے عرصے میں ادا بہن نے کوئی تقاضا نہیں کیا۔ بڑے صبر سے بیٹھی رہیں نہ جعفری صاحب نے کوئی سرزنش کی حالاں کہ وہ مزاجاً عجلت پسند ہیں۔ کام فوری چاہتے ہیں اور نک سے سک درست چاہتے ہیں مگر نہ کوئی تقاضا کیا نہ کوئی دخل دیا۔ کتابت ہو گئی تو کاغذ، طباعت، سرورق اور جلد کا مرحلہ آیا۔ سرورق بنا ہوا تھا مگر باقی سب معاملات میں نہ ادا بہن نے کوئی مداخلت کی نہ جعفری صاحب نے۔ میں نے اپنی مرضی سے خوشی خوشی سارے کام کیے۔ سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی کہ ادا بہن نے اشاعت میں تاخیر کے باوجود کتاب کو پسند کیا اور میری کوشش کو سراہا۔ پسند جعفری صاحب نے بھی کیا لیکن انھوں نے حسب عادت تعریف نہیں کی صرف پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"غزل نما" کا ذکر چھڑا تو ادا بہن کے حسنِ ذوق اور تنقیدی بصیرت کا خیال آیا۔ یہ انتخاب، انجمن کے رسالے 'قومی زبان' میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ ادا بہن کبھی کبھی فون کرتیں۔ فون پر پہلی بات یہ کہ اچھا ڈاکٹر صاحب بول رہے ہیں۔ لہجے میں غیر معمولی شفقت اور نرمی۔ یہ اعتماد کہ ہم آپ کو اور آپ کی آواز کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ پھر کوئی اور بات.... یہ فرمایش کہ کچھ قدیم شاعروں کے دیوان بھجوایئے۔ میں کتب خانہ خاص سے کچھ دیوان بھجوا دیتا۔ کچھ بعد پھر فون آتا۔ فلاں صاحب کا پورا دیوان دیکھ لیا۔ اک شعر بھی ڈھنگ کا نہیں ہے۔ میں بھی غور کرتا۔ واقعی موصوف سے پوری زندگی میں کوئی اچھا شعر کہنے کی حماقت سرزد نہیں ہوئی۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ ادا بہن نے "غزل نما" کے سلسلے میں بے شمار شعرا کے کلیات اور دواوین کھنگال ڈالے ہیں۔ بڑی توجہ سے پڑھے ہیں اور انتخاب میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے۔ یہ انتخاب خاصے کی چیز ہے۔ ادا بہن نے اس پر بڑی محنت کی ہے۔

"غزل نما" کا انتخاب ہی نہیں اس کا پیش لفظ بھی خوب صورت اور فکر انگیز نثر کی اعلیٰ مثال ہے۔ سچا فن کار نثر لکھے یا شعر کہے۔ لفظ لفظ سے روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

نکھرا نکھرا اور اجلا اجلا بیان۔ مرتب اور جا بہ جا سوال اٹھانے والے خیالات۔ عمیق مشاہدہ۔
گہرا تجربہ، فنی نزاکتوں کی تفہیم کا دل نواز انداز، یہی کیفیت ادا بہن کی خودنوشت میں
بھی ہے۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی وہ انفرادی اسلوب کی حامل ہیں لیکن اس جائزے کا
حق ان کے نقاد کو پہنچتا ہے، خاکہ نگار کو نہیں۔ میں نے ایک عام قاری کی حیثیت سے ان کی
خودنوشت سے لطف اُٹھایا ہے۔ اس کے بارے میں ان سے گفتگو کی ہے اور پروفیسر شمیم حنفی
جیسے صاحب نظر نقاد سے اس کی تحسین بھی سنی ہے۔ عنقریب یہ کتابی شکل میں شائع ہونے
والی ہے کچھ اضافے ہوئے ہیں مگر وہ حصے میں نے نہیں دیکھے۔ صرف ان کا تذکرہ سنا ہے۔
میرا خیال ہے کہ ادا بہن کی خودنوشت اردو خودنوشتوں میں گراں قدر اضافہ ہوگی کیوں کہ یہ
عام ڈگر سے ہٹی ہوئی زندگی اور فن کارانہ صداقتوں کی ایسی روداد ہے جس میں روداد نویس
نے اپنے آپ کو موقعے کی مناسبت سے بڑا بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔

خاکہ لکھنا، خاکہ اڑانا، خاکے میں رنگ بھرنا یوں تو بہت آسان ہے۔ واقعات کو
ایک لڑی میں پروتے جایئے۔ کام بن گیا مگر کبھی کبھی خاکہ لکھنے والے پر کڑا وقت بھی
آتا ہے کیوں کہ خاکہ لکھنا اڑتی ہوئی تتلی پکڑنا ہے۔ تتلی عام طور پر ہاتھ نہیں آتی۔ گرفت سے
نکل نکل جاتی ہے۔ کبھی ہاتھ میں صرف ایک آدھ رنگ رہ جاتا ہے، کبھی وہ بھی نہیں۔ تتلی ہے کہ
پھر سے اُڑ جاتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسا لمحہ بھی آجاتا ہے جب تتلی ہاتھ آجاتی ہے۔ اسی وقت
خاکے کی تکمیل ہوتی ہے۔ اتنا سب کچھ لکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ تم نے داستان تو
لکھ ماری مگر اس کا خلاصہ کیا ہے۔ چند لفظوں میں شخصیت کی گرہ کیسے کھولوگے۔ یہ واقعی
کڑی آزمائش تھی مگر پھر ایک لمحے روشنی سی محسوس ہوئی اور یک لخت خیال آیا کہ ادا بہن کی
شخصیت بیلے کا پھول ہے۔ اجلا اجلا، مدھر خوشبو والا، نازک، نفیس، گلے اور ہاتھ کی زینت،
دلوں کے قریب، جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے۔ ان سے ملے ہیں۔ انھیں جانتے ہیں۔
ان کی شاعری کی خوشبو محسوس کرچکے ہیں وہ میرے اس تاثر سے اتفاق کریں گے۔ ادا بہن
اردو شاعری کے چمن میں بیلے کے پھول کی طرح مسکرا رہی ہیں۔ مہک رہی ہیں اور مہکا
رہی ہیں۔

میں نے فوائد الفواد میں حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مبارک ارشاد انھیں دنوں پڑھا ہے۔ پڑھتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا تھا۔ وہ ارشاد بعض صوفیاے کرام کے حوالے سے تھا۔ مجھے شاعروں اور ادیبوں کے حوالے سے بھی یہ ارشاد بڑا موزوں اور برمحل معلوم ہوا چنانچہ تصرف کے ساتھ اسی کو دہراتا ہوں کہ "بے شمار شاعر اور ادیب ہو گزرے ہیں۔ کون جانتا ہے کہاں گئے اور کون تھے۔ یہ جو شہرت باقی ہے یہ حسنِ معاملہ اور نیک نیتی کی وجہ سے ہے، یہی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے وہ کل اور پرسوں ہی تھے۔ یہ سب حسن معاملہ اور حسن نیت کے سبب سے ہے۔" مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ادا بہن کی ساری شخصیت حسن معاملہ اور نیک نیتی سے عبارت ہے۔ آج بھی وہ ہمارے دلوں کے قریب ہیں۔ کل کے پڑھنے والے بھی انھیں اپنے ہی عہد کا فن کار سمجھیں گے اور پرسوں کے پڑھنے والے بھی ان سے دلی قربت محسوس کر کے انھیں اپنے ہی زمانے کی آواز خیال کریں گے۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب ادا بہن نے خود ہی لکھ دیا ہے:

حرفِ آغاز بھی میں نقطۂ انجام بھی میں
کل کی امید بھی میں آج کا پیغام بھی میں

کیا اس میں کوئی شک ہے؟ شاید بالکل نہیں.....

(۱۹۹۴ء کو ادا جعفری کے ساتھ ایک شام منجانب ہمدرد میں پڑھا گیا۔)

ooo

محمد معروف سلیمانی [illegible]

اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جامعۃ الفلاح

بلریا گنج، اعظم گڑھ سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے

بی اے (آنرز)، بی ایڈ، لسانیات میں پوسٹ

گریجویٹ ڈپلوما، پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان ماس

کمیونیکیشن (اردو)، ایڈوانس ڈپلوما ان (انگلش

(سال دوم)، اور ایم اے (اردو) کی ڈگریاں حاصل

کیں۔ دسمبر 2011ء میں یو جی سی کے زیر اہتمام

منعقدہ IRF ٹسٹ میں کامیابی حاصل کی۔ فی الحال سینئر

ریسرچ فیلو (SRF) کی حیثیت سے [illegible] کی علمی اور

ادبی خدمات کے موضوع پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی میں پروفیسر شہاب الدین ثاقب صاحب کے

زیر نگرانی Ph.D کے لیے تحقیق میں مصروف ہیں۔

متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسالوں

میں شائع ہو چکے ہیں۔

...ke Mashhoor Khake

...ted by Mohd. Maroof Sulaimani

...rshia publications

ISBN 93-81029-78-4

9 789381 029787

www.arshiapublications.com

arshiapublicationspvt@gmail.com